

محی الدین نواب

ایمان کا معنی



فہرست

9	ایمان کا سفر	1
107	چور رشتہ	2
147	سدا سہاگن	3
183	میٹھا زہر	4
213	آئینہ خانہ	5
261	آدمی کا باپ	6
293	شیشوں کے میا	7
335	جزیرے کی چاندنی	8
365	ممتا کی واپسی	9
437	کلی کا کفن	10

حرف اول

محی الدین نواب ایک زندہ اور روشن ادب پیش کرنے والے قلمکار کا نام ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں جہاں اردو زبان کی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں وہاں محی الدین نواب کو لوگ پڑھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

اگرچہ زیرِ نظر کہانیاں پچھلے سالوں کے دورِ ان ماہ بہ ماہ شائع ہو چکی ہیں۔ تاہم کتابی صورت میں انہیں اس لیے محفوظ کیا جا رہا ہے تاکہ آئندہ نسلوں کہانیوں کے اس اہم کھول کر پچھلے دور کے مزاج کو سمجھ سکیں۔ انسان پہلے بھی محنت کش تھا، اب بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہو گیا کہ وہ پہلے مزدور تھا، اب مشین بن گیا ہے۔ خواہ غریب ہو یا سرمایہ دار، سب ہی وقت کی رفتار کے ساتھ چیز رفتار بن گئے ہیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کہانیوں میں پیش کیے جانے والے مناظر کی تفصیلات ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سکیں۔ وہ اپنے حالات کو اپنی چیز رفتار کی کے مطابق پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب اس معاشرے کی کسی بھی نیچر می رنگ کو اپنی کہانی کا موضوع بنانا ہے تو قوم کی گہری اور روانی کی طرح تیزی سے اپنے پڑھنے والوں کو اس نیچر می رنگ کے آس پاس پھیلاتا ہے۔

عمر کی پچھلی آوی کو بے حد سنجیدہ بنا دیتی ہے مگر اس میں شونی برائے نام رہ جاتی ہے۔ نواب نے اپنی عمر کے پچاس برس گزار دیے ہیں۔ نصف صدی کا چہرہ دیکھا ہے۔ زندگی کے بے شمار طعنے کھائے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم، قحط بنگال اور قیام پاکستان ایسے تاریخی موڑ آئے جب وہ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا رہا۔ ان حالات میں آدمی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج ہو جاتا ہے لیکن نواب کی تحریر کی شوخیاں شاہد ہیں کہ وہ کانٹوں کے بستے سے کلاب کی شونی رنگارنگی اور خوشبو نہ چھوڑتا ہے اور اسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاتا ہے۔

حالات نے اسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ تحریر کا فن حاصل کرنے کے لئے کسی استاد کے آگے زانو ادب نہ کرتا۔ اس نے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ راجندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، نل سنہرا، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس کے عابدانہ استاد ہیں۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے لیکن ان ادیبوں نے اسے سماجی شعور کو قلم کی نوک سے برتنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

نواب کے پاس نہ خیالات کی کمی ہے اور نہ الفاظ کی۔ لکھتے لکھتے نواب کا ہاتھ تھک جاتا ہے اور انگلیاں دکنے لگتی ہیں لیکن خیالات کی فراوانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی لئے نواب کو نیپ ریکارڈر کی مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میری دانست میں نواب اردو کا وہ واحد مصنف ہے جو اپنی کہانی نیپ ریکارڈر پر نیپ کرتا ہے اور اس نیپ سے یہ کہانیاں صفحہ قرطاس پر منتقل ہوتی ہیں۔

نواب کی ایک اور خصوصیت اس کے کرداروں کی مانوسیت ہے۔ یہ کردار آفاقی یا تخیلی نہیں بلکہ زندہ اور مجسم ہیں۔ ہمیں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نواب قارئین کو خواب دکھانے کا معلوم دنیا میں ملے جانے کا قطعاً قائل نہیں۔ نواب کی باریک بین نگاہیں جس طرح معاشرے اور افراد کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ اور ذہن ان کا تجزیہ کرتا ہے وہی زبان قلم قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت مختصر سے عرصے میں نواب کی تحریر کی دھوم مچ گئی ہے اور اس نے ہر خاص و عام سے قبولیت کی سند حاصل کر لی ہے۔ موجودہ کہانیاں اگر پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اور پڑھنے میں ایک نیا لطف محسوس کرتے ہیں اور اگر پہلے نہیں پڑھ چکے تو آپ کو افسوس ہو گا کہ اتنی خوبصورت کہانیوں سے آپ اب تک کیوں محروم رہے۔

معراج رسول

انتساب

اپنے جواں مرگ بیٹے جمیل الدین نواب کے نام

بیٹے!

تمہاری ماں اپنی مردہ کوکھ کے کتبے سے سر ٹپکے ابھی تک رو رہی ہے۔ وہ تخلیق کے کرب کو نہیں بھولے گی۔ روتے روتے ایک دن مر جائے گی۔
مگر میرے پاس آنسوؤں کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہے۔ میں تمہارے بعد زندہ رہوں گا۔ اس بڑھاپے میں ان سے لڑتا رہوں گا جو تمہاری چھوڑی ہوئی دنیا کی خوبصورتی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

محی الدین نواب

ایمان کا سفر

”میں ایک مسافر
سج کے چکے سے
بر حہ پا گزر رہا ہوں
اس لیے کہ ہزار ہا صدی سے
کائناتوں کی راہ گز سے
ایمان گزر رہا ہے۔“

”مسافر تم کون ہو؟“

ایمان علی نے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے بھگوٹے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس اجنبی نے سر ہلا کر کہا۔

”تم ملے سے مولوی نظر آتے ہو، تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔ اور ایمان مسجد کے دروازے پر ہی آتا ہے۔ کیا تم نماز پڑھاؤ گے؟“

ایمان علی کے بھوکے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔ اس کی زبان نالو سے چپک مٹی تھی کہ وہ اس قدر ایمان دار نکلے گا۔ وہ ایسا ایمان دار تھا کہ سچ بول بول کر اپنوں کو دشمن بنا کر پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے زبان ہلا کر جواب دیا۔
”یہ سعادت نصیب والوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں“
”انہ“ اگر اس سے منافع حاصل ہو۔ مگر جہاں نقصان اٹھانا پڑتا وہاں بھی وہ ایمان ہی کی بات کرتا تھا۔ یہ آئے دن کی ایمانداری اسے ایک بے معرف سوکھے پتے کی طرح اورم سے ادھر اڑائے بھر رہی تھی۔
وہ سوکھا پتا حالات کے چھیڑے کھاتا ہوا، شاہ پور کی ایک مسجد کے دروازے پر آکر، کے لیے کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ۔“

مسجد کا بند دروازہ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا۔ ”مسجد میں مریہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔“ وہ پچھلی شام سے فائے کرتا آ رہا تھا۔ صحت پہلے ہی ماشاء اللہ تھی، پانی بغفل خدا اب بھی مجھ میں اتنی ایمانی قوت ہے کہ پہلے میں نماز پڑھاؤں گا پھر روٹی کی پیتا تو وہ بھی خالی پیٹ میں ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوک ٹھکانا چاہتا تو حلق میں کانٹے جیسے خراہش کروں گا۔“

تکتے۔ اس کا سر پکرا رہا تھا وہ بے دم ہو کر کہیں گر جانا چاہتا تھا لیکن ایمان والے کو گرنے کے لیے بھی کسی پاک صاف جگہ کی ضرورت تھی لہذا وہ مسجد کے دروازے پر آکر۔
”وہ ایمان علی کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس دنیا میں جہاں انسان روٹی کھاتے کھاتے زندہ رہتا ہے اور روٹی کھاتے کھاتے مر جاتا ہے، وہ احمق گرنے کے بعد بھی اس میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ ہوش میں تھا۔ ایسی حالت مرتے مرتے بھی روٹی کے بجائے نماز کی تمنا کر رہا تھا۔“

میں انسان روٹی اور صرف روٹی کے متعلق سوچتا ہے۔ اگر روٹی نہ ملے تو وہ کسی کے مکان کا دروازہ توڑ کر وہ روٹیاں حاصل کرنا چاہتا ہے جو بھوسی بھوکے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں مٹاتے ہوئے کہا۔

”تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ سنا ہے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی، وہ ہمہ وقت مہارت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر تمہیں تو پیاس لگ رہی ہے، میں ابھی پانی لے کر آتا ہوں۔“

یہ دروازہ بند کیوں ہے؟ نماز کا وقت ہو چکا ہے، نمازی کہاں ہیں؟ یہ مسجد دیران کیوں ہے؟ یہ تمام سوالات اس کے ذہن میں چکرار رہے تھے۔ اس کا سر بھی پکرا رہا تھا، ایسے ہی وقت ایک ادھر عمر چہرے نے اس پر ہتھکڑی کر پوچھا۔
”وہ ایمان علی نے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے بھگوٹے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس اجنبی نے سر ہلا کر کہا۔“
”تم ملے سے مولوی نظر آتے ہو، تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔ اور ایمان مسجد کے دروازے پر ہی آتا ہے۔ کیا تم نماز پڑھاؤ گے؟“
ایمان علی کے بھوکے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔ اس کی زبان نالو سے چپک مٹی تھی کہ وہ اس قدر ایمان دار نکلے گا۔ وہ ایسا ایمان دار تھا کہ سچ بول بول کر اپنوں کو دشمن بنا کر پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے زبان ہلا کر جواب دیا۔
”یہ سعادت نصیب والوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں“
”انہ“ اگر اس سے منافع حاصل ہو۔ مگر جہاں نقصان اٹھانا پڑتا وہاں بھی وہ ایمان ہی کی بات کرتا تھا۔ یہ آئے دن کی ایمانداری اسے ایک بے معرف سوکھے پتے کی طرح اورم سے ادھر اڑائے بھر رہی تھی۔
وہ سوکھا پتا حالات کے چھیڑے کھاتا ہوا، شاہ پور کی ایک مسجد کے دروازے پر آکر، کے لیے کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ۔“
مسجد کا بند دروازہ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا۔ ”مسجد میں مریہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔“ وہ پچھلی شام سے فائے کرتا آ رہا تھا۔ صحت پہلے ہی ماشاء اللہ تھی، پانی بغفل خدا اب بھی مجھ میں اتنی ایمانی قوت ہے کہ پہلے میں نماز پڑھاؤں گا پھر روٹی کی پیتا تو وہ بھی خالی پیٹ میں ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوک ٹھکانا چاہتا تو حلق میں کانٹے جیسے خراہش کروں گا۔“
تکتے۔ اس کا سر پکرا رہا تھا وہ بے دم ہو کر کہیں گر جانا چاہتا تھا لیکن ایمان والے کو گرنے کے لیے بھی کسی پاک صاف جگہ کی ضرورت تھی لہذا وہ مسجد کے دروازے پر آکر۔
”وہ ایمان علی کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس دنیا میں جہاں انسان روٹی کھاتے کھاتے زندہ رہتا ہے اور روٹی کھاتے کھاتے مر جاتا ہے، وہ احمق گرنے کے بعد بھی اس میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ ہوش میں تھا۔ ایسی حالت مرتے مرتے بھی روٹی کے بجائے نماز کی تمنا کر رہا تھا۔“
میں انسان روٹی اور صرف روٹی کے متعلق سوچتا ہے۔ اگر روٹی نہ ملے تو وہ کسی کے مکان کا دروازہ توڑ کر وہ روٹیاں حاصل کرنا چاہتا ہے جو بھوسی بھوکے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں مٹاتے ہوئے کہا۔
”تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ سنا ہے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی، وہ ہمہ وقت مہارت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر تمہیں تو پیاس لگ رہی ہے، میں ابھی پانی لے کر آتا ہوں۔“

لتی تھی جیسے کبھی کبھی بھولے ہوئے زخموں سے بولے بولے نہیں اٹھتی ہیں۔ اسی ”میراثہ چوہدری برکت علی“ ہے، میں یہاں زمیندار ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ ایمان کے باتوں سے تھپک تھپک کر سلائی ہوئی بھوک اچانک ہڑپڑ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں ایمان کا جذبہ ہے اس لیے میں نے یہ مسجد بنوائی ہے۔“ اور پیٹ کی آہٹیں سڑکرا رہی تھیں اور بھی نقاہت سے آگے کی طرف سکیڑ دیتی تھیں۔ ایمان علی نے کہا۔

”دروازہ کھولنے کے بعد وہ نقاہت سے جھکا اور ڈنگا تا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔“ ”صرف مسجد ہی بنوائی ہے یا نماز بھی پڑھواتے ہو۔ اگر میں نہ آتا تو یہ مسجد اسی طرح کے پختہ فرش پر گر گئی ہوتی تھی اور سوکھے پتے اس کی طرح اوھر سے اوھر ڈنگا رہے ان رو جاتی“ اور کراہتے ہوئے لڑکھڑاتے جا رہے تھے۔ اتنے میں وہ اجنبی اس کے لیے پانی لے آیا۔ چوہدری برکت علی نے کہا۔

”ننگے دقت اس کا حلق دکھ رہا تھا۔ وہ پیٹ میں پہنچ کر ٹھنڈک پہنچا رہا تھا مگر بھوک نہیں۔“ ”کئی بات نہیں۔ کل تک یہاں ایک پیش امام رہتے تھے وہی نماز پڑھاتے تھے اور رہا تھا۔ ایمان علی نے سوچا کہ عصر کی نماز مختصر ہوتی ہے، نماز ادا کرنے کے بعد اس کے بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن پچھلے دنوں اس مولوی کے دل میں شیطان پیدا روئیاں مل جائیں گی۔ عصر کی مختصر نماز کے متعلق سوچتے ہوئے اچانک اسے اپنی ٹالیا۔ اسی جگہ اس دس برس کی بچی کو تعلیم دینے کے دوران اس نے ایسی ذالالت کا مظاہرہ کا احساس ہوا۔ عابد کو عبادت کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔ عبادت کو ناپنے اور تولیہ کہ جس کا ذکر ہم نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہم نے اسے بری طرح ذلیل کر کے نکال دیا مطلب یہی ہے کہ تھوڑی دیر بعد ملنے والی روٹی کو عبادت کے برابر اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ پیش امام کے فرائض انجام دے سکے اسی لیے ”توبہ توبہ“

توبہ کرنے کے بعد اس نے چوڑے پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ اذان دینے کے لیے ایسے مقدس مقام تک پہنچنے کے لیے شیطان ایک مولوی ہی کے ہمیں میں آتا ہے ایک جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چند نمازی آگئے۔ نئے مولوی اپنی شیطانی حرکتوں سے پچھتا جاتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک مولوی اپنی دیکھ کر انہوں نے سلام کرتے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ بات سے دوسرے مولویوں کو بدنام کر دیتا ہے۔“

چوہدری برکت علی نے کہا۔ ”توبہ بھوکے ہیں پہلے کچھ کھائیں بعد میں باتیں ہوتی رہیں گی۔“ ایمان علی نے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں اور سالن کی پلیٹ کو دیکھا پھر سراٹھا کر پوچھا۔ ”کیا آپ روٹی کھا چکے ہیں؟“ ”جی ہاں“

”کیا آپ کے پڑوسیوں نے کھالیا؟“ یہ سوال سن کر چوہدری برکت علی ذرا چکرا سا گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں جی ہاں پڑوسیوں نے یقیناً کھالیا ہوگا۔“ ”تم یہ بات قیاساً کہہ رہے ہو۔ جب کہ تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ تمہارا لاپروسی بھوکا نہیں ہے۔“ اسرا جی نے جواب دیا۔

نمازیوں میں سے ایک نے کہا۔
 رچے ہو۔ جس کھیتی باڑی سے تمہاری عاقبت ہری بھری ہوتی ہے تم وہ محنت کیوں نہیں

”مسئولی صاحب! میں چوہری کا پڑوسی ہوں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کرکٹے؟ کبھی مسجد میں بھی آیا کرو اور ثواب کی فصل کاٹا کرو۔“

دوسرے چار نمازیوں نے بھی اس کی تائید کی اور چوہدری برکت علی کی حمایت سرگوشیاں کرتی تھیں کہ مولوی جو ان ہے مکریت کا کھوتا نہیں ہے، کبھی سر اٹھا کر پرانی سو بت کچھ کہنے لگے۔ جب ایمان علی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ روٹی لانے والے کا بیٹوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ہاں وہ بھی کوئٹہ کرنا تھا کہ کسی کی طرف نہ دیکھے مگر وہ کھڑکی پر دسی بھوکا نہیں ہے اور اس کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ سب پیٹ بھر کر کھا چکے ہوں گی۔ اس وقت وہ توبہ کر کے فوراً ہی نظر جھکا لیتا تھا۔ پہلے تو ہیں تو وہ ہم اللہ پڑھ کر فائدہ کشائی کرنے لگا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا تھا جس نے حجرے کی کھڑکی بند کر لی تھی۔ شدید گرمی کے باوجود وہ کھڑکی نہیں کھولتا تھا۔ گرمی جہاں سے ایک مولوی کو پچھلے دنوں نکالا گیا تھا اب وہاں نئے مولوی کو رہنے کی جگہ مل کر ان کی راتوں میں یوں تو سب ہی مکان کے باہر چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ زمیندار نے اسے تھی۔ ایمان علی روٹیاں کھانے کے بعد حجرے میں آیا تو اسے نہایت صاف ستھرا ملا بھی سونے کے لیے ایک چارپائی دی تھی لیکن وہ نماز عشاء کے فوراً بعد ہی سونے کا عادی زمیندار کا ملازم صفائی کر گیا تھا۔ اب تب میں شام کا اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا۔ ایمان علی نے نماز پڑھ کر وہ حجرے میں آتا تو چوہدری برکت علی کا ملازم اس کے لیے کھانا لے نے حجرے کی وہ کھڑکی کھولی جو کعبہ کی سمت کھلتی تھی۔ کھڑکی کھولتے ہی اس نے آواز دے کر کہا کہ آج کھانے سے پہلے وہ عادتاً ملازم سے پوچھتا۔

ہم کہاں کے ہو؟

”جی مولوی صاحب!“

”چھا اب نم جاؤ“ میں کھالوں گا۔“

تھی؟ یہ سب کچھ ایمان علی نہ دیکھ سکا کیوں کہ وہ پرائی ہو بیٹیوں کو ایک شاعری کی نظر سے نہیں دیکھتا چاہتا تھا اسی لیے اس نے انکو بند کرتے ہی وہ کھڑی بھی بند کر دی۔ طویل بموکھ کل ملازم کے جانے کے بعد وہ روٹی اور سالن کو ڈھانپ کر رکھ دیتا پھر حجرے سے باہر جاس اور در بدر کی ٹھوکروں نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ چیتے بھر کر روٹی کھانے کے بعد اس نے ان کی خیریت دریافت کرتا اور ان سے کہتا۔

”میرے پاس خوراک سے دو روٹیاں زیادہ ہیں اگر آپ میں سے کسی کو ضرورت ہو تو لا آئیں میرے کھانے میں شریک ہو جائے۔ دروازے دروازے گھومنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کے پر دوس میں کوئی بھوکا نہیں سو رہا ہے۔ مگر یہ نیکی اور شرافت اسے منگنی ہو چکی تھی کیونکہ اس نیک کام کے لیے اسے اس دروازے پر بھی جانا پڑتا تھا جہاں وہ لڑکی پہلے دن نظر آتی تھی۔

”تم یہاں ایسے بیچو تو ہو جس کی فصل کا ایک حصہ بھی تمہاری پیٹ میں نہیں اس لڑکی کے ہاں باپ بہت بوڑھے تھے۔ باپ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کے ہاتھ کانپتے جاتا۔ تم بھوکے رہتے ہو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہل چلاتے ہو اور پھر بھی خانا ہاتھ پیر بھیڑ بھیڑ زمیندار کے موسیٰ کی دیکھ بھال کرتا تھا اور وہ لڑکی اس کی حویلی میں جھاڑو

میں گر کر اپنے رب کریم کے سامنے گزرا تا تھا۔

”میرے معبود! میں نے ہمیری عبادت کے سامنے زندگی کی تمام ضروریات کو بھل کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو بچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ خواہش ایک بھرے ہوئے غبارے کی طرح ہے اسے جتنا دیا تا ہوں وہ اتنی ہی اچھلتی ہے۔ جب تک میں شرع کے مطابق کسی شریف زادی سے نکاح نہ پڑھواؤں اس وقت میرے پائے استقلال میں لغزش نہ آئے دے۔ میرے معبود!“

اللہ میاں بعض اوقات عجیب مذاق کرتے ہیں۔ اس کے گزرا نے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن وہ لڑکی روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں آئے گی۔ اسے دیکھتے ہی ایمان علی کو کھلا گیا۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا کر بھکاتے ہوئے پوچھا۔

”تھ۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

اس نے روٹیوں کا چھابہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”چوہدری صاحب کا حکم ہے کہ میں روٹیاں پہنچایا کروں۔“ جب وہ روٹیاں رکھنے کے لیے اس کے سامنے جھک رہی تھی تو ایمان علی کی نظریں بے اختیار اٹھ رہی تھیں مگر وہ نظریں اٹھتی ہی مڑ رہی گئیں۔ ایمان علی نے چیخ کر لالچل پڑتے ہوئے اپنی آنکھوں کو اتنی سختی سے میچ لیا جیسے وہ ان آنکھوں کو انٹی کھوپڑی میں چھپا لیتا چاہتا ہو۔ آنکھیں نہ چمپ سکیں بلکہ بند ہوتے ہی کچھ اور روشن ہو گئیں۔ دماغ کے وسیع آسمان پر غبارے ہی غبارے اڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ زرا سی دیر میں ہی نہ ہینہ نہ ہینہ ہو گیا اور غصے سے تھر تھراتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں نے کئی بار سمجھایا ہے کہ دوپٹے کو اچھی طرح بدن پر لپیٹا کر۔ تیرے ماں باپ تجھے سمجھاتے نہیں ہیں؟“

وہ معصومیت سے بولی۔

”میری ماں کو نظر نہیں آتا۔ میرے باپ کو چوہدری نے کام سے الگ کر دیا ہے کیوں کہ وہ اتنا بوزھا ہو گیا ہے کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے میوٹیوں کو پکڑ کر ایک جگہ نہیں لا سکتا۔ غریبی اور پریشانی سے اس کا سر جھجھکا رہا ہے۔ اس لیے وہ بھی میری طرف نہیں دیکھتا اور جو لوگ دیکھتے ہیں وہ روکتے روکتے نہیں۔ مولوی صاحب ایک تو یہی ہے جو ٹوٹا رہتا ہے۔ یہ لے میں لے اسے ٹھیک کر لیا ہے۔ اب تو آنکھ کھول دے۔“

دینے اور برتن مانگنے کا کام کرتی تھی۔ جب ایمان علی اس کے دروازے پر پہنچتا تو اکثر لڑکی اپنے باپ کے بجائے خود چلی آئی اور اس سے کہتی تھی۔

”مولوی صاحب! تیری بڑی مہربانی ہم نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ تو ہم سب کا گڑ خیال رکھتا ہے، پہلا مولوی تو بہت ہی کینہ تھا۔“

اس کے سامنے ایمان علی کی نظریں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ سر جھکا کر اسے صیغہ کرتا۔

”کسی کو اس کی پٹینہ پیچھے گالی نہیں دینا چاہیے۔ ہر شخص کو اس کے برے اعمال کی برا مل جاتی ہے لہذا ہمیں اپنی زبان کو گندا نہیں کرنا چاہیے۔“

پھر وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہچکا کر کہتا۔

”دوپٹہ سلیٹے سے اوڑھا کر سر پر سے آٹھل نہیں ڈھلکنا چاہیے۔ اچھی ہونٹیاں! اچھے طور طریقے سیکھنے چاہئیں۔“ یہ کہہ کر جب وہ اپنے حجرے کی طرف جانے لگا تو ہزار بار سوچنے کے باوجود یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ نظریں اٹھا کر تو دیکھتا نہیں پھر وہ کیسے سمجھ جاتا ہے کہ دوپٹہ سینے پر نہیں تھا اور سر سے آٹھل ڈھلکا ہوا تھا۔

یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ نہ دیکھنے کے باوجود غیر شعوری طور پر عذرہ چیزوں کو چور نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ سانس لیتا ہوا سینہ دھونکی کی طرح ابھر ابھر کر ڈوب رہا ہو تو دیکھنے والی نظریں شرافت سے جھک جھک کر بھی اٹھ اٹھ جاتی ہیں۔ بعد میں گزرا ہوا منظر ایک جوان مولوی کی جوان آنکھوں کے سامنے اومی بلو فلم کی طرح گزر جاتا۔ دن رات کئی بار توبہ کرتا تھا مگر یہ کبکشت جوانی توبہ سے نہیں مانتی۔ توبہ سے شراب کے پیالے فوٹ جاتے، من گھر شاد کا پیالہ خیالی ٹھوکروں سے نہیں ٹوٹتا۔ وہ قبر جیسے ٹھک حجرے میں ہی نہ ہینہ نہ ہینہ ہو جاتا تھا یا دالنی کے لیے سرائے میں بیٹھ جاتا تو ذرا پر سکون ہوتا۔

کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ حجرے کی کھڑکی بند کر دینے سے وہ لڑکی اس دنیا سے مر نہیں جائے گی۔ کھڑکی بند ہو جائے گی تو آنکھیں کھلی رہیں گی۔ وہ آنکھیں بند کرے گا تو خیال کے در پیچ کھل جائیں گے، خیال کو توبہ کے طمانچوں سے بھگائے گا تو آنکھوں سے نیند اڑ جائے گی۔ جب وہ اس دنیا میں پیدا ہو چکا ہے اور گیسوں کا دانہ کھا چکا ہے تو جوانی کی اس چینی ہوئی عمر میں خواہشات کی چڑیلیں ضرور اس کا پیچھا کریں گی۔ ایسے وقت وہ سجدے

ہوئی روٹیاں کھولتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے کان پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے کہ وہ جا چکی ہے یا اب تک کھڑی ہوئی ہے؟

”جا چکی ہے۔۔۔ نہیں کھڑی ہوئی ہے۔ نہیں جا چکی ہے۔ نہیں وہ میرے جواب کا انتظار کر رہی ہے۔“

اف! اک ذرا سامنے پھیر لینے سے کتنا تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ شیطان اپنی خالہ کو حجرے کے دروازے پر چھوڑ کیا تھا۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھتا تو اس کی کمزوری ظاہر ہو جاتی نہ دیکھتا تو روٹی طلق سے نیچے نہ اترتی۔ وہ عجیب تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کڑوا نوالہ تھی، اسے نگل نہیں سکتا تھا۔ وہ دس بھری تننا تھی، اسے اگل نہیں سکتا تھا۔ آخر اس نے جھلا کر پلٹے ہوئے کہا۔

”چلی جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ۔“

وہ ایک جھٹکے سے رک گیا دروازے کی چوکھٹ تصویر کے فریم کی طرح خالی تھی۔ وہ وقت کی طرح گزر چکی تھی۔ ایک دم سے اس کی بھوک مرگئی، پیاس اڑ گئی، ہاتھ میں لقمہ تھا، اس کو منہ تک لے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک نہ ہو تب بھی انسان کھا لیتا ہے لیکن خواہش نہ ہو تو کسی طرح بھی نہیں کھا سکتا۔ اس نے کتنی ہی بار دل کو سمجھایا کہ کھانا کھا لیتا جاہیے، اچھا ہوا وہ چلی گئی ہے۔ اب اسے اطمینان سے پیٹ بھرنا چاہیے مگر بھوک کے باوجود پیٹ بھرا ہوا تھا البتہ سینہ خالی ہو گیا تھا۔

ہائے یہ کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی سینہ خالی نہیں ہوا تھا، پہلے تو بھوک نہیں لگتی تھی، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارے کا سارا جسم ایک جگہ بیٹھا رہے اور دل دوسری طرف چلا جائے۔ حد یہ ہے کہ اس کے سامنے بھوک مٹانے کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی نعمت ہے اور وہ اس نعمت سے انکار کر رہا ہے۔ اسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔

یہ سوچتے ہی اس نے پھر ایک بار توبہ کی اور بسم اللہ پڑھ کر لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ پھر وہ لقمہ چباتے چباتے ٹٹکا رہا اور سیکھنے کو چاہتے چاہتے خیال ہی خیال میں اسے حجرے سے باہر اٹھتا رہا۔ بڑی مشکل ہے نفرت سے بھی یاد کر دو تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے یاد کیا جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد جب وہ سونے کے لیے منجی پر لیٹ گیا تو اس وقت بھی وہ

اس نے آنکھ کھول کر کہا۔

”اب تو یہاں سے چلی جاؤ روٹی کھا لوں گا۔“

”چلی جاؤں گی تیرے حجرے کے پیچھے ہی تو میرا گھر ہے۔ چوہدری صاحب نے یہاں روٹیاں پہنچانے کے لیے کہا تو میں خوش ہو گئی کہ اس بہانے تجھ سے اچھی اچھی باتیں سیکھتی رہوں گی۔“

”سیکھنے کے لیے تیرا یہاں آنا ضروری نہیں۔ وہ دعو کہاں ہے جو روز یہاں روٹیاں لایا کرتا تھا۔“

”چوہدری صاحب نے اسے دوسرے کام سے لگا دیا ہے۔ اب سیکھنے یہاں روٹیاں لایا کرے گی۔“

”کون سیکھنے؟“

”میرا ہی نام تو ہے۔ میں تیرے سامنے بیٹھی ہوں اور مجھ ہی سے پوچھ رہا ہے کون سیکھنے؟“

”اچھا اب نہیں پوچھوں گا، جایاں سے۔“

”چلی جاتی ہوں مگر مجھے کوئی اچھی سی بات بتا دے۔ میں بہت بری لڑکی ہوں، کوئی اچھا سا کام کرنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا کام کرنا چاہتی ہے تو پردہ کیا کر۔ تجھے غیروں کے سامنے اس طرح نہیں بتا چاہئے۔“

”پردہ کروں گی تو حویلی کا کام کیسے کروں گی۔ وہاں تو کتنے ہی غیر مرد آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں حویلی میں کام کرنے والی کوئی لڑکی پردہ نہیں کرتی۔“

”اچھا تو جہاں بہت زیادہ مجبوری ہو، وہاں نہ کرنا مگر یہاں میرے سامنے تو کر سکتی ہے۔“

”اچھی بات ہے، میں اب تیرے سامنے نہیں آؤں گی۔“

وہ غصے سے پاؤں پیٹتی ہوئی دروازے تک گئی پھر لپٹ کر وہاں سے بولی۔

”میں جا رہی ہوں پھر نہ کہنا کہ سیکھنے غصہ ہو کر چلی گئی ہے۔“

ایمان علی جواب دینے کے بجائے منہ پھیر کر روٹیاں کھانے بیٹھ گیا۔ کپڑے میں لپٹی

بیوی بچوں کے جھیلے سے دور رہنا چاہتا تھا جب تک وہ تھا تھا خود پر ظلم کر کے زندگی کی ضرورتوں سے دور رہ سکتا تھا۔ ایک بیوی آتی تو وہ اپنے جینز میں ضرورتوں کا جھوم لے آتی۔ پھر بچوں کی تعداد بڑھنے لگتی وہ اپنی تمام آرزوؤں سے منہ موڑ سکتا تھا لیکن بیوی بچوں کے آنے دن مطالبات سے ہمیشہ آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے وہ ایک بیوی کی ضرورت سے بھی کتر رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ آزمائش کی گھڑی ہے اگر اس نے کسی طرح اپنا سمن مار لیا اور سیکنہ کو اپنے دماغ سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ خواہشات کا غلام نہیں رہے گا۔ یہی غلامی عورت کی غلامی تک لے جاتی ہے اب یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ پردہ کرنے لگی ہے اب وہ اسی طرح چادر میں لپٹی آئے گی اور روٹیاں رکھ کر چلی جایا کرے گی نہ وہ اسے دیکھے گا نہ اس کے لیے دل چلے گا۔

اس دن سے وہ اپنے طور پر سنبھل گیا۔ مہم ارادہ کر لیا کہ اب اس کے خیالات کو دل میں جگہ نہیں دے گا۔ تیسری رات بھی وہ اسی طرح چادر لپٹی ہوئی آئی اس نے خود کو چھپایا تھا مگر بولنے سے باز نہیں آتی تھی۔ روٹیاں رکھنے کے بعد اس نے کہا۔

”پتہ نہیں لوگ عورت سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں اپنے اوپر بس نہیں چلتا تو اسے برقعے کے کنن میں لپیٹ دیتے ہیں۔ مردانگی تو یہ ہے خود پر قابو رکھیں یا پھر اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔“

وہ چلی کئی سنا کر کوئی جواب سے بغیر چلی گئی۔ وہ گاؤں کی اس جاہل اور بے وقوف عورت کو کیسے سمجھا کہ پردہ کرانے کی وجہ مردانگی کی کمی یا جنس کا خوف نہیں بلکہ حکم خداوندی کی تعمیل ہے۔ آواز میں بھی تو ایک سر ہوتا ہے ایک رسیلی کشش ہوتی ہے جو چھپے ہوئے وجود میں سے رس رس کر کانوں میں شد کی طرح ٹپکتی ہے زبان سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی یہ سمجھا دیتی ہے کہ وہ چادر کے پیچھے کتنی رس بھری ہے اسی لیے مرد عورت کے درمیان بلا ضرورت گفتگو کو اسلام نا پسند کرتا ہے۔

پاکل باغی کو اوپر اگل خواہش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ دماغ میں چٹکیاں لگتی رہتی ہے۔ جب وہ چوتھی رات بھی اگر چل گئی تب ایمان علی کی سمجھ میں آیا کہ وہ چھپنے کے بعد اور زیادہ جلوہ گر ہو گئی ہے۔ طور کا جلوہ ایک ہی بار نظر آیا تھا، وہ بھی ایک رات نظر آکر دوسری تمام راتوں کے لیے چھپ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی

اسے نفرت سے یاد کر رہا تھا اور بڑی عقیدت سے آیت انکری پڑھ رہا تھا۔ اس اطمینان نے اسے سلا دیا کہ سیکنہ آئندہ پردہ کیا کرے گی۔ دوسری صبح ناشتہ اور دوپہر کا کھانا دینے لگا۔ آتیا مکررات کو وہ پھر آگئی۔ مگر اس طرح آئی کہ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہ سکا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ جس ہاتھ سے اس نے روٹی کا چھابہ لاکر اس کے آگے رکھا، وہ ہاتھ بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ روٹیاں سامنے رکھنے کے بعد اس کی گواہ سنائی دی۔

”میں حکم کی بندی ہوں اپنے مالک کے حکم سے مجبور ہو کر یہاں تک آئی ہوں۔ بس اسی طرح اب آیا کر دیں گی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ایمان علی آنکھیں۔ پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر دیکھا کیا؟ اس کا تو ایک ناخن بھی نظر نہیں آیا تھا صرف سفید چادر ہی نظر آتی تھی۔ تب اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے جیتے جی اپنی خواہش کو کفن پستادیا ہو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی آرزوؤں کو کچل کر اور انہیں دفن کر کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر جہی دنیا گیا ہے اس جگہ کو بار بار کریدنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی ذرا ذلت ناک تفریح کا سامان ہو۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا جسے وہ چھپانا چاہتا تھا اب وہ چھپی ہوئی حالت میں برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ اس کو ٹھ قرار آ رہا تھا نہ اس کو ٹھ سکون تھا۔ وہ فرشتہ صورت انسان جس نے اپنی زندگی کو اپنی تمام ضرورتوں سے خالی کر دیا تھا وہی خالی زندگی اب کانٹوں کا بستری بن گئی تھی صرف ایک منہ زور ضرورت تھی جو اس بچھونے میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں سیکنہ کا قصور نہیں تھا۔ سراسر ایمان علی کی غلطی تھی۔ ایک جلوے کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور جب چھپا دیا تھا تو دیکھنے کو دل کیوں چل رہا تھا۔ اگر دل چل ہی رہا تھا تو اب اسے اپنے بس میں رکھنا اس کا اپنا کام تھا صرف سجدے میں گڑ گڑانے سے بھگتے ہوئے خیالات کو لگام نہیں دی جاسکتی تھی۔

اس نے تہہ کر لیا کہ وہ اپنے نفس کو مارنے کی پوری کوشش کرے گا حالانکہ اسلام میں نفس کشی جائز نہیں ہے۔ وہ شرعی پابندیوں میں رہ کر سیکنہ کو حاصل کر سکتا تھا لیکن حاصل کرنے تک نفس کو مارنا ضروری تھا لیکن اسے اپنا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا کیونکہ وہ

ہے۔ اگر میں نماز کے علاوہ لوگوں کو کلامِ پاک کی تعلیم دینا شروع کر دوں اور وہ مقبوض میرے انعام میں ایک گلاس دودھ کا اضافہ کر دے تب میں انکار نہیں کر دوں گا۔ اگر ابھی میں نے دودھ فور چائے جیسی غیر ضروری چیزوں کو منہ لگایا تو یہ اس طرح منہ لگ جائیں گی کہ رفتہ رفتہ میری ضرورت بن جائیں گی۔ ہمیں سے یہ ضرورتیں انسان کو رشوت اور حرام خوری کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنی اس دنیا کو حرام خوری اور فرب کاروں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے سب سے لازمی عمل یہی ہے کہ ہم اپنی تمام ضرورتوں کو کچل دیں۔ صرف زہد اور پرہیزگاری سے ایمان کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

”آپ ایسی باتیں بتاتے ہیں جو اس زمانے میں قابل عمل نہیں ہو سکتیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔“

”کبھی بھی زمانے میں ایمان نہیں بدل سکتا بشرطیکہ ہم چاہیں۔ آپ زمانے کے بدلنے کی بات کہتے ہیں حالانکہ زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ انسان خود کو بدلتے بدلتے زمانے کو بدل دیتا ہے پھر اسی زمانے کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ چوہدری صاحب صرف اپنی سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ تیرہ سو سال پہلے کا معاشرہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔“

”میں نے چالیس برس کی عمر میں آپ جیسا ایک ہی ایمان والا دیکھا ہے۔ ہم سب اپنی ضرورتوں میں اس طرح کھرچکے ہیں کہ زہد اور پرہیزگاری کے معاملے میں آپ کی طرح انتہا پسند نہیں بن سکتے۔ معاف کیجئے گا! کیا آپ تمنا اس معاشرے کو بدل سکتے ہیں؟“

”ایک ایک قطرے سے سمندر بنتا ہے۔ میں ایک قطرہ ہوں۔ آپ بھی ایک قطرے کی طرح مجھ میں مل جائے پھر دیکھیے کہ ایمان کا سمندر کیسے ٹھاٹھیں مارتا ہے۔“

چوہدری نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”آپ اتنی اونچی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ اس دنیا میں بالکل تمنا ہیں۔ اگر آپ یوی بچوں کے ساتھ زندگی گزاریں اور پورے ایک کنبے کی پرورش کریں تب آپ کو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ اس دنیا میں وہ کرائے دن کی ضرورتوں سے چھٹا نہیں چھوٹ سکتا۔ تمنا تو جانور بھی جنگلوں میں زندگی گزار لیتے ہیں۔ دنیا داری کرتے ہوئے دین داری کرنا محال ہے۔“

”محال ہو سکتا ہے، ناممکن نہیں۔ انسان چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔“

کہ بار بار دیکھتے رہنے سے اتنی تڑپ پیدا نہیں ہوتی جتنی کہ صرف ایک بار دیکھنے سے ہوتی ہے۔ وہ جگلی صرف ایک بار دماغ کے کوہ طور سے جھلکتی ہے اور دل میں آکر ہمیشہ کے لیے کھب جاتی ہے پھر وہ نظارہ بھلائے نہیں بھولتا۔ آخر اس نے پریشان ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے دن وہ چوہدری صاحب کے پاس جائے گا اور انہیں سمجھائے گا کہ وہ کیلنڈر کے لیے نامحرم ہے لہذا ایک جوان لڑکی کو روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں نہیں بھیجنا چاہئے۔ اس رات وہ فیصلہ کرنے کے بعد کرشمیں بدلتے بدلتے ہی سو گیا۔

دوسری صبح نماز کے بعد اس نے چوہدری برکت علی سے کہا ”میں آپ سے تمناؤں میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

چوہدری برکت علی نے کہا۔

”میں بھی آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چلئے اچھا ہے، آپ میری حویلی میں تشریف لے آئیں، اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ابھی میں کچھ تینوں کی طرف جا رہا ہوں۔“

کہنے بعد میں حویلی میں آؤں گا۔“

دو گھنٹے بعد ایمان علی حویلی میں پہنچا تو چوہدری اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بیعت عزت سے اسے بیٹھک میں کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

”میں چائے نہیں پیتا۔“

چوہدری نے مسکرا کر کہا۔

”آپ تو دودھ بھی نہیں پیتے۔ میرا ملازم کئی بار آپ کے لیے دودھ لے کر گیا مگر آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ آخر کیوں؟“

”جب روٹی اور چٹنی کھا کر پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر فاضل خوراک کا عادی بننا کیا ضروری ہے؟“

”اس لیے ضروری ہے کہ یہ سب خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، ان سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”بے شک انکار نہیں کرنا چاہیے اگر یہ نعمتیں اپنی محنت سے حاصل ہوں۔ میں ہالچ وقت نماز پڑھتا ہوں اور پڑھاتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے نین وقت کی روٹیاں انعام میں دیتا

روشنی میں سیکھ دامن بنی جیٹھی ہوئی تھی۔ چارپائی کے سرہانے ایک صندوق کے اوپر دودھ کا ایک گلاس اور مٹھائی کی ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک دامن قتل تھی اور اس کے ساتھ ہی غیر ضروری دودھ اور مٹھائیاں آٹھی تھیں۔ چوہدری نے اس کا انکار نہیں سنا تھا، یہ کہہ کر وہ چیزیں رکھوا دی تھیں کہ صرف ایک رات غیر ضروری خوراک استعمال کر لینے سے ایمان میں فرق نہیں پڑے گا۔

ایمان علی حجرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اسی دروازے سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دلہن کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی گجراہٹ طاری تھی۔ دروازے سے دلہن کی چارپائی تک صرف دو قدم کا فاصلہ تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ طے کرتے وقت وہ لاکھڑا کر گر پڑے گا۔ وہ بار بار کانڈھے پر رکھے ہوئے رومال سے چہرے کا پینہ نہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر کیا کرے؟

وہ گھبراہٹ میں ایک ہی جگہ کھڑا چھوٹے سے حجرے میں ادھر سے ادھر نظرس دوڑا رہا تھا جیسے ڈوبنے والا سارا تلاش کر رہا ہو۔ کبھی کبھی بھوک، کمزوری یا بیماری کے باعث اس کی طبیعت کھیرائے لگتی تو وہ اگر بھیاں سلگالیا کرتا تھا۔ بچپن سے اگر بھتی کی کمک مئے لے لے اکثر سارا داتا تھا لیکن اگر بھتی قبر یا کسی مقدس مقام پر جلائی جاتی ہے۔ آج تک کوئی اگر بھتی سلگالیا کر اپنی دلمن کے پاس نہیں کیا۔ یہ طریقہ رنکھیں اور روپانی احوال کے بالکل خلاف ہے پھر وہ کیا کرے؟

دو ساری رات ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ دو قدم کا فاصلہ کسی نہ صورت سے طے کرنا ہی تھا۔ اگرچہ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے پھر بھی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

دوسرے قدم پر ڈنگاٹا ہوا، جھٹکا ہوا چارپائی کا سارا لے کر دامن کے قریب کرتے کرتے بیٹھ گیا۔ چارپائی نے چرچا کر احتجاج کیا تو گھونگھٹ میں جھپی ہوئی سکیئر نے سمجھ لیا کہ مولوی کسی طرح کفن باندھ کر میدان میں آیا ہے۔ اب سے پہلے وہ کفن جیسی چادر میں لپیٹی ہوئی آیا کرتی تھی اس وقت سرخ جوڑے میں اس کی ساری شوخی اور تیز طراری ہوا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں حیا سے سنسنے لگی۔ ادھر حیا تھی، ادھر گھر باہر۔ وہ ابھی

”آپ زبانی دعویٰ نہ کریں۔ کیا آپ شادی کر کے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اپنے زید اور پرہیز گاری کو عملی طور پر ثابت کر سکتے ہیں؟“ ایمان علی اس کام نہ کھٹکے لگا۔ اس نے کبھی شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ چونکہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اپنی ایمانداری کو عملی طور پر ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری نے ابھتے دیکھ کر کہا۔

”ایمان والے ہمیشہ اپنے عمل سے دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ میں آپ کو عمل کی دعوت دیتا ہوں، آپ میرا مشورہ مان کر شادی کر لیں۔ کیونکہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

ایمان علی کے ذہن میں جیسے دھماکہ سا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے گڑبڑا گیا۔ بے چینی سے اُدھر اُدھر پہلو بدلتے لگا۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ سیکڑے کو اپنے حجرے میں آنے سے روک دے گا اور جوہداری اس لڑکی کو اس کی دلہن بنانا چاہتا تھا۔

اچانک ہی وہ اس کی نگاہوں کے سامنے دلہن کی روپ میں آگئی۔ سرخ جوڑے میں اور چاندی کے زیورات میں وہ ایسے جگمگاتی تھی کہ اس پر نگاہیں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ «
بظاہر خاموش بیٹھا ہوا تھا مگر اس کا دل سینے کی دیوار سے دیوانے کی طرح سرگزارا ہوا تھا۔
دھک دھک... کیکنہ... کیکنہ... دھک دھک... کیکنہ... کیکنہ...

چودھری نے اسے سننے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے فوراً ہی کہا ”میں آپ کی طرح عالم دین نہیں ہوں مگر اولیاء اللہ کے حالات زندگی پر میں نے ایک کتاب پڑھی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ حضرت خواجہ بایزیدؒ سلاطین فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ عورتوں سے مجھ کو بچائے رکھ۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ التجا غلط ہے جب کہ ہمارے حضورؐ نے ایسا نہیں چاہا۔ مولوی صاحب پھر آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے حضورؐ نے ایک بڑے کنبے کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے زہد اور پرہیز گاری کو عملی طور پر ثابت نہیں کیا ہے؟“

چوہدری کی بات سن کر ایمان علی کا سر جھک گیا۔



قبر کی طرح تنگ و تاریک حجرہ گلاب کی خوشبوؤں سے منک رہا تھا۔ لائٹین کی زرد

تک ہانپتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اپنی دلہن کو کس طرح مخاطب کرے۔ اس کا حلق خشک تھا۔ پہلے پیٹ کی بھوک سے حلق میں کانٹے پڑتے تھے اب جذبات کی بھوک سے ہر تھکے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ ایک گھونٹ پانی مل جائے مگر وہ مسرتوں کے جھرمٹے کے اندر پانی رکھنا بھول گیا تھا۔ اب دروازہ کھول کر باہر جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اس نے دودھ کے گلاس کی طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ گلاس کاہ اپنی دلہن کو پلانا چاہتا تھا۔

آخر اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟ وہ خدا کا نیک بندہ ہے نہ خدا کے سوا کسی سے ڈرنا یا گھبرانا نہیں چاہیے اور وہ خواہ مخواہ ایک ایسی لڑکی سے کلم ہے جو بیوی بن کر اس کی خدمت گزاری کے لیے آئی ہے۔ اس میں جب ذرا حوصلہ ہوا تو اس نے بسم اللہ پڑھ کر گھونٹ گھٹ کو تمام لیا۔ پتا نہیں ایسے وقت بسم اللہ ضروری تھا یا نہیں مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔

گھونٹ گھٹ کو ہاتھ لگاتے ہی وہ ذرا سا کسمپاسی پھر اپنے گھونٹ گھٹ کو پکڑ کر غائب اداؤں سے سمجھانے لگی کہ وہ اتنی آسانی سے گھونٹ گھٹ نہیں اٹھانے دے گی۔ ایمان کو یاد آ گیا کہ ایسے وقت کچھ نہ کچھ دلہن کو منہ دکھانی کے لیے دینا پڑتا ہے۔

اس نے کرتے کی جیب سے عطر کی ایک شیشی نکالی اور اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”بچھلے سال رمضان کی ستائیسویں شب کو تراویح مکمل کرنے کے سلسلے میں مجھے جوڑا لباس اور عطر کی یہ شیشی ملی تھی۔ ابھی اس میں تھوڑا سا عطر باقی ہے میں گیارہ دکھائی کے طور پر دے سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دلہن کے حنائی ہاتھوں پر تھوڑا سا عطر چھڑک دیا پھر شیشی کو کرنے کے بعد وہ لرزے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گھونٹ گھٹ اٹھانے لگا۔ سیکینہ کے انکار ادا نہیں ہوئی پاری لگ رہی تھیں پھر بھی چٹکتا دکھتا چہرہ گھونٹ گھٹ کی بدلی سے باہر آ گیا۔ ایمان علی دم بخود ہو کر اس حسین کھڑے کو دیکھتا رہ گیا۔ اب سے پہلے بھی وہ دیکھ چکا تھا لیکن ایک دلہن کے روپ سنگھار نے اسے حسین شاہکار بنا دیا تھا۔ اس نے ہی مل میں کہا کہ جنت کی حور کا جو تصور ہوتا ہے وہ آج نگاہوں کے سامنے مکمل ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر بے اختیار چھوٹے کو دل چل رہا تھا۔ پہلے اس کے لرزے ہوئے

جب اس نے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے کے گلاب کو چھو لیا تو اسے پتا چلا کہ وہ بھی کانپ رہی ہے اور اسی کی طرح گھبرا رہی ہے۔ وہ لرزے ہوئے بولا ”سیکینہ میری شریک حیات آنکھیں کھولو۔ وہ آنکھ کھولنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے عطر کے پاس گلے کو سلاتے لگی۔ ایمان علی نے پوچھا ”کیا پاس لگ رہی ہے؟“ سیکینہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایمان علی نے آگے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا گلاس اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لے، اسے پی لے۔“ اس نے سیکینہ کو ہاتھ پکڑ کر اسے گلاس تھما دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ آنکھیں حیا سے بھی بند ہوتی ہیں اور خوف و دہشت سے بھی

ہاتھ سیکینہ کے حنائی ہاتھوں پر آئے اور بڑی دیر تک اس کی ملامت کو محسوس کرتے رہے۔ وہاں سے آگے ہاتھ بڑھانے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے اندر جرات پیدا کرنے کے لیے یہی بات سمجھ میں آئی کہ پہلے باتیں کر کے اپنی گھبراہٹ کو دور کیا جائے اس لیے وہ لڑکھرائی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔

”ننتہ تم بہت بہت اچھی ہو۔“

اس کے حسن کی تعریف کے لیے اسے اس سے زیادہ الفاظ نہیں مل سکے۔ اس نے اب تک صرف خدا اور رسول کی تعریف کی تھی، ایک حسین عورت کے لیے وہ ایک شاعر کی زبان نہ لاسکا۔ اس لیے اس نے خدا کا ہی سہارا لیا اور بڑی عقیدت سے کہنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں سے خوش ہوتا ہے تو انہیں اپنی سب سے پسندیدہ چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ پہلی بار جب میں نے تمہیں جبرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا تو اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا معبود تمہیں مجھ سے منسوب کرے گا۔ واقعی اس دینے والے کے انداز نرالے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو ایسی خوشیاں نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ چاہے تو دیتا ہے وہ چاہے تو چھین لیتا ہے۔“

وہ بول رہا تھا اور سیکینہ کے حسین کھڑے سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے جبرے میں سخت گری تھی۔ کھڑکی اور دروازہ دونوں ہی بند تھے اسی لیے سیکینہ کی طبیعت گھبرا رہی تھی مگر وہ عورتوں کے معاملے میں اتنا ڈری تھا اس لیے سیکینہ کی گھبراہٹ کو نہ سمجھ سکا۔

جب اس نے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے کے گلاب کو چھو لیا تو اسے پتا چلا کہ وہ بھی کانپ رہی ہے اور اسی کی طرح گھبرا رہی ہے۔ وہ لرزے ہوئے بولا ”سیکینہ میری شریک حیات آنکھیں کھولو۔ وہ آنکھ کھولنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے عطر کے پاس گلے کو سلاتے لگی۔ ایمان علی نے پوچھا ”کیا پاس لگ رہی ہے؟“ سیکینہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایمان علی نے آگے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا گلاس اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لے، اسے پی لے۔“ اس نے سیکینہ کو ہاتھ پکڑ کر اسے گلاس تھما دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ آنکھیں حیا سے بھی بند ہوتی ہیں اور خوف و دہشت سے بھی

آخر اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟ وہ خدا کا نیک بندہ ہے نہ خدا کے سوا کسی سے ڈرنا یا گھبرانا نہیں چاہیے اور وہ خواہ مخواہ ایک ایسی لڑکی سے کلم ہے جو بیوی بن کر اس کی خدمت گزاری کے لیے آئی ہے۔ اس میں جب ذرا حوصلہ ہوا تو اس نے بسم اللہ پڑھ کر گھونٹ گھٹ کو تمام لیا۔ پتا نہیں ایسے وقت بسم اللہ ضروری تھا یا نہیں مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔

گھونٹ گھٹ کو ہاتھ لگاتے ہی وہ ذرا سا کسمپاسی پھر اپنے گھونٹ گھٹ کو پکڑ کر غائب اداؤں سے سمجھانے لگی کہ وہ اتنی آسانی سے گھونٹ گھٹ نہیں اٹھانے دے گی۔ ایمان کو یاد آ گیا کہ ایسے وقت کچھ نہ کچھ دلہن کو منہ دکھانی کے لیے دینا پڑتا ہے۔

اس نے کرتے کی جیب سے عطر کی ایک شیشی نکالی اور اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”بچھلے سال رمضان کی ستائیسویں شب کو تراویح مکمل کرنے کے سلسلے میں مجھے جوڑا لباس اور عطر کی یہ شیشی ملی تھی۔ ابھی اس میں تھوڑا سا عطر باقی ہے میں گیارہ دکھائی کے طور پر دے سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دلہن کے حنائی ہاتھوں پر تھوڑا سا عطر چھڑک دیا پھر شیشی کو کرنے کے بعد وہ لرزے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گھونٹ گھٹ اٹھانے لگا۔ سیکینہ کے انکار ادا نہیں ہوئی پاری لگ رہی تھیں پھر بھی چٹکتا دکھتا چہرہ گھونٹ گھٹ کی بدلی سے باہر آ گیا۔ ایمان علی دم بخود ہو کر اس حسین کھڑے کو دیکھتا رہ گیا۔ اب سے پہلے بھی وہ دیکھ چکا تھا لیکن ایک دلہن کے روپ سنگھار نے اسے حسین شاہکار بنا دیا تھا۔ اس نے ہی مل میں کہا کہ جنت کی حور کا جو تصور ہوتا ہے وہ آج نگاہوں کے سامنے مکمل ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر بے اختیار چھوٹے کو دل چل رہا تھا۔ پہلے اس کے لرزے ہوئے

ہوتے ہیں تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے جو اب سیکنہ کی ہو رہی ہے مگر اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ تو پہلی بار دلن بنی ہے جس میں بھی پہلی بار دلنابن کر اس کی زندگی میں آیا ہوں۔ کیا میں اس کی زندگی کا پہلا دلنابن نہیں ہوں؟ ہاں نہیں ہوں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے جو حقیقت ہے وہ سامنے ہے اور سمجھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟

وہ اس سے ذرا دور کھڑا اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ جب بات سمجھ میں آئی تو وہ ایک دم سے تھک کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ زیر لب ہیرا مانے لگا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں ایک دلن کی خواہش کو برسوں سے پکھلتا رہا۔ میں ذرا تھا کہ کبھی میں نے شادی کی تو نہ جانے کیسی عورت ملے، وہ میری طرح ایمان والی ہوگی یا نہیں؟ یوں تو بظاہر سب ہی ایمان والیاں ہوتی ہیں لیکن کتنی ہی بے ایمانی، جھوٹ، مکر و فریب کے جہوم میں گھری ہوئی رہتی ہیں، یہ شادی کے بعد پتا چلتا ہے اور مجھے پتا چل رہا ہے۔“

اس نے بڑے کرب سے کراہتے ہوئے خاموش پڑی ہوئی دلن کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں اور جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”آؤ! سیکنہ میں نے تیرا کیا بکا ڈا تھا۔ تو مجھے ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کرنے کیوں آئی؟ میرا گناہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ میں نے تیری تمنا کی تھی مگر خدا کی قسم ایک بہت اچھی اور خوشگوار زندگی کے لیے تیری آرزو کی تھی۔ اگرچہ میں نے عہد کیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی آرزو نہیں کروں گا لیکن اب میں دنیا داری کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرنا چاہتا تھا کہ رشتے بطنوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے بھی میں پوری طرح ایمان داری سے زندگی گزار سکتا ہوں۔ میں دوسروں کے سامنے ایک مکمل ایمان پیش کرنے کے لیے تجھے اپنی دلن بنا کر لایا ہوں۔ یہ جرم تو نہیں ہے کہ تو نے مجھے اتنی بڑی سزا دی ہے۔ بتا سیکنہ میں نے تیرا کیا بکا ڈا تھا؟“

ایمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے چار پائی پر لیٹی ہوئی بے ایمانی بھی روئے گی۔ زندگی کے کسی موڑ پر جب ایمان اور بے ایمانی اچانک ہی ٹکرا جاتے ہیں تو ایسے وقت انسان کا خمیر بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ سیکنہ بھی ایمان کی زد میں آکر کانپ گئی تھی اس

بند ہوتی ہیں۔ اگر حیا سے بند ہو تیں تو وہ دودھ پیتے ہوئے شرابی۔ کوئی دہشت تھی جو اس کا گلا خشک کر رہی تھی۔

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر دو چار گھونٹ پیئے، دودھ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ سینے کے اندر سے کوئی چیز لاوے کی طرح ابل کر باہر آنا چاہتی تھی۔ سیکنہ نے برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن کوشش کے باوجود لاوا ابل پڑا۔ گلاس سے دودھ کو چھٹکے دیکھ کر ایمان علی نے گلاس کو فوراً ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سیکنہ یک بیک تڑپ کر چار پائی کے کنارے جبک مٹی اور تے کرنے لگی۔

وہ اس صورت حال سے بوکھلا سا گیا۔ جلدی سے دودھ کا گلاس صند دق پر رکھ کر اس کی پیٹھ کو سہلانے لگا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور کمری کمری سانسیں لے رہی تھی۔ ایمان علی نے جلدی سے حجرے کی کھڑکی کھول دی پھر اس کے پاس آکر اس کے چہرے پر پکھچا جانے لگا۔ سیکنہ شرم و حیا کو مہول کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ایک بار اس نے آنکھیں کھول کر ایمان علی کو دیکھا پھر دوسری بار آنکھ بند کی تو آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ ایمان علی نے اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

”سیکنہ اللہ کا نام لے، وہ تیری تکلیف دور کرے گا۔ میں تیرا مجازی خدا ہوں، مجھے کیا پریشانی ہے؟“

وہ بدستور آنکھیں بند کیے انکار میں سر ہلاتی ہوئی بڑے کرب سے بولی۔
”میں تجھے پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں بہت بری لڑکی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے کڑا برا آدمی ملے گا مگر تیرے پاس آکر میرا دل کانپ رہا ہے۔ دھوکا تو انسانوں کو دیا جاتا ہے فرشتوں کو نہیں دیا جاتا۔ میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔“

ایمان علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔
”یہ تو کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہی ہے؟“

”سیکنہ والی بھکی ہوئی باتیں کر سکتی ہے۔ تو سمجھتا کیوں نہیں کہ مجھے مٹی کیوں ہو رہی ہے؟“

ایمان علی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب سیکنہ کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اس نے بارہا سنا تھا کہ عورت کے پاؤں بھاری

فرشتے سے اپنی بے ایمانی نہ چھپا سکی تھی اور اس سے بے ایمانی کرنے کے بعد یہ سچا ”بے شک لونڈی اپنے آقا کے حکم کی پابند ہوتی ہے۔ مگر یہ غلاموں اور لونڈیوں کی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی تطانی کیسے کرے۔ اسی لیے وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ زید و فروخت کا دور نہیں ہے۔ تولد وارث نہیں ہے، بازار میں بیچی نہیں گئی ہے اور نہ ہی ”تیرا بھی قصور ہے کہ تو نے میرا کچھ نہیں بگاڑا“ میں تمہاری میں آتی تھی تو مجھے خرید کر لایا ہے۔ اگر تو اس کی ملکیت رہ چکی ہے تو اسلام میں کسی آقا کے لیے یہ حکم ایمان داری سے شرافت کی چادر میں لپیٹ دیتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے ہی لوگوں کا گڑنا نہیں ہے کہ وہ اپنا گناہ کسی دوسرے کے سر تھوپ دے۔ اس آقا پر لازم ہے کہ جو جی بویا تجھے تیری شرافت نے کمزور بنایا، مجھے میری غریبی نے۔ تیری طرح مجھ میں بھی ایمان ہے، اس کی فصل کاٹنے تک اپنی لونڈی کو اپنی امان میں رکھے۔ یہ نہیں کہ اسے مصیبت نہیں تھا کہ میں کسی کا کچھ بگاڑ سکتی اسی لیے چوہدری نے مجھے بگاڑ دیا۔“

مجھ کو اسے دوسرے کے گناہوں پر ڈال دے اور اس طرح خود کو نیک نام بنا کر رکھے۔ وہ چوہدری کا نام سن کر چونک گیا اور جراتی سے اس کا منہ کھلے لگا۔ اسے یقین بڑے شک تو ہے قصور ہے، بیکانی گئی ہے۔ وہ بھانے کا مجرم ہے، میں اس سے بات کروں گا آ رہا تھا کہ جو شخص اتنا ایمان دار ہو کہ ایمان والوں کے لیے ایک مسجد تعمیر کرائے، وہ لادور ایمان کی رو سے اسے مجبور کروں گا کہ بچے کی پیدائش تک وہ تجھے اپنی امانت سمجھ کر مسجدوں کو یوں مسار کر سکتا ہے اور اپنے سیاہ عمل کو دلن کی طرح سنوار کر ایک مہلے پاس رکھے۔“

وہ ایک بیک ہسٹری سے اٹھ کر بولی۔

”میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تیری بیوی بن چکی ہوں کیا تو سمجھتا ہے کہ“

”میں نے چوہدری کا کیا بگاڑا تھا؟“

”میں نے بھی تو چوہدری کا کچھ نہیں بگاڑا تھا؟ میں نے کہا اس دنیا میں ان کا ہی ہمارا نکاح جائز نہیں ہے؟“

وہ اس سوال سے الجھن میں پڑ گیا۔ خاموش بیٹھنے بیٹھنے داغ کی لائبریری میں تمام حد۔ شل کو کھنگالنے لگا اور یہ اعتراف کرنے لگا کہ کینہ سے اس کا نکاح جائز ہے۔ جب

”اس کی غلطی میں تو برابر کی شریک ہے۔ اگر عورت نہ چاہے تو کوئی اس کی انگلی کوئی لونڈی حاملہ ہو کر کسی کے نکاح میں آئے تو وہ نکاح جائز تو ہوتا ہے لیکن شوہر اس وقت نہیں پڑ سکتا۔“

تک لونڈی سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائے۔

”ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔ جب تک میں نہیں چاہتی تھی، وہ میری انگلی بھی نہ۔ یعنی سیکھنے کتنا ہی ناقابل برداشت ہو جو وہ اسی کے پاس رہے گی کیونکہ نکاح ہو چکا پکڑ سکا۔ مگر عورت کو سمجھانے کے لیے مردوں کے پاس جہاں دولت ہوتی ہے وہاں ہے۔ وہ اس کا مجازی خدا ہے اور مجازی خدا کے آگے ایک لونڈی کے آقا کی اہمیت ختم ایمان کا سہارا بھی ہوتا ہے۔ چوہدری نے مجھے سمجھایا کہ جب ایک شخص کینڑوں کو بڑا ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ جو بوجھ لے کر آئی ہے اس بوجھ کا اٹھانا چوہدری پر لازم ہے۔ اس نے اور باندیوں کے تان نٹے کا ذمے دار ہوتا ہے تو اس کی پاؤں کی اڑی سے سر کی چوٹی نکلا۔

اس کا حق دار بھی ہوتا ہے۔ جب وہ ایمان دھرم سے یہ ثابت کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ چاہتا۔ ”بے شک تو میری شریک حیات ہے۔ اب تیری عزت و آبرو اور تیرے جان و مال کی وہ درست ہے، تو پھر جو درست ہے میں اس سے انکار کیسے کر سکتی تھی۔ تو بڑا عالم ہے، بغاوت میرے ذمے ہے۔ لیکن وہ جو بچہ آنے والا ہے، میں اس کا ذمے دار اور حقدار ایمان سے بتا کیا ایک لونڈی کو اپنے آقا کا حکم نہیں ماننا چاہیے؟“

نہیں ہوں۔ چوہدری کو اس کی بردارش کرنی ہوگی۔“

اس نے ایسا سوال کیا تھا کہ ایمان سوچا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تائید میں ”نہیں میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ جس کے لیے عورت لہو لمان ہوتی ہے، جسے ذرا تک اپنا لہو پلاتی ہے، اس کے لیے اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔ میرے جگر کا

کر کہا۔

کلوا پھینکنے کے لیے نہیں ہے۔ تو ایمان والا ہے ہزار بار اپنی گردن کٹا کر بھی خدا کا
 گا۔ میں عورت ہوں، ہوس کی قربان گاؤں پر ایک بار اپنی گردن کٹا کر ساری زندگی اپنے
 پکاروں گی۔ وہ تیرا ایمان ہے یہ میرا ایمان ہے۔“
 اس نے سیکڑ کو سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”یہ تیرا ایمان ہو سکتا ہے مگر میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ وہ بچہ کبھی میرے ہاں نہیں بھیج دو۔“
 ”تم چوہدری سے جا کر کہو کہ میں اچھی طرح اس کی آنکھ کھولنے آیا ہوں۔ جاؤ“

”یہ تیرا ایمان ہو سکتا ہے مگر میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ وہ بچہ کبھی میرے ہاں نہیں بھیج دو۔“
 ”تم چوہدری سے جا کر کہو کہ میں اچھی طرح اس کی آنکھ کھولنے آیا ہوں۔ جاؤ“

”کسی کے بھی نام منسوب ہو، بچہ تو میرا ہی ہو گا۔ ابھی تو نے کہا ہے کہ مجازی کا اظہار کرنے لگا۔“
 عورت کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے تو پھر میں مٹا کی جو دولت لے کر آئی ہوں تو

حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔ یہاں پہنچ کر تیرا ایمان کیوں ڈنگا رہا ہے۔ تو نے تو اپنا
 عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے۔“ ایمان علی کا سر جھک گیا
 عمل اور آزمائش کی گھڑی تھی۔ بڑی سخت آزمائش تھی کہ اندر ہی اندر بری طرح کا
 تھا۔ کانپتے کانپتے اچانک وہ جوش اور جذبے کے تحت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایمان دار
 فرض ہے کہ وہ کسی بھی بے ایمان کا محاسبہ کرے۔ وہ چوہدری کا محاسبہ کرنے کے لیے
 سے پلٹ کر ایک جھنگل سے دروازہ کھولتے ہوئے حجرے سے باہر چلا گیا۔ سیکڑ اسے

یہ دیتی رہی مگر وہ اس کی آواز سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے
 سارے پنڈیس سناٹا چھا گیا تھا۔ مکانوں کے باہر چارپائیوں پر لوگ گہری نیند سو رہے
 جب وہ حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اتنی حویلی کے سامنے اتنے چھوٹے آدمی کو
 ایک خارش زدہ کتا بھونکنے لگا۔ اب تک کتنی ہی خارش زدہ بے ایمانیاں اس پر بھونکنے
 آ رہی تھیں۔ وہ بھونکنے والوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ایمان کے راستے پر چلتے چلتے ایک
 ایمان کے دروازے پر آ گیا۔

دروازے کو پیچنے لگا۔ وہ بری طرح حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وحشت اور جنتوں کا
 بھول گیا تھا کہ وہ گوشت پوست کے ایک کمزور ہاتھ سے دولت کے فولادی دروازے کا
 رہا ہے ایک ملازم نے جھلاتے ہوئے دروازے کو کھولا۔
 ”نکول گدھ دروازے کو اس طرح پیٹ رہا ہے؟“
 مولوی کو دیکھتے ہی ملازم ایک دم سے گھبرا گیا۔ پھر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”معاذ کیجئے گا مولوی صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ہیں۔ مگر آپ اس طرح
 دروازہ کیوں پیٹ رہے ہیں؟ چوہدری صاحب کی آنکھ کھل گئی ہے، وہ ہم پر غصہ دکھا رہے
 ہیں۔“
 ”تم چوہدری سے جا کر کہو کہ میں اچھی طرح اس کی آنکھ کھولنے آیا ہوں۔ جاؤ“

”میں انسان ہوں مگر تم نہیں۔ تم اپنا جھوٹا کھانا کتے کو دیتے ہو اور جھوٹی عورت
 میرے حوالے کرتے ہو۔ کیا یہ شرافت ہے؟“

چوہدری نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے مجھے نام ہوتا بڑے۔ سیکینہ کے باپ برسوں سے میری ملازمت کرتے آئے ہیں۔ یہ غلامی، یہ خدمت گزار کی سیکینہ کو دور سے ملنی ہے۔ میں اس کے پورے خاندان کی کفالت کرتا ہوں، انہیں روٹی کپڑا دیتا ہوں، کے لیے مکان دیتا ہوں۔ کیا ایک آقا اپنی لونڈی کا ہر طرح سے حقدار نہیں ہوتا؟“

”تم اس مسئلے کی گہرائی کو کیوں نہیں سمجھتے کہ لونڈی کس وجہ سے آقا کے لیے قرار دی گئی تھی اس لیے کہ وہ بازار میں بیچی جاتی تھی۔ دس ہاتھوں میں جانے کے بعد اسے ایک آقا کے پاس محدود کر کے اس کی ملکیت بنادی گئی۔ ایسی صورت میں آقا لونڈی کا ہر طرح سے حقدار ہوتا ہے مگر سیکینہ تو بازار میں بیچی نہیں گئی تھی۔“

”تم سیکینہ کے حالات سے واقف نہیں ہو۔ اس کا ایک بھائی آوارہ اور بد چلن لادھور کی ہیرا منڈی میں رہتا ہے۔ ایک باریساں آکر سیکینہ کو اپنے ساتھ زبردستی لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مار بھجا اور سیکینہ کو بازار میں فروخت ہونے سے بچا۔ خاطر میں نے اسے کینرے کے طور پر رکھ لیا۔ اب بتاؤ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟“

ایمان علی اس بات پر چکرا سا گیا۔ اس واقعے کو سمجھاتے وقت وہ بھول گیا کہ لونڈیاں آج بھی بازاروں میں بیچی جاتی ہیں۔ آج بھی عورت کو خریدنے اور استعمال کا دستور ہے۔ ایمان علی نے سوچا کہ وہ کس لیے محاسبہ کرنے آیا ہے، وہ کون سی بات کہ جس نے اسے بے حد دکھ پہنچایا ہے اور اندر سے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑا دیا ہے۔ تب اسے پتا چلا کہ انسان احق بننے کے بعد جھنجھوڑا ہے اور احق بنانے والا غصہ کرتا ہے۔ اس نے کہا ”میں تمہاری بے ایمانی کی شکایت کرنے آیا ہوں۔ تم نے کو دھوکے سے میری دلہن کیوں بنایا؟ نکاح سے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہارے کی ماں بننے والی ہے؟“

چوہدری نے اثبات میں سر ہلا کر کہا ”ہاں کسی حد تک میں اپنی اس غلطی کو تسلیم ہوں۔ مجھے نکاح سے پہلے تمہیں سب کچھ بتانا چاہیے تھا لیکن میں تمہاری طرح دیندار تو نہیں ہوں، دنیا دار بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کسی چیز میں کھوت پیدا ہو جائے انسان اسے فراخ دل سے قبول نہیں کرتا۔ اگر اس کھوت کا علم تمہیں ہو جاتا تو تم مجھ

غریب لڑکی کا سہارا نہ بنتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے سیکینہ سے بہت زیادہ ہمدردی تھی اور میں اس کے لیے تمہارے جیسا ایک سہارا پیدا کرنا چاہتا تھا۔ نہیں، ہم اس دنیا میں رہ کر صرف اپنے مفاد کو اور اپنی عزت کو دیکھتے ہیں۔ میں زمیندار ہوں۔ زمین فصل پکاتی ہے تو میں اسے کبھی نہیں بیچتا۔ عورت فصل پکائے تو میں اسے کھوٹے سکے کے عوض بھی بیچ دیتا ہوں۔ میں نے تم سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ تمہارے پیسے مولوی کو جو عین وقت کی روٹیوں کے سوا زندگی کی دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ایک پیسہ نہیں رکھتا، اسے سیکینہ جیسی خوب صورت لڑکی مفت میں مل گئی ہے۔ میں اب بھی چاہوں تو اسے طلاق دلا کر اور اسے تم سے چھین کر اپنے کسی دوسرے ملازم کو دے سکتا ہوں۔“

ایمان علی غصے سے مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سیکینہ گھونگھٹ میں چھپی ہوئی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے اسے پا کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اللہ جب کسی سے خوش ہوتا ہے تو اسے اپنی سب سے عزیز چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ وہ اپنی کئی بات پر خود حیران اور پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا سیکینہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا انعام ہے؟ اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ چاہے تو دیتا ہے اور اللہ چاہے تو چھین لیتا ہے۔ مگر چوہدری اس بات کو غلط ثابت کر رہا تھا۔

اس دنیا میں اسے جو بھوک ملی وہ انسانوں کی دی ہوئی تھی۔ یہ انسان ہی ہے جو بابا بلیک شیپ کی انگریزی تعلیم دینے کی سورت پے فیس دیتا ہے اور کلام پاک کے سوارو پے دیتا ہے۔ ایمان کا یہ رشتہ خدا نے مقرر نہیں کیا، ایمان والوں کو بھوکا رکھنے کی سازش انسان ہی کرتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑا غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ چوہدری کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

”مولوی صاحب خاموش کیوں ہو؟ اگر تمہیں میرا دیا ہوا انعام پسند نہیں آیا تو میں اسے واپس بھی لے سکتا ہوں اور اس خوب صورت سے انعام کو کسی دوسرے ملازم کے حوالے بھی کر سکتا ہوں مگر اچھی طرح سوچ لو اس میں مجھ سے زیادہ تمہاری بدنامی ہوگی۔ میں تمہیں اتنا موقع نہیں دوں گا کہ تم مجھے بدنام کر سکو۔ یہاں چاروں طرف میری زمینیں بھٹی ہوئی ہیں، یہاں کے کسان میرے محتاج ہیں، اس پنڈ میں میری حکومت ہے۔ تم میرے منہ گلو گے تو منہ کی کھاؤ گے اور یہاں سے بدنام ہو کر جاؤ گے کہ تم مولوی تھے

جائے گا؟ اور کیا کرے گا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ وہ تو بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ چوہدری نے ایک برا انسان ہونے کے باوجود یہ اچھی بات کہی تھی کہ مسجد آخر مسجد ہے اور عبادت کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ اسے بے ایمان نے بنایا ہے، یہ دیکھا جائے کہ اسے ایمان کے لیے بنایا گیا ہے۔ ایمان علی کا اختلاف چوہدری سے ہونا چاہیے، مسجد سے نہیں۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ چوہدری کی بے ایمانیوں اور مکاریوں کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر نفرت اور غصے سے تھلا رہا تھا۔ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ جب بھی نماز کے اوقات میں مسجد سے میں سر جھکائے گا تو چوہدری کے فریب کی پوری داستان سجدے میں اس کے سر میں گھومتی رہے گی۔ وہ بظاہر سجدہ کرے گا اور باطن میں اپنے احقر بننے پر اور چوہدری کے احقر بننے پر کڑھتا رہے گا۔ نہیں وہ ایسی جگہ نماز نہیں پڑھا سکتا۔ پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟

یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟ حالانکہ اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ بعض اوقات انسان ارادے سے نہیں چلتا، فیرا رادی طور پر اس کے قدم اسے منزل مقصود تک لے جاتے ہیں۔ اس کے قدم حجرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ وہ گہرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کیا یہی منزل مقصود تھی؟ اس نے تو یہاں آنے کا ارادہ نہیں کیا تھا پھر کون سا جذبہ اسے یہاں تک کھینچ لایا۔ یہاں کون سی ایسی ہستی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی؟ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو وہ اسے پکار رہی تھی۔ وہ جو التجا آمیز پکار تھی، وہ اب تک اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی تھی جو اسے کشاں کشاں واپس لے آئی ہے۔

دردانے پر آہٹ سن کر سیکینہ نے سر اٹھایا تو اسے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ آہ کیا اسے دیکھ کر کسی لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ سکتی ہے؟ کسی کا چہرہ انتظار کی طوالت کے بعد اسے دیکھ کر گلاب کی طرح کھل سکتا ہے؟ ہاں یہ جذبہ، یہ خوشیاں اسے مل رہی ہیں۔ وہ جو اس کی سامنے تھی وہ سر سے پاؤں تک اس کی تھی۔ اس کے لیے مسکرا رہی تھی، اس کے لیے کھل رہی تھی اور اس کے انتظار میں اپنی بیماری سے زرد ہونے کے باوجود جاگ رہی تھی۔ اب اس لڑکی کے دماغ میں جتنی سوچیں تھیں، جتنے جذبے تھے، جتنی آرزوئیں تھیں، جتنی سرقتیں تھیں، وہ سب ایک ایمان کے لیے تھیں۔ وہ کبھی سوچ

مولوی رہے، کسی عورت کے قابل نہ بن سکے۔ کیا تم اپنے سے پہلے والے مولوی کا بھول گئے؟ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔"

وہ بولا جا رہا تھا اور ایمان علی اس کی بات کے وزن کو سمجھتا جا رہا تھا۔ وہ صبح کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔

"یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ انسان اپنے جیسے کسی انسان کو کچھ دیتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے یا کوئی فریب چھپا ہوتا ہے۔ تم مفاد پرست ہو تم بھی کرتے ہو صرف اپنے فائدے اور اپنی عزت کے لیے کرتے ہو۔ وہ مسجد بھی تم نے لاچ لیا کسی خاص غرض کے لیے تعمیر کرائی تھی اور اس مسجد میں آنے والے کسی بھی امام کو تم اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہو۔ میں سوچتا ہوں ایسی مسجد میں نماز پڑھنا پڑھنا کہاں تک درست ہے؟"

چوہدری زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔
"مولوی صاحب تم نادان ہو مسجد کس نے بنوائی؟ کیوں بنائی؟ یہ سوچ کر کیا کرو؟ اسے بنانے والے کی نیت پر چھوڑ دو۔ تم یہ دیکھو کہ وہاں خدا کی عبادت ہوتی ہے یا لوگوں کو سجدہ کرنے کی ایک جگہ مل گئی ہے یا نہیں؟ تمہارا کام نماز پڑھانا ہے، تم نہ کرو۔ دوسرا کیا کرتا ہے؟ دوسرا کس حد تک ایمان والا ہے اور کس حد تک بے ایمان؟ تم دوسروں کے متعلق کیوں سوچتے ہو؟ صرف اپنے ایمان کو کیوں نہیں دیکھتے۔ مگر سے کہا تھا کہ جب صحیح معنوں میں زندگی کا بوجھ اٹھاؤ گے، ایک سے دو اور دو سے چارہ رہو گے، ایک کنبے کی پرورش کرو گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ ایمان کو سلامت رکھنا مشکل کام ہے۔ تمہیں ابھی صرف ایک بیوی ملی ہے تو تم اس مسجد کو چھوڑ کر جانا چاہو اور اس بیوی سے بھی کھانا چاہتے ہو۔ راستے میں کوئی ٹھکرایا ہوا انسان تمہیں نظر آیا کیا تم اسے اور زیادہ ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاؤ گے یا اسے اٹھا کر سہارا دو گے؟ اگر اسے سہارا دینا ایمان ہے تو پھر تمہیں سیکینہ کو اٹھالیتا چاہیے، اگر اس ایمانی آزمائش ہے گئے تو پھر راتوں رات یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ سیکینہ کو چھوڑ دو اور صاحب! ہونے کا دعویٰ نہ کرو۔"

ایمان علی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر وہاں سے جا بنے لگا۔

رکھوں گا، مجھے وہ بے ایمان آدمی یاد آتا رہے گا اور میں کڑھتا رہوں گا۔ اس لیے اب میں یہاں نہیں رہوں گا، یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔“

”تو کہاں جائے گا؟ اور کیسے جائے گا تو اکیلے جانے کی بات کیوں کرتا ہے؟ میں تو تیری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہوں، سائے کی طرح تیرے ساتھ رہنے آئی ہوں۔ تو جو فیصلہ کرے گا میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔ تو ساری زندگی دھوپ میں چلنے کے لیے کئے گا تو میں تیرے ساتھ چلتی رہوں گی۔ بول کہاں جانا چاہتا ہے؟ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تو جہاں بھی جائے گا، مجھے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا چوہدری ملتا جائے گا۔ تیری عمر مجھ سے زیادہ ہے مگر میری غلامی کا تجربہ تجھ سے زیادہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ غریبوں اور ایمان والوں کی کمزوری سے یہ دنیا والے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

وہ سیکنہ کانٹہ دیکھنے لگا۔ اس کی عمر بے مشکل بیس برس ہوگی اور اس عمر میں وہ بچی ہوئی عمر کے تجربے بیان کر رہی تھی۔ عورت ایک بار ہانڈی کی طرح آگ پر جڑھتی ہے تو چاول کا صرف ایک دانہ نہیں گلاتی، ایک ہی اہل میں وہ تجربات کے سارے دانوں کو پرکھ لیتی ہے۔ اس نے ایک چوہدری کو گلا کر دینا کے سارے گلے سڑے چوہدریوں کے چہرے دیکھ لیے تھے۔ اس کے برعکس ایمان علی زمانے بھری ٹھوکریں کھاتا ہوا شاہ پور تک آیا تھا اور تمام تلخ تجربوں کو بھلاتا آیا تھا۔ وہ سیدھا سادا سا انسان اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے کا عادی تھا کیونکہ رسول خدا بھی اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا کرتے تھے اور اپنے دشمنوں کو سر جھکا کر سوچنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس اندھیر مگنری میں اسے کوئی دشمن سر جھکا کر سوچتا ہوا اور نام ہوتا ہوا نظر نہیں آیا۔ آج تک کسی دشمن نے بھی ندامت سے یہ نہیں کہا کہ مولوی صاحب تم راستی پر ہو۔ وہ یہی کہتے رہے کہ جو زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا، وہ اس زمانے کا سب سے احق انسان ہے۔ اس دور میں زندہ رہنے کے لیے تھوڑی تھوڑی ایمان داری اور تھوڑی تھوڑی بے ایمانی دونوں ہی ہونی چاہئیں۔ یعنی مسجد کی چھوٹی سی دنیا میں حسب حیثیت تھوڑا تھوڑا کم و فرب ضرور ہو۔ ایک کے منہ سے سونے کا نوالہ چھیننے کے لیے اور دوسرے کے منہ میں جھوٹا لقمہ ٹھونسنے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں خود کو اپنی سطح پر زندہ رکھنے کے لیے دوسروں کو اپنی سطح سے نیچے کرانا

بھی نہیں سکتا تھا کہ اک دم سے اسے اتنی ساری جائیداد مل جائے گی اور یہ جائیداد ایک لڑکی کے وجود میں چھپ کر آئے گی۔ وہ پھر اک دم سے ٹھک ہار کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ”آؤ! یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟ مجھے خوشیاں بھی دی گئی ہیں تو انہیں منہ پر ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ میری ہے مگر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنا نہیں سکتا جب تک کہ یہ پرائے بچے کی ماں بن جائے۔ مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا؟ تو مینے دس بیٹے ایک سال میں گیس سزا کاٹوں گا۔ کنویں کے پاس بیٹھا رہوں گا، پیاس کی شدت سے کنویں کا طواف کرتا رہوں گا مگر پانی نہیں پئی سکوں گا۔ یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہوا ہے؟ جب اس نے پیاس کے معلق سوچا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار دہن کے قریب جانا چاہتا تھا تو اس وقت اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی مگر حجرے میں پانی نہیں تھا صرف دودھ کا ایک گلاس تھا جس میں تھوڑا سا دودھ سیکنہ نے پیا تھا۔ وہ خشک ہونے لگا زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“
یہ سن کر سیکنہ چارپائی سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور دودھ کا گلاس اٹھاتی ہوئی بولی۔
”یہاں پانی نہیں ہے۔ پتا نہیں تو کہاں چلا گیا تھا؟ اب ٹھک ہار کر آ رہا ہے۔ میں بے بلاتی رہی مگر تو نے جواب نہیں دیا۔ یہ بے دودھ پانی ہے۔“
ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر دودھ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔
”میں یہ دودھ نہیں پیوں گا۔ یہ ایک بے ایمان آدمی کے گھر سے آیا ہے۔“
سیکنہ نے اس کے قریب اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تو بہت ایمان والا ہے مگر تو اس دنیا میں لوگوں کی دی ہوئی کو کس چیز کو ٹھکرائے گا۔ یہاں جو بھی چیز تیرے سامنے آئے گی اس کے پیچھے کوئی نہ لگا بے ایمانی چھپی ہوگی۔ یہ زمین جہاں تو بیٹھا ہوا ہے یہ بھی اسی بے ایمان آدمی کی ہے۔ مسجد بھی اس کی ہے، یہ پنڈ بھی اسی کا ہے، یہاں کی زمینوں میں اگنے والا اناج بھی اسی کا ہے، یہاں کے کنوؤں سے نکلنے والا پانی بھی اسی کا ہے تو کتنی چیزوں سے انکار کرے گا۔ ایمان علی نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا پھر کہا۔
”تو ٹھیک کہتی ہے میں بھی یہی سوچتا آ رہا ہوں کہ میں یہاں زمین کے جس حصے پر

پڑتا ہے۔ انسانوں کے درمیان یہ عمل ایک مدت سے جاری ہے۔ اور کتنی مدت! عین نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک پوری عورت اس کے حصے میں آئی تھی۔ اس کی جائداد جاری رہے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ایمان علی نے کہا۔

”تو ٹھیک سمجھتی ہے۔ میں بھی اب تک جہاں جہاں گیا، وہاں سجدے کرنے والے اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنی حسین عورت کو چھوڑنے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا پھر۔ مگر ایمان کو ایمان کی طرح برتنے والا کوئی نہ ملا۔ مگر اس شاہ پور کی مسجد سے آگے بھی شرعی طور پر نکاح ہو چکا تھا وہ دل اور دماغ میں بھی سما گئی تھی ہر طرح سے اسے سیکھنے کے بڑی دنیا ہے اور بہت سی مسجدیں ہیں۔ آگے جا کر کہیں تو شریف اور ایماندار لوگ مل گئے۔ ہم آگے جائیں گے جہاں ایمان کو سمجھنے والے ملیں گے وہاں ٹھہر جائیں گے۔“

میرے ساتھ کیسے چلے گی۔ یہاں تیرے بوڑھے ماں باپ بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ سیکھنے نے جواب دیا ”شادی کے بعد عورت اپنے گھر کی ہو جاتی ہے اور بیکے والا چھوڑ کر صرف اپنے مجازی خدا کے پیچھے چلتی ہے۔ یوں بھی میرے بوڑھے ماں باپ کو وقت کی روٹیاں ملتی رہیں گی۔ چوہدری میں بہت سی برائیاں ہیں مگر بہت سی اچانکیاں ہیں۔ اس کے جولاہا بوڑھے یا بیمار ہو جاتے ہیں اور کام کے قابل نہیں رہتے۔ گھر تینوں وقت کی روٹی بھجوا دیتا ہے۔“

یہ تو ایمان علی نے بھی دیکھا تھا کہ چوہدری ایک ہاتھ سے برائی کرتا تھا اور دوسرا ہاتھ سے نیکی کرتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو خدا سے ڈرتے بھی گناہ بھی کرتے ہیں پھر اس کا بوجھ کم کرنے کے لیے نیکی بھی کرتے ہیں۔ کسی کے مصیبت میں کام آجاتے ہیں۔ کسی کے بڑھاپے میں روزی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ زیادہ دولت مند ہوں تو حج کرنے چلے جاتے ہیں تاکہ گناہ دھل جائیں۔ گناہ وہ ضرور کرتے ہیں، کسی کے ساتھ برائی ضرور کرتے ہیں، کسی کو لوٹے کھوٹے ضرور ہیں لیکن اس ساتھ ہی کچھ نہ کچھ نیکی بھی کرتے جاتے ہیں۔ بس چوہدری ایسا ہی تھا۔ ہندوؤں کے ہر وقت میں کام آتا رہتا ہے سیکھنے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے بوڑھے ماں باپ کو وقت کی روٹیاں ضرور ملتی رہیں گی۔

لیکن سیکھنے کے لیے روٹیوں کا انتظام اب اسے کرنا تھا اور وہ یہ حماقت کر رہا تھا ایک عورت کا بوجھ لاد کر روٹی حاصل کرنے کی جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے غل کی باؤ کبھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ سیکھنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ کل وہ اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ سوچنے سے تو روٹی نہیں مل جاتی۔ وہ پھر سیکھنے کا منہ کھٹکے لگا لگا بیٹھی سا کھڑا

پڑتا ہے۔ انسانوں کے درمیان یہ عمل ایک مدت سے جاری ہے۔ اور کتنی مدت! عین نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک پوری عورت اس کے حصے میں آئی تھی۔ اس کی جائداد جاری رہے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ایمان علی نے کہا۔

”تو ٹھیک سمجھتی ہے۔ میں بھی اب تک جہاں جہاں گیا، وہاں سجدے کرنے والے اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنی حسین عورت کو چھوڑنے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا پھر۔ مگر ایمان کو ایمان کی طرح برتنے والا کوئی نہ ملا۔ مگر اس شاہ پور کی مسجد سے آگے بھی شرعی طور پر نکاح ہو چکا تھا وہ دل اور دماغ میں بھی سما گئی تھی ہر طرح سے اسے سیکھنے کے بڑی دنیا ہے اور بہت سی مسجدیں ہیں۔ آگے جا کر کہیں تو شریف اور ایماندار لوگ مل گئے۔ ہم آگے جائیں گے جہاں ایمان کو سمجھنے والے ملیں گے وہاں ٹھہر جائیں گے۔“

میرے ساتھ کیسے چلے گی۔ یہاں تیرے بوڑھے ماں باپ بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ سیکھنے نے جواب دیا ”شادی کے بعد عورت اپنے گھر کی ہو جاتی ہے اور بیکے والا چھوڑ کر صرف اپنے مجازی خدا کے پیچھے چلتی ہے۔ یوں بھی میرے بوڑھے ماں باپ کو وقت کی روٹیاں ملتی رہیں گی۔ چوہدری میں بہت سی برائیاں ہیں مگر بہت سی اچانکیاں ہیں۔ اس کے جولاہا بوڑھے یا بیمار ہو جاتے ہیں اور کام کے قابل نہیں رہتے۔ گھر تینوں وقت کی روٹی بھجوا دیتا ہے۔“

ڈاکو راستے میں لوٹ سکیں۔ مگر اب ایک جوان عورت ایک لچھاتے ہوئے غزوئے کی لڑائی کر مسجد اور پیش امام کے اخراجات اٹھائیں۔ اس طرح سب لوگ اپنے اپنے گھروں اس کے ساتھ ساتھ چلے والی تھی اور اسے فکر اور پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ اب وہ آلے حسبِ مشیت چندے کے طور پر چھوٹی بڑی رقیں یا اناج دیں گے اس طرح ہمارا نہیں تھا اس کے پرکٹ دیئے گئے تھے۔ وہ بے پرکار واندہ جو کبھی صرف شمع الٹی کا طواف گزار ہو جائے گا۔

کرتا تھا اب شمع حسن کی حفاظت کے لیے فکر مند ہو گیا تھا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کے ساتھ چوہدری کی آواز

ایسے وقت پہنچتا ہے کہ مصلحت اندیشی کسے کہتے ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق۔

انسان کو کام کرنا پڑتا ہے اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی جوان بیوی کو لے کر رات اندھیرے میں نہیں نکل سکتا تھا۔ لہذا اسے ایک بے ایمان کی زمین پر رات گزارنی تھی جب وہ ایک رات گزار سکتا تھا چوہدری کی مسجد میں ایک وقت کی نماز پڑھا سکتا تھا پھر اپنا اور سے ہوئے لئے میں کئے گئی۔

وقت کی نماز میں بھی پڑھا سکتا تھا۔ پھر بات کیا رہ جاتی ہے؟ کس بات کا جھگڑا رہ جاتا ہے؟ سوچا جائے تو جھگڑا کسی بات کا نہیں تھا اور بہت سی باتوں کا تھا۔ لیکن مسجد سے کسی وقت نہ جائیں اس سے بات کرتی ہوں۔

اختلاف نہیں تھا مسجد بنانے والے سے تھا۔ اب حالات اسے سوچنے پر مجبور کر رہے! ایمان علی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

کہ سیکینہ کی حفاظت کی خاطر اسے یہاں ٹھہر جانا چاہیے اور اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسجد کے معاملات اپنی جگہ ہیں اور انسانی جھگڑے اپنی جگہ۔ لہذا اسے اسی مسجد میرے ساتھ ہر مرد سے پرہیز کرے گی۔ یہ ہم مردوں کا جھگڑا ہے، میں خود ہی منٹ لوں گا۔ تو نماز پڑھنا اور پڑھانا چاہیے۔ اس نے سراٹھا کر کہا۔

”سیکینہ میں اسی مسجد میں نماز پڑھاؤں گا۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولتے ہوئے باہر گیا۔ باہر پانچ بجے کئے جوان ہاتھوں میں لائیں خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ایمان علی کے لئے کھڑے تھے جیسے ہی وہ باہر آیا چوہدری نے اس کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے میں ذرا سی چٹک پیدا کر دی تھی اور پہلی بار اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھا دیا تھا۔

خوشی سے دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے بولی۔

”لے لے اے پیالے، تجھے بہت پیاس لگ رہی تھی نا؟“

اس نے سیکینہ کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں اسے اپنے لیے حرام سمجھتا ہوں اور حرام آئے گا اسی طرح اس پنڈے کے لیے اناج کی منصفانہ تقسیم ہوگی۔ تو جس طرح مسجد سے ایک لیے کہ چوہدری کے گھر سے آیا ہے۔ میں چوہدری کے گھر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔“ آدمی کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا ہے اسی طرح میری دولت، میری جائیداد اور میرے سیکینہ نے جراتی سے کہا۔

”تو پھر ہم روٹی کہاں سے کھائیں گے؟“ اس نے جواب دیا۔

”کل صبح نماز کے بعد میں پنڈ والوں سے کہوں گا کہ وہ ایک مسجد کھینچی بنا میں اور سب رہنے دیں گا۔ اگر تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو ابھی اور اسی وقت چپ چاپ یہاں سے چلا جا

ورنہ یہ جوان تیری لاش کو اٹھا کر یہاں سے دور کہیں پھینک دیں گے۔“ ایمان علی نے بوکھلا کر کہا۔

”چوہدری! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ایک شریف آدمی کا گریبان پکڑنا کہاں تک نامعلوم منزل چھپی ہوئی تھی۔ اس کی ہم سفر بے حد حسین تھی لیکن اس کے حسن کی نہ میں لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔ سیدھی طرح باتیں کرو۔ میں ذرا چاندنی آگے جانے والے راستے کو روشن نہیں کر سکتی تھی۔ ایمان علی کے ایمان کا نور بھی نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن وہ باتوں نے فی الحال یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک سیکڑہ اس راستے کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حسن کا چاند دل کے آسمان پر چمکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کو دیران چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ایمان کی روشنی تہذیب کے راستوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس سے پہلے کالی تہذیب کے حلال روٹی کھانے کے لیے یہاں مسجد کی بنی بنا چاہتا تھا جو تجھے پسند نہیں ہے۔ کالے راستوں پر خود کو گھسیٹتے رہتا ہوتا ہے۔

ناپسندیدگی کے ہمانے تو کس گناہ پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور کس طرح خود کو گناہ بدنامیوں سے بچانا چاہتا ہے، میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر میں تجھ سے بحث نہیں کروں گا۔ یہاں سے چپ چاپ سیکڑہ کو لے کر چلا جاؤں گا۔ تو میرا گریبان چھوڑ دے، میں جا رہا ہوں۔“

چوہدری نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر حجرے میں آیا اور بکڑ بولا۔

”فیصلہ ہو چکا ہے ہم ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی سالن ہے۔ یہ کپڑا جو میں نے پہنا ہوا ہے بس یہی میرا اپنا ہے۔ تیرے پاس تیرا اپنا جو لباس ہے اسے پہن لے اور یہ دلن کا سرخ جوڑا اتار دے کیونکہ چوہدری نے اپنے گناہ کا حجرے میں دفن کرنے کے لیے تیرے لیے یہ سرخ کفن سلوایا تھا۔ میں اب اسے بڑا نہیں کر سکتا۔ میں باہر جا رہا ہوں جتنی جلدی ہو سکے لباس بدل لے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر واپس آگیا اور چوہدری سے تھوڑی دیر کی اجازت چاہی تاکہ اس کی دلن اپنا لباس بدل لے۔ چوہدری نے سر ہلا کر اسے اجازت دے لی۔ لیکن وہ اپنے تومبیوں کے ساتھ وہاں کھڑا رہا جب تک کہ سیکڑہ اپنے پرانے لباس میں لپیٹ کر باہر نہیں آگئی۔ ایمان علی نے اسے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا اسی لیے وہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔

چوہدری اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ ایمان علی نے فوراً ہی اپنی دلن کا ہاتھ تھام لیا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

”نہیں جب انہیں معلوم ہو گا کہ تو میرا خاوند ہے تو وہ تیری بڑی عزت کریں۔“
 وہ کہتے کہتے رک گئی اور ذرا سر ہٹھا کر اپنے ساتھ چلنے والے مجازی خدا کو دیکھنے
 پھر سر ہٹھا کر بڑی آہستگی اور درد بھرے لہجے میں بولی۔
 ”کیا آج ہماری سہاگ رات ہے؟“

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا جو ایمان علی کے دل کو چھو کر گزر گیا۔ واقعی وہ
 سہاگ رات تھی، دلہانے اچھی طرح اپنی دلہن کا گھونگھٹ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ چوڑا
 رہا تھا اسے چھو نہیں رہا تھا۔ دلہن اس کے ساتھ تھی مگر سچ کا سفر نہیں تھا۔ ایمان علی
 پہلے کبھی سہاگ رات نہیں دیکھی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ شب وصال آج کی طرح
 نہیں ہوتی۔ آج کی رات جذبات کے لاؤ روشن ہوتے ہیں اور خواہشیں دھوم مچاتی
 وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور اپنے ساتھ چلتے ہوئے بدن کی آج محسوس کرتا جا رہا تھا۔
 رہا تھا، ترتیب کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔
 ”ہاں سیکندہ آج سہاگ رات ہے۔ مگر چوہدری کی باتوں میں آکر تو نے جو غلطی کی
 اس کی سزا تجھے مل رہی ہے اور میں بھی سزا کاٹ رہا ہوں۔ میں تجھے ابھی ہاتھ لگا
 لگا سکتا۔ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اس کے باوجود میرے اور تیرے در
 چوہدری کا گناہ سفر کر رہا ہے۔ جب تک کہ وہ گناہ ایک بچے کے روپ میں تجھ سے
 نہیں ہو گا اس وقت تک تو مجھے پر حرام ہے۔“

وہ چل رہی تھی اور جل رہی تھی۔ ایسے جل رہی تھی جیسے بھری برسات میں گھر
 ہے۔ گھر جلتا بھی ہے اور برسات میں بجھتا بھی ہے اور اپنی راکھ کے ڈھیر کے اندر بچے
 باوجود کہیں کہیں سے سلگتا بھی رہتا ہے۔ جیسے وہ شرم و حیا کے تحت اوپر سے بھی
 تھی اور اندر کہیں کہیں سے سلگ رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے ننکھیوں سے ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے
 ایک گھبر جوں کا سپنا دیکھا تھا۔ ایمان علی کسی حد تک اس کے خواب کی تعبیر تو لانا
 اور لانے قدر چوڑی بڑی کاوی تھا۔ اگر آئے دن فاقے نہ کرتا، بدن پر گوشت ہوتا
 خوب بھاری بھر کم نظر آتا۔ مگر ایمانداری نے اسے سکھایا تھا کہ وہ لانے پالنے کی طرح
 ”اب تھا۔ اب اس کی ایمانداری سیکندہ کو سکھادی تھی۔ سارے جذبات پر اس پر زری
 تھی۔ ابھی تک وہ اسی انتظار میں تھی کہ یہ ایمان علی اگر حسن کا تمنائی ہو گا تو ایک پروانے
 کی طرح آئے گا۔ اگر جوانی کی محاسن پکارے گی تو اس پاس کبھی کی طرح بھینھنٹے گا۔ مگر
 نہ وہ پروانے کی طرح آ رہا تھا، نہ کبھی کی طرح بھینھنٹا رہا تھا بلکہ ایک بڑول چھھر کی طرح
 کانوں کے قریب گنگٹاتے ہوئے گزر رہا تھا کہ تو مجھ پر حرام ہے۔“
 سیکندہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شادی سے پہلے وہ کس طرح حلال کر دی گئی اور
 شادی کے بعد کس طرح حرام ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ کھیاں بیماری کا گھر ہوتی ہیں، مضائقہ
 پر بیٹھ جائیں تو مضائقہ کو ضائع کر دیتا چاہیے۔ مگر منگائی کے اس دور میں مضائقہ چھپتی نہیں
 جاتی صرف کھیاں اڑادی جاتی ہیں۔ اسی طرح سے چوہدری اس پر سے اڑ چکا تھا۔ پر ایمان
 علی کیوں اس مضائقہ سے پرہیز کر رہا تھا؟ یہی بات سیکندہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ شرم
 و حیا کے باعث کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی، اس مسئلے پر بحث نہیں کر سکتی تھی اس لیے چپ
 چاپ چل رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف تاریکی منہ بھاڑے کھڑی تھی اور اسے قدم
 قدم ٹھنکتی جا رہی تھی۔ موسم گرم کی ہوائیں تھم تھم کر سر رہی تھیں۔ چادر میں لپٹے رہنے
 کے باعث اسے پسینہ آ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا گزر جاتا تو اس کی جان میں جان
 آتی۔ اس نے پریشان ہو کر چادر کو سر سے ہٹا دیا اور کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے
 لگی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھ خاموشی سے چلنے والا اس کی زندگی کا ہم سفر
 زیر لب گنگٹاتے ہوئے کچھ کہ رہا ہے یا کچھ پڑھ رہا ہے۔
 ”کیا تو کچھ کہ رہا ہے؟“

ایمان علی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے گردن تک بے پردہ دیکھ کر چاروں طرف
 نظرس دوڑانے لگا کہ کہیں کوئی اس کی دلہن کو بے پردہ تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ صرف اندھیرا
 دیکھ رہا تھا اور اندھیرے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کپے ویران راستے پر کسی کے نظر
 آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔

”میں کلام پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ جب میں تمنا ہوتا ہوں یا لہجے سفر پر نکلتا ہوں تو
 قرآن خوانی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ پھر پتا نہیں چلتا کہ اتنا لہجہ کیسے کٹ گیا۔“
 وہ یہ کہہ کر پھر پڑھنے لگا۔ کچھ اس طرح مصروف ہو گیا کہ زبان پڑھتی جا رہی تھی اور

ایمان علی نے گزیرا کر اسے دیکھا۔ چادر سر سے ہٹی ہوئی تھی مگر آروں کی روشنی میں اس کی صورت صاف نظر نہیں آئی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”ہاں اس سے بھی اچھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ کیا تجھے کچھ کہتیں یاد ہیں؟“

سکینہ کی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

”بچپن میں یاد تھیں۔ جوانی میں چودھری نے بھلا دیں۔“

”تجھے بھرے یاد کرواؤں گا چل پڑھ۔“

سکینہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”جب تجھے پرہانہا ہی تھا تو درے میں بلایا ہوتا۔ اپنے حجرے میں کیوں بلایا تھا؟“

”مورتوں کی یہ بہت بری عادت ہوتی ہے۔ اچھی باتیں سکھاؤ تو حجت کرنے لگتی ہیں۔“

”مورتوں کی نہیں مولویوں کی بری عادت ہوتی ہے۔ ہمیشہ بے وقت نصیحتیں کرتے ہیں دیکھو اتنی دیر میں چاند نکل آیا ہے۔ چاندنی میں یہ ساری دنیا آہستہ آہستہ یوں اجاگر ہو رہی ہے جیسے خالق کائنات ابھی ابھی ہم دونوں کے لیے اس دنیا کی تخلیق کر رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ہم دونوں کے لیے نہیں بنایا ہے؟ کیا یہاں سے وہاں تک تجھے کوئی۔ خوب صورتی نظر نہیں آ رہی ہے؟“

ایمان علی نے آسمان کے کنارے چاند کا چہرہ دیکھا پھر اپنے کنارے سکینہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں سے یہاں تک کائنات کا حسن ایک نہ ٹوٹنے والے سلسلے کی طرح پھیلا ہوا تھا اور ایک حسن کو دوسرے حسن سے مربوط کر رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ صرف عبادت کے لیے فرشتے کافی ہیں۔ انسان کو تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عبادت بھی کرے اور کائنات کے ذرے ذرے کے حسن کو بھی سمجھے اور اسے اپنے طور پر برتے۔ اگر نہیں برتے گا تو تخلیق کائنات کے مقاصد سے انکار کرے گا۔

وہ چلتے چلتے راستے کے کنارے ایک پتھر بیٹھ گیا اور تھکے ہوئے لمبے میں بولا۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔ کتنی دیر ہو گئی جب تو دلہن بن کر حجرے میں آئی تھی، میں اس

”یہی تو میں سوچتی ہوں کہ تو رہ کر اپنی پیاس کو کیوں بھول جاتا ہے۔“ ایمان علی نے

دماغ سوچتا جا رہا تھا۔ اکثر رٹا ہوا سبق زبان سے دہراتے وقت دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے، کسی اور طرف ہٹکتا رہتا ہے۔ ایمان علی بہت دیر سے اندر ہی اندر ایک جنگ میں مصروف تھا۔ وہ پوری توجہ سے پرہنا چاہتا تھا مگر دماغ تھا کہ ساتھ چلنے والی کی طرف اشارہ چاہتا تھا جو ایک نئی نویلی دلہن تھی، جو تازہ تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح خوشبو بٹاتا تھا۔

تھی۔ ایسا نہ ہو کہ اس اندھیرے میں اور اس دیران راستے میں اس خوشبو کو بوٹنے لگا۔

لیرا آجائے۔

کسی لوٹنے والے کا اتنا زیادہ ڈر نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ سے ڈر رہا تھا اور اپنا

سفر سے توجہ ہٹانے کے لیے اللہ کا کلام پڑھ رہا تھا تاکہ شیطان ہٹکلا م نہ ہو۔ مگر لکھا

شیطان بھی نہیں بولتا جہاں عورت بولتی ہے۔ وہ بولنے لگی۔

”مگر تو اس وقت تنہا نہیں ہے، میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔ مجھ سے باتیں کر۔“

گما تو کیا یہ راستہ نہیں کئے گا؟ میں تیری بیوی ہوں، بلا تو نہیں ہوں کہ پڑھ پڑھ کر رہا ہے۔“

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس بات کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب شادی کر

دنیا داری شروع کی ہے تو اسے اپنی بیوی کے جذبات اور احساسات کو بھی سمجھنا پڑے گا۔

اس سے باتیں کرنا چاہیے، اس کی دلجوئی کرنا چاہیے تاکہ اس بے چاری کو تنہائی کا

نہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ سمجھتا تھا مگر اپنے آپ کو ہٹکنے اور ہٹکنے سے بچانے کے لیے لہا

سے کھڑانے کے لیے اس وقت یاد الہی میں مصروف رہتا چاہتا تھا۔ ہر کام کے لیے

وقت مقرر ہوتا ہے۔ انسان وقت کو مختلف جذبوں اور مختلف عقیدوں میں تقسیم کرنے

بعد خدا سے بھی محبت کرتا ہے اور خدا کی بندی سے بھی لہذا وہ خدا کی بندی کو نظر

نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تھک ہار کر کہا۔

”اچھی بات ہے، ہم باتیں کریں گے مگر اچھی اچھی باتیں کریں گے۔“

سکینہ نے دور آسمانوں کے کنارے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھ آسمان کا کنارہ سرخ ہو رہا ہے، اب چاند نکلنے والا ہے۔ ہر طرف چاند

جائے گی اور ہمیں اندھیرے میں یہ ڈوبی دنیا نظر آنے لگے گی۔ میں تیرا چہرہ دیکھ سکوں گا وقت سے پاس ہوں۔“

تو میری صورت دیکھ سکے گا۔ کیا یہ اچھی باتیں نہیں ہیں؟“

وہ بھی مطمئن ہو کر قریب آگیا اور تھراس کے پیالے میں پانی نکالنے لگا۔ ایمان علی نے اس کے ہاتھ سے پانی لینے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”امام دین۔ میں لاہور سے آ رہا ہوں اور اب جمال والا میں اپنے بھائی سے اپنے حصے کی جائداد حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایمان علی میں ایسی جگہ کی تلاش میں سفر کر رہا ہوں جہاں ایمان کو سمجھنے والے مل جائیں۔ میں حافظ قرآن ہوں، کہیں عزت کی روٹی ملے گی تو میں لوگوں کو کلام پاک کی تعلیم دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پانی پینے لگا۔ سیکنہ نے ذہن کو چادر میں چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔“ اسی وقت ہوا کا ایک شریر جھونکا آیا اور اس کی چادر کو سر سے اڑا کر شاتوں تک پہنچا دیا۔ امام دین کی نظریں اس پردے والی کے چہرے پر پہنچ کر جم گئیں۔ ایمان علی کو پانی پیتے پیتے ٹھنک لگا۔ اس نے گھور کر سیکنہ کو دیکھا۔ اس نے قریب پہنچنے ہی نفے کے درد کو نہیں پہنچی اور وہ ٹھنک کر رک گیا۔ اس نے سوچا، ”یہ نام جو جلدی سے چادر کو سر پر لا کر گھونٹھ کی طرح چہرے پر کھینچ لیا لیکن اتنی سی دیر میں امام دو انسان کون ہیں؟ دو انسانوں نے سوچا، پتا نہیں وہ آنے والا کون ہے؟ انسان؟ دین کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کووند گئی تھی۔ ایک لمحے کا نظارہ ہزار جلوں پر بھاری ہوتا شیطان؟ آنے والے نے بھی سوچا کہ دونوں بے ضرر راہ گیر ہیں یا لیرے ہیں؟ جنگل ہے اور سات پردوں میں چھپنے کے باوجود چشم تصور کو پکارتا رہتا ہے۔ ایمان علی مطمئن جانور ایک دوسرے سے اتنا خوف نہیں کھاتے جتنا کہ تہذیب کے جنگل میں انسان کو ہو گیا کہ اس نے اپنی جائداد کو اچھی طرح چھپا دیا ہے۔ اس نے تھراس کے پیالے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تھوڑا سا اور دو تمہارے لیے پانی کم تو نہیں ہو گا۔“

”نہیں مجھے آگے جا کر اور پانی مل جائے گا۔“

اس نے دوسری بار پیالے کو بھر دیا۔ ایمان علی نے وہ پیالہ سیکنہ کی طرف بڑھادیا۔ تھی اس لیے میں کچے راستے پر آگیا ہوں۔ میرے تھراس میں برف کا ٹھنڈا پانی ہے سیکنہ پیالے کو لے کر دوسری طرف گھوم گئی اور گھونٹھ کے اندر برف کی ٹھنڈک کو چلنے اٹیچی میں چار جوڑے کپڑے، شیونگ کا سامان اور دو ہزار روپے ہیں۔ تم مجھے نقد ہوئے سینے میں اتارنے لگی۔ امام دین نے کہا۔

”تم میرے ساتھ جمال والا چلو، وہاں میں تمہیں روزی روٹی سے لگا دوں گا۔ تم وہاں پہنچو، یہ دو ہزار روپے لے لو اور مجھے یہاں سے گزر جانے دو۔“

ایمان علی پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، ”میں لوہے کے لوگوں کو دینی تعلیم دیا کرتا۔“

”تمہاری بڑی مرثی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بندے کے لیے دوسرے بندے کے ذریعے تمہاری دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تم میں پیاسا ہوں، کیا تھوڑا سا پانی بلاؤ گے؟“

چونک کر اسے دیکھا۔ چادر اب شانے سے بھی دھلک گئی تھی۔ دوپٹہ کہیں چادر کے اندر گھلے ہو گیا تھا اور کوہ آتش فشاں کی طرح دھکتے اور بھڑکتے ہوئے سینے میں سانسیں گھڑ ہو رہی تھیں۔ چاندنی کے ستھرے جنگل میں جنگلی گلاب کی گلابیاں گھبر رہی تھیں۔ آتش کی سبک ہوائیں اس کی زلفوں سے کھیل رہی تھیں اور محبوب کی تادیبہ انگلیوں کی طرح کھڑے کی چاندنی پر سائے بکھیر رہی تھی۔

وہ بے اختیار اپنی پھٹی سی سے اپنے سینے کو سسلانے لگا۔ اندر آگ لگی ہوئی تھی اور آگ پانی سے بجھ سکتی تھی۔ یہاں تو پانی نہیں ملے گا۔ اس کی نظریں چاروں طرف بھاگنے لگیں۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش رہے۔ اگر وہ اسے سمجھ لیتا تو وہی ہوا نہیں گنگنائی ہوئی محسوس ہوتی۔ سوچ سے جذبہ بدلتے ہیں اور جذلوں سے کائنات کی ہر چیز کا رنگ دھونڈ جاتا ہے۔ اچانک ہی ساری فضا گنگنائی لگی۔ دور سے کوئی راہ گیر کا تاہوا آ رہا تھا۔ قریب پہنچنے ہی نفے کے درد کو نہیں پہنچی اور وہ ٹھنک کر رک گیا۔ اس نے سوچا، ”یہ نام جو جلدی سے چادر کو سر پر لا کر گھونٹھ کی طرح چہرے پر کھینچ لیا لیکن اتنی سی دیر میں امام دو انسان کون ہیں؟ دو انسانوں نے سوچا، پتا نہیں وہ آنے والا کون ہے؟ انسان؟ دین کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کووند گئی تھی۔ ایک لمحے کا نظارہ ہزار جلوں پر بھاری ہوتا شیطان؟ آنے والے نے بھی سوچا کہ دونوں بے ضرر راہ گیر ہیں یا لیرے ہیں؟ جنگل ہے اور سات پردوں میں چھپنے کے باوجود چشم تصور کو پکارتا رہتا ہے۔ ایمان علی مطمئن جانور ایک دوسرے سے اتنا خوف نہیں کھاتے جتنا کہ تہذیب کے جنگل میں انسان کو ہو گیا کہ اس نے اپنی جائداد کو اچھی طرح چھپا دیا ہے۔ اس نے تھراس کے پیالے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہو؟“

جواب میں مولوی نے پوچھا، ”اور تم کون ہو؟“

”میں جمال والا کے چوہدری دین محمد کا چھوٹا بھائی ہوں، راستے میں بس خرابی تھی اس لیے میں کچے راستے پر آگیا ہوں۔ میرے تھراس میں برف کا ٹھنڈا پانی ہے سیکنہ پیالے کو لے کر دوسری طرف گھوم گئی اور گھونٹھ کے اندر برف کی ٹھنڈک کو چلنے اٹیچی میں چار جوڑے کپڑے، شیونگ کا سامان اور دو ہزار روپے ہیں۔ تم مجھے نقد ہوئے سینے میں اتارنے لگی۔ امام دین نے کہا۔

”تم میرے ساتھ جمال والا چلو، وہاں میں تمہیں روزی روٹی سے لگا دوں گا۔ تم وہاں پہنچو، یہ دو ہزار روپے لے لو اور مجھے یہاں سے گزر جانے دو۔“

ایمان علی پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، ”میں لوہے کے لوگوں کو دینی تعلیم دیا کرتا۔“

”تمہاری بڑی مرثی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بندے کے لیے دوسرے بندے کے ذریعے تمہاری دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تم میں پیاسا ہوں، کیا تھوڑا سا پانی بلاؤ گے؟“

سیکنہ نے ہاتھ بڑھا کر خالی پیالہ واپس کر دیا۔ امام دین نے اس کے حنائی ہاتھ کو ہچکے ہوئے کہا۔

”اب ہماری منزل ایک ہو گئی ہے تو پھر ہم آگے پیچھے کیوں چلیں؟ ساتھ چلیں گے۔ ایمان علی نے اپنی دامن کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا ”میرے ساتھ میری گھڑا ہے اور یہ بہت تھک گئی ہے۔ ابھی ہم یہاں سناٹا میں گئے، تم اپنا راستہ کھوٹا کر دو۔“
”ہم جاؤ۔ ہم تمہارے پیچھے وہاں پہنچ جائیں گے۔“
امام دین نے تھوڑا سا گھبراہٹ سے دیکھا کہ وہ تو راستے میں کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ راستہ بھی آسان سے کٹ جاتا ہے ویسے تمہاری مرضی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی اٹیچی اٹھائی اور وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ ایمان علی نے باز اشارے سے سیکنہ کو سمجھایا کہ وہ پھر برہنہ کر ڈرا آرام کرے۔ وہ حکم کی بندی بننے لگا۔ گھونگٹ کے پیچھے سے جانے والے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ جانے والا تھوڑا سا جا کر رک گیا پھر لپٹ کر کفن میں لپٹی ہوئی عورت کو دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری بھراؤ لہرا رہا پر چلتے ہوئے اونچی آواز میں گانے لگا۔

”تو جنگل کا پھول ہے تجھے کھلتے ہوئے کس نے دیکھا ہے؟ تو رنگ ہے خوشبو جنگل کے جانور تیری خوشبو بچانے بغیر تجھے دیکھ کر اپنے چاروں طرف گھاس کو سونگھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اے جنگل کے پھول میرے پاس حسن نام کی شاعری ایک عاشق کا دل ہے اور میرے منہ میں ایک شاعری زبان ہے ایمان۔ حسن کو شعروں کے ترنم سے سنو رہا ہوں۔ مگر حسن و شباب کے خزانے پر ایک ماہی کا منہ کھڑی بارے بیٹھا ہے۔ میں تجھے دیکھ سکتا ہوں، تیری تمنا کر سکتا ہوں مگر تجھے چھو سکتا۔“

کی زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ سیکنہ کو وہ گیت بہت اچھا لگا تھا مگر وہ گیت اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دور جلتے جاتے فاصلے کی کھڑکیں گر کر زخمی ہو گیا تھا۔
”بہت دیر بعد جب گھونگٹ کی کال کو ٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔
”مجھے گری لگ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اتنی بڑی دنیا میں میں اکیلی بیٹھی ہوں تو بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے سر سے چادر ہٹا دی۔ ایمان علی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اسے دیکھنے والا چلا گیا تھا اور اب اسے دیکھنے کا حق صرف ایک مجازی خدا کو تھا۔ اگر مرد کے بس میں ہوتا تو دنیا کی ہر خوب صورت چیز کو وہ صرف اپنی جاگیر بنالیتا۔ ایمان علی جاگیر داری کے خلاف تھا۔ اسے زندگی میں جو کچھ ملا اس میں دوسروں کو برابر شریک بنایا۔ سب کے ساتھ مل کر دینی تعلیم حاصل کی۔ سب کے ساتھ مل کر عبادت کی حتیٰ کہ روٹی جیسی چیز جس کے لیے انسان کتوں کی طرح لڑتا ہے، اس روٹی میں بھی وہ دوسروں کو شریک کرتا رہا۔ اگر اس کے پاس بہت سی زمینیں ہوتیں تو وہ انہیں دوسروں کو تقسیم کر دیتا۔ دولت ہوتی تو دوسروں کی ضرورت سے بھی زیادہ گھر گھر پہنچا دیتا۔ مگر یہ کم بخت عورت ایسی چیز ہوتی ہے کہ تقسیم نہیں ہوتی۔ جب تک اسے اپنی جاگیر نہ بناؤ اس وقت تک اپنی نسل اپنے نام سے نہیں پکڑی جاتی۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو مرد کبھی عورت سے محبت نہیں کرتا۔ صرف اپنے نام کی فصل اگانے والی زمین سے پیار کرتا ہے۔ یہ محض شاعر ہے جو عورت کو نت نئے روپ میں پیش کرتا ہے اور اس کے لیے دل کو دھڑکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سیکنہ نے پھر پر اٹھتے ہوئے کہا۔

”تو بہت زیادہ تھکا ہوا ہے یہاں بیٹھ جا۔“

ایمان علی نے دور آگے جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ اس راستے کے افق میں

ایمان علی کو ایسا لگا جیسے وہ اسے گانیاں دیتا ہوا جا رہا ہے۔ اس نے سیکنہ کو ہلکا سا غروب ہو گیا تھا مگر ایک پریشانی طوع ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بیوی کے متعلق بڑی ہوئے کہا ”شاعر حسن کو بے نقاب کرتے ہیں اور الفاظ کی بازی مگرمی سے بڑھنے لگتا ہے۔“
برکت علی اس کی بیوی کو چاہنے کے بعد چھوڑ چکا تھا۔ اسے پیچھے بھی پریشانیاں ملی تھیں اور والوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ ان شاعروں کی گردن اڑا دینا چاہیے۔“
وہ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا مگر حسن اپنی مکمل شخصیت کو بچانے کے لیے آگے بھی پریشانیاں مل رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے نہیں تھکا تھا پریشانیوں نے اسے تھکا کر پتھر پر بٹھا دیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔

نہ رہا تھا۔

ایسی نکھری ہوئی چاندنی میں دلوں کے اندر کتنا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ نہ رنگ نہ روپ، زندگی کے تمام سر کھو گئے تھے۔ سر کے بغیر یہ ساری دنیا گونگی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو قبروں پر نوحہ خوانی ہوتی ہے مگر وہ مرد اپنی قبر میں خاموش پڑا تھا۔ ایک وفا شعار بیوی کے اندر جب سائے سپنوں کا شیش محل چٹنا چور ہوتا ہے تو اوپر سے اس کی وفا نہیں جاتی۔ اندر سے کوئی ہوتی کرچیوں کی طرح اس کی سونچیں نکھر جاتی ہیں۔ کم از کم ہماری مشرقی عورتوں کا یہی آدرش ہے کہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور اوپر سے مکمل مجسم اور پتھری طرح مستحکم رہیں۔

آگے جا کر پھر انہیں رکتا پڑا کیونکہ فجر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ سیکنہ کو لے کر کچی سڑک کو چھوڑا ہوا کھیتوں میں آگیا پھر اپنے کانڈھے پر بڑا بڑا سا رومال ایک جگہ بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہ کئی بار عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھ چکا تھا۔ اسی وضو سے تنہا کی نماز بھی پڑھی تھی اور تسبیح خوانی کرتا رہا تھا۔ کسی ایسے خیال کو دماغ میں جگہ نہ دیتا تھا جس سے وضو مجبور ہوتا ہے۔ اس وقت بھی نماز پڑھنے کے دوران زبان آیتوں کا ورد کر رہی تھی مگر دماغ سوچ رہا تھا۔

وضو تو سلامت ہے۔ ایک دلہن کی آمد نے مجھے بھگایا تو نہیں تھا۔ نہیں، میں نہیں بھگا تھا البتہ خیالات ابھی تک بھٹکتے آ رہے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ شیطان تو اکثر خیالوں میں چھپ کر آتا ہے۔ ہاں اگر سوچنے والا بھی شیطان بن جائے تب وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نہیں، میرا وضو سلامت ہے۔ ایسی ہی الجھی الجھی سوچوں کے دوران نماز ادا ہو گئی۔ وہ بھر سیکنے کے ساتھ اپنی راہ پر چل پڑا لیکن وہ اپنی عبادت سے مطمئن نہیں تھا۔ اندر سے بہت زیادہ پریشان تھا کہ اب یہ عورت اس کی عبادت میں بھی گھسی آ رہی ہے۔ ایسا کب تک ہو گا اس طرح زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ تو اسی طرح ساری عمر چلتی رہے گی۔

مگر سوچ سوچ کر اسے اپنی زندگی سے نہیں بھگا سکتا تھا۔ وہ کوئی شیطان یا شیطان کی نانہ نہیں تھی کہ لاحول پڑھنے سے بھاگ جاتی۔ باقاعدہ ایجاب و قبول کے بعد آئی تھی۔ واقعی یہ ایمان کی آزمائش تھی۔ اب اسے تاحیات ایک بہت ہی خوب صورت چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی تلوار کی چھاؤں میں نماز پڑھتے رہنا تھا۔

”مام دین کو ذرا اور دور نکل جانے دو، یہ آج کل کے نوجوان اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ شریف عورتیں سفر کر سکیں۔“

سیکنہ نے حیرانی سے پوچھا ”اس بے چارے نے ہمارا کیا گناہ ہے اس نے؟“ پانی پلایا تھا پھر تجھے روزی روٹی سے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ ساتھ تھکس نہیں تھا۔“

”یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے کہ کسی خلوص کے پیچھے کیا ہوتا ہے؟ اپنی میں دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اس کی دولت کی طرف نہیں دیکھا مگر وہ میری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حالات نے مجھے وقت سے پہلے محتاط ہونا سکھا دیا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تو جمال والا نہیں جائے گا۔“

”مجھے اپنی چیز کی حفاظت آپ کرنا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں مجھے تنہا پر رکھ کر رکھنی پڑے گی لہذا جمال والا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم وہاں ضرور گئے۔“

سیکنہ خوش ہو گئی مگر اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ مبادا ایمان علی ثبے ہو جائے۔ اس کی خوشی محض اس لیے تھی کہ آگے بڑھنے ہی ایک ٹھکانہ ملے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آگے دھڑ دھڑان وہی جانی پہچانی خاموشی تھی مگر سیکنہ کے احساسات اک ذرا سا بدل گئے اگرچہ اس کی وفا محض ایمان علی کے لیے تھی مگر اس کی سوچ اس کے گیت کی طرف رہی تھی جو زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا کہیں گر پڑا تھا۔ اگر کسی گیت سے پا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیت والے سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ گیت تو ایک نوحہ پانی کی پٹی ہے جو حرارت سے بچتی ہوئی عورت کی پیشانی پر رکھی جاتی ہے۔ اس سے ختم نہیں ہوتا زارا سا اثر جاتا ہے۔ وہ جانے والا جو تعریف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نواز طور پر دے گیا تھا یہی خیرات وہ اپنے ایمان علی سے چاہتی تھی۔ سہاگ رات میں بہت کچھ نہیں دے سکا تھا مگر تعریف کے دو بول تو دے سکتا تھا۔ اگر اسے پائے صرف خدا ہی کا شکر ادا کر لیتا تو اس بہانے ایک عورت کو اپنی اہمیت کا احساس ہوجاتا ہے تو اچھا چھٹا ہوا ڈھول ہوتا ہے کہ کچھ آواز میں ہی بجاتا ہے لیکن وہ تو کہیں سے

جب وہ جمال والا پہنچے تو دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ کسان کھیتوں میں لڑا ہو تلوں کے بجائے مونچھوں سے پوچھ رہا ہو۔

رہے تھے۔ پنڈ کی عورتیں نہر کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں اور غسل کر رہی تھیں۔ ایمان علی نے جواب دیا ”میں حافظ قرآن ہوں، شاہ پور کی مسجد میں پیش امام تھا۔ اس ایک اجنبی مرد اور ایک عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر عورتیں باتیں کرتے کرتے بگڑنے سے پہلے بھی کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں۔ یہاں اپنا ٹھکانہ بنانے آیا ہوں اگر خاموش ہو گئیں اور ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھونٹے نماز پڑھنے اور پنڈ کے بچوں کو دینی تعلیم دینے کا موقع دیا جائے تو یہ آپ کے لیے میں پوچھنے لگیں کہ اس اجنبی کے پیچھے چلنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ اگرچہ عورتوں کو اب کام ہو گا اور اس طرح میرا بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔“

ایک عورت سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ساتھ والے مرد سے ہوتی ہے۔ چوہدری دین محمد نے دور حویلی کے سائے میں کھڑی ہوئی سیکنہ کی جانب دیکھا۔ وہ نظر عورت چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی ہو تو صرف اس لیے دیکھنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا کہ اس کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی مگر یہ سمجھ میں آ جاتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہے۔ کہ وہ ہم عورتوں کے مقابلے میں کسی ہے؟ کیا سنگھار ہے؟ کیا پرست ہے؟ جیسی جگہ اس نے ایمان علی سے پوچھا۔

”وہ کون ہے؟“

رنگ روپ میں ہماری جیسی تو نہ ہوگی۔

ذرا دور جا کر ایمان علی نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ چوہدری دین محمد کی حویلی کا ”وہ میری بیوی ہے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو مگر مگر بھٹکنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی۔ میں اس عورت کو ساتھ لے کر دور دور تک نہیں بھٹک سکتا اگر آپ میری فرمائیں تو۔۔۔۔۔“

چوہدری نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا ”یہاں آئے دن مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں کتوں پر مہربانیاں کر سکتا ہوں۔ یہاں کی مسجد میں ایک مولوی صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور پنڈ کے بچوں کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں بوڑھا انیس ساتھ لے کر حویلی کی طرف جانے لگا۔ بستی کے اندر سے گزرنے کے بعد اسے مستقل ٹھکانے کا بندوبست نہ کر سکوں گا۔ تم مسافر ہو، تمہارے ساتھ ایک

بعد آخری سرے پر چوہدری کی حویلی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ چوہدری حویلی کے پیچھے مہاروت ہے اس لیے آج میرے مہمان خانے میں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہے۔ بوڑھا انیس حویلی کے پیچھے لے گیا۔ چوہدری دین محمد قد میں چھوٹا تھا مگر لڑائی باز ہوگی، کل جہاں چاہے چلے جانا۔“

میں بھینس کی طرح نظر آتا تھا۔ اور بھینس کی طرح کالا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی ایمان علی نے مایوس ہو کر دور کھڑی ہوئی سیکنہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس بوجھ کو اٹھائے موٹھیں اسے بڑی حد تک خطرناک بنا رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ کر پر رکھے اپنے توڑ پھوٹاں کہاں گھوم سکتا تھا۔ امام دین نے تو کہا تھا کہ اس پنڈ میں اسے ٹھکانہ مل جائے گا۔ سے کام کروا رہا تھا۔ دو آدمی ایک جگہ لکڑی کے چار کھجوں کو گاڑنے کے بعد اس پر بچوں نے چوہدری کو امام دین کا حوالہ دیا ”چوہدری صاحب ابھی جب ہم یہاں آ رہے تھے تو ڈال رہے تھے اور چھپر کے نیچے جو زمین تھی اسے ہموار کرنے کے بعد ایک آدمی لپٹا لپٹا سے میں آپ کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملاقات ہوئی تھی۔“

امام دین کا نام سننے ہی چوہدری کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے اختیار ایک قدم سے اسے لپ رہا تھا۔ ایمان علی سیکنہ کو حویلی کی دیوار کے سائے میں چھوڑ کر چوہدری کی طرف بڑھنے لگا۔ چلا گیا اور ایمان علی کو ایسی وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ایمان علی نے امام چوہدری سے آتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا قریب آنے پر اس نے پوچھا۔

بن کا نام لے کر اسے چھڑا رہا ہو۔ ایمان علی اسے بتا رہا تھا کہ کس طرح اس کے بھائی سے ”تم کون ہو؟“ یہ پوچھنے کے دوران اس کی گھپے دار مونچھیں یوں ہلنے لگیں جیسے کات ہوئی تھی اور اس نے یقین دلایا تھا کہ اس پنڈ میں وہ اسے روزی روٹی سے لگا دے

گا۔ اس کی باتوں کے دوران چوہدری کسی حد تک سنبھل گیا۔ اس نے حیرانی سے پھر وہ غائب ہو گیا اور وہ دو ہزار روپے بھی غائب ہو گئے۔ اب یہ تم ہی جج جج بتا سکتے ہو کہ وہ دو ہزار روپے کہاں گئے؟ اور میرا بھائی کہاں گیا؟“

ایمان علی نے جواب دیا۔

”وہ یہاں سے پانچ میل دور اسی کپے راستے پر ملا تھا جو شاہ پور سے ملتا ہے۔“ چوہدری نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

”وہ راستہ یہاں آتا ہے مگر امام دین یہاں کیوں نہیں آیا؟ تم کیسی باتیں کہتے ہو؟“

”وہ تقریباً تین گھنٹے پہلے مجھ سے ملا تھا۔ اسے تو ہم سے بہت پہلے ملنا چاہیے تھا۔“

چوہدری نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری باتوں پر کس طرح یقین کر لوں۔ وہ نہ گھنٹے پہلے چلا تھا مگر ابھی تک نہیں پہنچا۔ تین گھنٹے میں تو ایک بھیجنس بھی نہیں پہنچ جاتی پھر وہ اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچا۔“

ایمان علی نے گمزہ کر کہا۔

”میں کیا جانوں؟ امام دین کو تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں آپ سے اپنی جائداد کا حصہ مانگنے آ رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہی اس نے دلایا تھا کہ وہ یہاں میرے بھی رہنے کا بندوبست کر دے گا۔“

چوہدری اس کی باتیں سن رہا تھا اور اسے گہری جھپٹی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار پلٹ کر کام کرنے والے آدمیوں کی جانب دیکھا جو چھت ڈالنے کے نیچے والی زمین کو لینے میں مصروف تھے پھر اس نے پوچھا۔

”کیا میرے بھائی کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا؟“

”جی ہاں۔ اس کے پاس ایک تھرماس اور ایک لٹینی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ان میں دو ہزار روپے ہیں۔“

چوہدری نے غرا کر کہا۔

”ہوں۔ اس کے لٹینی میں دو ہزار روپے تھے اور وہ تم سے دیران راستہ کر رہے ہوں۔ باتوں کے دوران ان کے ہاتھ اوھر سے اوھر مل رہے تھے۔ ناپتے اور

گئے۔

لہراتے ہوئے ہاتھوں سے اس حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی بات رہے ہیں اور چوہدری کے سامنے اپنی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ اگر انسانوں کی دنیا میں کے لیے زبان نہ ہوتی تو اشاروں کی زبان سے بھی غریب اور امیر طبقے کا فرق دھار رہے۔ وہ تینوں ملازم ہاتھ ہلا کر باتیں کر رہے تھے مگر صاحب ان کے آقا نے زمین پڑھیں طرح سمجھ کر کتنی مضحکین نازل ہو گئیں۔ پاؤں چٹا تو پاؤں کی ایک ہی ٹھوک سے دوسرے طبقے کے ہاتھ کٹی ہوئی شاخوں کی طرح گئے۔ پہلے ان کے سر انکار میں دائیں بائیں مل رہے تھے، چوہدری کے پاؤں نے بھائی میاں پہنچایا نہیں ہے تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ آپ نے اسے راستے سے ہٹایا ہے نیچے پٹنے لگے۔

گئے۔

جب وہ لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو گئے تو چوہدری نے ایمان علی کے قریب سے چوہدری نے بڑی پریشانی سے کرسی پر پلوں بولتے ہوئے کہا ”یہ درست ہے کہ وہ میاں میرے ملازموں کا بھی یہی خیال ہے کہ تم شریف آدمی ہو، میرے ساتھ چلیں، میں پینا ہے مگر تم یہ کسی سے کہو گے کہ وہ میاں سے پانچ میل دور تم سے ملا تھا اور تم سے وہاں روٹی کھا کر تھوڑی دیر آرام کرو۔ میرا خیال ہے کہ تم رات بھر کے جاگے تھیں، پہلے اوپر آ رہا تھا تو کیا ایسی صورت میں میرے دشمن مجھ پر شبہ نہیں کریں گے وہاں تم آرام سے سو سکو گے۔“

ایمان علی سینکھنے کو ساتھ لے کر چوہدری کے پیچھے چلا ہوا حویلی کے سامنے دروازے پر آکر رک گیا۔ چوہدری انہیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ تقویٰ پانچویں بعد ان دونوں کو اندر بلایا گیا اور حویلی کا سامنے والا کمرہ انہیں آرام کرنے کے لیے بند نہیں ہو سکیں گے۔ دونوں کی زبان بند رہنے کے لیے کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ گیا۔ کھانے کے لیے روٹیاں بھی آگئیں۔ سینکھنے کو کھانے کے لیے زمان خانے میں لے گئے۔

گیا۔ ایمان علی کھانا کھاتا رہا اور تشویش کا اظہار کرتا رہا کہ امام دین اپنے پنڈے کے قریب ”میرے زبان بند رکھنے سے کیا ہو گا؟“

کر کہاں غائب ہو گیا؟ ایمان علی نے اس سے پوچھا۔ ”میرا بھلا ہو گا۔ میں بہت سی پریشانیوں سے محفوظ رہوں گا۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آس پاس کے پنڈے میں آپ کے رشتے دار ہوں یا امام دین لاہور میں ہے۔ اگر وہ وہاں بھی نہ پایا گیا تو کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ وہ پنڈے کی طرف آیا تھا کوئی دوست ہو جس سے وہ ملنے چلا گیا ہو؟“

ایسا کوئی نہیں ہے جس کے لیے وہ راستہ بدل دے۔ تم کہتے ہو کہ وہ مجھ سے ہاتھیں ہو گا میں وہ چشم دید گواہ اس بات کا چشم دید گواہ حصہ مانگے آ رہا تھا۔ دوسرے یہ باتیں سنیں گے تو یہی شبہ کریں گے کہ میں نے فراموش کیا۔

جاننا دھم کرنے کے لیے اسے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ زر زن اور زمین الٹی ہو گئی۔ ایمان علی نے روٹی کھانے کے بعد ہاتھ پونچھے ہوئے کہا ”مجھے امام دین کے ذکر سے جس کے لیے بیٹے باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کر دیتے ہیں۔ تہناری زبان سے جاننا ہو لیتا ہے۔ یوں بھی میں غیر ضروری باتیں نہیں کرتا۔ میں کسی کے سامنے اس کی بات ہزارے کی بات سن کر میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میرے رشتے خاندان میں گائیکن اس سلسلے میں اگر پوچھ گچھ ہوئی تو میں وہی کہوں گا جو سچ ہے اور سچ یہ میں کہتا دشمن ہیں۔ وہ سب مجھے ایک ناکارہ جرم کا مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

ہے کہ امام دین ادھر آ رہا تھا۔ جب آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے تو آپ کو دنیا والا ان علی سیکند کو وہ ساری باتیں بتانے لگا جو چوہدری اس سے کہہ رہا تھا۔ سیکند نے کہا ڈرنا نہیں چاہیے۔ صرف خدا سے ڈرنا چاہیے۔“

چوہدری نے ایک دم اسے گھور کر دیکھا لیکن جلد ہی سنبھل گیا کہ اس دن زبان پر نہ لائے۔“

دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے سامنے جو مولوی بیٹھا ہوا ہے وہ بے فہم نہ ہے۔ ”بھارے چوہدری کے بہت سے دشمن ہیں۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ لوگوں کو اس سے ضد نہیں کر رہا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آیا تو وہ جج بولے گا۔ مگر اس بل پٹ چلے گا کہ امام دین ادھر آیا تھا تو سارے دشمن خواہ مخواہ اسے الزام دیں گے کہ وہ ایمان اس کے لیے مصیبتیں پیدا کرنے والا ہے لہذا اس کے ایمان کو کمزور بنانا اور کابو کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے راستے سے اپنے بھائی کو ہٹا دیا ہے۔ یہ دنیا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔“

”مولوی صاحب! ہمارے یہاں مسجد میں پہلے ہی ایک مولوی صاحب ہیں۔ اس لیے میں چوہدری کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ اس بھارے کو بھی خواہ مخواہ اس پر دھاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں تمہارے یہاں رہنے کے لیے تمہاری روزی کاغذ دے دوں گا۔“

نکروں گا۔ حویلی کے پیچھے جو چھپر ڈالا جا رہا ہے، میں وہاں بھیس باندھنا چاہتا ہوں۔ سیکند اس کا منہ ٹکٹنے لگی۔ وہ اپنی شریک حیات کو بتا رہا تھا کہ شاہ پور آنے سے پہلے اس جگہ تمہارے لیے ایک مدرسہ کھولوں گا۔ تم وہاں چھوٹے بچوں کو پڑھانا کہ انہیں کہاں ٹھوکرین کھاتا رہا ہے اور لوگ کس طرح اس کی ایمانداری کو حماقت سمجھ کر عمر کے لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سکھایا کرتا۔“

ایمان علی نے خوش ہو کر کہا۔

”امام دین آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ آپ کی رحم دلی کو سمجھتا ہے اسی لیے آپ نے روپے بیسے کی خاطر کس طرح خون کے رشتوں کو کاٹ کر چھینک دیتے ہیں۔ اسے یقین دلایا تھا کہ میرے لیے یہاں روٹی کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”مولوی صاحب! تم پر امام دین کی بات کر رہے ہو حالانکہ تم نے ابھی کہا تھا کہ ہٹا دیا ہے۔ لیکن اس نے ایمان علی کے سامنے اپنے شے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سوچ ذکر کبھی نہیں کرو گے۔“

”میں نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو پھر وہ اس حویلی کی روٹی نہیں کھائے گا۔ یہاں سے بھی آگے بڑھ جائے گا اور پچھلی رزق حلال کا ذکر نہ کرنا تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ اس نے مجھ پر بڑا احسان کینا ہی رات چلتے رہنے کے بعد سیکند میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ آگے بڑھ سکتی۔ آپ جیسے رحم دل انسان کے پاس مجھے پہنچا دیا ہے۔ دراصل میں اس کا احسان مند ہوں۔ آگے بڑھنے سے حاصل کیا ہوتا؟ کیا اسے آگے ایماندار لوگ مل جاتے؟ اور ایمان علی کا ذکر کر رہا ہوں اور یہ نامناسب نہیں ہے۔“

چوہدری دین محمد اسے بڑی بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ناموش رہنا چاہیے اور ایمان علی اپنے ور پر ایمانداری سے سوچنے کے لیے چھوڑ دینا اس مولوی کی زبان کو کیسے لگام دے۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر کھانے کے کپڑے پہنے۔ وہ چوہدری دین محمد کو بے چارہ سمجھ رہا تھا تو بے چارہ ہی سمجھتا رہا۔

اٹھا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولا ”میں تمہارے لیے دو سرا کرہ خالی کر دیا ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد انہیں دوسرے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں دو چارپائیوں پر بستر بچھے تھے آرام سے سو جانا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بیکہ ایمان علی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد چارپائیوں کی طرف توجہ دی تو وہ

دونوں ایک دوسرے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس تصور سے ہی اس کا دل ٹھنڈا نہیں ہے۔ میں بہت مجبور ہوں سیکندہ؟ میں جہاں جاتا ہوں لوگ میرے ایمان کو کمزور دھڑکنے لگا کر سیکندہ اس سے لگی ہوئی ہے۔ اس نے فوراً ہی ایک چارپائی کو کھینچ کر بیانی کی کوشش کرتے ہیں۔ تو وقتی طور پر رانی ہے مگر ساری زندگی کے لیے میری اپنی ہے۔ سے الگ کیا اور اسے کمرے کے آخری سرے پر لے جا کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ کم از کم تو مجھے کمزور نہ بنا۔ مجھ پر رحم کر، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ یہ کہتے ہی وہ پھوٹ "تورات بھری جاگ ہوئی ہے، تجھے نیند آ رہی ہے، جاو دھر منہ پھیر کر سوجا"۔ پھوٹ کر رونے لگا۔ سیکندہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"منہ پھیر کر سونے سے نیند نہیں آئے گی اگر تجھے آسکتی ہے تو سوجا، لیٹا دوپٹے کو اپنے سینے پر درست کرتے ہوئے اس کے سامنے آئی اور فرش پر گھٹنے ٹیک کر کہنے لگی اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

وہ بڑی بے بسی سے اپنی دلہن کا منہ دیکھنے لگا۔ ساگ رات کی صبح ہو چکی تھی۔ "مجھے معاف کر دے میں اتنی بری ہوں کہ اپنے ایمان کو بھی رلا دیا۔ میرے لیے اس چھوٹ جائے قضا پڑھ لی جاتی ہے مگر وہ قضا کا مارا ساگ رات کا چھوٹا ہوا زفر ہے۔ یہ زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی تو ٹھنکنا چاہتا ہے میں مگر انا چاہتی ہوں۔ اب سمجھ میں آ گیا کر سکتا تھا۔ اسے سر جھکائے سوچتے دیکھ کر سیکندہ کو بہت ترس آیا۔ اس دلہن کا کہ تو کرنے والا نہیں ہے۔ ایمان کے سامنے تو مجھے منہ کے بل گرنا چاہیے اور میں گر چکی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے مجازی خدا کو سمجھائے کہ کمرے کی چارپائی پر بیٹھ کر۔ اب میں اس طرح رہوں گی کہ تیرا دل اس طرح کبھی نہ روئے گا۔ مجھے معاف وہ اگر اپنے اصولوں سے ہٹ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ دراصل شدید بھوکہ کر دے۔"

انسان کے اصولوں میں ذرا سی لچک پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس حد تک فائدہ ہو کر نہ پڑے۔ یہ کہہ کر وہ فرش پر سے اٹھی اور اپنے دوپٹے کے آٹھلے سے اس کے آنسو پونچھنے برداشت ہو جائے تو حرام چیزیں بھی کھانے کے لیے حلال ہو جاتی ہیں لہذا اس کا دل بھی۔ اب وہ کوئی ادا نہیں دکھا رہی تھی مگر ایک نوجوان عورت کا آٹھلے پیل بار اس کی ناقابل برداشت بنانے کے لیے وہ چارپائی پر سیدھی لیٹ گئی۔ حیا مانع تھی۔ آٹھلے تک پہنچا تھا اس لیے وہ بھی ایک برکانے والی ادا بن گئی تھی۔ بڑی مشکل تھی پھول نہیں بول سکتی تھی خاموش آواؤں سے بہت کچھ سمجھا سکتی تھی۔ اداؤں سے لپٹ اپنی ہنکریوں میں اپنی خوشبو کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ پھول چھپ جائے گا مگر اس کی اس پنڈلی لڑکی نے کہیں سے سیکھا نہیں تھا، عمر اور حالات کے تقاضے عورتوں کی خوشبو آنکھوں کی خیمہ تک ضرور پہنچے گی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا پھر دوسری آپ سب کچھ کرا لیتے ہیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے بھرپور انداز میں انگڑائی لی کہ طرف کرٹ بدل کر سر کے نیچے تکیہ رکھنے کے بجائے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے طرف ڈھلک گیا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا اور بری طرح ہٹکلاتے ہوئے کہنے لگا۔ آیا۔ تکیے کے سر کے ہی بہت سارے کر نی نوٹ بستر پر بکھر گئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور "یہ۔ یہ۔۔۔ کک۔ کیا بے حیائی ہے، تجھے چادر اوڑھ کر لیٹنا چاہیے۔" بڑی حیرانی سے دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ سیکندہ نے بھی کبھی اتنے سارے روپے نہیں دیکھے تھے اس لیے اس کی سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ ایمان علی نے

"اپنے مروے کے سامنے بے حیائی کیا ہوتی ہے! میں بازار میں تو نہیں بیٹھی ہوں پر میں ہو کر کہا۔"

کس لیے اوڑھوں کیا تجھ سے پروہ واجب ہے؟

ایمان علی کا ایک ہاتھ تکیے پر رکھا ہوا تھا اور وہ بے خیالی میں اسے روہ کر لے کے نیچے رکھ دی ہوگی۔ مجھے فوراً ہی واپس کر دینا چاہیے۔ وہ جلدی جلدی نوٹوں کو سمیٹ بیٹھ رہا تھا۔ پھر وہ روٹے ہوئے لہجے میں بولا "تیری بہت سی باتوں کا میرے پاس کر بستر سے اٹھ گیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ سیکندہ اندر ہی اندر اس کی آواز

سنتی رہی وہ چوہدری کو بلند آواز سے پکار رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری کی آواز سنائی
 ”کیا بات ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟“
 ”جی نہیں“ ایمان علی نے کہا ”آپ یہ روپے اس کمرے میں بھول گئے ہیں۔“
 ”ممن لیجئے۔“

چوہدری نے حیرانی کا اظہار کیا ”یہ میرے روپے تو نہیں ہیں۔“
 ”تو پھر آپ اپنے گھر کی عورتوں سے پوچھیں۔ شاید کسی نے رکھ دیے ہوں۔“
 ”میں اپنے گھر کی عورتوں کو کھانا اور کپڑا دیتا ہوں، نقدی کبھی نہیں دیتا۔ بلا
 کے پاس اتنے روپے نہیں ہو سکتے۔ ذرا اسے گمن کر دکھو یہ کتنے ہیں؟“
 تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، ایمان علی نوٹوں کو گمن رہا تھا۔ گنتے کے بعد
 ”پورے دو ہزار ہیں۔“

”ہوں“ چوہدری نے ایک لمبی سی معنی خیز ”ہوں“ کے بعد کہا ”تم بہت ایمان
 ہو۔ تم نے سمجھ لیا تھا میں یہاں کسی وقت بھی تمہاری تلاش لی سکتا ہوں اور
 کہ یہ دو ہزار روپے تمہاری جیب سے نکال سکتا ہوں۔“

”یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری قمیص کی اندرونی جیب میں صرف ایک
 کلام پاک ہوتا ہے۔ میں نے اتنے روپے آج پہلی بار دیکھے ہیں۔“

”ہاں۔ پہلی بار دیکھے ہیں اسی لیے حیران ایمان ڈگمگا گیا۔ اب سیدھی طرح
 میرے معصوم بھائی کی لاش کہاں پھینک کر آیا ہے ورنہ ابھی جوتا ہاتھ میں لے
 سے ایمان کی ساری گرد جھاڑ کر رکھ دوں گا۔“ ایمان علی ایک دم ٹوٹ کر فریاد
 بیٹھ گیا۔ اس کے لیے اس سے زیادہ شرم اور توہین کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

ایمان علی کا سر جکرا رہا تھا۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا سر اٹھا کر رو دیکھ پلا
 اپنے سامنے کھڑے ہوئے بیٹھیں نما چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چوہدری ایک
 جوتا نظر آ رہا تھا جو اس کے سر پر بیٹھنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس گھڑی اسے دائیں
 آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر سمت جوتے ہی جوتے نظر آ رہے تھے اور یہ گیان حاصل
 اس کے چاروں طرف متحرک انسان اتنا زیادہ نہیں چلتے ہیں جتنے ان کے درمیان
 چلتے ہیں۔

یہ دنیا کیا ہے؟ جوتوں کا بہت بڑا گھر ہے۔ جب وہ مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا
 تھا تو استادوں کے جوتے اٹھا تا تھا اور گھر میں سوتیلے باپ کے جوتے کھاتا تھا۔ پھر کچھ ہوش
 سنبھالا تو تقسیم القرآن کے ادارے میں قرآن شریف کو پڑھنے کا فن سیکھتا رہا کہ حروف کو
 ان کے صحیح مخارج سے کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ علمائے دین کے جوتے
 سیدھے کرتا رہا۔ وہاں سے آگے چلا تو پتہ چلا کہ مسجد ہو یا دینی ادارے، ہر جگہ بڑے بڑے
 جوتے والوں کی اجارہ دار ہوتی ہے۔ وہ پیش امام جیسے معزز شخص کو ملازم سمجھ کر اپنے
 جوتوں پر بٹھلتے ہیں اور اپنی جوتوں کے صدقے تین وقت کی روٹیاں کھلاتے ہیں۔ بہت
 زیادہ خوش ہوتے تو اپنی جوتی کو دلن کی طرح چپکا کر کسی کے گلے میں طوق کی طرح پہنا
 دیتے ہیں۔ اس کے قدم جس زمین پر گئے، اس نے یہی دیکھا کہ انسان نئے جوتے کی طرح
 کانٹا ہے اور پرانے جوتے کی طرح ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں
 جوتے سکہ رائج الوقت کی طرح چلتے ہیں۔ کسی کو مار کر کچھ دیتے ہیں اور کسی کو مار کر سب
 کچھ چھین لیتے ہیں اور یہ سب کچھ محض اس لیے ہے کہ انسان ایمان کے سائے سے ہٹ
 کر جوتوں کے سائے میں ہی خوشی سے زندگی گزارتے ہیں۔

دروازے پر کھڑی سیکنہ نے اپنے ایمان پر الزام آتے دیکھ کر کہا ”چوہدری جی! ذرا
 انصاف سے کام لو، ایک شریف آدمی کو چور اور قاتل نہ بناؤ۔ میرا خاندان ایسا ایمان والا ہے
 اس نے کبھی کسی کی جیب سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکالی ہے، کبھی کسی سے دشمنی
 نہیں کی ہے پھر کسی کو قتل کیسے کر سکتا ہے؟ تم سوچے سمجھے بغیر اسے جوتے مارنے کی دھمکی
 دے رہے ہو اور ایک شریف آدمی کی توہین کر رہے ہو۔“ چوہدری نے دروازے کی طرف
 دیکھا جس کے پیچھے سیکنہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر ایک عورت کی سر ملی
 آواز سن کر وہ دروازہ پر بڑا گوارا مسکرا کر کہنے لگا۔

”مگر کوئی انسان کی زبان نہ سمجھے تو جوتے سمجھا دیتے ہیں۔ میں نے تیرے خاندان کو
 زبان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھ پر کس طرح چھوٹے بھائی کے قتل کا الزام آ سکتا
 ہے۔ اگر یہ اپنی زبان بند رکھے تو میں اس الزام سے بچ سکتا ہوں مگر یہ بات اس کی سمجھ میں
 نہیں آئی۔ یہ اپنی ایمانداری جھاڑتا رہا کہ پوچھ کچھ ہوئی تو وہ جج بولے گا۔ اب میں پوچھتا
 ہوں کہ اس سے دو ہزار روپے کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تو اس کی سچائی کیا کام آئے

میں تجھے چوری اور قتل کے بہت بڑے الزام سے بچالوں گا اور یہ روپے بھی واپس لے لوں گا۔ جا چلے اپنی گھروالی سے باتیں کر لے۔“ ایمان علی سر جھکا کر کمرے میں گیا۔ سیکنہ نے دروازہ بند کرتے وقت دیکھا چوہدری دروازے کے باہر کرسی رکھ کر بیٹھ رہا تھا۔ یعنی وہ ایمان کی زبان سے اپنے حق میں فیصلہ سنے بغیر وہاں سے نکلنے والا نہ تھا۔ سیکنہ دروازے کو اندر سے بند کر کے ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ وہ ہاتھوں میں دو ہزار کی گڈی پکڑے بستر کے سرے پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے ہاتھوں میں چوہدری کا دیا ہوا جو تپکڑے ہو۔ سیکنہ نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”تجھے کب عقل آئے گی؟ تو ایماندار بنتا ہے، یہ اچھی بات ہے مگر تیرا ایمان صرف تیری ذات تک ہونا چاہیے۔ تو دوسروں کے معاملے میں ایمان اور سچائی کو لے کر آئے گا تو دوسرے اپنا نقصان کبھی برداشت نہیں کریں گے۔“

وہ روتے ہوئے کنبے میں بیٹھا ”یہ کتنی شرم کی بات ہے سیکنہ کہ ایمان اور سچائی سے لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔“

”ہاں اندیشہ ہوتا ہے۔ تیرے سامنے کی بات ہے کہ تو چوہدری کے معاملے میں سچ بولنا چاہتا ہے۔ تیری سچائی اسے تمھارے پکڑی تک لے جائے گی جبکہ آج صبح اس بے چارے نے اپنے بھائی کی شکل تک نہیں دیکھی ہے مگر تو یہ کہے گا کہ تو نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے تو پھر اس بے چارے کے تمام دشمن اسے اپنے ہی بھائی کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”انسان چاہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”تو بھی تو سچا ہے پھر یہ دو ہزار روپے تجھے کیسے نقصان پہنچانے والے ہیں۔“

”یہ چوہدری نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔“

”فریب نہیں کیا ہے بلکہ تجھے ایک اچھا سبق سکھایا ہے۔ اس بات سے تجھے سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی ایمان والوں پر بھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی زبان کی سچائی کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ بے چارہ چوہدری بھی بے گناہ ہے۔ اگر تو نے یہ کہہ دیا کہ امام دین

کو یہاں آتے دیکھا تھا تو ایسی صورت میں تو چشم دید گواہ بن جائے گا اور چوہدری پر جھوٹا

الزام آجائے گا۔“

گی؟ اس کے بیان کی سچائی کے مطابق سب یہی سمجھیں گے کہ امام دین اسے راستہ ملا تھا اور اسے دو ہزار روپے دے کر اپنی جان بچا کر یہاں آنا چاہتا تھا مگر وہ یہاں تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے دو ہزار روپے اس وقت اس کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ پولیس والوں کے سامنے ہزار قسمیں کھا کر یقین دلانے کے لیے روپے اس نے امام دین سے نہیں چھینے کے لیے اسے قتل نہیں کیا ہے تو تو ہی بتاؤ کون تیرے خاندان کی سچائی پر یقین کرے گا دیکھ میں سمجھتا ہوں کہ تیرا خاوند مجرم نہیں ہے واقعی ایماندار ہے۔ اس طرح میں بھی نہیں ہوں لیکن میری اور تمھاری سچائی کو اس دنیا میں کون سمجھتا ہے؟ انہیں سمجھانے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے یا آنکھوں دیکھی باتوں سے انکار کرنا پڑتا ہے انہوں نے کچھ نہیں دیکھا انہیں راستے میں کوئی نہیں ملا تھا۔ بس اتنا سا جھوٹ کہ وہ سے یہ دنیا والے ہماری تمھاری سچائی پر یقین کر لیں گے۔“

سیکنہ نے پوچھا ”تم کہتے ہو میرا خاوند مجرم نہیں ہے تو پھر یہ روپے کس کے ہیں؟“

چوہدری نے جواب دیا۔

”تیرے خاوند کو ایک اچھا سبق سکھانے کے لیے میں نے یہ روپے نکلے کے بچے دیئے تھے۔ جس کے پاؤں میں جو تانا تھا ہے وہی تکلیف کو سمجھتا ہے۔ اب تیرے والدے شوہر کو جو تانا کاٹ رہا ہے تو اسے بلا کر پوچھ کہ اب کیسی تکلیف ہو رہی ہے میرے دل میں بے ایمانی ہوتی تو میں کبھی یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ روپے میں نے نیچے کے رکھے تھے۔ میں ابھی تمھارے وار کو بلاتا اور اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ ایمان علی چلاتا رہتا کوئی اس کی سچائی کو تسلیم نہ کرتا۔ اس کے خلاف بہت سے ثبوت مایہ ہو جاتے کیونکہ خود اس کا بیان اسے مجرم ثابت کرتا ہے۔ تو ذرا سمجھدار معلوم ہوتی ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لے گی۔ اس لیے میں تجھے موقع دیتا ہوں کہ اسے سمجھا نہیں سمجھے گا تو پھر میں قانونی کارروائی کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ایمان علی کو کمرے کے اندر جانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے اپنی سے اٹھتے ہوئے وہ دو ہزار روپے چوہدری کو واپس کرنے چاہے مگر چوہدری نے انکار کر دیا۔

”ابھی یہ روپے تیرے ہی پاس رہیں گے۔ جب ہم ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے۔“

و نایاد آندھیوں کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔ آندھیاں تھک جاتی ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”پھر میں کیا کروں؟“

”اپنی زبان بند کر لے۔ کسی سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ امام دین سے تو ملاقات ہوئی تھی؟“

”مگر کوئی مجھ سے پوچھے گا تو؟“

”تو یہ کہہ دیتا کہ تو کسی امام دین کو نہیں جانتا۔“

”تو مجھے جھوٹ بولنا سکھا رہی ہے۔“

وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی پھر اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بولی۔
 ”ایسا ایماندار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا نہ کبھی سنا۔ خدا کی قسم تیرے ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت کمزور نہیں بنا سکتی۔ تیرے ہی جیسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو مجھ جیسی عورتیں تیرے جیسے شوہروں کو سجدہ کرتیں۔“

اپنے اصولوں کا جہاں تک تعلق تھا وہ سچ سچ چٹان تھا مگر انسان بھی تھا۔ اس لیے جب سیکڑے نے اس کے گھٹنوں پر سر رکھا تو وہ پھر اس کی قربت سے گھبرا گیا۔ ایک انسان اگرچہ فرشتہ سیرت ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے دماغ میں دوسرے تقاضے نہیں چھپتے ہوں گے۔ ہمارے سوچنے کا انداز عجیب ہے ہم کسی ایماندار مولوی کو دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ صرف مولوی ہو اس کے سینے میں جو دل ہے وہ کسی کی محبت کے لیے دھڑکتا نہ ہو۔ نہ جلتے کیوں ہم اسے انسان کے بجائے فرشتہ سمجھنا چاہتے ہیں یا اگر فرشتہ نہ سمجھیں گے تو اسے ایسا احمق سمجھیں گے جو اپنی ہی عورت سے دور بھاگتا ہو۔ ایمان والوں کو نہ اس کوٹ چھین ہے نہ اس کو ٹہ۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اسی لیے سیکڑے سے دور ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اگر سا جھوٹ نہیں بولے گا تو ان دو ہزار روپوں کے ساتھ تمھارے پہنچ جائے گا۔“
 تجھے جیل ہو جائے گی، تجھ پر مقدمہ چلے گا، تو مجھے کس کے حوالے کر کے جائے گا؟
 اس دنیا میں ایسا تو نہیں ہے کہ سچ بولتا ہو اگر تار جائے گا اور سزا میں پاتا جائے گا۔
 مجھے بھی تیری سچائی کی سزا مل کرے گی۔ میں تیرے ایمان کی خاطر بڑی سے بڑی سزا برداشت کر سکتی ہوں مگر اتنا بتا دے کہ تیرے حالات میں جانے کے بعد میرے کون کون رکھے گا۔ تو مجھے اپنی ملکیت بنانے کے لیے ایک چادر میں چھپاتا ہے کہ کوئی مجھے نہ سکے۔ تیرے بعد میں یہ پردہ کیسے رکھوں گی؟ کیا مجھے دو وقت کی روٹیوں کے لیے اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑے گا؟ کیا میرا ہاتھ چادر سے باہر آکر نہنگ نہیں ہو گا؟
 بتا دے کہ میں تیرے بعد کیا کروں گی؟“

میں ابھی جا کر چوہدری کو اپنا فیصلہ سناتا ہوں۔ وہ سیکڑے سے کترا کر نکل گیا پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے چوہدری سے کہنے لگا۔

ایمان علی سر جھکائے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا:
 اب میں ایسا نہیں ہوں۔ پہلے صرف ایمان کے لیے سوچتا تھا اب تیرے لیے بھی۔
 میرا اولین فرض ہے۔ اب مجھے ایسا قدم اٹھانا چاہیے کہ تو بھی سلامت رہے اور
 ایمان کو بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کا یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اس پنڈ میں نہیں رہیں۔
 ابھی یہاں سے چلے جائیں گے پھر کوئی مجھ سے امام دین کے متعلق سوال نہیں کرے گا۔
 نہ ہی خواہ مخواہ مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔“

”چوہدری! یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بعض اوقات انسان کتنا ہی سچا ہو دنیا والے اس کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے۔ صرف حالات اور واقعات کے پیش نظر اسے مجرم سمجھ لیتے ہیں۔ تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لہذا اگر میں یہاں نہ رہوں اور یہاں سے دور چلا جاؤں گا تو پھر مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا۔“

اس طرح میرا ایمان بھی سلامت رہے گا اور تمہاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اب تم یہ دو ہزار روپے رکھو، میں اپنی گھر والی کو لے کر ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔“

یہ بہت اچھی تدبیر تھی۔ آدمی ایمان دار بن کر رہتا چاہے تو سوچنے سمجھنے سے اسے سلامتی کے لیے ہزاروں تدبیریں کھل سکتی ہیں۔ سیکڑے اسے بڑی محبت سے اور عقیدت سے دیکھنے لگی۔ وہ اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا آدمی چٹان

”تم کہاں جاؤ گے؟“

چوہدری نے بے زار ہو کر کہا ”تمہاری باتیں میرے لیے قابل قبول نہیں ہیں اور میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہاری گھروالی تم سے زیادہ سمجھ دار ہے تم پھر اس کے پاس جاؤ وہ تمہیں سمجھائے گی۔ اگر اس بار نہیں سمجھو گے تو میں تمہیں تھانیدار کو بلواؤں گا۔“

وہ سر جھکائے اسی طرح کرنی نوٹوں کے جوتے پکڑے پھر سیکینہ کے پاس آ گیا۔ اس بار سیکینہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اپنے جس آدمی کو وہ چٹان کہہ رہی تھی اس چٹان کو باہر کھڑا ہوا چوہدری بڑے عجیب انداز سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ایمان کو کس طرح بچائے وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بہت دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ مرد کے سامنے عورت بیٹھ کھڑی ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کم عقل کہلاتی ہے مگر ڈوبتے وقت تنکے کی طرح سسارا بھی بن جاتی ہے۔ ایمان علی سوچ رہا تھا کہ اس تنکے جیسی عورت کا سسارا ہی مل جائے تو وہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ جائے بہت دیر بعد سیکینہ نے اس سے کہا۔ اب میں تیرے ایمان کو انھیں پہنچانے والی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ اگر ایک طرف ایمان ہو اور دوسری طرف میں ہوں اور دونوں میں سے کسی کو انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو تو ایمان کی طرف جائے گا۔ کیا تو ایمان کی سلامتی کے لیے مجھے چھوڑ سکتا ہے۔“

ایمان علی نے گھبرا کر پوچھا۔
”تو کتنا کیا چاہتی ہے؟“ ایسی باتیں نہ کر میں پہلے ہی پریشان ہوں۔“
”تجیری پریشانیوں دور کرنے کے لیے ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ چوہدری تجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا ہے۔ اگر تو کوئی ضمانت دے کر یہاں سے چلا جائے گا تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔“
”میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے خدا کی قسم کھائی ہے۔ خدا کی قسم سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔“

”میرے ایمان! تیرے لیے خدا سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے لیکن دنیا داروں کے لیے یہی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ تو ضمانت کے طور پر مجھے چھوڑ کر چلا جا۔ چوہدری ایک دم سے مطمئن ہو جائے گا۔“

”یہ دنیا بہت بڑی ہے میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔“
”مگر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں جانے دوں گا۔ تم اس بات کے چشمہ زور ہو کہ تم نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے۔ اگر تم دوسرے پنڈ میں جا کر کوئے تو یہاں میرے دشمنوں تک پہنچ جائے گی۔“

”میں یہاں سے دور جا کر کسی سے نہیں کہوں گا۔“
”جب کسی سے نہیں کہو گے تو یہیں رہو۔ تم کیسے احمق ہو انکا نہیں سمجھتے کہ زبان کو وہاں بند رکھو گے اسی زبان کو یہاں بھی بند رکھ سکتے ہو۔“
”یہاں تو پوچھنے والے پیدا ہو سکتے ہیں۔“

”قانون ہر جگہ پوچھنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ تم جوان ہو تم نے مجھ سے زیادہ دیکھی ہے۔ میں تمہیں صاف صاف اپنا فیصلہ سناؤں کہ جب تک امام دین کا پتا نہیں گا یہ دو ہزار تمہارے پاس رہیں گے اور تم میری نظروں کے سامنے رہو گے۔ اس طرح اپنے زبان بند رکھنی چاہیے اور تم میری نگاہوں کے سامنے رہو گے تو مجھے اطمینان رہے گا کہ تم ایک سچ بول کر مجھ سے دشمنی نہیں کر رہے ہو۔“

ایمان علی پریشان ہو کر چوہدری کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے ہوئے بھیجیں غما انسان کو کیا سمجھ۔ کیونکہ وہ بیک وقت بے ایمان بھی نہ ایماندار بھی۔ ایماندار اس لیے نظر آ رہا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا تھا کے حصے کی جائداد ہضم نہیں کرنا چاہتا تھا اپنے گمشدہ بھائی کو تلاش کرنے تک ان نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کے لیے وہ اس سے بے ایمانی کر رہا ہزار کی چوری اور اپنے بھائی کے قتل کے الزام لگانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ واقعی حالات میں انسان بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو جب تک اپنی جوتیوں میں نہ اس وقت تک قانون کے جوتوں سے نہیں بچ سکتا۔

ایمان علی نے بڑی بے بسی سے کہا ”چوہدری تم میرے لیے مصیبتیں پیدا کر رہے ہو میں ایک سیدھا سادا راستہ تیار ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ یہاں سے باہر کے بعد کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”کیا جکتی ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تجھے اس لیے نہیں اپنایا تھا کہ کچھ مکر م کر کے ثمرات پلائے ہیں۔“
تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں۔“



”کسی ایک کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اگر چھوڑنا نہیں چاہتا ہے تو اپنے ایمان ٹٹا لپک پیدا کر۔ اتنی دیر کے لیے زبان بند کر لے جب تک کہ امام دین واپس نہ آجائے۔“
دروازے کے باہر سے چوہدری کی آواز سنائی دی ”مولوی صاحب! زیادہ بائیں سر کے چھت ڈالنی تھی اور پھت کے نیچے والی زمین لپ پوت کر ہموار کر دی گئی تھی برصاؤ! اپنی گھروالی کی بات کو سمجھو میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم خود کسی کے سامنے امام دین کا ذکر نہ کرو۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ تمہارے پاس اگر کوئی امام دین کے لیے نہ پوچھتے۔“

ایمان علی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
”یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ میں غیر ضروری باتیں نہیں کرتا۔ کسی کے سامنے امام دین کا ذکر نہیں کروں گا۔ ہاں اگر کوئی پوچھے گا تو جی بولنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ کوشش کرو کہ کوئی مجھ سے نہ پوچھے۔“

چوہدری نے کہا ”چلو منظور ہے تم اسی طرح مان جاؤ۔ اگر اس سلسلے میں تفتیش تو میں تمہاری اسے سخت لوں گا۔ اسے تمہارے قریب جھٹکنے نہیں دوں گا۔“
ان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا۔ چوہدری مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اب کی پریشانی نہیں تھی۔ ایمان علی جھوٹ بولنے سے بچ گیا تھا۔ چوہدری اس موقع پر بچانے والا تھا جہاں بچ بولنے کی نوبت آتی۔ اس کے باوجود ایمان علی کے دل میں بے بسی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ایمان کو کس طرح الجھا دیا گیا ہے اور سب سے بڑا جو اس کے دل میں چھب رہا تھا وہ دو ہزار روپے کی صورت میں اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا نہ ان روپوں کو واپس کر سکتا تھا نہ انہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ وہ چوہدری کی لمانت چوہدری کی ضمانت تھی۔

وہ نوٹوں کو مٹھی میں بھینچ کر غصے سے تھلا رہا تھا۔ اسی وقت چوہدری کا ملازم دو دوہ کا ٹھنڈا شربت لے کر وہاں آیا اور ان کے پاس میز پر رکھ کر چلا گیا۔ سیکھنے لگا گلاس اٹھا کر اس کی طرف برصاوتے ہوئے کہا۔
”خواہ مخواہ گری دکھانے سے کیا فائدہ! لے لی لے۔ اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ اگر

ایمان علی اسی پنڈ میں رہنے پر مجبور ہو گیا۔ چوہدری نے اس کے ایمان کی آسودگی کے لیے حویلی کے پیچھے اسی جگہ ایک مدرسہ کھول دیا جہاں پچھلے دنوں لکڑی کے چار کھمبے نصب کر کے چھت ڈالنی تھی اور پھت کے نیچے والی زمین لپ پوت کر ہموار کر دی گئی تھی تاکہ وہاں بھینسوں کو باندھا جائے مگر چوہدری نے ایمان علی کو وہاں باندھ دیا تھا۔ وہاں ایک کمرہ اور بنا دیا گیا تھا تاکہ وہ سیکھنے کے ساتھ آرام سے رہ سکے۔ روز صبح پنڈ کے نیچے وہاں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ایمان علی انہیں دین و ایمان کی اچھی اچھی باتیں سکھاتا تھا اور کلام پاک کے ابتدائی سارے پڑھاتا تھا۔ اس طرح اس کا دھیان بٹ گیا تھا کہ اب وہ ایک جگہ بیٹھ کر نہایت اطمینان و سکون سے ایمان کا درس دے رہا ہے اور حلال کی روایات کھاتا ہے۔ لیکن جب وہ نماز پڑھنے کے لیے وہاں کی مسجد میں جاتا تو اس کے دل کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ وہاں جو پیش امام تھے ان کا حافظہ کسی قدر کمزور تھا۔ نماز پڑھانے کے دوران وہ اکثر ایک آدھ آیت بھول جاتے تھے یا غلط پڑھ جاتے تھے۔ ایمان علی ان کے پیچھے نماز پڑھتے وقت انہیں ہمیشہ لقمے دیتا تھا۔ یہ بات پیش امام صاحب کو ناگوار گزرتی تھی۔ نماز کے بعد اکثر وہ ایمان علی سے جھگڑا کرتے تھے اور پنڈ والوں کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ صحیح پڑھتے ہیں۔ ایمان علی خواہ مخواہ اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے نماز کے دوران انہیں کوتاہی دیتا رہتا ہے۔ پہلے تو ایمان علی نے انہیں سمجھایا۔

”دیکھیے مولوی صاحب! ہمارے ملک میں مسلمان بہت ہیں مگر صحیح معنوں میں ایمان والے مٹھی بھر میں۔ ایمان کو صحیح طور سے پیش کرنا میرا اور آپ کا فرض ہے۔ اگر ہم اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر غلط پڑھیں گے تو یہ غلطیاں عام ہو جائیں گی اسی لیے میں آپ کا محاسبہ کر رہا ہوں۔ اگر مجھ سے اور مجھ سے بڑے عالم سے بھی آپ کے سامنے کوئی غلطی ہو تو آپ بھی محاسبہ کر سکتے ہیں۔ میں نے نماز کے دوران لقمہ دے کر آپ کی توہین نہیں کی ہے بلکہ بروقت غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایسے میں آپ کو اپنی توہین محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کی کمزوریاں ایسی ہیں کہ آپ ذرا سی کوشش کے بعد انہیں دور کر سکتے ہیں۔ آپ کچھ روز کلام پاک کھول کر بغور پڑھیں اور پھر سے حفظ کریں۔ پھر مجھ جیسا کوئی بھی

فحش آپ کی نماز کے دوران رکاوٹ نہیں بنے گا۔
ایمان علی نے پیش امام کو کئی بار اچھی طرح سمجھایا۔ لیکن بعض نیم لاپرواہی رہی تھی۔ لیکن کو وہ بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے حویلی کے پیچھے دو کمروں کا جو کچا سامکان ہیں جو اپنے آپ کو مکمل مولوی سمجھتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کی برتری برداشت نہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا اس کے ایک کمرے میں سیکندر رات گزارتی تھی دوسرے کمرے کرتے۔ جب وہ سیدھی طرح راہ راست پر نہیں آیا تو ایمان علی نے یہ مسئلہ چوہدری جلال دہ بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا وہیں بستر پر رات بھر کر ٹیٹیں بدلتا رہتا تھا۔ اگرچہ محمد تک پہنچایا۔ چوہدری حافظ قرآن نہیں تھا وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں سیکینڈز اب اس کے سامنے بکائے والے انداز میں نہیں آتی تھی لیکن عورت کی جالی میں سے کون درست کہہ رہا ہے۔ آخر پچائیت میں یہ فیصلہ ہوا کہ شہر سے کسی بڑے نجی لوازمین نہ ہوں تب بھی اس کی موجودگی ہزار جلوں سے بکاتی ہے۔ پھولوں سے بلایا جائے۔ اس عالم کے سامنے دونوں مولوی کلامیہ کی تلاوت کریں گے معتقد مذہبی ہوئی شاخ خود بخود نہیں چلکتی ہوا کی پھیز خانی اسے لپکاتی ہے۔ سیکینڈز بھی جان بوجھ کر جانے کی کہ تلاوت کے سلسلے میں کس مولوی کا حافظ کمزور ہے۔

چوہدری نے اپنے ایک خاص آدمی کو لاہور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ وہاں باغیں۔ اس عمر کی گدگد کی محسوس نہ ہو تب بھی اپنا تماشا دکھا دیتی ہے۔ ہزار ضبط کے باوجود کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملے اور اس سے کہے کہ وہ کسی بڑے عالم سے ملائیت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایمان علی بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کی سمجھ کرے اور اس عالم کو پنڈ میں آنے کی دعوت دے۔ چوہدری نے امام دین کے نام باغیں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی آنکھیں بند کرے اور قدرت کے ایک حسین شاہکار کو اسے بھی پنڈ آنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ دونوں بھائی پوری دیا تندی سے جا کر لکھنے سے انکار کر دے۔

دوسرے دن ایک بہت بڑے عالم صاحب تشریف لائے تو ایمان علی نے ان کے کرلیں۔

پھر اس پنڈ میں بڑے عالم کا انتظار ہونے لگا۔ مسجد کے پیش امام کے دل میں کولہائے زانوے ادب تہہ کیا۔ جس مسئلے کے پیش نظر انہیں بلایا گیا تھا وہ تو پہلے ہی حل پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ اپنی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مگر اکثر لوگوں کی بڑبڑ کا تھا۔ ایمان علی نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ایک نیا مسئلہ پیش کیا۔ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب پول کا ”جناب! ایک مسئلہ درپیش ہے۔ زید نے ایک مسلمان دوشیزہ سے شادی کی۔ شادی تھا اس لیے وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اور پریشانیوں کے باعث نماز کے دوران رونا رات پچا کہ زید کی منکوحہ پہلے سے حاملہ ہے۔ کیا ایسی صورت میں زید اپنی اس غلطیاں کرنے لگا۔ ایمان علی اسے معاف نہیں کرتا تھا۔ بیش اپنا فرض ادا کرنے لکھو کے ساتھ رات بستر کر سکتا ہے؟“

نماز پڑھتے وقت اسے لقمہ دیا کرتا تھا۔ دونوں کے بعد چوہدری کے آدمی نے شہر سے آکر بتایا کہ شہر میں امام دین سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن ایک عالم صاحب دوسرے سے مل چکی جادہ ہیں۔ شریف گھرانے کی ہونییاں شادی سے پہلے ہی گمراہ ہو جاتی ہیں۔ بعض پنڈ میں جینے والے ہیں۔ جس روز چوہدری کا آدمی یہ خبر لے کر آیا اسی رات پیش امام ہوتی ہیں جنہیں حالات مجبور کر دیتے ہیں بعض ایسی ہوتی ہیں جنہیں عیاش مرد بڑا تباہ دیتے ہیں۔ اگر زید کی منکوحہ پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ مظلوم ہے تو ایسی صورت میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ایک عالم دین کے اس پنڈ میں پہنچنے سے پہلے ہی ایمان علی کی چٹائی ثابت ہوئی۔ زید سے اس کا نکاح جائز ہے لیکن پرہیز لازمی ہے۔“
والے اور زیادہ اس کی عزت کرنے لگے۔ اسے مسجد کا پیش امام بنادیا گیا۔ ایمان علی نے عزت ملی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پچھلی تلخیوں کو بھلا دیا۔ وہ گزری ہوئی ہر

”توزید کو ہر ممکن طریقے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر بیوی کی موجودگی اور غلطی و عین بیان کرے۔ اگر اس کے بیان سے بے گناہ بکر قانون کی زو میں آتا ہے تو زید اور بکر اسے اس کے میکے والوں کے پاس یا اپنے عزیزوں کے پاس چھوڑ دے اور اسے دونوں پر واجب ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔“

اخراجات پورے کرتا رہے۔“

”اگر زید کے اپنے رشتے دار نہ ہوں اور اس کی مشکوہ بھی اپنے میکے والوں سے ہے کہ زید اپنی زبان کھولے۔“

ہو۔ پھر یہ کہ زید کی اتنی آمدنی نہ ہو کہ وہ اپنی مشکوہ کو کسی دوسری جگہ رکھ کر لے۔ ”قانون کا احترام ہر فرد پر لازم ہے۔ اگر پولیس والے اس واقعے سے لاعلم ہیں تو زید اخراجات برداشت کرے تو ایسی صورت میں کیا ہو سکتا ہے؟“ عالم دین تھوڑا اور بکروں کا فرض ہے کہ پولیس والوں کو معلومات فراہم کریں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے اپنی خوب صورت واڑھی کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچتے رہے پھر ان کو ایک بات کو چپانے سے اس کے پیچھے دوسرے دس گناہ چھپنے کے لیے سرابھارتے جواب دیا ”کبھی کبھی ایسے پیچیدہ مسائل بھی ایمان کے راستے میں آجاتے ہیں۔“

صورت میں دوسرے آئمہ کرام کے فتاویٰ سے سارا لیا جاسکتا ہے۔ زید نے اب ان کی باتیں سن کر اچانک ہی ایمان علی کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ گناہ میرے ساتھ آئیں مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔“

ایمان علی بازیاں چھٹنے لگیں اور سیکھ آتش رنگ لباس میں دلہن بن کر سامنے آئے۔ ”ایمان علی کو اپنی نادانی کا پتا چلا۔ اگر وہ پہلے ہی کسی بڑے عالم سے رجوع کرنا چاہتا تو برا خطرناک ہے۔ آخر اس مسئلے کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“

دیر پا سامانہ ٹھٹکا۔ اب اس کا جی بار چاہتا تھا کہ وہاں سے اٹھ کر تیر کی طرح کیڑے بچھ جائے۔ لیکن مسجد کے صحن میں دینی نشست جاری تھی۔ چوہدری دین محمد کے دوسرے بڑے بوڑھے بھی عالم دین کے سامنے باادب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ وہ مسجد کا پیش امام ہو کر دینی مجلس کو چھوڑ اس وقت سے میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ میں بظاہر خاموش رہتا ہوں مگر اندر سے سچائی کا جاسکتا تھا لہذا اسے دل پر برا جبر کرنا پڑا۔ وہ مجلس کے اختتام تک وہاں رکنے پر مجبوز جب مجھے اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ میں کروں کیا؟ چوہدری صاحب خدا کے لیے تم لیے اس نے دوسرے مسائل پر بحث شروع کر دی۔

”جناب زید اپنے دوست بکر کے بارے میں ایسی بات جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ کرادو۔ میں نے بھی جو کچھ دیکھا ہے اسے صحیح طور پر بیان کروں گا اور تمہارا رے سے تو قانون کی گرفت میں آجائے بلکہ پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے گا جبکہ بکر تمہاری بے گناہی کی قسمیں بھی کھاؤں گا۔ دیکھو خدا پر بھروسہ کرو تم بے گناہ ہو قاتل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اگر قانون کے محافظ زید سے پوچھ گچھ کرنا بے عزت تمہاری عزت رکھے گا اور تمہیں ہر مصیبت سے بچائے گا۔“

اپنے دوست کو بچانے کے لیے صحیح بات یا صحیح واقعے سے چشم پوشی کر سکتا ہے؟“ وہ کہتا رہا اور چوہدری سر جھکائے اتنی عقیدت سے سنتا رہا جیسے اس کی سچائی سے متاثر ہوتا جا رہا ہو۔ ”کون گدھا متاثر ہوتا ہے؟ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنے کے لیے“

”جب واقعہ صحیح ہے تو زید کا فرض ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کے سامنے کون ایمان کی باتوں کو گلے لگاتا ہے؟ وہ تو سر جھکائے اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔“

میرے ساتھ تھانے چلو گے اور ہم دونوں پوری سچائی سے قانون کا ساتھ دیں گے۔
تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس مجلس میں امام دین کا ذکر نہ اٹھاؤ“ اس کے بارے دھماکے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اب وہ ایسی عورت کے پاس نہیں جا رہا تھا جو پرانی کردی کوئی مسئلہ نہ چھیڑے۔ مجلس برخاست ہوئے ہی ہم دونوں یہاں سے اٹھ کر کھانے کا، کچھ تھکی، اب وہ سرے پاؤں تک اس کی اپنی تھی۔ اس خیال سے ہی اس کے قدم لڑکھڑکھ رہے تھے۔ جو اس کی بالکل اپنی تھی اس کے سامنے جاتے ہوئے دل گھبرا رہا تھا۔

ایمان علی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، جب ہم اس مسئلہ کو جب وہ دوسرے کمرے میں پہنچا تو سیکینہ چوہلے کے پاس بیٹھی ایلٹی ہوئی باغی کو دیکھ میں جا کر حل کر رہے ہیں تو یہاں یہ باتیں چھیڑنا فضول ہیں۔“ چوہدری نے خوش ہو کر ری تھی۔ جلتی ہوئی لکڑی کے سامنے اس کا چہرہ جھٹک رہا تھا۔ وہ ایمان علی کو دیکھتے ہی اٹھ کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا ”مولوی تم بہت اچھے ہو۔ اب تم عالم صاحب کے ہاں کھڑی ہوئی اور چارپائی کی طرف اپنا دوپٹہ اٹھانے کے لیے بڑھنے لگی کیونکہ ایمان علی نے میں تم لوگوں کے لیے شربت وغیرہ بھجوا تا ہوں۔“

ایمان علی مسجد کے صحن میں واپس آگیا اور چوہدری حویلی کی طرف چلا گیا۔ لاپا چارپائی کے درمیان ایمان علی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کو قہنجی بنا تی ہوئی بیٹھ والوں کے ساتھ عالم صاحب کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں بولی۔

مستحق بھرتی تھیں۔ ایک تو اس بات کی خوشی تھی کہ چوہدری کے دو ہزار روپے کی طرح اس کے سینے میں چھ رہے تھے اب انہیں چوہدری واپس لے لے گا۔ جھوٹے الزام سے محفوظ رہے گا۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ چوہدری اس کا ساتھ دیا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ساری باتیں کس طرح زبان سے ادا کرے۔ وہ راستہ دینے لیے تیار تھا نہ جارہا تھا یعنی اس نے اپنی ایمانداری سے چوہدری کو بھی ایماندار بنا دیا۔ چپ چاپ کھڑا سوچتا رہ گیا۔ عورت سے زیادہ مرد کے بدلے ہوئے تیور کو اور سب سے بڑی خوشی وہ تھی جو شروع جوانی سے انسان کا پیچھا کرتی ہے اس کا بچپن کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ سیکھنے کے دل میں خورائی یہ بات آئی کہ مولوی کی نیت بدل گئی ہے۔ کرتے سہاگ کی سچ رہنمائی ہے یعنی اب اس کی سیکھنے اسے ملنے والی تھی۔ اس خیال نے دل ہی دل میں کہا۔

ہی اس کے دماغ پر ایسا نشہ چھا رہا تھا کہ اس پاس کی دنیا سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
 ”اللہ میاں سواروپے کی نیاز دلاؤں گی، اس کی نیت بدل ہی جائے“ پھر اس نے
 شرماتے ہوئے ایمان علی سے کہا ”دوپٹہ نہیں دے گا؟“ ایمان علی نے پلٹ کر چارپائی سے
 سکیٹنے ہی سکیٹنے سمجھ میں آ رہی تھی۔

دوپٹے کو اٹھالیا پھر بے خیالی سے دوپٹے کو لا مت سے مٹھی میں سمیٹنے لگا۔ اس کے بڑا مشکل سے ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ جو عالم صاحب آئے ہیں نا انہوں نے کہا ہے کہ.....“

”کسا کہا ہے؟“

پھر ان پر چوری اور قتل کا الزام نہیں آئے گا اور وہ لوگ تھانے میں جا کر کس طرح بیان دیں گے۔ لیکن نے مایوسی سے پوچھا۔

”کیا ایسی جانا ضروری ہے؟ چوہدری سے کہہ دے تھوڑی دیر بعد جائیں گے۔“

”یہی کہ تو بالکل میری ہے اگر میں چاہوں تو تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔ اور میں کہ دور رہتا چاہتا ہوں۔“

مگر اب میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”اے ایمان علی نے اس کی باتوں کو سمجھتے ہوئے سراٹھا کر دیکھا تو وہ بھری ہوئی بندوق کی طرح کھڑی ہوئی تھی گردواں سے پھر چوہدری نے آواز دی۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا ”جی، ابھی آ رہا ہوں۔“ پھر اس نے وحشی آواز میں سیکنڈے کے ”کر ہم ابھی

یہ کہتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے سر کو حمام لیا جیسے جنڈیوں کے ہجوم میں چکر مارا، نہیں جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ چوہدری کا ارادہ بدل جائے۔ ہم ابھی ایک دو گھنٹے میں سکیئر نہ فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کے لیے حمام لیا۔ بس اتنا ہی سہارا کافی رہا۔ واپس آجائیں گے۔ اس وقت ہمارے دل دو بارغ سے بہت سے بوجھ اتر جائیں گے۔ ایمان علی نے اپنا سہارا بوجھ اس پر ڈال کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ چوہدری اپنے دو ہزار روپے والپس لے لے گا اور میں چوری اور قتل کے الزام سے بری چند لمحوں تک اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس دنیا میں ہے؟ اس کے یہ ہو جاؤں گا۔"

چند لمحوں تک اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس دنیا میں ہے؟ اس کے بچے ہو جاؤں گا۔“

یہ بات سیکند کی سمجھ میں آگئی۔ وہ نیک بخت بھی یہی چاہتی تھی کہ کس طرح اس کا
تھا اور سنبھل رہا تھا مگر اس کی قسمت میں پھسلنا نہیں تھا۔ چوہدری نے اسے باہر سے ایمان ان مہیتوں سے نجات حاصل کرے۔ اس نے اپنے من کو مار کر چادر اٹھائی پھر اس
میں خود کو اچھی طرح چھپاتی ہوئی ایمان علی کے پیچھے چلے گئی۔ جب دونوں مکان سے باہر
دی۔

”مملووی کیا کر رہے ہو، باہر آؤ۔“

”ممدولی کیا کر رہے ہو باہر آؤ۔“
ایمان علی یک بیک ہڑبڑا کر سیکینہ سے یوں الگ ہوا جیسے گناہ کرتے رہتے ہاتھوں اُجالنے لگے۔ تھانہ وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ چنڈے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ دو میل کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، گھنے درختوں کا سلسلہ شروع

گیا ہو۔

سیکنہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”نہ جوہد ری کہاں سے مرنے آگیا۔“

”یہ چوبدری کہاں سے مرنے آگیا۔“
ایمان علی چارپائی پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دور سے دوڑا چوبدری نے چاروں طرف مطمئن ہو کر ایمان علی کو دیکھا تو اس کے تیور بدل چکے تھے۔ اس آرا ہو۔ زندگی کی دھوپ میں دوڑتے دوڑتے کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی۔ تعجب نے ’نے سخت لہجے میں کہا۔

زندگی کی دھوپ میں کچھ نہ ہوا! زلفوں کی چھاؤں میں ہانپ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا: ”مولوی میں نے تیری قبر کے لیے یہی جگہ پسند کی ہے۔“ چوہدری کے منہ سے یہ بات نکلتی ہی اس کے ملازم نے بڑا سا گھبرا نکال لیا۔ ایمان علی نے گھبرا کر جھجھکتے ہوئے کہا: ”ابھی چوہدری ہمارے ساتھ تھانے جانے کا تو مجھے ہی ساتھ چلے گی۔“

”ابھی چوہدری ہمارے ساتھ تھانے جائے گا تو بھی ساتھ چلے گی۔“

”ہم تھانے کیوں جائیں گے؟“

ایمان علی اسے بتانے لگا کہ کس طرح خود مرے اسے دوچار روئے داخل ہونے لے۔ ”ہیہ یہ کیا؟ کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارا کیا گناہ ہے؟“

چوہدری نے غصے سے کہا۔

چتر پھینک کر فوراً ہی چھرا اٹھالیا مگر وہ دشمنوں پر حملہ نہ کر سکی۔ چوہدری اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ چھرا لے کر بھاگتی ہوئی چپختے لگی۔

”بچاؤ بچاؤ“ میرے ایمان کو بچاؤ۔ کوئی خدا کا بندہ ہے، میرے سہاگ کو بچاؤ۔“ وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ چوہدری اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ملازم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سربراہی زبردست چوٹ پڑی تھی، وہ سنبھل نہ سکا لیکن مگر تے مگر تے بھی اس نے ایمان علی کی گردن دبوچ لی تھی۔ ایمان علی کاشانہ اور ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔ دودو سرے ہاتھ سے اسے پرے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ہی زخمی تھے، دونوں ہی کمزور تھے۔ کمزوری کے باوجود ملازم نے سکیٹھ کے ہاتھ سے مگر اہوا چتر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔

اسی وقت سکیٹھ چوہدری کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہوئی والپس آ رہی تھی۔ اس نے ایمان علی پر دوبارہ حملہ ہوتے دیکھ کر اسی چھرے سے ملازم پر حملہ کر دیا۔ چھرے کا پھل دسے تک ملازم کی پشت میں اتر گیا پھر وہ فوراً ہی چھرے کو پشت سے نکال کر پلٹ گئی اور چوہدری کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ چوہدری اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹھنک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دسٹ کے ماحول میں پٹی ہوئی ایک شیرنی کھڑی تھی۔ کساہو ابدن تھا، مضبوط کلائیائیں تھیں، زمین کھودنے والی فولادی انگلیوں میں خون آلود چھرا چوہدری کو چنچ کر رہا تھا۔

”میں ایمان کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ چیختی ہوئی چوہدری کی طرف لگی۔ چوہدری ایک بیک پلٹ کر بھاگنے لگا مگر وہ پانچتی ہوئی چیچھا کرتی رہی۔ چوہدری کو جلن کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس سے بہت دور نکل گیا تھا۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سکیٹھ ٹھک کر گر پڑی۔ ایمان علی کو ہوتا نہیں تھا کہ وہ خود کہاں گم ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں تھوڑی دیر کے لیے مر چکا تھا۔ کبھی کبھی انسان اسی طرح وقتی طور پر مر جاتا ہے۔ ساری دنیا کے مصائب سے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ پھر یہ دنیا اسے اپنی طرف بلا لیتی ہے۔ جب اسے دوبارہ زندگی ملی تو وہ آہستہ آہستہ میں تارے ناچ گئے۔ وہ لوگ سکیٹھ کو ایک کمزور عورت سمجھ کر بھول گئے تھے۔ مگر آنکھیں کھول کر اپنے آپ پاس کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ملازم کے ہاتھ سے چھرا گر پڑا۔ مگر

”تو جب سے یہاں آیا ہے، میرا کام بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ ابے او ایماندار کے بچے تھے میرے ہی پنڈ میں آتا تھا۔ جب تک تو زندہ رہے گا اس وقت تک میرے سامنے ہوا کا پھندا لگتا رہے گا۔“

”جب تم نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا ہے تو تمہیں کون پھانسی پر چڑھاؤ؟ تمہیں خدا پر بھروسہ۔“

”خدا پر بھروسہ کرنے سے میں سزا سے نہیں بچ سکتوں گا۔ تیری سچائی مجھے لے گی پولیس والے تیرے بیان ہی سے یہ سمجھ لیں گے کہ میں امام دین کا قاتل ہوں اور اب بھی نہیں ہے۔ میں نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔“

ایمان علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چوہدری نے حقارت سے کہا ”وے“ والے بے وقوف تو بے ایمانی کی دنیا میں اگر ایمان کی بات کرتا ہے؟ بے وقوف تو زمین پر بیٹھ کر پنڈ کے بچوں کو کلام پاک کی تعلیم دیتا ہے، اسی زمین کے نیچے امام دین دفن کیا ہے۔ تو جب پہلی بار حویلی کے پیچھے آیا تھا تو اس سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اسی زہر نیچے امام دین کو دفن کر کے اس زمین کو لپ پوت کر برابر کر رہے تھے۔ پہلے میرا ارادہ وہاں بھیجیں باندھوں گا پھر میرے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ وہاں تھے باندھ کر کھول پولیس والے کبھی شبہ نہیں کریں گے۔ جہاں کلام پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے میرے بھائی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

کامیاب منصوبہ بندی کے تصور سے قاتل چوہدری کا چہرہ دمک رہا تھا کیونکہ وہ دیدگوارہ ایمان علی اور سکیٹھ کو ہمیشہ کے لیے اس جگہ دفن کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے سے کہا ”وے“ دیکھتا کیا ہے ختم کر دے اس ایمان کے بچے کو۔“ اس کا حکم سننے پر اس نے ایمان علی پر چھرے سے حملہ کیا۔ ایمان علی سسم کر بھاگ نہ سکا صرف ذرا سا ایک طرف ہو گیا جس کے باعث چھرا سینے کی طرف آنے کے بجائے شانے کو زخمی کر گزر گیا۔ بے ایمان کے ہاتھوں ایمان کا لہوا چھل پڑا، وہ زخم کی تاب نہ لا کر زمین پر ملازم نے چھرے کو دوبارہ ہتھیلی میں تول کر اس پر حملہ کرنا چاہا مگر اسی وقت اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ لوگ سکیٹھ کو ایک کمزور عورت سمجھ کر بھول گئے تھے۔ مگر آنکھیں کھول کر اپنے آپ پاس کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ملازم کے ہاتھ سے چھرا گر پڑا۔ مگر

آنکھوں کے سامنے دھندلے سے منظر تھے۔ سفید دیواریں اور کچھ دھندلے سے نظر آرہے تھے جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھ کھلتے ہی ایک چہرہ اور قریب کسی کو پہچان نہیں رہا تھا بس کچھ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ملازم ہسپتال کے لورڈ کی نبض ٹٹول رہا ہے۔ ایک خوب صورت سا چہرہ اس پر جھکا ہوا ہے اور اس کی آنسو بہہ رہے ہیں پھر کسی نے کہا۔

”دور ہٹ جاؤ“ ابھی مریض کے قریب نہ جاؤ۔ جب یہ پوری طرح ہوش میں آگاتو میں آپ لوگوں کو باتیں کرنے کی اجازت دے دوں گا۔“

وہ روتا ہوا حسین چہرہ سیکنہ کا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی کیونکہ ایمان علی اسے پہچان رہا تھا اور ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا کہ مریض کو ابھی مخاطب نہ کیا جائے۔ اس کے کم دوسری طرف پولیس انسپکٹر بھی کھڑا تھا لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر اس کا بیان نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ بیان دینے کے قابل بھی نہیں تھا اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اسی طرح کبھی سوتا تھا کبھی جاگتا رہا۔ رات اور دن گزرتے رہے اسے اس بات کا نہ تھا کہ اس نے کتنی بار آنکھیں کھولیں اور کتنی بار بے ہوشی کی نیند سوتا رہا۔ وہ اس کی طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔ آنکھیں کھول کر پوری طرح ہوش میں آئے بعد اس نے سیکنہ کو دیکھا۔ اپنے مجازی خدا کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کا چہرہ غور کھل اٹھا تھا۔ وہ بے اختیار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اس کے ہاتھ کو تمام کرنا کانپ رہی تھی۔ ایمان علی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو اسپتال ہے میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟“

سیکنہ ذرا اس کے قریب اور کھسک آئی اور اسے جانے لگی۔

”پولیس والے تجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔ میں نے چوہدری دین محمد کے چہرے سے زخمی کر کے بے ہوش کر دیا تھا ورنہ وہ تجھے زندہ نہ چھوڑتا۔“

ایمان علی نے شدید جراتی سے پوچھا ”تو نے ایک عورت کو کراتے بٹے کے کیسے زخمی کر دیا؟ کیا چوہدری نے تجھے نہیں پکڑا؟“

”چوہدری تو بڑا بزدل نکلا۔ اپنے ملازم کو بے ہوش ہونے دیکھ کر یہ سمجھا کہ اس ہے۔ اس وقت میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں خون آلود چھڑا رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تو کتنی وفادار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے مگر تو حوالات سے اس نے ہر حال میں پردے کو قائم رکھا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تو کتنی وفادار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے مگر تو حوالات سے اس نے ہر حال میں پردے کو قائم رکھا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تو کتنی وفادار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے مگر تو حوالات سے اس نے ہر حال میں پردے کو قائم رکھا ہے۔“

”مگر وہ میرے پاس تو نہیں آئی۔ میں دوسرے کو ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اپنے گھر پر تھا۔ اسے فوراً ہی میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

”تو پھر وہ تھانیدار کے پاس گئی ہوگی۔“

”تھانیدار اس شہر سے بیس میل دور رہتا ہے۔ میں نے سیکینہ کی ضمانت لی ہے، اسے تھانیدار کے پاس نہیں دیتا تھا۔ پھر وہ اتنی دور کیسے جائے گی وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ مجھ سے ملے بغیر چلی جائے۔“

ڈاکٹر پریشانی سے بڑھتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ ایمان علی نے باہر جانے تک اس کی اتار دینی وہ کہہ رہا تھا ”تین گھنٹے گزر گئے، وہ کہاں جاسکتی ہے؟ اگر کہیں چلی گئی تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔“ اس کی بڑبڑاہٹ نے ایمان علی کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی بھلا وہ کہاں جائے گی۔ ایسی وفادار شریک حیات مجھے ایسی حالت میں چھوڑ کر کبھی تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں صبر کر سکتی تھی۔

اس نے بڑے اضطراب سے کمرے کی چابی مگریدن سے اٹھنے والی میسوں نے اسے سمجھایا کہ اس کا ایک شانہ بری طرح زخمی ہے۔ وہ مریض چاروں شانہ چت لیٹا رہا ہے۔ پہلوؤں جیسی زندگی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں پھر گردش کرتے ہوئے کچھ کو دیکھنے لگا۔

شام کے بعد رات آئی تو پریشانی اور بڑھ گئی کیونکہ سیکینہ واپس نہیں آئی تھی۔ کئی بار یہاں آیا اور تجھے بے ہوش دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو جاکر تھانیدار آگیا تھا، وہ بھی سیکینہ کی نگہبانی سے پریشان ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی ایمان علی کا بیان لے کر سیکینہ کی تلاش میں چلا گیا۔ ایمان علی اور ڈاکٹر کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ سچائی کی وہ تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی کو محبت سے ہولے ہولے سہلاتی رہی پھر جیت ہو رہی تھی مگر بچوں کو عذاب میں مبتلا کر رہی تھی۔

واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ ایمان علی تنہا بستر پر گردش کرنے، چھت کے کچھ کو دیکھتا رہا اور گردش حالات پر غور کرتا رہا۔ سیکینہ جلدی واپس آئے گا مگر روتے رہے۔ سیکینہ کہاں چلی گئی تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ تھانیدار ڈاکٹر کو روز تسلیاں دیتا تھا کر کے گئی تھی لیکن وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر اس کا معائنہ کیا کیونکہ وہ سیکینہ کا ضامن تھا لیکن ایمان علی اس کی ساری زندگی کا ضامن تھا۔ اس کی تسلی سیکینہ کے بارے میں دریافت کیا ”تم ساری گھر والی کہاں ہے؟ وہ دوسرے کونجھ سے؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی کا لے کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو دوسرے کو ہی یہ کہہ کر گئی تھی کہ آپ کو اور تھانیدار کو بلا کر لائے گی۔“

نہیں! انکا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی سی سیدھی سادی سی سرتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں۔

”ہم دونوں کا اس دنیا میں کون ہے؟ کوئی ایسا نہیں ہے جو آڑے وقت ملے۔“

تھانیدار مجھ سے بہت متاثر ہے لیکن اس کی ضمانت قبول نہیں ہو سکتی تھی۔

نے ڈاکٹر کو ساری داستان سنا لی کہ تو ایمان کی خاطر کتنی کڑی آزمائشوں سے گزر رہا ہے۔ میں کس طرح ساتھ دے رہی ہوں۔ اس رحم دل ڈاکٹر نے کہا کہ میں سچائی کا مانو گا۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے مگر دوسرے بندوں کو بھی کچھ اپنا فرض چاہیے۔ اس نے اپنا فرض نبھایا اور کمرے سے میری ضمانت لے لی۔ اب میں ادا میں ہوں، وہ مجھے بتی کہتا ہے اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔“ اس کا سننے کے بعد ایمان علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”ایمان کے سفر پر نکلے تو کہیں شریک سفر مل ہی جاتے ہیں۔ پہلے تو لی، اب تھانیدار اور ڈاکٹر مل گئے۔ انسان نہیں ہارنی چاہیے کیونکہ سچائی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اس کا انعام ضرور ملتا ہے۔“

سے ملے آخر چودہری ثبوت کے ساتھ پکڑا گیا۔“

سیکینہ نے اس کے ہتھیلی کو محبت سے سہلاتے ہوئے کہا ”تیرے جیسے سلاہ ایمان کے لیے قربان ہو سکتے ہیں۔ ایمان کی سلامتی کے لیے ایک پردہ دار عورت حوالات میں چلی گئی اور تیری حالت یہ ہو گئی تھی کہ تیرے بدن میں خون کا قطرہ نہ تھا۔ تجھے تین بار خون دیا کیا تب کہیں جا کر تو نے آنکھ کھولی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ باتیں کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ میں تھانیدار کو بلا کر لاتی ہوں، وہ تیرا ایمان لینے کئی بار یہاں آیا اور تجھے بے ہوش دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو جاکر تھانیدار آگیا تھا، وہ بھی سیکینہ کی نگہبانی سے پریشان ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی ایمان علی کا بیان لے کر سیکینہ کی تلاش میں چلا گیا۔ ایمان علی اور ڈاکٹر کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ سچائی کی وہ تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی کو محبت سے ہولے ہولے سہلاتی رہی پھر جیت ہو رہی تھی مگر بچوں کو عذاب میں مبتلا کر رہی تھی۔

واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ ایمان علی تنہا بستر پر گردش کرنے، چھت کے کچھ کو دیکھتا رہا اور گردش حالات پر غور کرتا رہا۔ سیکینہ جلدی واپس آئے گا مگر روتے رہے۔ سیکینہ کہاں چلی گئی تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ تھانیدار ڈاکٹر کو روز تسلیاں دیتا تھا کر کے گئی تھی لیکن وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر اس کا معائنہ کیا کیونکہ وہ سیکینہ کا ضامن تھا لیکن ایمان علی اس کی ساری زندگی کا ضامن تھا۔ اس کی تسلی سیکینہ کے بارے میں دریافت کیا ”تم ساری گھر والی کہاں ہے؟ وہ دوسرے کونجھ سے؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی کا لے کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو دوسرے کو ہی یہ کہہ کر گئی تھی کہ آپ کو اور تھانیدار کو بلا کر لائے گی۔“

نہیں! انکا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی سی سیدھی سادی سی سرتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں۔

لوگ وہ بھی چھین رہے تھے۔ کراچی پہنچ گیا۔ وہاں کئی دن تک فاقے کرتا رہا، کبھی ایک وقت کی روٹی مل جاتی کبھی پانی ہی کئی دن بیت گئے۔ وہ بستر لیٹا ہوا بڑی بے بسی سے بڑبڑاتا رہتا تھا، میں کیا؟ پر گزارہ کرنا پڑتا۔ سیکنہ کی عدم موجودگی نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ اب کبھی یہاں سے کیسے اٹھ کر جاؤں؟ اٹھ کر بیٹھتا ہوں تو زخموں سے ٹھیس اٹھنے لگتی ہیں۔ نہیں ملے گی۔ چلتے پھرتے چادر میں لپیٹی ہوئی کسی عورت کو دیکھ کر وہ ٹھک جاتا تھا۔ ایک ساعت کے لیے یوں لگتا جیسے وہ ابھی آنکھ پھولی کھیل کر آ رہی ہو۔ وہ ایمان علی جو نظر اٹھا کر ڈاکٹر الگ پریشانی میں مبتلا تھا اس کے پاس ہنر کرتا تھا ”لوگ اسی لیے کچلے“ پرانی عورت کو نہیں دیکھتا تھا، وہ چادر والیوں کو بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ لیکن گھبراتے ہیں۔ سیکنہ بچ بول کر اور ایک قاتل کو گرفتار کرانے کے بعد کسی مہینہ دیکھتے وقت نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا۔

چھٹس گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ دشمن کے آدمیوں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ کئی دنوں کے بعد اسے ایک مسجد میں ٹھکانہ مل گیا۔ وہ مسجد ایک چھوٹے سے علاقے ضمانت لینے کے لیے میں نے اپنے مکان کے کاغذات جمع کرائے تھے اگر وہ نہ ملے میں تھی۔ وہاں کچے مکانات کم تھے، بھلیاں زیادہ تھیں۔ وہاں کی مسجد کینٹی نے اسے مسجد کا مکان ضبط ہو جائے گا۔ یعنی میں تقریباً اسی ہزار روپے کا نقصان اٹھانے والا ہوں۔ جو پیش امام بنادیا تھا۔ مسجد کے لیے جو چندہ جمع ہوتا تھا، وہ کمیٹی کے صدر محمد رکن الدین کے ہاتھ میں کر ایمان علی کا سر ٹھک جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بڑی آناٹا پاس امانت کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ رکن الدین ایماندار آدمی تھے، ان کے پاس دولت کی جتلا کر رہا تھا مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ کیسا برا وقت آگیا تھا کہ جو لوگ بھی ایمان کا سہو گئی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ مسجد کی امانت میں خیانت کرنے کے بجائے وہاں کی رقم میں رکھیں گے، انہیں اسی طرح ذلیل کیا جائے گا اور نقصان پہنچایا جائے گا۔ اپنی طرف سے امانت کیا کرتے تھے۔ اسی رقم سے ایمان علی کو تین وقت کی روٹیاں ملتی ایک ماہ کے بعد وہ چلتے پھرنے کے قائل ہو گیا۔ لیکن سیکنہ کی تلاش میں وہاں تھیں۔

جاسکا کیونکہ چوہدری دین محمد پر مقدمہ چل رہا تھا لہذا فیصلہ ہونے تک اسے ایک ایمان علی کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ وہ صبح کی نماز پڑھانے کے بعد اس بڑے شہر کی گواہ کی حیثیت سے وہاں موجود رہتا تھا۔ تھانہ دار نے اسے یقین دلایا کہ دو چار ڈیڑھا ہوں اور گلیوں میں گھومنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ لوگ روزگار کے لیے یا تفریح کے فیصلہ ہو جائے گا پھر وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے مگر وہ کئی ماہ تک پیشیاں بھگتتے پر مجبور لیے گھومنے لگتے ہیں، وہ سیکنہ کی تلاش میں نکلتا تھا۔ جدائی اور انتظار میں ایسا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ دوسرے سال چوہدری دین محمد کو سزائے موت سنائی، اس ٹوٹی ہے پھر بندھتی ہے اور پھر ٹوٹی ہے۔ سوچ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل ایمان علی تو ڈیڑھ سال کے عرصے میں بے موت مر گیا تھا۔ عبادت کے بعد کوئی ایسا تک دوڑاتی رہتی ہے۔ جس کا انتظار ہو اس کے مرنے کا یقین کر لیا جائے تو وہ یقین پائیدار تھا جب وہ سیکنہ کو یاد نہ کرتا ہو۔ اکثر عورتیں اپنے حسن کا جادو جگا کر اپنے جسم کی نہیں ہوتا۔ انتظار کرنے والے کو کوٹ کر ڈٹ ہر آہٹ پر چوٹ کا ہے کہ وہ آگنی میری چادر پیش کر کے مروت کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔ لیکن سیکنہ نے کچھ نہیں دیا تھا۔ غمزدگی ”آہ سیکنہ تو کہاں ہے ملتی کیوں نہیں؟ اگر تو دنیا میں نہیں ہے تو مجھے اس زمین کا پتہ ہی کا حسن و فاقہ جو ایمان علی کے ذہن سے مٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ معلوم ہو جائے جہاں تو گمری نیند سو رہی ہے۔“

وہ امام دین کے قتل کے کیس میں اپنا بہت کچھ ہار کر پھر انجانی منزل کی طرف چلے ”میرے معبود! میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا کیونکہ تو مجھے مانگے بغیر میری اگرچہ ڈاکٹر نے وہاں کی ایک مسجد میں اس کا ٹھکانہ بنادیا تھا مگر اب اس کی زندگی کی ضرورت کے مطابق رہتا آ رہا ہے مگر تو نے اب میرے دل میں سیکنہ کی محبت اور اس کی عبادت نہیں تھی، اپنی گمشدہ محبت کی جستجو بھی تھی۔ وہ آگے بڑھتا ہوا خدا کی ضرورت پیدا کی ہے تو اب میں گڑگڑا کر مانگتا ہوں کہ میری سیکنہ مجھے واپس کر دے۔ واپس سجدے کرتا گیا اور اپنی محبت کو تلاش کرتا رہا۔ اسی طرح حالات کی ٹھوکریں کھائیں کرتا تو اس کی موت کا یقین دلادے۔“ دعا اور دعا کبھی دیر سے اثر کرتی ہے، کبھی

جلدی اثر کرتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مبرک کا پھل ملتا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا نماز کے لیے میں کسی گھڑی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے دن کے وقت دھوپ اور چھاؤں سے قبول ہوگی۔ بندے کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خود کو اور فخر کے وقت صبح کا وہی جھک سے نماز کا صحیح وقت معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری تسلیاں دیتا ہوا اس کا انتظار کیے جا رہا تھا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو تراویح کے باعث اس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ صبح کی نماز جاتی ہے۔ کبھی صبح وقت نہیں بتاتی۔

وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ سیکنے کی تلاش میں نہیں نکل سکتا تھا۔ مایوسی سے نہ بڑھتا تھا۔ اس کا سایہ نظر نہیں آیا۔ چلے پھر گئے۔

دو جوتیاں بچھ گئی ہیں پاؤں کے تلووں میں راتے کے کنکر اور کانٹے جیسے ٹپے۔

روزے رکھ کر چلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کیا میں تھک ہار کر بیٹھ جاؤں؟ اس کی کیا کیا تھا۔

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایک رات وہ سحری کے وقت کھانا کھا کر مسجد میں آئے۔

افان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ اس چھوٹی سی مسجد کا پیش امام بھی تھا اور مؤذن بھی۔ اپنی باتیں کلاں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وینے کے لیے مسجد کے چوترے پر آیا تو اسی وقت مسجد کمیٹی کے صدر رکن الدین نے اسے چھ سو روپے کی وائپر فوف اور شاک پروف گھڑی ہے یہ صحیح وقت بتاتی ہے۔

”آپ گھڑی کا مول نہ بنائیں۔ خریدنے اور بیچنے والی چیزوں میں کبھی بے دینا کا واحد سودا ہے جو بغیر پیسے کے طے ہوتا ہے۔ بے پیسے کی نماز دنیا کا سکون اور عاقبت کے لیے ذریعہ نجات ہے۔ مجھے افسوس نہیں ہے کہ میں آپ کی خاطر پندرہ منٹ دیر سے

سحری کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب نماز کا وقت ہے۔ اگر کوئی دیر سے سحری پڑھا تو اس نے فراموش کر دیا۔ میں صرف آپ کو سمجھا سکتا ہوں کہ روزہ اور نماز وقت کی پابندی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز بھی دیر سے پڑھی جائے۔ یہ کہتے ہی اس نے فراموش کر دیا۔ آپ کو بھی وقت کی پابندی سے سحری کرنا چاہیے۔“

لے بلند آواز سے ”اللہ اکبر“ کہہ دیا۔ ملازم کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملا تو وہ نے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد جب دن نکل آیا تو کمیٹی کے صدر صاحب نے اپنے مکان میں طلب کیا۔ ایمان علی وہاں پہنچا تو رکن الدین اپنے کمرے میں۔

مثل رہا تھا۔ اس نے ایمان علی کے سوال کا جواب ایک جھنگے سے دیتے ہوئے کہا۔ ایمان کے پیچھے تجربات اسے سمجھا رہے تھے کہ اس کی ایمان داری پھر اسے کسی صاحب! مسجد کی گھڑی پندرہ منٹ آگے ہے۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا بیٹا تقابلیت میں جملہ کرنے والی ہے۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سیکنے کی گمشدگی نے پندرہ منٹ کے بعد اذان دیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی وجہ سے عذرا پلے ہی تو ذکر رکھ دیا تھا اب رکن الدین کی ناراضگی اسے اور بھی توڑ رہی تھی۔

کر سکا۔ صرف ایک گلاس پانی پی کر روزہ رکھا ہے۔

ایمان علی نے جواب دیا ”جب میں برسوں سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتا آیا ہوں تو اسے لقمہ دیا۔ ایمان علی نے فوراً ہی اس لقمے کو قبول کیا پھر صحیح طور سے پڑھتا

ہوا آگے بڑھ گیا۔ غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی آخر وہ بھی ایک انسان تھا۔ خوش قسمتی کا نمبر بھی چار ہے اور چار بار اسمگلنگ کیس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ ایمان علی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جب اس کی روٹی لینے کا نمبر آیا تو اس نے روٹی دینے والے سے کہا۔ ”میں بڑے صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ دوسرے ممبروں کو اپنا فیصلہ سنایا کہ پیش امام بدلا جائے۔ پتا نہیں ایمان علی نے اس کے پہلے کتنی بار غلط پڑھا ہے، وہ تو اتفاق سے ایک قابل شخص اس کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ غلطی کیوں نہ ہو اس طرح تو وہ ہمیں الٹی سیدھی نمازیں پڑھاتا رہے گا۔“

کمیٹی کے کچھ ممبروں نے دبی زبان سے ایمان علی کی حمایت کی لیکن محدود کئی کے حای زیادہ تھے لہذا اس کا فیصلہ مان کر ایمان کو چھٹی دے دی گئی۔ وہ پھر ٹھوکر لگا کر ایمان علی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے رازدارانہ انداز کے لیے مسجد سے باہر آگیا۔

وہ تمام دن سڑکوں پر گھومتا رہا۔ دوسرے مخلوق کی مسجدوں میں جا کر نماز پڑھتا رہا۔ روزی کا ذریعہ تلاش کرتا رہا۔ ایک شخص نے کہا۔

”جناب آپ کون ہیں مجھے صاف صاف بتا دیجئے۔“

”میں آپ ہی کی طرح انسان ہوں۔“ ایمان علی نے جواب دیا۔

”میں اب تک کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں لیکن اپنی سچائی اور ایمان داری کا باعث جم کر نہ رہ سکا۔“

بڑے صاحب نے خوشامدانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”دیکھیے آپ مجھ سے چھپنے کی کوشش نہ کریں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ پولیس میں آکر اپنی سچائی اور ایمان داری کے بارے میں بتا دیں گے۔ آپ کی یہ داڑھی غلطی ہے۔“

ایمان علی نے کہا ”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ روشنی میں چل کر دیکھ لیں۔ یہ داڑھی تھی۔ روٹی کھانے کے لیے بہت سے بھکاری ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔“

بڑے صاحب تھوڑی دیر کے لیے ہچکچایا پھر اس نے اچانک ہی ایمان علی کی داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

ایمان علی نے کہا ”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ روشنی میں چل کر دیکھ لیں۔ یہ داڑھی تھی۔ روٹی کھانے کے لیے بہت سے بھکاری ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔“

بڑے صاحب نے اسے تڑا تڑا مارنا شروع کر دیا۔ ”اے نہ تو تو پولیس والا ہے، نہ مولوی۔ کم ان کی طرف توجہ نہیں دی پھر جب خیرات لینے والے کی باتیں سنائی دیں تو وہ کانٹا لگا۔ ایک فقیر کہہ رہا تھا۔“

”اللہ جب دیتا ہے تو چھپر بھاڑ کر دیتا ہے۔ یہ صاحب اتنے پیسے والا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں بڑی بڑی کالیں ہیں اور چار بڑی بڑی حسین بیگمات ہیں۔“

ناک اور باجھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اسی جگہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ رات بھر اسی
 رہا، صبح ہوئی تو اس پاس کی کوٹھیوں والے اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر اپنی کاروں
 مصروفیات کے لیے روانہ ہو گئے۔ کسی نے پچھلی گلی میں جھانک کر نہیں دیکھا۔
 کی آخری تاریخ تھی، شام کو عید کا چاند نظر آنے والا تھا۔ تمام لوگ آنے والے
 خوشیاں منانے کے لیے منگلی شاپنگ میں مصروف تھے اور جو عید کی خوشی کا سبب
 حق دار تھا وہ گلی میں پڑا ہوا تھا۔ کسی کو بھی کی ایک بیگم نے پچھلی گلی سے جھانک کر
 دیکھ لیا۔ اس نے فوراً ہی میونسپل کمیٹی کے دفترمیں فون کیا کہ کوٹھی کے پیچھے کون
 کی لاش پڑی ہے، اسے فوراً اٹھوایا جائے ورنہ اس صاف ستھرے علاقے میں
 پھیل جائیں گی۔

شام کو ایک میونسپل کمیٹی کی گاڑی اسے اٹھانے کے لیے آئی تو اسے پا کے
 بھٹکے اس کے پاس آکر بیٹھ گئے اور اسے اچھی طرح متول کر دیکھنے کے بعد ہی
 کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ دونوں بھٹکے شاموش ایمان کے پاس بیٹھے کچھ دیر تک
 کرتے رہے پھر ان میں سے ایک چارپائی لانے کے لیے چلا گیا۔ کمیٹی والے آپ ایک
 بھٹکے لگنا کہ مارنے والا اس کا رشتہ دار ہے، وہ دونوں سے بیمار تھا، تو ان کے
 مانگنے نکلا تو یہاں آکر مر گیا۔ یہ سن کر مردہ اٹھانے والے مسٹر نے اسے دوبارہ جانے
 کہا۔

”مسروں کو مرنے کے لیے سڑک ہی ملتی ہے۔ اب اسے لے کر سال کیل چاروں بھٹکے مانگنے والوں کے دل خوشی سے دھڑک رہے تھے لیکن وہ منافع حاصل کرنے کی
 چلوا سے اٹھا کر لے جاؤ۔“ بھٹکے منگنے نے عاجزی سے کہا۔
 ”جما دار صاحب مرنے والے کا بھائی چارپائی لانے گیا ہے۔ وہ مرنے والے کے پاس بیٹھا اس سے آگے سے کہہ رہا تھا۔
 بھی بلا کر لائے گا، ہم ابھی اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔“ کمیٹی والے دہلے بن کر
 دیر انتظار کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مگر اگر لاش اٹھا کر لے جائیں تو وہ نہ تو ”چارو والی کے دل کی گمراہی سے آہ نکلی“ آنکھوں سے آنسو پونٹنے لگے۔ پھر وہ چین کرتی
 جائیں گے۔ بیس منٹ کے بعد تین بھٹکے ایک چارپائی اٹھا کر لے آئے اور وہی سوچنے لگی۔

ایمان علی کے بے حس جسم کو ڈال کر کلہر شہادت پڑھتے ہوئے صدر کی طرف بڑے بوڑھے منگو تیرا منہ جلے میرا خصم بھی نہیں مر سکتا کیونکہ وہ ایمان والا ہے اور ایمان
 ایمان کی لاش چار کاندھوں پر جارہی تھی۔ دیکھا جائے تو کتنے ہی لوگ اس منگو بھی موت نہیں آتی۔ میں جو رو رہی ہوں تو بے ایمانوں کی لمبی حیات پر رو رہی ہوں کہ
 ایمان کو مار کر اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا ایمان کے سڑے گلے دشمن کیوں نہیں مرتے۔ آہ کبھی میں بھی ایمان والی تھی، میرے

خاوند نے مجھے ایمان کا راستہ دکھایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایمان کے راستے پر چلنے والے چوہدری کو جلد سے جلد سزائے موت سنائی جائے پھر وہ بوڑھا بھی ایسا تھا کہ ایمان والے کے قدموں میں جان دے دوں۔ مگر ہماری اس دنیا میں بے ایمانی کے چہرے سے ہٹا کر نظر نہیں آتا تھا۔ اگر ہر انسان کے چہرے سے مکاری ظاہر ہو جائے تو بہت مضبوط ہیں۔ میں نے چوہدری دین کو گرفتار کرانے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھ پر محسوس عورتیں کبھی دھوکہ نہ کھائیں۔

پھانسی ہو جائے گی۔ شاید پھانسی ہو چکی ہوگی مگر ایک جھوٹ اپنے پیچھے دوسرے بچے۔ جب میں اس بوڑھے کے ساتھ تھانیدار کی بن کے گھر پہنچی تو اس گھر میں داخل چھوڑ کر مرنا ہے تاکہ دنیا میں اس کا سکھ بھی چلتا رہے اور بچوں کو یہ سوچنے پر مجبور نہ کر دے کہ ایک مضبوط ہاتھ پیچھے سے آخر میرے منہ پر جم گیا۔ پھر دوپٹے کے جوان رہے کہ اتنی بڑی دنیا میں جھوٹ کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولو گے تو ٹخنے انہوں نے میرے منہ پر کپڑا ٹھوس کر ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔ میں تڑپتی گئی۔ نہیں بولو گے تو فٹ پاتھ پر مر جاؤ گے یا صرف مرنے والے کی لاش پر روئے جاتی رہی مگر ان کی گرفت سے آواز نہ ہو سکی۔ وہ مکان بالکل ویران تھا۔ اس کے پیچھے آؤ گے اور میں کسی اجنبی کی لاش پر روئے ہوں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ ہل ہلادار ٹرک کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اس ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ باقی حصے بابا خوش ہو گیا۔ اس کے آنسوؤں کی ایک ایک بوند منافع کی شرح بڑھاتی جاری تھی۔ ہل ہلادار ٹرک کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اس ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ باقی حصے دنیا کے بازار میں کبھی کبھی آنسو بھی فروخت ہوتے ہیں۔ ان کے عوض کسی کو لانا کہ کسی قسم کا فخر ہو تو مجھے فوراً ہی ہلاک کر دے۔

ہے کسی کو کفن ملتا ہے۔ وہ روئے روئے بدستور سوچ رہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ایک رات اور ایک دن تک وہ میں یہاں تک کیسے پہنچی؟ مجھے یہاں تک پہنچانے والا چوہدری دین محمد کاٹا۔ چلتا رہا۔ اس دوران کھانا کھانے کے لیے دو بار ویران جگہوں پر رکا۔ انہوں نے مجھے میں نے اس سالے کی بن کا ساگ اجاڑ دیا۔ سالے کا یہ رشتہ اس پر خوب چٹانی کھانا کھانا چاہا میں نے انکار کیا تو وہ مجھے مارنے لگے۔ میں پھر بھی کھانے کے لیے تیار نہ چوہدری دین محمد کے لیے ایک رشتہ اور میرے لیے گالی بن گیا ہے۔ اس واقعہ کو کئی تو انہوں نے میرے بدن کے ایسے حصوں سے لباس کو پھاڑ دیا کہ میں گھبرا کر کھانے پر گزر گئی۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتی جب ایمان علی ہوش میں آیا تھا۔ میں ہلکے ہو گئی۔

آنے کا وعدہ کر کے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینے گئی تھی۔ اسپتال سے نکلتے ہی ایک دوسری رات وہ مجھے ایک ایسے کچے مکان میں لے آئے جس کے چاروں طرف دور آوی سارے اٹھیا۔ اس نے پوچھا۔

”بیٹی کیا نام ہے تمہارا سیکھتے ہو؟“

میں نے سر ہلا کر ”ہاں“ کہا۔ وہ کہنے لگا۔

”میں تھانیدار کا ملازم ہوں۔ تھانیدار صاحب یہاں اپنی بن کے گھر آئے اس طرح قتل کرتے کہ اس کی بولی بولی کاٹ کر جانوروں کے آگے ڈال دیتے۔ ایک ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور کہا کہ اسپتال کے ایک ڈاکٹر صاحب سے چوہدری دین محمد کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا تھا مگر عورت کو قتل کرنے کی ضرورت سیکھنا نام کی ایک عورت رہتی ہے اس کا خاوند اسپتال میں علاج کے لیے پڑا ہوا ہے۔ اس کی عزت کو ختم کر دو وہ خود ہی مر جاتی ہے۔“

ہوا تم جلد ہی مل گئیں۔ انہوں نے تمہیں اسی وقت بلایا ہے۔ چوہدری دین محمد جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ چوہدری کے سالے اور اس کے دوپٹے کے ساتھ ہوں مقدمے کی کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے مقدمے کا حوالہ دیا تو میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑی۔ میں چلتے چلتے بدن سے اتنا خون بہ گیا تھا کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ مجھے دوا اور

مارنا چاہے تھے۔ میں رونے لگی، ابی خاوند نے کہا: ”پھر یہ تو کس کی طرف سے ہے؟“ میں نے کہا: ”میرا خاوند بہت ایمان کے لیے تڑپتی تھی۔ ایسے ہی وقت انسان بھٹکتا ہے اور سوچتا ہے کہ چٹائی بستر“۔ میں اپنے خاوند کے ساتھ کراچی شہر کی طرف جا رہی تھی۔ میرا خاوند بہت ایمان جلا کرتی ہے۔ میں بھی چٹائی سے توبہ کرتی تھی مگر ایمان علی کے چٹائی حوصلے والا ہے، وہ بیدل سز کرتا ہے اور لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سمجھاتا جاتا ہے۔ کل رات تھے۔ وہ بھی تو آخر انسان تھا، وہ کس کس طرح بدی قوتوں سے لڑ رہا تھا۔ ایک دیر لانے میں چند ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے خاوند کے پاس صرف ایمان کی میرے پاس ایمان علی نہیں تھا مگر اس کا وہاں ہوا ایمان موجود تھا۔ بھڑکتا ہے جو نئی نہیں جاسکتی لیکن مجھ جیسی جوان عورت لٹیروں کے لیے ایک بہت بڑی محبوب کی کوئی نشانی تو ہوتی ہے، میں نے نشانی کے طور پر اس کے ایمان کو بھارت ہوئی ہے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے، میں کسی طرح بھاگ کر یہاں آ گئی مستحکم کر لیا۔ یہ کہنے افسوس کی بات ہے کہ جس بچے کی خاطر میرا ایمان علی بچا۔ پتا نہیں میرا خاوند کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“ ایسا کہتے وقت مجھے اپنا ایمان رہتا تھا، انہوں نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ نہ میں ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ کانٹا دو لگیا۔ میں بچ چکی نہیں جاتی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اسے دیکھنے کے لیے اس نے ایمان کے بازو رسونے کا موقع مل جاتا۔

اس کے مکان میں سسک سسک کر مرتے مرتے میں پھر زندہ ہو گئی۔ میزبان نہیں تڑپ رہا ہو گا۔ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی عبادت میں مصروف ہو گیا ہو گا۔ سنہیلے لگی۔ وہ مجھے مار کر پیچنک دینا چاہتے تھے مگر دوبارہ مجھ پر رنگ روپ نہ پڑا تو کہہ اسے دنیا کی ہر خوب صورتی سے زیادہ خدا کی خوشنودی عزیز ہے۔

کارا وہ بدل گیا۔ پورے ڈیڑھ برس تک ان تینوں کی داشت بنی رہی۔ پھر ایک میں اتنی دور آکر اب یہی سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ میں وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس رات صرف ایک جوان اس پرے پر پہنچنے سے بے حیا وجود کو لے کر اس کے سامنے نہیں جاسکتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر بھی مجھ سے وابستہ ہو گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھ پر عاشقِ بے زبان و لالاب بھی ٹھہے قبول کر لے گا کیونکہ وہ میری بے گناہی کو سمجھے گا۔ مگر دنیا والوں نے مجھ کو صدمات دیئے ہیں، وہ صدمات اس کے دماغ کا پھوڑا بن جائیں گے۔ وہ جلے گا کسی حد تک مجھ پر بھروسہ کرتا تھا۔

اس رات میں نے بڑی محبت سے پیش آکر اسے سلا دیا۔ جب وہ غرائز سے بچا، اس دنیا کے شیطانوں سے جھنجھلائے گا۔ اس طرح اس کی عبادت میں خلل نہیں آئے گا۔ میں نہیں جانتی کہ وہ بیڑہ سال میں سے کس جگہ گریے گا۔ میں ایمان والی نہ رہی مگر ایک ایمان والے کو صدمات سے بچا کر کسی حد تک سکون دے سکتی ہوں۔

میں نے اپنے ایمان سے دور رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے کلچر پر پتھر رکھ لیا۔ وہاں مزار نہیں معلوم تھا۔ جب صبح ہوئی اور دھوپ نکل آئی تو ایک جھوٹی سی ہستی نما میں سے اپنے ایمان سے دور رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے کلچر پر پتھر رکھ لیا۔ وہاں مزار کہ ٹھنڈے کے قریب ہوں۔ کسی بزرگ کے مزار کے پاس کچھ لوگ نظر آئے، اب اس کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ”میری بیٹی اس بچے مانگنے والی عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ انہوں نے مجھے لنی بنی جانے ختم دیتے ہیں مرگئی۔ یہ جو میرے پاس بیٹھی ہے میری بہن ہے۔ میں اس بچے کو بہن کے پوجھا کہ میں کون ہوں اور کہاں جا رہی ہوں؟ میں ایک عورت ہو کر زبان سے لے کر نے آیا ہوں پھر میں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ بچہ اس عورت کی گود میں بھوک کہہ سکتی تھی کہ ڈیڑھ برس تک اپنی عزت لٹا کر آ رہی ہوں۔ میں بچ بات نہ کہ بلکہ رہا تھا۔ اگر میرا بچہ زندہ ہو تا تو اس کا نام عمر ہوتا۔ میری متابھری چھاتیوں میں اب دوران مجھے پھر جھوٹ کہنا لگیاتھا اور روٹی کھاتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ؟ درود موجود تھا۔ میں نے اس بچے کو گود میں لے کر اور ان لوگوں سے منہ پھیر کر اپنی

نفع حاصل کرنے کا لالچ سرمایہ دار میں ہوا فقیروں میں 'منافع بڑھتا رہے تو ایمان کی باتیں انہیں مشکلہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ رات کے ایک بجے چار فقیروں نے کھن کی آمدنی کا حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں ایک ہزار دو سو سات روپے آئے۔ یعنی مجموعی آمدنی چار ہزار آٹھ سو اٹھائیس روپے تھی۔ انہوں نے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے سوچا کہ ایمان کی لاش کو ابھی محفوظ رکھا جائے۔ دوسری صبح عید گاہ کے پاس اسے رکھ کر سیکنہ کو پھر رلا یا جائے گا۔ ہائے ری عورت! تو منافع کے کس بازار میں کام نہیں آتی؟

سیکنہ کو شام کے وقت اچھی طرح کھلایا پلایا گیا تاکہ روئے کی سکت رہے اور بچے کے لیے چھاتروں میں دودھ بھی اترتا رہے۔ اسی رات کو وہ ایمان علی کی لاش چارپائی پر رکھ کر اپنی جگہ کی طرف لے گئے۔ منگو بابا کی جھکی میں وہ لاش رکھی گئی۔ پھر وہ لوگ سیکنہ کو بچے کے ساتھ وہیں بٹھا کر باہر چلے گئے اور دروازے کو باہر سے اچھی طرح بند کر دیا کیونکہ ایمان علی روپے پیدا کرنے والا ایک مردہ مشین تھا اس کی حفاظت لازمی تھی۔

جھکی کے اندر چراغ کی ہلکی ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں سیکنہ کا شکستہ چہرہ زردی مائل بن کر نظر آ رہا تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ وہ شام سے لاش کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی اس لیے بچے کو فرش پر لٹا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایسی غمزہ نظروں سے چادر میں چھپے ہوئے انسان کو دیکھنے لگی جیسے بچہ بچہ ہو گئی ہو اور اب تک اپنے خاندان کی موت پر روتی رہی ہو۔ اس پر مٹلی چادر بڑی ہوئی تھی۔ چادر مٹلی ہونے سے کیا ہوتا ہے اس کے پیچھے جو ایمان تھا وہ کہیں سے بھی میلانا تھا۔ اگر کوئی آنکھوں پر پڑا ہوا میلانا پردہ اٹھا دے تو اسے ایمان کا روشن چہرہ نظر آجائے گا۔

کوئی اٹھا دے۔ ایمان کب تک چھپا رہے گا؟ ایک فراق کی ماری اپنی آنکھوں میں اختصار کے الاؤ روشن کیے زندگی کے ایک موڑ پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی تھکی تھکی سی نگاہیں پوچھ رہی ہیں کہاں ہے میرا ایمان؟ کوئی پردہ اٹھا دے، کوئی جلوہ دکھا دے۔

باہر آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔ اسی وقت بچہ دودھ کے لیے رونے لگا۔ پچھلی شام سے سیکنہ کو اچھی خوراک مل رہی تھی۔ اس نے ایک گلاس دودھ بھی پیا تھا اسی لیے اس کے سینے میں دودھ کا سمندر موجزن تھا۔ وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے بڑی سی توجہ دے رہی تھی۔

چھاتی سے لگالیا۔ منگو بابا نے خوش ہو کر کہا "تو میرے ساتھ کراچی چل کر تجارت کرو۔ ہم بھی اسے تلاش کریں گے، وہ کبھی نہ کبھی مل جائے گا۔" تک تو میرے پاس رہنا اور اس بچے کو دودھ پلاتی رہنا۔

میں منگو بابا کے ساتھ اس شہر میں آگئی اور اس کے ساتھ فقیروں کی ٹولہ بھیک مانگنے لگی۔ کتنی ہی سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر اور چادریں جھپ کر بیکساتے میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی تھی۔ میں ایمان علی کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی میری نگاہیں اسے تلاش کرتی رہیں۔ یہ دل میرے قابو میں نہیں ہے، مجھے سمجھاؤ میں اس سے نہ ملوں مگر اسے دیکھ تو لوں کہ وہ ایمان کے سفر میں کتنی دور نکل گیا ہے ایمان اس کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ سفر کے دوران وہ تھک کر نہیں گرا تھا بلکہ تھا۔ اس پر چادر ڈال کر اس کی پچان مٹا دی گئی تھی اور سیکنہ سے کہا جا رہا تھا کہ سے روتی رہے۔ اس طرح روتی رہے جیسے اس کا قصہ مر گیا ہو۔ کسی رشتے آجائے تو کوئی روتا بھی ہے مگر ایمان مرحائے تو کوئی نہیں روتا۔ جس کی لاش حاصل ہو اس کی موت سے خوشی ہوتی ہے۔

لاش کے سامنے سفید چادر پر پیسوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کے ہاتھوں سے گر گر کر ٹھکراتی ہوئی ایسی ہی طرح بچ رہے تھے۔ چاند رات کی خوشبو ہی فراخ دل ہو گئے تھے۔ اس طرح ڈھیر سارے پیسے چھینکتے جا رہے تھے جیسے ایمان کا کفن پتھر کو کوئی تاریخی کارنامہ انجام دینا چاہتے ہوں کہ دیکھو تیرہ سو سال سے ہمیں مذہب بتانے کی کوشش کرتا آ رہا ہے۔ آج ہم اس کی کوششوں کو سونے سے لے رہے ہیں تاکہ آئندہ نسلوں کے ماہر آثار قدیمہ جب زمین کی تہ سے اسے کو کاٹ سونے کا کفن اس بات کی سند رہے کہ ایمان کو اس کے شبانہ شان و دفن کیا گیا ہے۔ کبھی کیا سکتے ہیں؟ ہم سچ نہیں بول سکتے اور سچ نہیں سن سکتے لیکن زبان سے یہ یقین دلاتے ہیں۔ شریف نہیں ہیں، شرافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اندر سے ملہ ہیں، اوپر سے اسلام کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہم آج جتنے دھنگلے ہیں کل نہیں تھے بھی ہمیں اپنے کردار پر شرم نہ آئی تو آئندہ کل بھی ہم اپنی جیسی دھنگلی فطرت پیدا کریں گے۔

”میرے ایمان! میری جان آنکھیں کھول، تو نہیں مر سکتا ایمان کو کوئی نہیں مار سکتا۔ تو ایک سانس کے بعد دوسری سانس لے گا اور ہر آزمائش کے بعد زندہ رہے گا۔“

اس نے آنکھ نہیں کھولی، صرف لب ذرا سے کھولے ”پاپائی۔“

تب اس کے چہرے کی مرونی سکنے کی سمجھ میں آئی۔ وہ صرف پیاسی نہیں بلکہ بھوکا بھی تھا۔ وہ اپنے خاوند کے فاتحہ زدہ چہرے کو پہچانتی تھی اس لیے پھر دوڑتی ہوئی دروازے تک گئی اور اسے پیٹ پیٹ کر کہنے لگی۔

”سنگو بابا میرا خاوند زندہ ہے، وہ بھوکا ہے۔ اس کے لیے دو دھ اور روٹی لے آ۔ خدا کے لیے اسے بھالے۔“

”اری کیوں باڈی ہو رہی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تو راتوں کو بھی نیند میں اسی طرح زبردستی ہے۔ میرے ایمان کو بچاؤ میرے ایمان کو بچاؤ۔“

”مرنے سے چلانے والے سنگو، سالانہ بکھڑکھا موس ہو جائے گی۔“

گوئی اس کی نہیں سن رہا تھا، سب اپنی کارہے تھے۔ وہ جنگلی کے اندر پنجرے کے پنچھی کی طرح پوچھ پڑھ رہی تھی۔ ایمان کی سلامتی کے لیے خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔ ادھر آری نمی اور جاری تھی۔ پروانے کی طرح شمع ایمان کا طواف کر رہی تھی۔ ایک طرف پتہ بھوک سے بلک رہا تھا، دوسری طرف ایمان علی کا منہ بھوک سے کھلا ہوا تھا۔ وہ کس کی بھوک مٹائے؟ کس طرح مٹائے؟ پتہ مسلسل رو رہا تھا، چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہر بیٹھے ہوئے سنگو بابا کا دل تڑپنے لگا کیونکہ وہ اس کی اپنی بیٹی کا پتہ تھا۔ نواسے کا رونا روات نہیں ہو رہا تھا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا جنگلی کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔

”امری کیا پاگل ہو گئی ہے؟ کیا بچے کو دودھ نہیں پلائے گی؟“

منگو بابا کے ساتھ دوسرے فقیر بھی بڑبڑاتے ہوئے اندر آئے مگر سیکنہ کو دیکھتے ہی ملک کر خاموش ہو گئے۔ وہ مروے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے کھلے ہوئے منہ میں اپنی زبان ڈالے لعاب وین سے اس کے حلق کو تر کر رہی تھی۔ ایک چراغ دوسرے چراغ کو روشن کر رہا تھا۔ وہ بھی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ مردہ سانس لے رہا تھا اور وہ بڑی بے باکی سے اس کے منہ میں منہ ڈالے ہوئے تھی۔ یہ مسیحائی کا ایک انداز تھا کہ ایک کی بے باکی سے دوسرے کو زندگی مل رہی تھی۔

ہوا کی تیزی نے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ایمان علی کے چہرے پر سے چادر کا کنارہ اڑا کر دیا گیا تھا۔ سیکنہ پر جیسے ایک ساعت کے لیے سکتہ طاری ہو گیا اور کپڑی سانس اوپر اڑا پھر وہ چیخیں مارتی ہوئی قریب آئی اور ایمان علی سے لپٹ کر رونے لگی ”میرا ایمان جان! بائے میں کیسی ہوں، اب تک تجھ پر جھوٹے آنسو بہاتی رہی۔ بائے! مجھے برا آجائے، تجھ سے پہلے میں کیوں نہ مر گئی۔“ وہ چیخ رہی تھی، ٹرپ ٹرپ کر بین کر دی اس کی آنکھوں سے سجے آنسو رواں تھے۔ باہر سے منگو بابا نے ڈانٹ کر کہا۔

”اُری پاکل ہو گئی ہے، تجھے اب عید گاہ پر چل کر رونا ہے۔ ابھی چپ ہو جا۔“ وہ ایک دم سے چپ ہو گئی اور حیرانی سے ایمان علی کی صورت دیکھنے لگی۔ اس

لپٹ کر دوتے وقت محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لاش کی طرح سرو نہیں ہے اس کے بدن میں
جلگی سی غیر محسوس سی حرارت ہے۔ ایک مرد کا جسم ہو اور چھپی چھپی سی حرارت ہو
عورت کا بدن ہی محسوس کرتا ہے۔ کیا میرا ایمان زندہ ہے؟ وہ دل کی جگہ کان لگا کر
سُننے لگی۔ وہاں بہت ہولے ہولے کمزور سی دھڑکنیں اپنی زندگی کی گواہی دے رہی تھیں
ترنپ کر چیخ مارتی ہوئی اٹھ گئی اور جھگی کے دردناکے کی طرف بڑھتے ہوئے ہوئی۔
ایمان زندہ ہے، میرا خداوند زندہ ہے خدا کے لیے اسے بچاؤ۔"

باہر سے ایک فقیر نے دوسرے فقیر سے کہا ”بے چاری شام سے اسے خاوند بنا رکھی ہے۔ ایک تو پہلے ہی خاوند سے بچھڑ کر آؤ گی یا کھل ہو گئی تھی“ اب روتے روتے اسے اپنا خاوند سمجھ رہی ہے۔“

دوسرے فقیر نے کہا ”اچھا ہے“ عید گاہ میں پاگلوں کی طرح روئے گی تو زیادہ پہلے
 ”۔“

انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تو وہ پھر ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ اسے یاد کیا کہ بچے ضد میں آکر سانس روک لیتے ہیں تو دیہات کی عورتیں کیا عمل کرتی ہیں۔ وہ غور سے ایمان علی کے چہرے پر جھک گئی۔ نیم مہرے کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا وہ اپنا منہ اس کے منہ میں ڈال کر زور زور سے پھونکنے لگی۔ اس کے جیسے بھڑوں میں سانس بھرنے لگی۔ وہ جانتا کہ یہ عمل کرتے ہی ایمان علی کی ہمت ہی ہولے سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خوشی سے روتے روتے چیختے لگی۔

سب ہی سمجھ میں آگیا کہ وہ نیند کی حالت میں ایمان کو بچانے کے لیے نہیں کہہ
تھی نہ ہی اس پر خواہ مخواہ رونے کا جنون سوار ہوا تھا بلکہ یہی اس کا ایمان علی ہے
تلاش کر رہی تھی۔ منگو باجی چیخ کر دوسروں سے کہہ رہا تھا۔
”ارے دیکھتے کیا ہو“ دوڑ کے جاؤ۔ اس کے لیے دودھ روٹی لاؤ۔ یہ میرے نانا
دودھ پلاتی ہے۔ کیا میں اس کے سناگ کو نہیں بچاؤں گا؟ جاؤ جلدی کرو۔“
اس کی چیخ و پکار اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ ایمان کو زندہ رکھا جائے گا۔
اپنے ایمان علی پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا اور سیکڑی
آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھللا رہے تھے۔ عید کی صبح ہو رہی تھی۔



چور رشتہ

ہماری مذہب سوسائٹی میں جب
وہ رشتہ قائم کرنے کی اجازت
نہیں ملتی۔ تب آدمی تہذیب کے
چور دروازے سے ایک چور کی طرح
اسی رشتے تک پہنچتا ہے۔

ہر وقت چشم تصور میں کوئی البیلی سی حسینہ مجھے اپنی طرف بلاتی رہتی ہے اور میں اس کے ساتھ ذرا بے نیازی سے پیش آتا ہوں۔ سنا ہے کہ عورت کے سامنے ذرا بے نیازی برتو تو وہ ناز و نہن کر بیچھے بیچھے چلی آتی ہے مگر یہ سب میری جاگتی آنکھوں کا خواب ہے اگرچہ جج کوئی حسینہ میری طرف مائل ہو تو میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ”دوسروں کو مایوس کرنا گناہ عظیم ہے۔“ شاید یہ بات حسین لڑکیوں کے سلسلے میں ہی کہی گئی ہے۔

پہلے تو میں اس انتظار میں رہا کہ کوئی ضرورت مند خود ہی چل کر میرے پاس آئے گی کیونکہ آئینہ مجھے سمجھاتا تھا کہ میں ایک خوبصورت اور اسارت نوجوان ہوں۔ مگر آئینے تو بد صورت بوزخوں کو بھی یہی سمجھاتے ہیں۔ میں شیو کرنے کے بعد اور بہترین سوٹ پہننے کے بعد اپنی بیوی سے پوچھتا تھا کہ میں کیسا لگتا ہوں وہ نیک بخت جواب دیتی۔

”اللہ بہت اسارت لگ رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرتا۔ میں تو خاموش نظروں سے آپ کی نظراں دیتی ہوں۔“

کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ ہر فرمانبردار بیوی اسی طرح اپنی شوہروں کی نظرس اتارتی ہے۔ ان کی نظروں میں خوب صورتی ہے۔ ہے کہ دنیا کا سب سے خوب صورت مرد مجازی خدا ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایئر کنڈیشنڈ امپالا ہے۔ وقتاً فوقتاً سر راہ جب کوئی لڑکی لفٹ مانگتی تھی تو مجھے اپنی خوبصورتی کا یقین ہو جاتا تھا۔ آخر عورتوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی جگہ میں کوئی خاص بات ہے۔ مگر لفٹ مانگنے والیاں دوبارہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے زیادہ میری ایئر کنڈیشنڈ امپالا خوب صورت ہے۔ پھر بھی میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ یہ خیال تقویت پہنچاتا ہے کہ لڑکیاں بد فطرت ہیں جو مجھ جیسے با فطرت انسان کی قدر کرنا نہیں جانتیں۔

اس طرح اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے کئی برس گزر گئے۔ آخر پے در پے ناکامیوں نے مجھے سمجھایا کہ مانگنے سے کچھ نہ ملے تو مذہب انداز میں بڑے سلیقے سے جھین لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”پشاور صادق علی اینڈ سنز کے ادارے میں ناولوں کی پروف ریڈنگ کے لیے ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ تعلیمی صلاحیت کچھ بھی ہو مگر رومانی ناول پڑھنے سے دلچسپی رکھتی ہو۔“

چور رشتہ

انسان کی خواہش ہر لمحہ جتنے بچے دیتی ہے ان کا شمار کوئی نہیں کر سکتا۔ ایک خواتین کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، خواہشات سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں نوڑا سیدہ کیڑوں کی طرح کلبلائی ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتی ہیں اس نکتے کے پیش نظر لکھا جاتا ہے کہ ”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“

میرا بھی دم نکل رہا تھا کہ ایک حسین و جمیل محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش پور نہیں ہو رہی تھی حالانکہ گھر میں ایک بیوی موجود تھی وہ بیوی پہلے محبوبہ کی حیثیت۔ میری زندگی میں آئی تھی۔ لیکن نادان محبوبائیں یہ نہیں سمجھتی ہیں کہ وہ بیوی دن رات رات گزارنے کے بعد سیکڑ ہینڈ ہو جاتی ہیں۔ مرد کے لیے پھر ان میں وہ چارم اور پیلے بے کشش نہیں رہتی۔ میں ایک عام سی حقیقت بیان کر رہا ہوں ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیوی بتالیئے کے بعد اپنی آخری سانس تک یا بیوی کی آخری سانس تک اس سے بڑ کرنی پڑتی ہے اور ہر سانس کے ساتھ یہ خواہش سرا بھارتی ہے کہ بیوی کی سانسیں چلو پوری ہو جائیں۔

میری ایک بیمار بیوی ہے۔ وہ شادی سے پہلے بھی بیمار رہتی تھی۔ دلمن بن کر آئی کھانسی اور بخار اپنے جینز میں لے کر آئی۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کرنا کیونکہ وہ میرے چار بعد پچارے پچارے پھول جیسے بچوں کی ماں ہے۔ میرا بڑا لڑکا پچیس برس کا ہے اس حساب سے میں تقریباً سولہ برس سے اپنی بیوی کے ساتھ شرعی محبت کر رہا ہوں لیکن میری داستان کا موضوع تقریباً محبت ہے۔

میں ایک بہت بڑا شاعر ہوں۔ رومانی ناولیں شائع کرتا ہوں۔ اب تک سیکڑوں ناول شائع کر چکا ہوں اور ان رومانی ناولوں کو پڑھتے پڑھتے خود رومانس کی طرف مائل ہو گیا ہوں

اشتمار میں یہ آخری فقرہ میں نے اس لیے لکھوایا تھا کہ رومانی ٹاول پڑھنے والی لڑکی ٹاول کے اوراق سے جھٹکتی ہوئی خیالوں ہی خیالوں میں کسی ہیرو کا سراپا تراشنے لگتی ہو سکتا ہے کہ ٹاول کی کتابت کی تصحیح کرنے والی لڑکی میری خواہشات کی بھی تصحیح فرما کر دے۔ میرے بارے میں ٹاول، نگاری، کتابت، حروف، ریڈنگ اور کاروباری نقطہ نظر کا کاروبار کیا۔

قائم رکھنے کے کئی شعبے ہیں۔ ہر شعبے میں مرد کام کرتے ہیں لیکن جب یہ خبر پھیلی کہ پٹنہ اس ادارے میں ایک لڑکی ملازم رکھی جائے گی تو سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ اس وقت پاکستان میں پہلی بار ہمارا ایک جھوٹا آ رہا تھا۔ جس روز درجنوں لڑکیاں انٹرویو کے آئیں اس روز ادارے کے سبھی لوگوں کے چروں پر جھانڈ پھر گئی تھی یعنی سب کھنڈتے تھے۔ جن کی مونچھوں کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے انہوں نے خضاب کا مار لیا تھا یا پھر اپنی مونچھیں منڈوا دی تھیں کیونکہ لڑکی مستقل طور سے آنے والی تھی۔ خضاب لگانے کی زحمت کون گوارا کرتا۔

عورت بڑی ظالم شے ہے جہاں پہنچتی ہے وہاں کا نقشہ ہی بدل دیتی ہے۔ بلکہ وہ اپنی ذہین آنکھوں سے چپ چاپ میرا اندر دیکھ لے رہی ہے اور مجھے سمجھ رہی ہے کہ یقیناً وہ کے لوگوں کے سوچنے کا انداز بھی بدل دیتی ہے میں اپنے دفتر کے ملازموں کو اچھی طرح سمجھ کر انہیں اسی لیے تو ملازمت کرنے کے لیے آنکھوں میں کاجل لگا کر آئی تھی۔ شاید وہ جانتا ہوں ایک باس کی حیثیت سے ان کے مسائل کو بھی سمجھتا ہوں۔ محمد و خواجہ مسیحی تھی کہ مودو سب سے پہلے عورت کی ایک چنگی بھر نگاہ مارتی ہے۔ تیر بھی ایک چنگی اُلے ملازموں کو مجھ پر مڑ گئی اتنی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دل پر پسند لڑی کو اپنی رائے سے جھوٹ کر چلتا ہے اسی لئے وہ تیر کی طرح میرے دل میں ترازو بٹھاتی۔

ہٹائیں۔ کسی لڑکی کی دوستی سے زیادہ روٹی کپڑے اور مکان کی دوستی عزیز ہوتی ہے۔ میرے دفتر میں جو لڑکی آنے والی تھی اس کی قربت مفت حاصل ہو سکتی تھی۔ اے کے سچ ایک پھول کھلے اور اس کے بعد وہ کسی کے جھم سے آنے یا نہ آنے مگر غریبوں کے لئے گھر نہیں لگتے ہیں۔ دوسرے؟ سولہ برس تک صرف ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے پیاس بجھتی رہتی ہے۔ گھر میں ایک ہی بیوی کی آواز سننے سننے کان دیکھنے لگتے ہیں۔ دوسرے؟ سولہ برس تک صرف ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے ایک رس بھری آواز تو سنائی دے سکتی ہے، پھول کے قریب جا کر اسے چھو لہائی ضرور ایک حسین دھڑیر کو قریب سے دیکھ رہا تھا اس لیے ذرا گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے نہیں۔ اک ذرا قافلے سے پھول کا حسن نظروں کو گرہاتا ہے۔ اپنی خوشبو سے آشنا کیا۔

ہے۔ اپنے رنگین پیرہن سے مرعہائی ہوئی آنکھوں میں رنگ برنگے خواب جھانک رہے تھے۔ آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم جیسے بھوکے پیاسے مزدور جانوروں کے سامنے وہ اپنے حسن کا چارہ ڈالنے آ رہی تھی۔

انڈیو کے لیے آنے والی لڑکیاں کالی بھی تھیں گوری بھی۔ صحت مند بھی تھیں۔

”یہ دورانی صاحب کون ہیں؟“

”شہناز دورانی“

”یہ کونسا نام؟“

”نظر کی جھپکا کر ذرا شرارتی، ذرا مسکراتی ہوئی بولی۔“

”میری کوٹھی میں بہت سے غیر مطبوعہ ناولوں کے مسودے پڑے رہتے ہیں۔ تم وہاں آکر انہیں پڑھو گی اور ان مسودوں پر اپنی رائے دینے کے لیے نوٹس لکھو گی۔“
”کیا مسودے پڑھنے کے لیے آپ کی کوٹھی میں آنا ضروری ہے؟ وہ تو دفتر میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔“

”کبھی اشارہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ یہ لڑکیوں کی بہت بری عادت ہے۔ سمجھتی بھی ہیں تو تباہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں اسے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔“

”ہاں غیر مطبوعہ مسودے راز میں رکھے جاتے ہیں تاکہ دوسرے پبلشروں تک ان کی تک نہ پہنچے اسی لیے میں انہیں دفتر میں نہیں لاتا ہوں اگر تم کوٹھی میں آکر انہیں پڑھو گی تو پڑھنے کے تین سو روپے الگ سے ملیں گے۔ اس طرح تم ہالانڈ آٹھ سو روپے حاصل کر سکو گی۔“

”وہ ہولے سے مسکرائی جیسے آٹھ سو روپے بھی کچھ پیسے ہی سے ہوں لیکن آنکھوں کی سرت آئینہ چمک کو نہ چھپا سکی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آٹھ سو روپے اس کی توقع سے زیادہ ہیں۔ اس نے ذرا بے نیازی سے کہا۔“

”میں یہ ملازمت کروں گی مگر کوٹھی میں جانے والی بات ایسی ہے کہ ذرا سوچ کر جواب دلاں گی۔“

”یہ تمہاری مرضی ہے میں نے تو تمہاری پریشانیاں دور کرنے کے لیے اضافی آمدنی کا راستہ دکھایا ہے۔ بہر حال کل سے تم ڈیوٹی پر آ جاؤ۔“

”اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی پولیس ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت مخلص اور مہربان ہیں میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گی۔“ وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے محو کر میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ چمکتی رہی۔ ہر نئی چیز سونے کی طرح چمکتی ہے۔ اس سنہری چمک کے سامنے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ جو سامنے سے چلی گئی تھی بس وہی بار بار نگاہوں کے سامنے چمکتی رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس طرح موم کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک مدت سے ایسی ہی کسی حینہ کا خنجر تھا۔ بڑے مہر سے انتظار کر رہا تھا اب وہ آگئی تھی تو مہر نہیں ہو رہا

”میرے ڈیڈی ہیں“

میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ بھلا ڈیڈی کا ذکر کرتے وقت اسے شرمائے ضرورت تھی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ شرمانے والی بات پر شرماتی ہیں شرمانے والی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

”ہمارے یہاں جب ناول چھپنے کے لیے پریس میں جاتے ہیں تو دفتر میں رات تک کام ہوتا ہے۔ کیا ایسے وقت تمہارے ڈیڈی تمہیں اور ٹائم کی اجازت دیں گے؟“
”جی ہاں! مجھے گھر والوں کی طرف سے پوری آزادی ہے۔ میری ہی محنت سے اگر اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو ہاتھ پیسے دیتے ہیں ان ہاتھ کوئی نہیں پکڑتا، کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھ کتنی دیر تک اور کتنے تک کہاں جاتے ہیں؟“

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چھوٹی سی عمر میں بہت سے عجیب تجربات کیے ہیں۔“
میں نے چھوٹی سی عمر اس لیے کہا کہ وہ خوش ہو جائے حالانکہ وہ ایسی کم عمر نہیں ایک دم بیکے ہوئے پھل کی طرح تھی۔ عورت کو خوش کرنے کا موقع آئے تو وہ ہرگز سے جانے نہیں دیتا چاہیے۔ وہ مسکراتے ہوئی بولی۔

”ہاں اب بھی زندگی میں تنجیاں ہیں اسی لیے تو ملازمت کرنے نکلی ہوں۔ یہاں وقت ذہن الجھا ہوا تھا کہ نہ جانے یہ ملازمت ملے گی بھی یا نہیں؟ اگر ملے گی تو کتنے ملے گی؟“

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے خوش خبری سنائی۔
”تمہاری ملازمت یہی ہے تنخواہ پانچ سو روپے ہالانڈ ملا کرے گی۔“
اس کام کے لیے پانچ سو روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر اس نے کچھ زیادہ اظہار نہیں کیا، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں نے جلدی سے ”اور ٹائم کرو گی تو زیادہ پیسے ملیں گے۔“

اس نے پوچھا۔

”یعنی فاضل وقت میں کیا کام کرنا ہو گا؟“

میں نے جواب دیا۔

بیگم کی کیا ضرورت تھی؟

آپ کیس کے میں انسان نہیں شیطان ہوں۔ ایک وفادار اور خدمت گزار بیوی کی موت کی تمنا کر رہا ہوں۔ بظاہر آپ کی بات درست ہوگی مگر ایمان سے کیس کے کرنی نوٹ کے عزیز نہیں ہوتے؟ ریمسہ بیگم بھی مجھے اسی طرح عزیز ہے۔ مگر انگلیوں نے اس نوٹ کو جھوٹے جھوٹے میلا کر دیا تھا اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ کیا آپ کسی بینک کے کاؤنٹر پر جا کر ایک برائے نوٹ بچینک کر اس کی جگہ نیا نوٹ حاصل نہیں کرتے؟ یہ کون نہیں چاہتا کہ پرانی چیز کے بدلے نئی چیز مل جائے۔ اگر میں چاہ رہا تھا تو کون سا گناہ کر رہا تھا۔

میرٹنی ہوم تک پہنچتے پہنچتے میرے داغ میں مثبت اور منفی سوچیں آپس میں لڑتی رہیں۔ مثبت سوچ مجھے اخلاق اور مروت سکھاتی رہی کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بڑی شرافت سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن میں نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہے تو وہ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہوتے ہیں یا اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے من کو مارنے میں درنہ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ آج بھی اگر کوئی حوا زادی مگر اگر ایک نجیب الافین آدم زاد کو دیکھ لے تو وہ خوف خدا کے باوجود اس کا ہاتھ تھام کر مذنب کی جنت سے نکل جاتا ہے۔

اہستہ اہستہ بیگم مرتے مرتے بچ گئی ہیں۔ بچہ اور بچہ دونوں فزیت سے ہیں۔ میں نے ریمسہ کے بیڈ پر پہنچ کر اسے دیکھا وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی تھی۔ اس ڈھانچے پر جو کمال منڈھی ہوئی تھی وہ مادہ درق کی طرح بالکل سفید تھی مارا خون بچنے سے نچوڑ لیا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ میں نے اس کا خون نچوڑ لیا ہے۔ آج سے پہلے شہناز میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود میں نادانستگی میں بغیر شعوری طور پر ریمسہ بیگم کو آہستہ آہستہ قتل کرتا آ رہا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹنے لگی۔

”دیکھیے صادق آپ آپ جیسے پڑھے لکھے ذہین لوگ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کریں تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ میں نے ریمسہ بیگم کی پچھلی زندگی میں ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ اس عورت میں اب جان نہیں رہی۔ خدا کے لیے اسے بخش دیجئے لیکن پتہ نہیں آپ کتنے بچوں کے باپ بن کر زانیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

تھا۔ میں نت نئے جھکندے سوچ رہا تھا کہ کسی بھی ترکیب سے وہ میرے عشق میں ہو جائے۔

اسی وقت فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی آواز ایسی کرخت تھی کہ شہناز چپکا چور ہو گئی۔ میں نے بری ناگواری سے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ کوئی کاؤنٹر کال ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کال ہزاروں روپے کا منافع پیش کر سکتی تھی مگر اس وقت منافع کا بھی لالچ نہیں تھا۔ صرف شہناز کی تمنا تھی لیکن میں دفتر میں بیٹھ کر کتنے دنوں سے منہ موڑ سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے ایک لیڈی ڈاکٹر کی آواز آئی۔

”ہیلو۔ میں ڈاکٹر شازیہ بول رہی ہوں۔ کیا صادق صاحب موجود ہیں؟“

”میں صادق ہوں۔ میری بیگم کا کیا حال ہے؟“

”بہت سیریس کیس ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ذہنی کے وقت بچہ کی با خطرہ ہے۔ آپ فوراً یہاں آ جائیں۔“

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے بھی جھنجھلا کر ریسیور کو کیڈل پڑا کیسی ٹواہوں کی محفل گنجی ہوئی تھی اور کیسے یہ زندگی مجھے پتہ چلا رہی تھی۔ کہاں شہناز کہاں میری ریمسہ بیگم۔ ایک آمد ہمار تھی تو دوسری رخصت ہمار۔ اب شوہر کا نبھانے کے لیے میرٹنی ہوم تک جانا ضروری تھا لہذا میں اسی وقت دفتر سے اٹھ گیا۔

میرٹنی ہوم کی طرف جاتے وقت میری آنکھیں کاری دند اسکرین کے پار دو تھیں اور داغ دیوار گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرتا ہوا کبھی شہناز کی طرف اور کبھی ریمسہ کی طرف ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ریمسہ بیگم کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ جانے کیوں میں ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک ذہنی چراغ بجھ رہا تھا اور ایک نئی جگہ لگتی ہوئی شمع روشن ہو رہی تھی۔ میں بے ایمانی کی باؤ میں چھپا کر نہیں رکھتا۔ صاف کہتا ہوں کہ ریمسہ بیگم کو رخصت ہو ہی جانا چاہیے۔ پرانا لباس کب تک پہن سکتا ہے اگر وہ لباس کسی پرانے رشتے کی یاد دلاتا ہو تو اس سے زیادہ اسٹور میں رکھا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اسے جھانک کر دیکھا جاسکتا ہے مگر میں ریمسہ بیگم کی یاد دلانے کی بہت سی چیزیں تھیں۔

طور سے غصہ آتا ہے۔ وہ کہنت لیڈی ڈاکٹر مجھے قاتل کہہ رہی تھی مگر قاتل کسے کہتے ہیں؟ کسی کو چمرا گھونپ کر کسی کا گلہ دبا کر کسی کو شدید زخم پہنچا کر اور دلنا قتل ہے لیکن میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ اگر میں اپنی بیوی کو محبت سے آغوش میں لیتا ہوں اور اس کی سچ کا ہم سفر بنتا ہوں اور ایسے میں وہ موت کی طرف جاتی ہے تو میں کیسے قاتل کلاؤں گا؟ اگر ہم سب کی ازدواجی زندگی میں اور سماجی زندگی میں کوئی محبت سے دھیرے دھیرے مرنے یا مرنے سے پہلے قاتل کے ذمے میں نہیں آتا۔ قانون کے کسی ذمے میں نہیں آتا۔ اگر آتا ہو تو کوئی مجھے گرفتار کر لے۔

میں نے رخصت کے پاس پہنچ کر اسے بتایا کہ وہ تک چڑھی لیڈی ڈاکٹر کس طرح ہماری پاکیزہ محبت کو برباد قرار دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم آئندہ بچے پیدا نہ کریں۔ میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں کہ میری بیوی کٹر مذہبی قسم کی عورت ہے۔ وہ بھی عام عورتوں کی طرح بچوں کو خدا کی دین سمجھتی ہے اور شوہر کے کروت بھول جاتی ہے وہ بھی آنے والے بچے سے دشمنی نہیں کرتا چاہتی تھی مگر اپنی کمزوری اور بیماری کے پیش نظر دوسرا راستہ اختیار کرتی تھی یعنی مجھ سے دوسری دودھ پلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”آپ ناراض نہ ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر میری بھلائی کے لیے کہتی ہے اس بار آپ میری ایک بات مان لیں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ سال چھ ماہ کے لیے مجھے میرے میکے میں چھوڑ دیں۔ میں ہڈیوں کا دھانچہ بن گئی ہوں۔ میکے میں رہوں گی تو شاید کچھ صحت یں جائے۔“

وہ خود ہی میرے راستے سے ہٹا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہزادہ اپنی ماہانہ آمدنی پورے پڑھنے کے لیے میری کوٹھی میں آئے گی۔ اگر رخصت کچھ عرصے کے لیے چلی جاتی تو اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن میں فوراً ہی راضی نہ ہوا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تمام کڑجھاتی انداز میں کہنے لگا۔

”تم نے مجھے اپنا عادی بنادیا ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے وقت گزاروں گا۔ جانے سے پہلے ایک اور تصویر اتروا لیتا۔ میں رات کو اسے سرہانے رکھ کر دیکھ کر کہوں گا۔“

میں نے اسے جواب دیا۔

”بچے خدا کی دین ہیں۔ اگر ہم انہیں وجود میں آنے سے روکتے ہیں تو دوسرے فلم میں ان بچوں کے قاتل بن جاتے ہیں۔“

”اسی لیے آپ اپنی بیوی کے قاتل بن رہے ہیں۔“ لیڈی ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں ”ایک عورت جو آپ کے گھر کو جنت بناتی ہے جو آپ کی آئندہ نسل کو اپنی گود میں پالتی آپ اس عورت سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ جو آپ کی اولاد کو دودھ پلاتی ہے آپ قطرہ قطرہ زہر دیتے ہیں کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے؟“

میں نے غصے سے کہا۔

”ڈاکٹر میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کہ آپ اس انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ اپنا رویہ درست کریں۔“

لیڈی ڈاکٹر کو ہوش آگیا کہ وہ جوش میں باتیں کر رہی ہے۔ وہ ایک گہری سانس لے ہوئی بولی ”سوری مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں نہیں بولنا چاہیے صرف ایک ذاتی حیثیت سے سمجھانا چاہیے مگر آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔ ہر حال آئندہ آپ اپنی یہ بات نہ لائیں۔ اس شہر میں اور بھی سیکڑوں میٹرنٹی ہوم ہیں۔“

”آپ کی اطلاع کا شکریہ۔“

میں اٹھ کر جانے لگا لیڈی ڈاکٹر نے آواز دے کر کہا۔

”ایک بات سنتے جائیں۔ بچے کی ولادت ہمارے لیے براہم بن گئی تھی۔ بچہ کے ذریعے آپ کا یہ بچہ وجود میں آیا ہے۔ بچہ کے اندر اور کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے آپ کو نہیں بتا سکتی۔ یہ آپ اپنی بیگم سے پوچھ سکتے ہیں۔ میری طرف سے یہ وارنٹ کہ اگر اب رخصت بیگم حاملہ ہوں گی تو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکے گا۔ اب آپ نہ لیں کہ کسے قتل کرنا چاہتے ہیں بیوی کو یا اس بچے کو جو وجود میں نہیں آیا ہے۔ میں انکتہ سمجھاؤں کہ قتل اسی کا ہوتا ہے جس کا کوئی وجود ہوتا ہے اس کے سمجھنے کے لیے کپاس عقل ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں کوئی جواب دینے بغیر دروازے کو ایک جھٹکے۔ کہ اس کمرے سے نکل گیا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ چہرے سے نقاب اتر جائے

کایہ نفرو تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔“

وہ جلدی سے مسودہ اٹھا کر اپنی میز پر چلی گئی۔ مگر کتنی دور جا سکتی تھی، میز تو میرے ہی کمرے میں تھی اور ذرا فاصلے پر آنے سامنے تھی لہذا وہ شراتے ہوئے خود کو مجھ سے نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ اپنی میز پر پہنچ کر مسودے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے جذبات کو چھپانے میں عورتوں کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ میں اتنے فاصلے سے اس کے چہرے کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ عینک لگنے کی ضرورت تھی لیکن میں عینک لگا کر اپنی عمر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے دن اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹ ٹائم کام کرے گی کیونکہ دفتر آنے جانے اور میاں بچ کرنے میں کافی پیسے خرچ ہو جاتے تھے ان اخراجات کو سنبھالنے کے لیے مزید آمدنی کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”میری کو نمی سوسائٹی میں ہے وہاں آنے جانے سے مزید اخراجات بڑھیں گے اگر تم چاہو تو میں شام کو دفتر سے جاتے وقت تمہیں اپنی کار میں لے جاؤں گا۔ کو نمی میں تم جتنی دیر چاہو پڑھتی رہنا وہاں سے میں تمہیں گھر پہنچاؤں گا۔“

میں اس کے لیے آنے جانے کی سہولتیں فراہم کر رہا تھا۔ کراچی شہر میں جیسے یہ سہولتیں مل جائیں وہ بہت خوش نصیب سمجھا جاتا ہے شہناز نے پہلے تو مجھے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر مجھ سے نظرس ملیں تو سر جھکا کر بولی۔

”آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر میں آپ کی گاڑی میں جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟“

”یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگ پوچھ پیچھے کیا کہیں گے۔ اتنا جانتا ہوں کہ منہ پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا کیونکہ یہاں سب میرے دست مگر ہیں۔ اونچی آواز میں کوئی بول نہیں سکتا اور نیچی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس ادارے سے باہر جو کتنے والے لوگ ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں کچھ کہنے کے لیے جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں ہماری کار کا کافی فریٹنگ آگے نکل جائے گی۔ بدنامی کے پاؤں آج تک کسی دولت مند کا چھپنا نہیں کر سکے۔“

میں نے سمجھایا۔ وہ سمجھ گئی۔ اپنی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی بصیرت اور دماغی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عقل اتنا نہیں سمجھاتی جتنا کہ دل کے زخم سمجھا دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی کہیں سے زخمی تھی اسی لیے اچھی طرح سمجھ کر شام کو میری کار میں آکر

میری باتوں سے وہ پکھل پکھل جاتی تھی میں کچھ دیر تک اسے اس کی اہمیت کا اظہار دلاتا رہا پھر اس کے ہاتھ چوم کر اس سے رخصت ہو گیا۔ چوتھے وقت میرے ہونٹا کے ہاتھ کی ہڈیوں سے ٹکرائے تھے۔ پجاری!

دوسرے دن سے شہناز ڈیوٹی پر آنے لگی۔ کچھ روز تک میں اچھی طرح اس صورت نہ دیکھ سکا۔ اس کے بیٹھنے کے لیے دوسرے کمرے میں ایک میز اور کرسی قائم کر دی گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دفتر کے سبھی لوگ اسے پروف ریڈنگ سکھانے کے اس طرح اس کا طواف کرتے رہتے ہیں کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ پہلے تو وہ ادارے کے منبر نے انہیں کھیلوں کی طرح ہٹکایا پھر شہناز کی میز اپنی میز کے قریب آ گیا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ غیر صاحب اپنا کام چھوڑ کر خود ہی اس کے حصے کی پروف ریڈ کرتے ہیں تو میں نے شہناز کی میز اور کرسی اپنے کمرے میں منگوائی۔ شہناز میرے کمرے میں آئی تو میرا کام رکھنے لگا وہ کتاب شدہ مسودہ اٹھا کر میرے پاس آکر کھڑی ہو جاتی۔

”پلیز ذرا یہ بتا دیں۔ یہاں مسودے میں لکھا ہے کہ سلیم انارکلی سے محبت کر رہا ہے محبت تو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے کیا مصنف نے یہاں غلط نہیں لکھا ہے؟“

میں نے اسے سمجھایا۔

”بعض حالات میں محبت نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد محبت ہو جاتی ہے اس لیے یہ درست ہے محبت کی بھی جاتی ہے۔ بے تکلفی معاف کیا تم نے اپنی زندگی میں کوئی تجربہ نہیں کیا؟“

وہ ذرا جھجکتے لگی۔ پھر ہلکیا جاتے ہوئے بولی۔

”تجربہ تو نہیں مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کے سمجھانے سے مجھے یاد آیا ہے کہ شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے۔“

”تم بتا رہی عورتوں کی باتیں کر رہی ہو لیکن انارکلی یہاں نہیں تھی، سلیم بھی کواڑا تم بھی کواڑی ہو مگر تم تو کہتی ہو کہ کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا۔“

وہ میری باتوں سے جھینپ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم کسی سے محبت کرو جب کرنے کے بعد محبت ہو جائے گی۔“

ہے کوٹھی ہے اور برہنہ پانزار نے والا بینک بیلنس ہے اور میرا پرس ابھی خالی ہے۔
 ”دیری انٹرٹنگ“ میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا ”تمہارے ساتھ کی لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟“

شہناز نے ایک حسرت بھری سانس لینے کے بعد کہا۔
 ”ان لڑکیوں کے موجودہ شوہر شادی سے پہلے دفتروں میں ان کے پاس تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے دولت مند شوہروں کی پرورش کرتی ہیں۔“
 اس کی باتوں سے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔
 ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا پرس خالی رہے لاؤ اپنا پرس مجھے دو۔“
 اس نے جلدی سے اپنے پرس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

”یہ میری عزت ہے میں سستی خواہشات کے عوض اسے بھرتا نہیں چاہتی۔ اس سے ڈنڈہ ہے کہ یہ خالی رہے۔ میں نے اپنی جن سیلیوں کی مثال دی ہے وہ بازاری نہیں تھیں۔ نہ ہی میں ایسی ہوں۔ ہم عورتیں ایک سہانے مستقبل کے خواب دیکھ کر بلازمت کرنے لگے تھیں۔ میرا پرس صرف ایک قبض کے آگے کھلے گا۔“

”وہ خوش نصیب کون ہے؟“
 ”وہ ہے جو مجھے ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دے گا۔“
 میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آسانی سے ہاتھ آجائے گی مگر اس کی باتوں نے سمجھا دیا کہ وہ سستی لڑکی نہیں ہے ایک باعزت اور معیاری زندگی کی تلاش ہے۔ بہر حال وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ تو وقت رفتہ رفتہ سمجھانے والا تھا مگر یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز ہاتھ آتی آتی ذرا اور سرک جاتی ہے وہ اسی کے حصول کا دیوانہ بن جاتا ہے۔ اس طرح ہرے دل میں بھی شہناز کی تمنا اور بڑھ گئی۔

”میں تمہیں ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟“
 ”کچھ چاہنے سے پہلے آپ کو سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ کتنی سنجیدگی سے میرا مستقبل سنا رہا ہے؟“
 ”مجھے سمجھنے کے لیے کتنا وقت لگے گا؟“
 ”کچھ آپ سمجھاتے رہیں گے کچھ میں اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔“

بیٹھ گئی۔

ہم اگلی سیٹ پر پہلی بار ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا اس پر اس قریب کا رد عمل کیا ہونا ہے کیونکہ وہ دوسری طرف کھڑکی کے باہر گزرا ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی لیکن میں اس سے بے نیاز نہیں تھا۔ وہ بالشت کے غلط اس کے بدن کی آغ بھجھ تک پہنچ رہی تھی اور معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا کہ ایسے آتش دان بھی ہوتے ہیں جہاں سے آج آتی ہے۔ آگ نظر نہیں آتی۔ میں نے ہلکا ہلکا ایک نظر ڈالی۔ خاموشی بوجھ بن گئی تھی۔ آخر مجھے ہی بولنا پڑا۔
 ”باہر کیا دیکھ رہی ہو یا کچھ سوچ رہی ہو؟“

وہ کھڑکی سے نظریں پھیر کر دغا سکرین پر دیکھنے لگی پھر سیٹ کی پشت سے لگا کر کہنے لگی۔

”دیکھ بھی رہی ہوں اور سوچتی بھی جا رہی ہوں۔ جب میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوں والے بہت اونچے اور بہت ظالم نظر آتے ہیں۔ ہم پر کچھ اچھا لگتا ہے۔ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے انسان کا مذاق اڑاتے ہوئے گئے ہیں۔ اب کچھ بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں تو یہ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت چھوٹے اور حقیر نظر آ رہے ہیں۔ کیرٹے کوٹھوں کی طرح ریگنے والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں؟ پیدل چلتے ہیں اور دوسرے چلتے ہیں اور گھنٹوں بس اور منی بسوں کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے حساب لگایا کہ وہ پچاس برس زندہ رہتے ہیں تو زندگی کے ساڑھے بارہ برس کراچی کے بس اسٹینڈ پر ہو کر گزار دیتے ہیں۔“

”تم ایک اچھی اکاؤنٹ بن سکتی ہو لیکن فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی قدر کرنا بدل سکتیں۔“

”میں صرف اپنی قدر پرید لے نکلی ہوں۔ حالات نے مجھے سکھایا ہے کہ ایک دن چڑھنے کا موقع آئے تو گھبرا کر نیچے نہیں اترنا چاہیے۔ آپ نے پانچ سو کے بعد مزدور کی آفری تو میں نے قبول کر لی۔ آپ مجھے فٹ پاتھ کی دھوپ سے بچا کر ایئر کنڈیشنر لے آئے تو میں نہیں گھبرائی۔ اب سے پہلے میں کئی بار گھبرا کر پیچھے رہ گئی۔ اب آپ نہیں کرنا چاہتی۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں مجھ سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ ان کے

سے چلتی ہوئی میرے بیڈروم سے باہر آگئی۔
 ”آپ۔ آپ کی بیگم اور بچے کہاں ہیں؟“ اس کے منہ سے الفاظ نکلے وقت ہاں

دے تھے۔

”وہ بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں۔“

میرے حلق میں گوازا اٹکنے لگی۔ اس نے بڑی سادگی سے رئیسہ بیگم کو پوچھا تھا مگر مجھے اس کا سوال طنز آمیز محسوس ہوا کہ آپ کے پاس تو بیگم ہے پھر وہ کی تکی کی کیا ضرورت ہے؟ ”بیگم کی موجودگی کے باوجود میں ایک مجبوری کی زندگی گزار رہا ہوں۔“ میں وضاحت کرنے لگا کہ رئیسہ سدا کی بیمار ہے اور ہمیشہ مجھ سے دور رہتی ہے شہناز کو متاثر کرنے کے لیے میں نے ایک روحانی عامل کا مکالمہ ادا کیا۔

”شہناز میں وہ نصیب ہوں جس کی زندگی میں کبھی بیمار کا ایک جھوٹا نہیں آیا۔ میں شہناز کو خُشی کے کھنڈر میں ایک زندہ لاش کی طرح رہتا تھا۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھے ایسا زہر توڑنے کی گنج پیدا ہو گئی۔ کیا تم مجھے ایک نئی زندگی دو گی؟ کیا تم میرے دل کی کمرے سے اتنے ہی کٹری دی؟ ریڈیو گرام، ریکارڈ پلیئر اور کیسٹ ریکارڈز نے میرے دل کو بھاری بھرے کھیلوں کو ابھارنے کے لیے رنگین نظاروں اور سرگیت کا مکمل اہتمام کیا تھا۔ جب وہ صوفے سے جن پر بیٹھنے والے اٹھنا بھول جاتے تھے۔ سہ طرفہ آئینوں کی سنگھار و شاباب کی سلامتی اور شگفتگی کے لیے میکس فیکٹری کی تمام مصنوعات موجود تھیں۔ میری پیاری بوی اب استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم کے فرش پر قالین ملائم اور دیریز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھستے تھے جیسے کپڑے دوسرے جذبے میں دھستا ہے اور ہولے ہولے گد گداتا ہے ویسے ہی پاؤں کی

جب ہمارے درمیان چاہت کے جذبات ہوں گے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں آپ وقت کا حساب نہ کریں۔“

وہ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلی۔ اس معاملے میں لڑکیاں قدرتی طور پر زیادہ ذہین ہوتی ہیں جو ان ہوتے ہی نجانے کس طرح اپنے بچاؤ کے جھکڑے بن جاتیں۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ بہت زیادہ دولت ہو اور دو توہنوں کی بجائے تو دولت مند پر اس کا خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جس کے پاس شباب کی ایک عزت کی ہی پونجی ہو اور وہ لٹ جائے تو سارے مستقبل کا جوا کھیلنے کے لیے نہیں بچتا۔ اسی لیے ذہین لڑکیاں ابتدائی میں سمجھ لیتی ہیں کہ آج کل عشق کے نام میں دور ہی دور سے پونجی دکھا کر چالیں چلی جاتی ہیں۔

میری کو خُشی خالی تھی۔ میں نے دو دن پہلے ہی رئیسہ کو بچوں کے ساتھ اس بھیج دیا تھا۔ شہناز میری شاندار کو خُشی میں داخل ہو گئی۔ تو وہاں کی شاندار بچوں تک دیکھتی رہ گئی۔ وہاں ایک عورت کے کون سے خواب کی تعبیر نہیں تھی۔ کمرے سے اتنے ہی کٹری دی، ریڈیو گرام، ریکارڈ پلیئر اور کیسٹ ریکارڈز نے میرے دل کو بھاری بھرے کھیلوں کو ابھارنے کے لیے رنگین نظاروں اور سرگیت کا مکمل اہتمام کیا تھا۔ جب وہ صوفے سے جن پر بیٹھنے والے اٹھنا بھول جاتے تھے۔ سہ طرفہ آئینوں کی سنگھار و شاباب کی سلامتی اور شگفتگی کے لیے میکس فیکٹری کی تمام مصنوعات موجود تھیں۔ میری پیاری بوی اب استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم کے فرش پر قالین ملائم اور دیریز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھستے تھے جیسے کپڑے دوسرے جذبے میں دھستا ہے اور ہولے ہولے گد گداتا ہے ویسے ہی پاؤں کی میں رہتی سرسراہٹ سی ہوتی تھی۔

میں نے صاف طور سے شہناز کو سنبھل سنبھل کر چلنے دیکھا۔ وہ دھڑکتی تھی اور نہ مجھ پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی کٹورا ابھی آٹکھیں خواب ٹانگ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بہت ہی خوب تھا۔ فوم کی پچیلی بیج پر ہفت رنگ فانوس کے کتے ہی رنگ پھسل رہے تھے۔ خواب پیچھے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں پھسل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ فوراً ہی

میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں سمٹ لیا۔

”پیارا، دامت حاجت کرنے لگی“ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ابھی یہ مناسب نہیں تھا۔ اگر آپ حد سے بڑھیں گے تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔ پلیز مجھے چھوڑ

زور کی کامو اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر جتنی دیر وہ میرے بازوؤں

میں اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ میری آغوش خالی ہو گئی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک خالی خالی سے کھڑے رہے پھر میں نے اسے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں جا۔ وہاں تو ایک کھڑکی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں جا۔ وہاں تو ایک کھڑکی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں جا۔ وہاں تو ایک کھڑکی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔

کر گھر والے سمجھ میں آجاتے ہیں۔
 ”تو پھر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی چلو مسوے کل سے پہلے لے لی۔ جہاں قیوم دانی ایک بستر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر پاؤں سے سر تک ایک کوٹھی سے باہر جانے لگی تو میں نے کہا ”ہم بالکل ہی اجنبی نہیں ہیں۔ میں کوئی چادر بڑی ہوئی تھی اس کا چروٹا ہوا تھا کہ بوڑھا نہیں ہے آنکھوں کی گرائی بتا رہی تھی کہ ایک تسمار ابا چھ کڑ کر چل سکتا ہوں۔ اتنی آس تو دلاؤ کہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے ہتھکڑی کے مصائب نے اسے بوڑھا بنا دیا ہے۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے مصافحہ کے لیے ہاتھ پرجاتے ہوئے کہا۔“

وقت صرف کر رہا تھا۔
شاید وہ میری نیت کو سمجھ رہی تھی چونکہ میں صرف ایک ہاتھ کو تمام کراہی، انگوٹوں پر نالغی گرا تھا۔“

”میرے پاؤں آپ کی طرف نہیں جاسکتے مگر آپ کے پاؤں مجھ غریب کی طرف آگئے ہیں میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ باہر کی دنیا سے کوئی تو ایسا ہے جو میری عیادت کے لیے آیا ہے۔“

میں نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

”آپ باؤس نہ ہوں مجھے جب بھی فرصت ملے گی میں آپ سے ملنے آیا کروں گا۔“

”صالح صاحب!“ اس نے کہا ”دنیا والے صرف ایسے ہی لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ان کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو میری دلجوئی کے لیے آئیں گے۔“

اسے کیا معلوم تھا کہ میں بھی اپنی ضرورت پوری کرنے یعنی اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لالچ میں دہاں گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں شہناز کو کسی کی بیوی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ اب جان کر غصہ آ رہا تھا ایسے ہی غصے کے وقت وہ چائے لے کر آگئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا بھی گوارا نہیں کیا۔ پیالی اٹھا کر گرم چائے کو پھونک کر جلدی جلدی پینے لگا۔ چائے کی گرمی سے زبان جل رہی تھی۔ شہناز کی موجودگی سے دل جل رہا تھا۔ نفرت سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی پھر اس کی گئی کے لیے اٹھ گیا۔ شہناز نے مجھے نہیں روکا۔ وہ کس منہ سے مجھے روکتی؟ اس کے غور نے مجھے دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے اس دم گھٹنے والے ماحول سے اٹھ گیا۔

اپنی کو غمی پر پہنچا تو وہ ایسی خالی خالی سی تھی کہ وہاں کا ہر کمرہ منہ کھولے مجھے ننگے کو دیکھتا۔ ایک گھنٹے پہلے وہ اسی جگہ آئی تھی اور اپنے مہکتے ہوئے دودھ سے ایک روحانی فضا کرنے کے بعد اس بستر سے اٹھ کر قبرستان کے راستے پر جاؤں گا۔ چار کاغذوں پر لکھ کر اس کے نکل کر اس راستے پر جانے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑا ہوا تھا مگر اس کے اندر زندگی کی جواہر جھپٹنے اور دھڑک رہا تھا۔ مجھ پر یا بیوی کو بازوؤں میں اٹھالنے کی جو خواہشات سب اس کی گفتگو کے الفاظ میں، آواز کے درد میں بین کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور میں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہناز سے فہم درانی کی شادی؟ کس میں نہیں سن رہا ہوں۔ میں نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو وہ نظریں جھکا کر یہ کہتی ہوئی کہ ابھی چائے لے کر آ رہی ہوں۔ اس کی جھکی ہوئی نظروں نے اور کترا کر دہاں سے جانے کی انداز لے لیتا تھا کہ وہ اچھوتی دھیشیہ نہیں ہے شادی شدہ ہے اور اس کے ساتھ جو درانی آتا ہے وہ اس کے شوہر کا نام ہے۔

اس کا شوہر فہم درانی کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے کان سن رہے تھے مگر دماغ نہیں تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ شہناز مجھے اپنے گھر میں ایک طمانچہ مارنے لائی تھی۔ یہ بات تو وہ مجھے میری کو غمی پر بتا سکتی تھی۔ انٹرویو کے دن بھی بتا سکتی تھی۔ یہ کسی زلالت تھی کہ شوہر کا نام سن کر تھی اور باپ کا رشتہ بتاتی تھی۔ یہ ہماری دنیا میں کیسے کیسے متاثر ہوتے ہیں؟ باہر سماجی اور خونی رشتے سمجھ میں نہیں آتے۔ فریب کا پردہ چاک کیا جائے تو انسانی رشتے سمجھ میں آتے ہیں؟

اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی بہانے وہاں سے جاؤں۔ اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ فالج زدہ فہم کو دیکھ کر یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ کسی بھی بہانے سے فوراً واپس جانے کا ارادہ ظاہر کر دوں تو وہ نہ جانے کیا ہو گا۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

”آدمی کے دونوں پاؤں بے کار ہو جائیں تو اس کا باقی جسم بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ فالج زدہ بیروں پر جسم کا باقی بوجھ اٹھا کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چلنا تو دور کی بات ہے۔ سامنے اس دنیا کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں صرف ایک ہی راستہ ہے زندگی کی بات کرنے کے بعد اس بستر سے اٹھ کر قبرستان کے راستے پر جاؤں گا۔ چار کاغذوں پر لکھ کر اس کے نکل کر اس راستے پر جانے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑا ہوا تھا مگر اس کے اندر زندگی کی جواہر جھپٹنے اور دھڑک رہا تھا۔ مجھ پر یا بیوی کو بازوؤں میں اٹھالنے کی جو خواہشات سب اس کی گفتگو کے الفاظ میں، آواز کے درد میں بین کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور میں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں ہر کوچ کے بعد وہ میرے پاس میز کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس سے یہ طویل خاموشی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مسرور لے کر کچھ پوچھنے کے بدلے سے چلی آئی۔ اس طرح بے اعتنائی برتی جائے تو عورت پیچھے پیچھے چلی آئی ہے۔ میں نے پھر بڑی بے نیازی سے کہا۔

”مسرور غیور کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھ لو۔“
وہ جانے کے لیے میرے قریب نہیں آئی تھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے بول۔

”میرے والد کا نام شباب درانی ہے۔ اپنے باپ کے نام کی مناسبت سے میرا نام شہناز درانی ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی باپ کا یہ نام میرے نام کے ساتھ چلا آ رہا ہے اسی لیے ان دونوں کے دن میں نے صرف اپنے باپ کا ہی ذکر کیا تھا۔“
میں نے نفرت سے منہ پٹا کر کہا۔

”آپ باتیں بنا کر اپنی غلطی کو نہ چھپاؤ۔ شادی کے بعد عورت باپ کا نہیں مشورہ کا نام لیتی ہے۔“

”مجبور دست کہتے ہیں مگر میں شادی شدہ ہونے کے باوجود خود کو کسی کی بیوی نہیں سمجھتی۔ کیا فیصم نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی دونوں ٹانگوں پر ناخن تراخا۔ دینا والوں کی نظروں میں میری شادی ہو چکی ہے لیکن میرے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکا کہ کس طرح میں اپنی ساگ کا سوگ منا رہی ہوں۔ میں خود کو کیا کہوں؟ بد نصیب کواری یا ساگن بیوہ؟“

میری ساری نفرت دھل گئی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی اسے کیا کہا جاسکتا ہے۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ فیصم ناخن زورہ ہے اور شہناز پر کیا بیعت رہی ہوگی اور وہ اپنی عمر کے سائے شب دروڑ کیسے گزار رہی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا۔
”ایسی بات ہے تو ہمیں فیصم سے قطع تعلق کر لینا چاہیے۔“

”کہا نا ایسی ہو یا خراب ہو جائے تو اسے پھینک جاسکتا ہے۔ انسان کو نہ پھینک جاسکتا ہے۔“
وہ اس کے برے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑا جاسکتا ہے۔ آخر محبت اور موت بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ کی بیگم دائی مریضہ ہیں۔ کیا آپ ان کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔“

آئی تھی۔ کبھی وہ میرے برے وقت میں مجھے بھی دھوکا دے سکتی ہے۔ عورت دن بھر سو کر باقی نہیں چاہیے۔ عورت کو گالیاں دے کر اسے کتھڑا کر ڈھیل بنا کر رکھنا ہے۔ جب یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا کہ بحیثیت ایک مرد ایسی عورتوں سے فائدہ ہوں تو مجھے نیند آ گئی۔ یہ غور کرنے اور سمجھنے کے لیے اہم نکتہ ہے کہ ہم اپنی کینک باوجود جب تک ایک کمینٹی عورت سے خود کو برتر نہ سمجھیں اس وقت تک نہ تو کہا جاتا ہے اور نہ ہی سکون سے نیند آتی ہے۔

دوسرے دن میں دیر تک سو نہ سکا۔ اس لیے دیر سے دفتر پہنچا۔ مجھے جین ٹھاکر منہ نہ دکھائے کی مگر وہ اپنی میز پر سر جھکائے پروف ریڈنگ میں مصروف تھی۔ میرے میں آیا اسی وقت اسے ملازمت سے الگ کر دوں۔ مگر ذاتی کشیدگی کے باعث کسی کے پر لٹ مارنا اچھی بات نہیں ہے اس لیے میں نے اسے برداشت کر لیا۔ تمام دن کام نہ ہو سکا کیونکہ وہ سامنے میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس طرف جاتی تھیں۔ الوکی ٹپٹی ایسی جاذبِ نظر تھی کہ نظروں کو جذب کر لیتی تھی۔ اس کی جھلکی ہوئی تھیں مگر اٹھی ہوئی نگاہوں کی حشر سامانی مجھے یاد آ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھتی لیکن جب دیکھا کرتی تھی اس وقت خواہ مخواہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ صورت آنکھیں صرف مجھے دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

میں ٹھہر ٹھہر کر اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا ایک ایک نقش مجھے مجھ میں ایسی حسین عورت کسی نصیب والے کے حصے میں ہی آتی ہے۔ پہلے اسے بڑے لیے میں اپنا نا چاہتا تھا اب یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ ایسی حسین اور دلکش عورت ساتھ صرف رنگین لمحات گزارے جاسکتے ہیں، سنجیدگی سے محبت کرنا محنت ہے اپنے آپ کو نڈلا تو یہ بات بھی سمجھ آ گئی کہ گھر میں بیوی تو موجود ہے ایک عجیبہ گھر دراصل میں ایک محبوبہ یا دوسرے لفظوں میں ایک داشتہ کا خواہش مند تھا۔ میں ایک بار نظروں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو اس کے لیے میرے خیالات بکھر گئے ایسا کھلونا نظر آ رہی تھی جو اپنی عمر کی چالی سے جوانی کی مدت تک چلا ہے پھر بیکار ہو جاتی ہے۔ میری بیوی بیکار ہونے کے باوجود بیکار نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ تھی۔

کر میرا ساتھ چھوڑ سکتا تھا کہ میں کسی فالج زدہ کو نہیں پہنچا کر آئی ہوں۔ کئی برس کے بعد کل میرے دل میں آپ کے لیے جگہ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ آپ مجھے طعنہ نہیں دیں گے کیونکہ آپ بھی کسی مریضہ کے دل کو نہیں پہنچا کر میری طرف بڑھ رہے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اتنے لمبے لمبے راستوں پر نہ کوئی اکیلا چل سکتا ہے نہ کوئی اکیلی چل سکتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہوتا ہے گلیا آپ بتا سکتے ہیں؟“

”ہاں ان حالات میں چور رشتے قائم ہوتے ہیں۔ اوپر سے تہذیب اور شرافت کا خول چڑھا دیتا ہے اندر سے خواہشات کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ آج تک اس دنیا کا کوئی تہذیبی اصل اس بارود کو نہیں بچھا سکا۔ ہم اپنے جیسے انسانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں تو کتنی ہی جگہ اس بارود کے دھماکے سے تہذیب کی دیواریاں اڑتی نظر آئیں گی۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سے کوئی مکمل کر اس چور رشتے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے تالیان زمین کی سطح پر بہتی تھیں اب زمین کی تہ میں بہتی ہیں اور اوپر سے ابلے لباس کا ڈھکنا چڑھا دیتے ہیں۔“

شہناز نے ہلکی سی ہنسی سے کہا۔

”یہ تو تقریر ہو گئی۔ ایسی تقریریں سماج کے مصائب اور لڑائیوں تک یا مصلحتین کے ظلم تک اچھی لگتی ہیں۔ اگر یہ باتیں قلم کی نوک سے باہر آجائیں تو اپنے اندر قہقہوں کا زخیر دھونے والے دوسروں پر قہقہو کر دیتے ہیں مگر ہم کیا کریں گے؟“

”وہی کریں گے جو حالات کا تقاضا ہے اگر نہیں کر سکیں گے تو تسبیح لے کر ایک گوشے میں بیٹھ جائیں گے کیونکہ ایک گوشے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی ضروریات اور خواہشات سے بچا جاتا جاسکتا ہے۔“

”اچھے ہوئی ہوئی۔“

”مگر یہ چور رشتہ مجھے بدنام کر دے گا، دستور کے مطابق آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم جیسی عورتوں کے لیے سماجی رشتوں میں لپک کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ یہ درست ہے کہ مذہبی اور قانونی اصولوں کے تحت عورت ایک فالج زدہ شوہر سے قطعاً نفی کر سکتی ہے لیکن انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ان حالات میں ایسے مجبور خاوند کا ساتھ نہ چھوڑا جائے۔ وفا بھی تو کوئی چیز ہے۔ پھر بھی تو کسی جذبے کا نام ہے۔ آپ یقین کریں جب میں فحیم کو بستری پر یا رومدگار پر ڈال دیکھتی ہوں تو میرا دل محبت اور ہمدردی کے

میں نے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پچھلی محبوبوں سے قطعاً نفی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر میں اپنی بیماری کو چھوڑ دوں تو انسانوں کی دنیا میں انسان کیسے لکھتا گا اور شہناز جیسی عورتیں تو ہمیشہ بدنامی کے گڑھے کے پاس کھڑی رہتی ہیں۔ جہاں ان کے ذرا بھول چوک ہوئی، جہاں انہوں نے مجازی خدا کی ذرا سی برائی کی، وہاں ان پر نفرت کے پتھر برسے لگتے ہیں۔ وہ دوسری شادی کرنے کے باوجود بدنامی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتیں۔ ان کا دوسرا شوہر بھی بے وفائی کے طعنے ضرور دیتا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر دیکھ کر دھم لے جے میں بولی۔

”میں دن رات اپنی ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہوں۔ فحیم بہت مجبور ہے۔ ہم اس مجبور کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے باوجود سوچتی ہوں کہ زندگی کی تمام خواہشیں اسی طرح خاموشی سے دم توڑتی رہیں گی۔ کوئی تو ایسا راستہ ملے گا کوئی تو ایسی صورت نکلا میں بے وفا اور بے مروت نہ لکھاؤں اور زندگی کی ساری سرشتیں میرے دامن میں سٹ آجائیں۔“

”ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں کہ بیوی گھر کی چار دیواری میں قید رہے اور اس سے باہر زندگی کی ساری سرشتیں اور خواہشیں ہمارے روپ میں مل جائیں۔ اپنا قناعت پسند نہیں ہے ہم جس محرومی کی آگ میں جل رہے ہیں وہاں قناعت پسندی ہم پہلے جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔“

میں اپنی بات کہہ کر اس کا منہ نکلنے لگا۔ جو بات میں نے کسی ذہنی بات اس کے لہجہ تھی۔ شرافت سے اور تہذیبی اصولوں سے کوئی صورت نہیں نکلی کہ محرومی کی آگ کس طرح بجھائے، جب کوئی راستہ نہیں ملتا تو بہت سے میزے میزے راستے نکل رہے ہیں اور انسان سہم سہم کر ان راستوں پر قدم رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ہنسا ہنسا ہوئے کہا۔

”اگر ہم اسی طرح ملتے رہیں تو یہ کوئی بری بات تو نہ ہوگی؟“

”ہاں! مرد کے لیے کوئی بات بری نہیں ہوتی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر کی دیواری سے باہر کوئی ساتھی ہو۔ اتنی بڑی دنیا کے اتنے لمبے لمبے راستوں پر کوئی کب اکیلا چل سکتا ہے اگر میں کسی نوجوان کا ساتھ تلاش کرتی تو راستے کے کسی موڑ پر

محدود ہوتا اور ایسی محبت کا اجازت نامہ حاصل ہوتا جس کے تحت میں آپ کی دنیا کو جنت بنا دیتی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا شہناز! ایسا اسی وقت ہو گا جب قیامت سے پہلے اولاد ماؤں کے نام سے پکاری جاتی گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا صرف دیا ہی ہو گا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یعنی چور رشتے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے بیڈ روم میں ایک صوفے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری ملاقات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اتنی مدت میں میں صرف اس کے ہاتھ کو پکڑنا آیا تھا۔ اس روز میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر سے لے پا کر اس کے شانے پر رکھا۔ وہ ذرا کسمائی مگر جدوجہد نہیں کی۔ میں نے حوصلہ پا کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ تب اس نے اعتراف کیا۔
"نہیں ہم کوئی غلطی نہیں کریں گے۔"

"ہاں غلطی نہیں کریں گے۔" میں نے اس کے کان کے قریب جذبت سے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی "لیکن پیار کرنا تو کوئی غلطی نہیں ہے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لبوں کی کلیاں کھلیں پھر کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے ہونٹ ان پر ایسی کلیوں پر رکھ دیئے۔ مدت سے ہمارا کاجھونکا نہیں آیا تھا۔ رات کی لکھ سے صبح ہمارا ان کی جبین نہیں چلتی تھی پہلی بار میرے ہونٹوں کی نمی نے پھول کی ہتھکڑیوں کو تر کر دیا تو اس کے حلق سے ایک لطیف سی کراہ نکلی۔ وہ جدوجہد کرنا بھول گئی۔ جب سانس لینا دھیر ہو گیا تو میں نے ذرا الگ ہو کر دیکھا۔ ہتھکڑیوں کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ رخسار آج دے رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں وہ میرے سینے پر سر دھ کر سسکیاں لینے لگی۔

"میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے ڈر لگتا ہے بہت ڈر لگتا ہے۔"

میں نے تسلیاں دینے کے بجائے اپنا ہاتھ ادھر سے ادھر پھیرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"ایک ڈر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پیدا ہوتا چلا جاتا ہے تو ڈرتی رہو گی تو ایک دن اپنی جوانی کا ماتم کرنے کے لیے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ کوئی اس الٹا ناک ماننے کو نہیں سمجھ سکے گا کہ تمہاری جوانی کو خوف اور شرم کی دھنوں نے کس طرح

جذبے سے بھر جاتا ہے اور جب میں اپنے بستر پر تنہا لیٹی رہتی ہوں تو میرے اپنے جذبات اور خواہشات میری انسانی ہمدردی کے باوجود وفات کرنے لگتے ہیں میرے اندر پلنے والے دکھ سے کوئی واقف نہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ ہم اسی طرح ملتے رہیں گے اور کوئی مناسب راستہ تلاش کرتے رہیں گے۔"

"تو پھر آپ وعدہ کریں کہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اس نئے راستے پر کوئی غلطی نہیں کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔ جب کہ بات کا عہد کیا جاتا ہے تو اس عہد کو مستحکم بنانے کے لیے ہم آپس میں ہاتھ ملا تے ہیں۔ نے بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا کہ کوئی غلطی نہیں کریں گے مگر اس کا ہاتھ تو میرے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا اس کے ہاتھ آنے میں کتنی دیر لگتی؟ غلطی کی ابتدا ہو چکی تھی یا نہ کہ جانے تو ہم نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو غیر شعوری طور پر چھونے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا اکثر غلطی کا آغاز شعوری طور پر نہیں ہوتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہماری دنیا بدل گئی۔ شہناز سے پہلے یہ دنیا بلیک اینڈ وائٹ نظر آتی تھی اب وہ میرے قریب آتی تو رنگوں کا جھوم لے کر آتی۔ اب میں جہاں سے گزرتا تھا عمارتوں کے باغیچوں کے پھولوں کے اور گزرنے والی کاموں کے رنگ الگ الگ دماغ میں سے نظر آتے اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو مرد کو رنگوں کی پہچان نہ ہوتی۔ شہناز احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے وہ اکثر کبھی تھی۔

"اب میری زندگی میں دوسرا دور تک مایوسی کے سائے نہیں ہیں۔ آپ کو پکارا؟ مضبوط سارے کا یقین ہوتا ہے کیونکہ عورت کسی قابل اعتماد سارے کے بغیر نشوونما جہوم میں بھی تنہا رہتی ہے اب میں نعیم کے پاس جاتی ہوں تو یہ خیال مجھے پریشان نہیں کہ میں ایک لڑکی ہوئی عورت ہوں بلکہ اب میں پہلے سے زیادہ نعیم کی خدمت کرتی ہوں آپ میری محبت ہیں لیکن وہ میرا فرض ہے اور کوئی عورت بھی فرض کو بھول کر سچائی محبت نہیں کرتی۔ کاش کہ ایسا نکاح بھی پڑھایا جاسکتا جو نعیم جیسے شوہر کے لیے فرض

مرد کا بڑھ ہوا عورت کا پرس۔ وہ ہماری سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے وہ ایک دولت مند کی طرح مالا مال ہوتا ہے یا پھر غریب کی جب کی طرح خالی رہتا ہے۔ وہ حاملہ عورت کے بیت کی طرح پھولا ہوتا ہے یا ریشہ بیگم کی طرح چمک بھی جاتا ہے اور شہناز کے وجود کی طرح ملائم اور چمک دار بھی ہوتا ہے۔ میں نے اس ملائم پرس کی زپ کھول دی اور اس کی ضروریات اور خواہشات کے ایک ایک سیکے سے پہلی بار اس کے پرس کی گود بھروی۔

پہلے ہم ایک دوسرے کی آرزو تھے۔ اب ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے اب وہ شام کو کوٹھی میں آکر مسودے نہیں پڑھتی تھی کیونکہ میں اس کی زندگی کے مسودے پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی محبت کا کیشن بڑھ گیا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ہزاروں روپے کی شاپنگ کراتا تھا۔ اس کے نام سے ایک بینک میں اکاؤنٹ بھی کھول دیا تھا اور وہ اکاؤنٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر سٹپلی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک کاروباری رشتہ تھا میں شاپنگ اور بینک اکاؤنٹ کے ذریعے اس کی جوانی کے لمحات خرید رہا تھا لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میں اپنے دل کی بات کموں گا کہ وہ دن بدن میرے دل میں سمائی جا رہی تھی۔ میں اسے خرید نہیں رہا تھا بلکہ محبت اور خلوص سے اس کے کام آ رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے وہ میرے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنتی جا رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو چیز ضرورت کے وقت فوراً ہی آسانی سے حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنی کشش نہیں رہتی اور جو چیز دنیا والوں کے خوف سے چوری چوری حاصل ہو اس کی جاہلیت اور کشش بیٹھ قائم رہتی ہے اسی لیے بیوی سے زیادہ محبوبہ حسین نظر آتی ہے۔

مگر اس حسین زندگی کو بھر کس نکلتے گا۔ میری ریشہ بیگم سیکے سے واپس آگئی تھی۔ آٹھ ماہ کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس دوران میں کتنے ہی بھانوں سے اپنی بیگم کو اس کے سیکے میں روک رہا تھا۔ کبھی مینے میں دو چار دن کے لیے لاہور چلا جاتا تھا اور اسے سمجھاتا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا اسے صحت مند اور شگفتہ بنا رہی ہے کراچی کی آب و ہوا پھر اسے بیمار کرے گی۔ میں اسے آغوش میں لے کر اس خوش فہمی میں جلا کر تارتا تھا کہ اب وہ میرے لیے صحت مند اور پرکشش ہو گئی ہے اور میں کراچی جا کر اس کی قربت کے لمحات کو نہیں بھولتا ہوں (قربت کے لمحات میں میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا کہتا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ ماہ کے بعد وہ اپنے بھاری پاؤں لے کر کراچی پہنچ گئی۔

کھایا ہے تمہارے بڑھاپے کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ بڑھاپا ایک لعنت ہے اور سمجھنے کے لیے ہمارے اطراف جوان عورتوں کا میلہ لگا رہا ہے۔ ایسے میں کسے فرصت ملے گی کہ وہ تمہارے بارے میں سوچے اگر تم صحیح معنوں میں آزاد رہنا چاہتی ہو تو دوسروں کو اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کرو۔“

ایسے مرحلے پر زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سماجی سماگ کی خوشیوں کی تلاش میں جتنی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی تھی لہذا میں اسے اس مقام سے آگے لے جانے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

میں نے اسے سمجھا دیا کہ بدنامی کا اندیشہ نہیں ہے خاندانی منصوبہ بندی بڑی اچھی چیز ہے (ہاں میں وہی ہوں جو اپنی بیگم کے معاملے میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا سمجھتا رہا) وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک وقت میں جو چیز نقصان دہ ہوتی ہے دوسرے کی دولت میں قائمہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پہلے ہتھیار ایک اچھے مقصد کے لیے اپنی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے پھر ہم اپنے مفاد کے لیے اس ہتھیار سے اپنی برائیوں کو قتل کرنے لگے خاندانی منصوبہ بندی ایک صحت مند معاشرے کے لیے عمل میں آئی ہے مگر ہمارے بل تو ایک گھناؤنے معاشرے کے مفاد کے لیے بھی کام آتی ہے۔ اس دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک راستے کے روشن کنارے پر چلا ہے کوئی تاریک کنارے پر۔

خواب گاہ خاموش تھی ہم خاموش تھے تمناؤں سانسیں لیتی ہوئی بول رہی تھی۔ بڑے سرانے والی میز پر شہناز کا پرس رکھا ہوا تھا۔ پہلی بار جب وہ میرے ساتھ میری کاندھ بیٹھ کر میری کوٹھی میں آ رہی تھی اور اس نے اپنی سیلیوں کی باتیں کرتے ہوئے کہا تھا اس کا پرس خالی ہے تو میں نے اس کے پرس کے خلا کو پر کرنا چاہا تھا۔ وہ منکر مجھے اچھے طرح یاد ہے۔ اس نے فوراً ہی انکار کرتے ہوئے پرس کو سینے سے لگایا تھا جیسے وہ اپنی تو کو کلیجے سے لگا کر رکھ رہی ہو۔ وہ عزت نما پرس میری خواب گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت خوب صورت پرس تھا اس کے بدن پر رنگ برنگے موتی جڑے ہوئے تھے۔

وہ قیمتی موتی کہیں سے ابھرے ہوئے کہیں سے ڈوبے ہوئے تھے میں ایک ایک کو چھو کر اس کے حسن کو سمجھ رہا تھا۔

مہم جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

”ہاں آپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ خواہ خواہ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔“

اس کے سمجھانے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے مگر میرے اندر فزائیم کی کوئی چیز کلکتی رہتی تھی جو مجھ سے چور سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ تم غیر شعوری طور پر ریمہ کو بنا کر اس کی جگہ شہناز کو لانا چاہتے ہو۔ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں جھلا کر بے اندر دھنچنے لگا تھا۔ اچھے خاصے چھپے ہوئے جرم کا اقرار کوئی مجرم نہیں کرتا۔ میں غراف نہیں کرتا تھا مگر پریشان رہتا تھا۔ شہناز کے سمجھانے سے بھی پریشانی کم نہیں ہوتی تھی اور ریمہ نہ سلیطے سے جیتی نہ مرنی تھی کہ مجھے اندر سے سکون حاصل ہوتا تھا۔ ایک روز

میں نے شہناز کے سامنے اعتراف کیا۔

”شہناز! میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی پردہ نہیں ہے جب ہم دونوں ایک دوسرے سے رہبات کہتے ہیں تو میں یہ بات بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ ریمہ میری وجہ سے ہوت کے منہ میں جا رہی ہے۔“

شہناز نے مجھے چونک کر دیکھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس حقیقت کا اعتراف کر لوں گا۔ میں نے کہا۔

”تم میری رازدار ہو اس لیے کہہ رہا ہوں میں دنیا والوں کے سامنے اور تمہارے سامنے بھی خود کو ایک فرض شناس شوہر ثابت کرتا ہوں کیونکہ ہزار محرومیوں کے باوجود یہ اگنا پڑا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے مگر تمہارے وجود سے زندگی کی سرشتیں چلی جاتی ہیں۔ ریمہ پہلے وہ چیزیں چھینک دیا کرتی تھیں اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں۔“

میں نے اس سے پیچھا چھوٹ جائے نہ وہ ہمیشہ کے لیے میکے میں بیٹھتی ہے اور نہ ہی مطابق ریمہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی دور کے دو سروں پر بند باندھی ہو جاتی ہے۔

”ہاں ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار پر کھینچے برس اس کی حالت بہت ہی ناؤک تھی۔ بدن میں نام کو خون نہیں تھا۔“

بہتے تھے وہ لاپ ی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو ذہن دیتی ہے مگر عورت کو بے جا وار بے وفا بنا دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

”کہہ میں فہم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ

لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس بار وہ ذہنی کے ذریعہ زندہ نہیں بنے گی۔ میں اس کا منکا سا پیٹ دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ شہناز کے لیے میں نے بیڈ روم کا ایک مکان اور لے لیا تھا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اس نے مجھے گرد دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے آپ اس نظر آرہے ہیں؟“

”ہاں! ریمہ بھرماں بننے والی ہے اس بار وہ نہیں بنے گی۔“

شہناز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی چہرہ جلدی سے نظریں جھکا تی بانظر سے ہوئی بولی۔

”خداوند کریم آپ کی بیگم کو سلامت رکھے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”یہ باتیں میں نہیں کہتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تین سال پہلے ریمہ کی ذہنی کے ایک ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ اپنی بیوی کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو یہ مر جائے گی۔“

ہمارے خاندان میں خاندانی منصوبہ بندی کو کبھی برا سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے میں آنے والے بچے کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔“

شہناز نے بوسے کنوڑے میں تائید کی۔

”ہاں یہ گناہ ہے۔ اللہ کی دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”خاندانی منصوبہ بندی کے اوارے میں فیلڈ درک کرنے والی عورتیں ہر تیسرے ماہ ریمہ کے پاس آتی ہیں اور منصوبہ بندی کے لیے پی سی ٹیبلٹ دے دیتے ہیں۔“

ریمہ پہلے وہ چیزیں چھینک دیا کرتی تھیں اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں۔“

میں نے اس سے پیچھا چھوٹ جائے نہ وہ ہمیشہ کے لیے میکے میں بیٹھتی ہے اور نہ ہی مطابق ریمہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی دور کے دو سروں پر بند باندھی ہو جاتی ہے۔

”ہاں ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار پر کھینچے برس اس کی حالت بہت ہی ناؤک تھی۔ بدن میں نام کو خون نہیں تھا۔“

بہتے تھے وہ لاپ ی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو ذہن دیتی ہے مگر عورت کو بے جا وار بے وفا بنا دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

”کہہ میں فہم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ

ہم کے سوچنے کا انداز رہا تو وہ میری بیوی کے مرنے کے بعد اپنے شوہر کو نہیں چھوڑے

کتی۔

اچانک ہی وہ دونوں تھیلیوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ہائے دی گور
چھپانے سے کیا خواہشات چھپ جاتی ہیں؟ اس انسانی نفسیات سے کون انکار کرے
کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے دماغ میں مثبت اور منفی دو سوچیں ہوتی ہیں۔ غور
تقل کرنے کے لیے منفی انداز میں کبھی نہیں سوچتی مگر حالات کے تحت وہ سوچ
مرضی کے خلاف ضرور کبھی کبھی سراٹھاتی ہے۔ جب وہ سراٹھاتی ہے اور جب
ذلیل سوچ کو روک نہیں سکتی تو وہ اپنے ہی اندر مرنے ہے اور بے بسی سے منہ چھپا
گئی ہے۔ اور وہ رو رہی کبھی مگر میں مرد ہوں میرے پاس آنسو نہیں تھے۔

”میں مر جاؤں گی“ وہ سسکیوں کی تال پر کہنے لگی ”ایسا کیوں ہوتا ہے
بس میں کیوں نہیں رہتا؟ ایسی بات دماغ میں کیوں آتی ہے جو عورت کو ذلیل
فہم نے میرا کیا کیا ڈا ہے وہ تو اپنی آنکھوں میں سامنے خواب سجا کر مجھے اپنی
تھا۔ بد قسمتی نے اسے تو ذکر کر رکھا دیا۔ وہ مجبور ہے، معذور ہے میرے سارے
وہ مجھے ازدواجی مسرتیں نہیں دے سکتا مگر میں تو اسے اپنی محبت اور اپنی توجہ
ہوں۔ عورت ہر جگہ کاروبار تو نہیں کرتی کہ مرد سے کچھ ملے تو معاوضے میں اپنی

گزاراوی پیش کرے ورنہ منہ پھیر لے۔ مگر میں منہ نہیں پھیروں گی۔ میں اپنے
جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر فہم کی آخری سانس کی
فالج زدہ وجود سے لپٹی رہوں گی۔ اس کے لیے کھانا پکاتی رہوں گی اس کے لیے
اس کے پسینے کی بو سونگھ کر انہیں دھوٹی رہوں گی۔ میں اس کے نصیب کو اجلا کر
اس کے لباس کو دھو کر تو اجلا کر سکتی ہوں۔ انسان ایسا بے محوت تو نہ ہو کہ مرنا
کر ظلم کرے یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اب اگر فہم کے خلاف میرے دل
بات آئی تو میں ذہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی
کڑھ رہا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محبت تقسیم ہوتی ہے میں اپنی بیوی کی محبت
کر کے اس کا زیادہ حصہ شہناز کو دے رہا تھا۔ شہناز بھی میری طرح کی بیوی
اعتراف کی بات یہ تھی کہ میں بیوی پرست نہیں تھا۔ وہ شوہر پرست بن رہی تھی
لیکن شہناز کو میری بیوی پرست بننے کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے بیوی بناؤں۔ تو یہ تو بے کسی
کر کے اس کا زیادہ حصہ شہناز کو دے رہا تھا۔ شہناز بھی میری طرح کی بیوی
اعتراف کی بات یہ تھی کہ میں بیوی پرست نہیں تھا۔ وہ شوہر پرست بن رہی تھی

میں بعض اوقات جھنجھلا جاتا۔ ایک تو ریسرہ اسپتال پہنچ گئی تھی اور وہاں کے ڈاکٹر اور
بازکرٹھ کھاجانے والی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں اپنی بیوی کی زندگی کو تقریباً
ایک ماہ سے مری طرف شہناز نے الجھا رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اسے صاف طور سے
دیا۔

”ریشہ اب چند دنوں کی مہمان ہے جس روز زوجگی ہوگی اس روز میرے راستے کی
رہا جائے گی۔ مگر تمہارا راستہ رکا ہوا ہے۔“

دوسرے دن کوئی
”میں فہم کو رکلاؤ نہیں سمجھتی۔ میں نے کوٹھی، کار اور بھاری بینک بینکس کے
تھا جو اسے ایک روشن مستقبل کی طرف بلاتا تھا۔ دوسری طرف کی بلندی
اسے شوہر کی خدمت گزاری اور ایک مشرقی عورت کی نیک نائی کی طرف بلاتا تھا۔“

میں مگر کروڑوں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔
”تم اپنے من کو مار کر زندہ نہیں رہ سکتی ہو، جھوٹی شوہر پرستی کو اپنے من سے
دو۔ وہ جو تمہارے دماغ میں ایک منفی سوچ ابھرتی رہتی ہے کہ تمہیں فہم
حاصل کر لیتا چاہیے، دراصل وہ منفی نہیں بلکہ مثبت اور صحت مند سوچ ہے۔“

عورت ایسے حالات میں بھی اپنے راستے کا پتھر مٹا دیتے ہیں اگر تم نہیں مانتے
کے لیے کھودو گی۔ میں جا رہا ہوں تم اچھی طرح سوچ لو۔“
میں نے ہنر کر کہا۔
”ایک اس وقت کو۔ یہ کیسی چاہت ہے کہ بیک وقت دو مردوں کو چاہتی ہو۔ یہ محبت
نکاح کی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ جو عورت اپنے شوہر کو دھوکہ دے سکتی
ہو۔“

ایک دن سے کہتے میں آگئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی
کہ اسے بے وفائی کا ٹھنڈا دوں گا۔ اس نے بڑے کرب سے پوچھا۔
”جے جانی اور بے وفائی کی بات صرف عورت کے لیے کیوں کی جاتی ہے آپ جیسے
میں نے سوچا ہے۔ جب ہاتھ آئی ہوئی مسرتیں اور
گتی ہیں اور زندگی کا معذور اپنا چہرہ سامنے آتا ہے تب اس
احساس ہوتا ہے جو مسرتیں مہیا کرتا ہے۔ شہناز کو بھی اسی طرح میں
ہو سکتا ہے۔“

میں روزانہ اسپتال جاتا تھا ریشہ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے
میں نے فہم میں لائے ہوئے کہا۔

دکھیں اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہوں ورنہ یہ چور رشتہ کب تک قائم رہے گا؟“
 ”میرے مرنے تک چلتا رہے گا۔ اس چور رشتے کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر گئی
 ایک عورت کے لیے اس رشتے کو توڑنا ممکن نہیں۔“

”میں خود بھی توڑنا نہیں چاہتا۔ تم میری خواہش کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری یہ
 درخواست ہے کہ تم صرف میری بن کر رہو گے اس بات سے میرے والدین کا اظہار
 ہوا ہے؟“

”میں آپ کی اس دیوانگی کو سمجھتی ہوں جو صرف میرے لیے ہے جب میں سوچتی
 کہ آپ مجھے اپنانے کے لیے مجھے اپنا سمجھ کر غصہ دکھاتے ہیں تو دل میں ایک عجیب
 کی خوشی ہوتی ہے بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے
 دیکھنے والا اور کوئی اسے ڈانٹنے والا بھی ہو جب میں آپ کی طرف سوچتی چلی جاتی
 ہوں یا آپ کی طرف سے کمزور پڑ جاتی ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ان دونوں کے
 میرے دل میں کتنے بڑے بڑے خیالات آتے رہے ہیں۔ خدا کے لیے میرے
 نے اپنی کوئی شرط پیش نہ کریں کہ میرا دل آپ کو بوجھ سمجھنے لگے۔ یہ اچھی بات نہیں
 خدا کے لیے ایک عورت کا مان رکھ لیجئے۔“

میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے سبب فضا کوئی قلبی بخش جواب نہیں دیتا
 افلا میں نے رسدِ دل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے ریسہ کی فکر ہے میں اسپتال جا رہا ہوں اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری فکری
 اور پھر فیصلے پر عمل کرو۔ اس کے بغیر تم مجھ سے دور ہوتی چلی جاؤ گی۔“

میں اس سے جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام کر پوچھا۔

”اب آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں! سو کے فیصلے نہیں بدلتے۔“

”ابھی بات ہے آپ شام کو کوئی نہیں آئیں میں بھی اپنا آخری فیصلہ سنائوں گی۔“

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا میں اس کی طرف دیکھے بغیر تیری طرح دفتر سے نکل گیا۔
 مگر اس طرف جاتے وقت مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرے گی۔

مجھ کو کئی بھی حسین اور نوجوان عورت ایک اپناج کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار

نہیں سکتا تھا اسے خون دیا گیا تھا اور دوسری مرگئی دواؤں کے ذریعے اس کی جان بچا
 کوشش کی جا رہی تھی مگر اس کا معہ اچھی دوا اور اچھی خوراک کو قبول نہیں کی
 اسے کس طرح بچا سکتا تھا وہ ایسی کھنڈ رہن گئی تھی کہ اس کے قریب بیٹھے ہوئے
 ہوتی تھی۔ میں یہی کوشش کرتا تھا کہ کھڑے کھڑے اسے تسلیاں دے کر
 ڈاکٹروں کا بھی سامنا نہ ہو کیونکہ وہ مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں اور سیدھے سبھا
 کرتے تھے۔

دوسری طرف شہناز کے سامنے اب میں اپنی بیوی کا ذکر زیادہ کرنے لگاؤ
 شوہر پرستی دکھا چکی تھی اب میں ریسہ کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرنا لگا۔
 میں اس کے ساتھ پرائیویٹ کو بھی میں نہیں گیا تھا۔ دفتر میں کبھی وہ کوئی بات
 میں فوراً ہی کہہ دیتا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔ میری ریسہ بیویوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے کبھی
 سانسیں رکنے لگتی ہیں ابھی سے یہ حالت ہے تو زچگی کے وقت کیا ہو گا میں
 کے لیے دعا نہیں کرتا رہتا ہوں۔“
 ”جینے کی بامرئی کی؟“

شہناز نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ میں مگر بڑا سا گیا پھر چلا۔
 ”میں اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا ہوں وہ میری بیوی ہے وہی آؤ
 ساتھ دے گی۔ تمہاری طرح اس کے راتے میں کوئی دیوار نہیں ہے۔“
 وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا آپ مجھے اسی طرح طے دیتے رہیں گے جب آپ پہلی بار میری
 آپ کو علم ہو چکا تھا کہ میرے راستے میں دیوار ہے مگر اس وقت آپ نے
 نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک انمول خزانہ تھی آپ کے دل میں
 کہ یہ خزانہ حاصل ہو سکے گا یا نہیں؟ اب وہ بے جینی دور ہو چکی ہے۔
 حصول کا موقع دے کر اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ اب میں بے شرم تو بن چکی ہوں
 فیم کی طرف سے بھی بے وفایاں چاہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

”اس دنیا کا ہر شخص صرف اپنے حق میں انصاف کرتا ہے اسی لیے میں

کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سماج کے شریف مگر چھپوں کی آنکھوں سے نکلنے ہیں۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر وہ مرگئی ہے تو اسے کمرے میں لے جایا گیا ہے؟ میں تیزی سے چلا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ وہاں رئیسہ کو آکسیجن پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی بڑی ناگواری سے ہاتھ جھٹک کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں باہر چلا جاؤں۔ میں نے ایسی توہین کبھی برداشت نہیں کی تھی مگر اسپتال کا وہ کمرہ ایک عدالت تھا۔ ڈاکٹر منصف تھا وہ مجبور تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا مگر اس کمرے سے نکال سکتا تھا۔

میں باہر آیا اس وقت میں بری طرح جھنجھالیا ہوا تھا۔ کیونکہ رئیسہ زندہ تھی اور یہ لوگ خواہ مخواہ مجھ سے نفرت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نرس باہر آئی تو میں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میری بیگم مر گئی ہے؟“

نرس نے حیرانی سے کھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کب کہا تھا کہ وہ بے چاری مر گئی ہے۔ میں تو یہ بیڑیاتی جاری تھی کہ بچی بہت خوب صورت تھی مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ آپ کے دماغ میں تو آپ کی بیگم کی موت ہائی ہوئی ہے آپ اور کیا سوچیں گے؟“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی پھر زرارہ کی بولی۔

”مج تک زچہ سے کوئی نہیں مل سکتا۔ آپ اب یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں اجازت نہ کریں۔“

وہ اونچی آڑی کی سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دروازے کے شیشوں سے جانک کر دیکھا۔ رئیسہ ایک زعمہ لاش کی طرح بیستر پر پڑی تھی۔ وہ بڑی سخت جان تھی۔ وہ میرے لیے نہ سہی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے جیسے کا عزم کر چکی تھی۔ خدا اس کا ساتھ دے۔ رات کو آکسیجن پہنچانے کے لیے اس کے چہرے پر شیشے کا ایک ماسک رکھا ہوا تھا۔ پھر لا اور دیکھا ہوا۔ ہر جھٹک بیک اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کی سانسیں احتیال پر آ رہی ہیں۔

میں باہر ہو کر شہناز کے پاس آیا تو بازی پلٹ گئی تھی وہ بیستر پر ہی آخری سانسیں لے

سکتی۔ اس کی اپنی عمر کے کچھ تھکے ہیں، جسم کی کچھ مانگ ہے اس کی اپنی کچھ خواہشات ہیں جو اسے میری طرف آنے پر مجبور کر رہی ہیں اگر وہ ایک مثالی اور طرح نادانی سے فیصلہ کرے گی تو میں نے اس شہر میں ایک ایسی عورت کو بھی نہ دیکھا ہے جس پر اتنے کپڑے پہن کر اپنے اپناج شوہر کو دوسروں کی ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں بٹھانے کی ضرورت ہے اور اللہ کے نام پر بھیک مانگتی رہتی ہے۔ شہناز کا انجام کچھ عبرت ناک ہو گا۔

میں اسپتال پہنچا تو وہاں رئیسہ کو اسٹینڈ کرنے والی ایک نرس کو بت رہی تھی ایک بار کسی کام سے زچہ خانے سے باہر آئی تو میں نے اس سے رئیسہ کی خبر پوچھنے پر مجھے گھور کر نفرت سے دیکھا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

”اگر وہ عورت مر جائے گی تو آپ کے لیے کیا فرق پڑے گا اور وہ مری ہے تجربات اسے بچا نہیں سکتے۔“

اس کی باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس وقت اپنے دل کو نوازنا سمجھ میں آئی کہ میں نفرت کے قابل ہوں۔ جو میرے رحم و کرم پر زندگی گزارنے والی بن کر آئی تھی۔ اب میں اسے تقریباً قتل کر چکا ہوں مگر یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی قانون مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکے گا کیونکہ محبت سے قتل کرنا کوئی جرم نہیں جرم ہوتا تو مجھ جیسے شوہر کم از کم سوسائٹی میں شریف زادے نہ کہلاتے۔

دوسری بار وہ نرس زچہ خانے سے باہر نکلی تو اس نے میری طرف دیکھا مگر کیا کیا۔ خود ہی بیڑیاتی ہوئی چلی گئی۔

”اور کیا ہو گا۔ اسے تو مرنا ہی تھا مر گئی بیچاری۔“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ مر گئی۔ میں اسے مارنا چاہتا تھا۔ غار بندی کے خلاف تقریریں کرتا تھا لیکن جب وہ مر گئی تو مجھے یوں لگا کہ سڑکوں ہوں۔ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں۔ کھڑا نہ رہ سکا تو زچہ کی ایک چیخ پر بیٹھ گیا۔ اب نام ہوئے اور پچھتانے کا وقت تھا۔ جب اسے زچہ اسٹریچر پر ڈال کر زائدہ دارڈ کے ایک کمرے میں لے جانے لگے تو میری آنکھوں آگئے۔ ایسے وقت ہر شریف مرد کو رونا چاہیے۔ ہماری اور آپ کی دنیا میں!

رہی تھی اس کے سرانے خواب اور گولیوں کی ایک شیشی رکھی ہوئی تھی جو خالی ہو گئی تھی میں نے گھبرا کر ایسولینس کو فون کرنا چاہا تو اس نے میری آستین پکڑ لی اور اکھری اکڑ سانسوں کے ساتھ کہنے لگی۔

”بہت دیر ہو چکی ہے میں نے ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیا ہے کہ میں اپنی خوشی مر رہی ہوں۔ اپنی خوشی سے جی نہیں سکتی، مر تو سکتی ہوں۔ میں نے بہت سوچا۔ بہت کیا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ فہم سے ہی میری نیک نامی قائم رہ سکتی ہے۔ کوکڑا جیسی عورتیں تمہاری اس مطلبی دنیا میں۔ نیک نامی کے بغیر۔ زندہ۔ نہیں رہ سکتی فہم میری زندگی ہے اور تم صرف۔ ایک ہلاوہ ہو۔ تم میری خالی خواہشات کے پوچھنے والا۔ صرف ایک روال تھے۔ صرف ایک ایسے۔ کپڑے کا ٹکڑا تھے۔ سے ساج کی گندگی۔ پونچھ کہ۔ ٹالی میں پھینکا جاسکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کپڑے کو بھی ساج کے ڈر سے۔ اپنے پرس میں چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں پرس سے نکال کر پھینک نہیں سکتی تھی جب میرے ضمیر نے مجھے سمجھا دیا۔ کہ۔ نے اپنے اعتماد کرنے والے شوہر کو دھوکہ دیا ہے نہ میں باخیا رہی نہ میں باوقار رہی۔ کی رہی نہ ادھر کی رہی۔ تو اب اپنی حیثیت معلوم کرنے کے لیے۔ اس کے جاری۔ جس نے مجھے۔ جس نے مجھے خواہشات کا روگ۔ دے کر اس دنیا میں۔ خواہشات کا روگ۔ خواہشات کا۔ دے۔ دے۔“

وہ خواہشات کی بات کرتے کرتے چپ ہو گئی ہزاروں خواہشیں تھیں اور ہر خواہ دم نکلتے نکلتے آخر نکل ہی گیا۔



سدا ساگن

میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیشہ تھی۔

میں نے ہاتھ لگایا۔ وہ پتھر تھا۔

وہ تھی اور وہ تھا۔

ایک متعفن ماحول میں ایک نازک جذبے کی کہانی جو نازک دلوں میں اتر کر لہو کی طرح کھل جاتی ہے۔

سدا ساگن

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب جوانی انھان پر تھی اور مجھے ہر چلتی ہوئی چیز سناٹا آتی تھی۔ میں ادھ کھلی کھلی اور ایک شاداب پھول کی شنگلی کے فرق کو سمجھنے لگا تھا۔ اب یہی وقت میں نے زلیخا کو دیکھا تو یوں لگا کہ جازے کی ہلکی سنری دھوپ آنکھوں کے دریا سے اتر کر دل کو آج دے رہی ہے۔

زندگی میں پہلی بار ایسا چندن ساروپ دیکھا تھا اس لیے بڑی محبت سے اسے دیکھا گیا۔ وہ داتا دربار کے اس دروازے پر کھڑی ہوئی تھی جو خواتین کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے قریب ایک خسر اپنے زانوں پر دھولک رکھے بیٹھے بیٹھا ہوا آئے جانے والی خواتین کی بھیڑ میں وہ کبھی لگا ہوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور کبھی لوہو ہورہی تھی۔ حسن چھپتا رہے اور جھٹکتا رہے، پڑھ گرتا رہے اور اٹھتا رہے تو پھر جلوسے کی تاباکی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ وہ چاند سا کھڑا عورتوں کے سیلاب میں لہر لہا رہا تھا۔ میں داتا صاحب سے کچھ مانگنے آیا تھا۔ کیا مانگنے آیا تھا؟ اس وقت بھول گیا تھا اس نئی داتا سے مانگنا ضرور تھا مگر دعا بدل گئی تھی۔ پہلے زبان سے مانگنے آیا تھا اب مانگ رہا تھا اور اس لعین کے ساتھ کہ وہ بیٹے والا میرے حسن طلب کو خوب جھٹکا توڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت شیرینی اور اگر تیاں لے کر اس کے پاس خسر اپنے پر بیٹھا رہا اور وہ بوڑھی عورت کے ساتھ دربار میں داخل ہو گئی۔ میں بھی سے پلٹ کر دوسرے دروازے پر آیا جو مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں میں نے لے کر جوتیاں جمع کیں اور زبان سے داتا صاحب کو پکارا ہوا تصور کی آنکھوں سے زلیخا دیکھا ہوا اور دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتا ہوا مزار مقدس تک پہنچ گیا۔ مزار کے ایک مود کھڑے ہوئے دعا میں مانگ رہے تھے اور کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے یہی طرف عورتیں نذر نیاز میں مصروف تھیں۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی پہلے داتا صاحب

حضور سجدہ کیا۔ حالانکہ سجدہ صرف خدا کے سامنے کیا جاتا ہے مگر وہاں میری طرح اکثر لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اس پر بحث نہیں کر سکتا کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں بس عقیدت سے سر جھٹکا ہے اور سجدے تک پہنچ جاتا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔

میں سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیئے۔ اٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں کے درمیانی فاصلے سے میں نے مزار کے دوسری جانب دیکھا جہاں عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ پرانی عورتوں کو دیکھنا مقصود نہ تھا میں جسے داتا صاحب سے مانگنے آیا تھا اسے تلاش کر رہا تھا۔

میں اس جگہ تھا جہاں لوگ دنیا کی دولت بھی مانگنے آتے ہیں اور دل کی دولت بھی اس مقدس مزار کو چھو کر ایک غریب ماں اپنی بیٹی کو ساگن بنانے کی آرزو کرتی ہے وہیں ایک ٹانگہ اپنی بیٹی کے پاؤں میں تھکرو باندھنے سے پہلے یہ منت لے کر آتی ہے کہ کا دوبار چل لگا تو وہاں کے فکر خانے میں چارو دیکھیں چنچاڑے گی۔ وہاں ایک مجبور اور بیمار شخص بھی آتا ہے اور ایک صحت مند اسٹیکر بھی۔ میں نے ایسے فلم پروڈیوسر بھی دیکھے ہیں جو ریلیز سے پہلے فلم کے ڈبے لے کر وہاں آتے ہیں۔ تو می اگر تیاں مزار پر رکھتے ہیں تو می اگر تیاں فلم کے ڈبوں پر۔ پھر اس فلم کے سپر ہٹ ہونے تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ دراصل بے ایمانی اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب لوگ اسے ایمان کی طرح برتنے لگے ہیں۔ میں نے کتنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے طور پر کس حد تک ایماندار تھا اور ایک پرانی لڑکی کی آرزو کرنا کہاں تک درست تھا میں یہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محبت کرنے والے بھی مرادیں مانگنے آتے ہیں لہذا میں بھی آیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا وہ عورتوں کی بھیڑ سے گزرتی ہوئی مزار کی جالی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی اور دعا مانگنے سے پہلے اپنے سر پر آٹھل کو درست کر رہی تھی۔ وہ صحن لباس میں تھی لباس کی سرخی اس کے گورے کھڑے پر جھٹک رہی تھی۔ عجیب سحرانگیز حسن تھا میرا دل وہاں اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میں دل سے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں سے دعا مانگ رہا تھا کہ ۳۰ داتا اے مظہر نور خدا! خدا سے میرے لیے اس لڑکی کو مانگ لے۔ میں اور کچھ نہیں پاتا۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی اٹھ گئیں۔

ہو جاتا۔ نہ اقرار تھا نہ ہی انکار۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو پہلے ہی مرٹے میں آنکھیں لڑا کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اس کی معصومیت میرے لیے ایک معمہ بن گئی تھی۔

بمجرد سر جھکا کر میری جانب دیکھے بغیر واپس جانے لگی۔ میں بھی اٹھنے پاؤں واپس ہو گیا۔ میں اور کہاں جاتا؟ ایک عرصے سے تنہا تنگ رہا تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ایک ظالم چچا نے مار پیٹ کر میری پرورش کی۔ انور کشہ کے ریپرنگ ورکس میں ایک روپیہ روز پر کام کرتا تھا۔ جوان ہوتے ہوتے اچھا خاصا کارمگر بن گیا ہوں جنازہ گاہ کے قریب رکشوں کی مرمت کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا ہے۔ ہر ماہ ہزار روپے کی بچت ہوتی ہے۔ چچا بھی مرچکا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں مجھ اکیلے کے لیے ہزار روپے کی بچت بہت زیادہ ہے۔ ان دنوں یا دوست ہیرا منڈی کا راستہ دکھاتے تھے میرے بچے کا وقت آپکا تھا نہ کوئی نصیحت کرنے والا تھا اور نہ ہی میں کسی کے رعب اور دیدہ پے میں خامیرا، مسکنا لازمی تھا۔ ایسے ہی وقت وہ میری نگاہوں کے سامنے آگئی اور میرے دل میں ساکنی۔

میں تو سمجھ رہا تھا کہ تقدیر مجھے غلط راستے سے بچا کر اس اجنبی لڑکی کے راستے پر لے جا رہی تھی۔ دوبار سے نکل کر وہ باہر آئی اور دروازے کے قریب مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بوڑھی عورت نے اس سے کچھ کہا، شاید اس کی گھبراہٹ کی وجہ پوچھ رہی تھی اور وہ فی میں سر ہلا کر اس کے سوال کو ٹال رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے بڑی محبت سے اس کی باتیں لیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ خراسان کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں پیچھے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ آگے جا کر وہ رک گئی مین روڈ پر ٹریفک زیادہ تھی۔ سڑک پار کرنے سے پہلے وہ زرد گردن گھما کر دیکھنے لگی کہ کہیں میں پیچھا تو نہیں کر رہا ہوں؟ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور سڑک کی جانب نکلنے لگی۔

بمجرد سڑک پار کر کے بھائی گیٹ کی طرف جانے لگیں۔ میں سوچتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ ورکشاپ میں نہیں رہوں گا، اس محلے میں ایک مکان کرانے پر حاصل کر دوں گا جہاں وہ رہتی ہے۔ مجھے محبت کا جواب محبت سے ملے نہ ملے مگر اب اس کے قریب رہ کر ہی دل کو قرار آ سکتا تھا۔

چند لمحوں تک اس کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں خود کو یوسف ثانی نہیں سمجھتا۔ مگر وہ میں کوئی بات تھی یا میرے دعائے کا انداز ایسا تھا کہ وہ متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ سمجھا چاہتی تھی کہ میں دعاؤں میں گم ہو گیا ہوں یا اس بہانے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ میرا لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور وہ سمجھ گئی کہ میری نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اس کی ہلکی فوراً ہی جھک گئیں۔ اس کے سر کا انچل اپنی جگہ موجود تھا پھر مجھے وہ ہاتھ اٹھا کر اسے خود بخود ادر ادر سے درست کرنے لگی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ کچھ بدحواس نہ ہو گئی ہے۔ میری نگاہوں سے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اپنے دوپٹے سے دہانہ ڈھانپ رہی تھی۔

اس کے بعد دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اس نے دیکھا کہ کہیں میں اسے نہ تو نہیں رہا ہوں۔ میں اسے برابر دیکھے جا رہا تھا اس لیے اس کی آنکھیں فوراً ہی جھک گئیں دونوں ہاتھ اٹھے رہ گئے تھے۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا جیسے صاف طور سے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ وہ دعا کے لیے کھڑی تھی دعا سے خالی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ میری نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی ہے۔ بڑی دیر تک ہم دو بروکھڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد اس نے پھر نکلنے ہوئے غم اٹھائیں شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں چلا گیا ہوں یا جواباً فطرس نہ ملانے سے لڑکی اب اسے نہیں دیکھ رہا ہوں مگر میں بھی دھن کا پکا تھا۔ اسے دکھائی جا رہا تھا۔ اس جلدی سے سر کے پینچل کو کھینچ کر گھونگھٹ بنالیا۔

نصف چہرہ چھپ گیا۔ شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چھپ رہا ہو اسے جزاً جزاً چاہیے لیکن اس کے چھپنے کی ادا اتنی باری تھی کہ میری نگاہیں اس کے سوا زیادہ نظر اسے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں اس کی آوازیں سے یہ سمجھتا چاہتا تھا کہ وہ متعلق کیا سوچ رہی ہے۔

چھپنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے نہ دیکھو۔ ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی رہو، چاند پھر کبھی گھونگھٹ سے نکلے ہو گا یہ ایک محبوبانہ انداز ہے۔ لیکن نہیں، محبوبانہ انداز اس وقت سمجھا جاتا جب وہ جواباً مسکرا کر دیکھتی میری کوئی ہلکا سا، نازک سا اشارہ چھوڑ دیتی یا پھر ناگواری سے منہ پھیر لیتی تو یہ تصدیق

ساگن کو کچھ بڑی محبت سے مخاطب کیا ”نہ لٹا بیٹی! وانا کے دربار سے آئی ہو۔ شیرنی کے
 دوانے میری بیٹی کو بھی دو۔ تمہارے ہاتھوں میں کتنی برکت ہے۔ اے بیٹی! مجھے بھی۔“
 دوسرے مکان کی کھڑکی سے کسی عورت نے آواز دی۔ پھر تو اس پاس کے مکانوں کی
 کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ کبھی سے عورتیں اور کہیں سے مرد تو ازیں دے رہے
 تھے اور اسے اپنے ہاں بلا رہے تھے۔ وہ اپنے لیوں پر سنجیدہ سی مسکراہٹ لیے باری باری
 ہی کے دروازوں پر جارہی تھی کسی کے ہاتھ میں شیرنی کے دانے رکھ رہی تھی تو کوئی
 لٹا کر کے اسے اپنے گھر کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا ذرا سی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا
 کہ کھلا کے تمام لوگ اس کی بے انتاعزت کرتے ہیں وہ کسی کے دروازے پر چل جائے تو
 اس کے لیے آنکھیں پھجادی جاتی ہیں۔

میں ایک پان والے کی دکان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ میری طرف نہیں دیکھ
 رہی تھی شاید اس لیے کہ دکان کے سامنے کچھ نوجوان کھڑے ہوئے تھے وہ اپنے چہرے اور
 لباس سے چھپے ہوئے بد معاش معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی نہ لٹا کو بڑی عزت اور عقیدت
 سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کسی کسی مخلوق پیدا کرتا ہے نہ لٹا کو دنیا جہاں کا حسن
 واپے مگر کسی کی کیا مجال کہ کوئی اسے میلی نظر سے دیکھ لے۔ دیکھے گا تو ساری عمر پچھتائے
 گا۔“

”ہاں بار!“ دوسرے نے کہا ”اس پر قرضتوں کا سایہ ہے انسان اسے چھو نہیں
 سکتا۔“ میں جرات سے ان کی باتیں سن رہا تھا وہ لنگے جو عورت کو کھلوتا سمجھتے ہیں۔ بد معاشی
 پر اڑائیں تو کسی بھی جوان لڑکی کو کاندھوں پر اٹھا کر لے جاسکتے ہیں وہ نہ لٹا کے متعلق ایسی
 باتیں کر رہے تھے جیسے اس لڑکی کو کوئی مادرانی ہستی سمجھ رہے ہوں۔ جو فرشتوں کی دنیا سے
 آئے ہیں اور جسے انسان چھوٹا چاہے تو کسی عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ اس لڑکی میں کوئی بات
 تھی جب ہی محلے کے بچے بوڑھے نوجوان عورت اور مرد سب کے سب اس کی ایسی عزت
 کر رہے تھے جیسے وہ آسمان سے اتر آئی ہے۔ کوئی نوجوان اسے ایک عاشق کی نظر سے نہیں
 دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی محظوظ ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی ذات سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی
 ایک شخص پیدا ہو گیا آخر وہ کون ہے؟ اس میں کیا بات ہے سب ہی اسے عزت و احترام

وہ بیانی گیٹ سے گزر کر آگے بڑھتی جارہی تھی جگہ راستے کے اطراف صدیوں پہلے
 کی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں جن کی شکستہ دیواریں اس قدر
 جھکی ہوئی تھیں جیسے اب تب میں گرنے ہی والی ہوں۔ وہ آگے اور آگے بڑھتی جارہی تھی
 اور آگے ہیرا منڈی کی سرحد قریب آتی جارہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا کیا وہ بدنام ملک
 کی رہنے والی ہے؟ دل نہیں مانتا تھا۔ وہ ایسی شرمیلی تھی کہ مجھ جیسے اجنبی سے نظریں نہ
 ملا سکتی تھی اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی جو بازار حسن کی لڑکیوں میں بولے
 بھی نظر نہیں آتی پھر میں کیسے مان لیتا کہ وہ اس بازار کی رہنے والی ہے۔

آؤٹ آف بوئے کا بورڈ دور سے نظر آ رہا تھا اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے
 کے چلنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے پیچھے میری موجودگی کو محسوس کرتی ہلا
 ہے۔ پھر وہ منسوبہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئی۔ میرا خیال سمجھ گیا
 ایک شریف زادی تھی جس بوسیدہ عمارت کی طرف وہ جارہی تھی وہاں شریف لوگ
 تھے۔

مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ محلے کے بچے اس کے آس پاس اچھلنے کودنے لگے
 مچا رہے تھے۔

”سہاگن بائی آگئی سہاگن بائی آگئی۔ باجی ہمیں تھوڑی سی شیرنی دو۔“
 چاروں طرف گھومتے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بہانے اس نے گھوم کر مجھے دیکھا
 اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی اس کے دیکھنے کے بہانے اس نے گھوم کر مجھے دیکھا
 تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں کیوں اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا ہوں۔ اس بارہم
 اور توجہ سے اسے دیکھا بچوں نے اسے سہاگن بائی کہا تھا لیکن وہ دلی پستی ہی باز کر
 لڑکی مجھے سہاگن نظر نہیں آرہی تھی۔ حالانکہ اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ البتہ
 جوڑے تو کتوریاں بھی پہنتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ پندرہ یا سولہ
 سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ آدھ کھلی کلی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ابھی اس نے سہاگن کا سر
 نہیں کیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا اور خود کو بالوی سے بچانے کے لیے ہر ممکن طریقے سے لگاؤ
 رہا تھا۔ اسی وقت ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اس

میں نے محسوس کیا کہ زلیخا نے اطمینان کی سانس لی ہے۔ وہ نگے پان والے سے پولی
آتی باقی کر لے میں ماں جی کو بھیج دیتی ہوں۔“
یہ کہہ کر اپنے مکان کی طرف واپس جانے لگی۔ نگے نے مجھ سے پوچھا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“

میں قصیل سے اسے بتانے لگا۔ میرا نام اقبال ہے، بچپن میں والدین اقبالے کہتے
بھریہ ہم گتے گتے بالے بن گیا۔ جتنا زہ گاہ کے پاس آنور کشہ کی مرمت کرتا ہوں۔
دل آدنی ہے۔ مکان کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرتا رہوں گا۔ جہاں میرا درکشاپ ہے
اسے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، نشہ تو دور کی بات
میں پان سکرٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ یہاں رہوں گا تو کبھی مالک مکان کو شکایت کا
نہیں دوں گا۔“

نگے نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا، ”دیکھو وہاں سے یہاں تک جتنے مکانات ہیں۔ یہ
کے سب زلیخا کے نام پر ہیں۔ یہاں اس کے پانچ کرایہ دار ہیں، وہ سب ہمیشہ پاک
رہتے ہیں۔ زلیخا انہیں پہلے ہی سختی سے تاکید کر دیتی ہے۔ ایک کرایہ دار اس کے
ناکے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک رات وہ شراب پی کر مکان میں آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زلیخا
پاک دھ اسے نہیں دیکھ رہی ہے جیسے ہی اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھا، اسے ابکائی
نہ، نوکڑا کر اور خون کی تے کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

مرنے والے کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ گرنے کے بعد اس دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا
کے پیچھے زلیخا رہتی ہے۔ وہ تڑپ رہا تھا اور ہکلاتے ہوئے معافی مانگ رہا تھا مگر بہت
بوجھ کی۔ اسے اچانک خون کی ایک تے ہوئی اور وہ مر گیا۔

دیکھو بالے بھائی! راتوں کو ہم بھی نشہ کرتے ہیں اپنی عادت سے مجبور ہیں مگر ہم
نگے کے قریب یا اس کے مکان کے دروازے پر نہیں جاتے۔ وہی کبھی مہراں ہو کر ہمارے
ب آتے اور ہمیں نیازی شیرینی دے کر چلی جاتی ہے، وہ بڑی کرموں والی ہے جس روز
وہاں پر آجاتی ہے میری آمدنی بڑھ جاتی ہے وہ سدا سا گن ہے جس کنواری کے سر پر
نور کھڑی ہے وہ کبھی ہی ونوں میں سا گن بن جاتی ہے۔

زلیخا کہہ گئی ہے تمام باتیں تمہیں سمجھا دوں۔ سمجھانے کے بعد بھی تم نے جھوٹ کہا

سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جاری تھی۔ لیکر
نے اسے آواز دی۔

”زلیخا! مجھے بھی دو دانے دیتی جا۔۔۔“
اس کے قدم رک گئے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر زلیخا
گئی۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔ تیرے آچل میں بڑی برکت ہے۔ شیرینی کبھی ختم
لا ہمیں بھی دے دے۔ وہ ان کی جانب آہستہ آہستہ سر جھکا کر بڑھنے لگی۔ مجھے ہلکا
میری طرف آ رہی ہے۔ یہ اچھا موقع تھا میں اسے سناٹا چاہتا تھا کہ میں اس کے قریب
چاہتا ہوں میرا ارادہ وہاں سے واپس جانے کا نہیں ہے۔ جب وہ قریب آکر ان
میں شیرینی تقسیم کرنے لگی تو میں نے پان والے سے کہا۔

”بھائی صاحب! میں کرائے پر ایک مکان تلاش کر رہا ہوں۔ کیا اس مسئلہ کا
ہے؟“

”تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے ہیں؟“ کاندار نے پوچھا، ”میں میں اس
بالکل تنہا ہوں۔“ زلیخا کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ کاندار نے جواب دیا۔
مشکل ہے اکیلے آدمی کو بڑی مشکل سے کوئی مکان دیتا ہے۔ کیوں زلیخا! میں ٹھیک
تا؟“

یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ مکان کے سلسلے میں بھی اس لڑکی کی رائے پوچھی
تھی۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ حقیقتاً ایک محترم ہستی ہے۔
وہ سر جھکا کر مجھ سے نظریں چراتی ہوئی پان والے کے پاس آئی اور شیرینی
دانے اس کی طرف برسھاتے ہوئے بولی۔

”نگے! اما! اس سے پوچھ گیا یہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے؟“
پان والے نے مجھ سے پوچھا۔ میں ذرا جھجکے لگا۔ مجھے بچپن سے کسی نے
کی تعلیم نہیں دی تھی۔ وہاں زلیخا کے ذریعے مذہبی احکامات پر عمل کرنے والے
مل سکتا تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو اس کے قریب رہنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔
جھوٹ کا سارا رالیا۔

”جی ہاں! میں نماز پڑھتا ہوں۔“

اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تھیں توبہ کی سہولت بھی نہیں ملے گی اور ناک انجام کو پہنچ جاؤ گے۔

کئے پان والا سمجھا رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان روحانی پہلو سے زیادہ میں اس کے روحانی پہلو کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ مجبور تھا۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے وہاں مکان مل جائے گا۔ سمجھتا ہوں کہ تقدیر مجھے ایک بڑے اور بہت اہم تجربے سے دوچار کرنا چاہتی تھی۔ مجھے وہاں لایا گیا تھا بہر حال اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتا تھا۔ وہ دو کمروں کا مکان تھا۔ آنگن میں دو دروازے تھے ایک دروازہ باہر کی طرف جو فی الحال بند تھا اور میری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ وہ میرے دل کی نگاہوں کے سامنے کھل جائے۔ کچھ اور بھی کوششیں تھیں ایک تو پاک منہ کوشش دوسرے نماز کی پابندی۔ کوئی دنیاوی دولت حاصل کرنے کے لیے جنت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتا ہے، میں زلیخا کو خدا سے مانگنے کے لیے تھا اس کی ابتدا ایک جھوٹ سے ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ مجھے نماز میں ایک اور سرور سامعوس ہونے لگا جس سے پہلے میں نا آشنا تھا۔

جب میں مسجد کے دوران اس کون و مکان کی عظمت کا اعتراف کرتا میرے دل اور دماغ کے کسی گوشے میں دنیاوی لالچ کی ہلکی سی رمت بھی نہ ہوتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو اس دینے والے سے ایک ہی چیز مانگتا۔ زلیخا! زلیخا! اور زلیخا! اور زلیخا کے آنگن میں وہ دروازہ کھلنے لگا کبھی اس کی بوڑھی ماں خدا کی شہرٹی لے کر آتی کبھی میں ایسے ہی چیزیں لے کر ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ کبھی پاس نظر آتی اور کبھی کمرے میں بیٹھی کپڑے سلائی کرتی رہتی۔ اپنے ہوں باپ سے باتیں کرتی تھی ایک جگہ سے ہی ذرا کتراتا تھی۔ دو ماہ کا عرصہ گزرنے کے اسی طرح چور نظروں سے مجھے دیکھتی تھی کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں اب تک ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی اور نہ میری بیٹھی نظروں کا خاطر خواہ جواب اس دوران مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ سہاگن نہیں ہے۔ اس روز

میں نے اس کو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بوڑھی مائی سے باتیں کرتا ہوا اس کے آنگن میں میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بوڑھی مائی سے باتیں کرتا ہوا اس کے آنگن میں

آیا تاکہ شکریہ ادا کرنے کے بہانے اس سے باتیں کرنے کا سلسلہ بھی شروع کرے
آنگن میں تنہا نہیں تھی اس کے پاس دو خسرے بیٹھے ہوئے اپنا دکھڑا رو رہے تھے
رہا تھا۔

”اے بی بی! ہم بھی انسان ہیں ہم بھی مسلمان ہیں۔۔۔ مزاروں پر جانے نہ
بیاد کے موقعوں پر پڑتے گاتے ہیں دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں
دکھوں میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ مذہبی معاملات میں کوئی ہمیں مسلمان نہیں
اگر ہم مر جائیں تو۔۔۔“

وہ کہتے کہتے مجھے دیکھ کر رک گیا پھر مسکرا کر ہاتھ بچاتے ہوئے بولا
”بڑے نصیب والے ہو۔ سدا سدا گن کے سامنے میں رہتے ہو۔ تم سے ہزاروں
رہیں گی۔“

سدا سدا گن کے الفاظ سن کر میں پھر الجھ گیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھا
وہ واقعی سدا گن نکلی تو میری چاہت کا کیا بنے گا؟ میں خود کو فریب دینا چاہتا تھا کہ
ہے۔ اس لیے میں نے کچھ پوچھنے کے بجائے مسکرا کر کہا۔

”زیلنا! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم
کپڑے دھوئے ہیں اور بیشہ میرے کمرے کی صفائی کیا کرتی ہو۔“

وہ جواب دینے کے بجائے اپنے سینے پر دوپٹے کی تہہ جھانے لگی۔ اس
اوڑھنے کا انداز دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف تھا۔ دوپٹے بھی تقریباً عین گرد
ہو آ تھا۔ ایک بڑی سی چادر کی طرح اسے اوڑھ رہی تھی۔ گردن کے نیچے
تھیں ہوتیں کہ سینے کی شادابیاں اس میں چھپ کر رہ جاتی تھیں۔

اگر یہ گناہ ہے تو میں اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے حسن سے
میری نگاہیں چوری چوری دور دور سے اس کے جسم کو ٹوٹتی تھیں یہ مفہوم
پہنچنے کا ایک عام قاعدہ ہے کہ پہلے نگاہیں وہاں تک پہنچتی ہیں اسے چھوتی ہیں
اور اسے اچھی طرح سمجھ کر اس شہکار پر عاشق ہوتی ہیں۔ اگر میں ایسا کرنا

عجیب، انوکھی اور عجیب بات نہیں تھی۔ ویسے یہ میری ناکامی تھی کہ میں نے اس
میں سانسوں کی ابھرتی ہوئی شادابیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ میری نگاہوں سے

لے آئے تھے اور جلدی سے کمرے کے اندر جانے لگی۔
میں نے غلط موقع پر شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے اس کے لیے تنہائی کا موقع تلاش کرنا
بیجا تھا۔ سدا گن غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے کمرے سے دلچسپی لے کر
راوند بڑھاری ہے لہذا اب اگر تنہائی نصیب ہوئی تو میں اسے باتیں کرنے پر مجبور
رہا گا۔

یہ سوچ کر بہا جانے لگا۔ اسی وقت اس کی رس بھری آواز سنائی دی ”سنئے!“
میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی
تھی۔ مجھ سے نظریں ملنے ہی مر جھا کر بولی۔

”تب میری ایک بات مانیں گے؟“
ہائے! پہلی بار وہ مجھے مخاطب کر رہی تھی، التجا کر رہی تھی، میں نے خوش ہو کر آگے
جئے ہوئے کہا ”ایک نہیں ہزار باتیں مانوں گا تم حکم کرو۔“

میرے کہنے کے انداز میں ایسی اپناہیت تھی کہ وہ ذرا سمٹ گئی۔ دروازے سے کچھ اور
پلٹ کر پوچھتا ہوا کہ

”ممدو چاچا! ایک عزیزہ فوت ہو گئی ہے۔ کیا آپ کا نہ ہادیے جاسکتے ہیں؟“
میں ایک نئی امید ایک نئی زندگی کی آس میں آگے بڑھا تھا اور وہ مجھے کسی کی موت کی
خبر دے رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اس نے پہلی بار التجا کی تھی میں اس کی التجا پر ایک نہیں ہزار
اڑوں کا نہ ہادیے سکتا تھا اس لیے ممدو چاچا کا پتہ پوچھ کر محل پورے کی طرف چلا
پا۔

مجھے کسی ممدو چاچا سے دلچسپی نہیں تھی لیکن زلیخا کی اس التجا کا میری کمائی سے گہرا
لمحہ ہے لہذا وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ مختصر طور سے بیان کرتا ہوں۔ میں اپنے محلے کے
والے لے جے پٹین کا ذکر کر چکا ہوں وہاں اس جے پٹین کے دو ملازم نظر آئے اور وہ صاحب
کی نو زلیخا سے کٹ کر کٹ کر پوچھنے آتے تھے۔ ان کے علاوہ زلیخا کے پاس آنے والے دو چار

فدیت ممدو اور بھی نظر آئے۔ ممدو چاچا کے متعلق اتنا معلوم ہوا کہ انہوں نے پچھلے ہی
ایک محل بورہ کے اس محلے میں وہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ ان کی بیوی اسپتال میں
بارہ بجی رات انتقال ہو گیا تھا اور وہ اسپتال سے اس مکان میں لائی گئی تھی۔ ممدو

جائے گا راستہ نہ ملا تو وہ منہ پھیر کر اپنے آپ کو دوپٹے میں چھپانے لگی۔
میں نے آگے بڑھ کر زرا نرمی سے پوچھا ”نہ لگنا! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟“

و خاموش رہی۔ میں ذرا اور قریب چلا گیا۔

”ایک عرصہ گزر گیا ہے نہ لگنا! میں خاموشی سے تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے آج تک زبان نہیں ہلائی۔ کیا اب تک تمہیں میری شرافت کا یقین نہیں ہوا ہے؟ تمہارے اس طعنہ نہ پھیر لینے کو میں کیا سمجھوں۔ خوف یا نفرت؟“

و سر ہٹکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے بتاؤ، مجھے اپنا سمجھ کر بتاؤ، میں۔ میں تمہیں دل و جان سے پہچانوں۔ میں تمہارے لیے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں رہتا ہوں۔ جب تک یہی سانس چلتی رہے گی، میں تمہاری آس لگائے یہاں بیٹھا رہوں گا مجھے اپنی محبت کا مارا دوڑ لگنا!“

و زرخ پر ایسے بیٹھ گئی جیسے نہ ٹنٹھتی تو گر پڑتی۔ پھر منہ کی پائے سے لگ کر نئی میں مڑائی ہوئی ہوئی۔

”نہیں، نہیں۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں۔ میں آپ کے قاتل نہیں ہوں۔“
”کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم کس قاتل ہو۔ یہ میرا دل جانتا ہے کیا تم میری محبت، میری یادگی کو نہیں سمجھتی ہو؟“

میں نے اس کے قریب دوڑا تو وہ کر اس کے بازوؤں کو بڑی محبت سے تھام لیا۔ وہ بے لے کھڑے ہوئی۔

”مجھے جھوڑتے ہوئے مجھے ہاتھ مت لگائیے۔ میں سناگن ہوں۔“

میری امیدیں مرجھانے لگیں۔ میں نے دل برداشتہ ہو کر پوچھا ”کون ہے تمہارا خاوند؟ میں نے تو کبھی اسے نہیں دیکھا۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ میں نے سمجھا کہ وہ جواب دینے والی ہے مگر وہ دل سے نکلنے والی آہ کے بعد خاموش ہو گئی اور ڈوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے لگی۔

جس ہاتھ سے دوپٹے کو تھام کر وہ پردہ کر رہی تھی میں نے اس ہاتھ کو تھام لیا، التجا کی جھٹ سے نہ نہ چھپاؤ نہ لگنا! میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے تمہارا خاوند؟“

چاچا محلے والوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ مکان ان کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے لہذا کی تجیزو عینکین کے بعد وہ اس مکان کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے ان سے ہمدردی ظاہر کی۔ جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا اس جنازہ ادا کی اور اسے دفنانے کے بعد جب اپنے محلے میں واپس آیا تو رات کے گیارہ بجے۔ آس پاس کے تمام مکانوں پر غیند کی خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔ کئی کارستان بھی ہو گیا تھا۔ محلے والے کی دکان بھی بظاہر بند ہو چکی تھی مگر دکان کا پچھلا دروازہ تھا۔ تین ماہ کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نکلے غیر قانونی طور سے چرسے دن ہو یا رات نشہ کرنے والے دکان کی پچھلی طرف سے آتے تھے اور کھڑے دم چرس کی گولیاں لے جاتے تھے۔

ایک نکلے ہی اکیلا جرم نہیں تھا۔ دن کی روشنی میں جائز کاروبار کرنے والے لوگ منافع کی شرح بڑھانے کے لیے ناجائز کاروبار کا ایک پچھلا دروازہ ضرور اپنے میں اس دکان سے کتر کر اپنے دروازے پر لگایا۔ آلا کھول کر میں نے دروازے کے پٹوں کو آہستگی سے داکیا۔ آنگن سے پرے میرے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ کمرے کی ایک دیوار پر اس کا سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا سایہ جسے میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے بند کیا۔ پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا اپنے دروازے پر لگایا۔

وہ میری منہ کی سرے پر میرے تکیے کو دو نوں بانسوں میں لے اے جب۔ ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔

مجھے اس کی آمد سے جتنی خوشی ہوئی تھی اس کے آنسو دیکھ کر اتنی ہی جھلا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

”نہ لگنا!“

میری ہلکی سی میٹھی آواز اس کے لیے دھماکہ ثابت ہوئی۔ وہ یکبارگی اچانک ہو گئی، اس کے چہرے پر ایسی پریشانی اور گھبراہٹ تھی جیسے چوری کرتی ہوئی ہو کر فرار ہونے کے راستے پر میں کھڑا ہوا تھا ورنہ وہ ہلک جھپکتے ہی وہاں سے ہماگ با

وہ نفی میں سرلانے لگی "کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ میں کسی خاوند کے حوالے
سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ میں سدا ساگن ہوں۔"
"عجب ہے۔ یہ بھی کمتی ہو خاوند نہیں ہے۔ یہ بھی کمتی ہو کہ ساگن ہو۔ کیا یہ
پن کی باتیں نہیں ہیں؟"

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ تھر تھراتے ہوئے لمبے میں بولی "اللہ
آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ سدا ساگن کا مطلب نہیں سمجھتے ہیں۔ میں آپ کو
سمجھاؤں؟"

اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑالیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرہ
ڈھانپ کر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں پیدا انٹی ساگن ہوں۔" اس کی آواز آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈوبنے لگی۔
خدا کی ایک عجیب تخلیق ہوں۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے ماں باپ بھی مجھے نہ پہچانے
کہ میں مرد ہوں یا عورت۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس دنیا میں کبھی کبھی مجھ جیسی
بھی پیدا ہوتی ہیں جن کی صحیح تشخیص نہیں ہوتی چونکہ ان میں عورتوں کی خصوصیات
ہوتی ہیں اس لیے انہیں واضح طور سے عورت کہنے کی بجائے سدا ساگن کا
ہے۔"

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کتنی حیرانی سے اور کسی بے فکری سے
دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا حیرت انگیز انکشاف تھا کہ کچھ دیر کے لیے میری قوت کشش
تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا وہ عورت نہیں تھی مگر عورت تھی۔
ڈھنگے خروں سے بالکل مختلف تھی جو اس دنیا میں آنے کے بعد مرد سے عورت بننے
مرد کی تبدیل کرتے ہیں اور عورت کی ایک نقل بن کر نہ ادر کے رہتے ہیں نہ لوم
زلیخا ان سے مختلف تھی اس کی جسمانی ساخت، شاعرانہ نزاکت، بدن کی ریشمی
جیران حیران سی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے خنیدہ رُس مجھے ہونٹ۔ یہ
زبان بے زبانی سے کہہ رہے تھے کہ قدرت نے اسے ایک حسین سانچے میں ڈھالا
عورت کے درمیان رکھ کر ایک ادھوری تخلیق کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیا تھا۔
میرے کمرے میں سوئیڈل پادر کا بلب روشن تھا لیکن آنکھوں کے سامنے

"چھوڑ دیجئے! اللہ! مجھے چھوڑ دیجئے! یہ اچھی بات نہیں ہے میں میرا دل گھبرا رہا ہے
سدا ساگن ہوں مجھے چھوڑ دیجئے۔"
"تم پہلے ساگن نہیں تھیں مگر اب میرے نام سے ساگن ہو گئی۔ کیا تمہارا جی نہیں
جاکہ کوئی تمہیں چاہے تم سے بے انتہا محبت کرے۔"

میرے بازوؤں کی قید میں اس کی سرد تہ سرسرائی، اس کے دونوں ہاتھ آہستگی سے
ڑتے ہوئے میری پشت پر آئے۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی کچھ اور لگ گئی۔ میری
غزل میں جذب ہو جانے کی خاموش ادا سے اس نے ظاہر کر دیا کہ اسے چاہے جانے کی
روز ہے۔ انسان کوئی بھی ہو۔ مرد ہو، عورت ہو یا زلیخا ہو۔ سب کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ
ایک ایک ہستی کی منفرد محبت اسے ملے ایسی محبت کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو۔ اس

میرے دل میرا بھلا نہ سکے گی۔

ایسی صورت میں یہ بڑی سخت آزمائش تھی کہ میرا پیار کتنا پائیدار ہے اور میں کب لے کی غرض بالا لے کے بغیر اس کی قربت کے کٹھن مرحلوں سے گزرتا رہوں گا؟
اسے پاک روح اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ انسانی ہوس کی غلاظتوں سے وابستہ نہیں کی
تھی کہ کسی کنواری کی سر پر ہاتھ رکھتی تو ساگن بن جاتی۔ حقیقت کچھ اور تھی
کہ وہ اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک تھی اس لیے اسے جاننے والے ایک حبرک اور
ہم ہستی مانتے تھے۔

وہ سدا ساگن لڑکی اور لڑکے والوں کے ہاں جا کر کہہ دیتی کہ میرے دل میں یہ بات
دلی ہے یا میں نے خواب دیکھا ہے کہ فلاں لڑکی اور فلاں لڑکے کا رشتہ ہو جانا چاہیے تو
یوں خانہ دنوں کے بزرگ اس کی بات تسلیم کر لیتے تھے۔

دلگانے مجھے بتایا کہ ایک آٹھ بار اسے ناکامی ہوئی ورنہ عقیدت مند ایسے تھے کہ اس
بات نہیں مانتے تھے یہی وجہ تھی کہ صرف بوڑھے ہی نہیں، جوان لڑکیاں اور لڑکے بھی
ن کے احسان مند تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے اور ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسی
نے شورے پر لوگوں نے حاجی خدا بخش کو دوٹوے کر محلے کا چتر میں بنادیا تھا۔ ایک بار
نے سوئی بھائی سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ اتفاق سے شے کے
لب میں دو پانچ نمبر لگ گیا، اس دن سے سوئی بھائی پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔
انہ انسان مطلب کا بندہ ہے مطلب برادری کے لیے ہی بندگی پر مائل ہوتا ہے اور وہ جو
نراب پنے کے بعد خون کی تے کر کے اس جہاں سے رخصت ہو گیا تھا تو بے چاری نے دنیا
نے سے بدعنائیں دی تھی۔ شراب میں ملاوٹ کرنے والوں سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ
یکہ بدیہی ساوی سی لڑکی تھی۔ اس کی معصومیت اور خدمت خلق کے جذبے نے اسے
دل کی نظروں میں محترم پاک روح، پر اسرار ہستی اور نہ جانے کیا کچھ بنادیا تھا۔ میری
غلوں میں صرف اس محبت کی اہمیت تھی جو صرف میرے لیے تھی۔

قریباً چار ماہ کا عرصہ گزر گیا تو وہ محبت آہستہ آہستہ ٹھنڈے لگی اگر مجھوں اور فرہاد بھی
اتنے سے اپنی لیلیٰ اور شیریں کے ساتھ راتیں گزارتے اور صبح اپنی محبوبوں کو بغیر پڑھے
ایک کوئی کتاب کی طرح بند رکھتے تو میری طرح ذہنی غلبان اور اعصابی بے چینی میں مبتلا

کے محبوب کا تمام پیار اور تمام توجہ اسے حاصل ہو۔ خصوصاً عورت اپنی فطرت
ہوتی ہے محبت کو بھی ایک جائیداد بنا کر اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔

وہ بھی ایک جائیداد تھی جسے میں نے بڑے انتظار کے بعد پایا تھا۔ ہم فلاں
دوسرے کے مطلوب اور مقصود تھے میں اسے ادھر ادھر سے سمیٹ رہا تھا۔
خاموشی سے مجھ میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس کی خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا اور
جھجک اور بے نام سے خوف کو دور کرنا چاہتا تھا اس لیے پیار بھری سرگوشیوں
یقین دل رہا تھا۔

میں تمہارا ہوں، دل کی گمرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں، تم اپنی زندگی کی آخر
تک مجھے محسوس کرو اور سوچو اور یقین کرو کہ میں ہی تمہارا محافظ ہوں۔ بہت
ادھوری ہو، بے سارا ہو تم میرا سارا لے کر ہی مجھے اپنا کر ہی اپنی تکمیل کو
ہو۔

میں اسے سمجھا رہا تھا میری سانسوں کی سرگوشیاں اس کے لبوں پر پڑتی
کے رخساروں پر ترتیبی رہیں، اس کے کانوں میں گنگنائی رہیں اور صبح گردن کے
پھسلتی رہیں اس پر ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ اسے ایسی محبت اور ایسی آغوش
ہو رہی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر سکتی تھی لہذا وہ بڑی اپنائیت سے اپنے آپ کو
میرے حوالے کر رہی تھی۔

ایک عورت جب تمہاری میں خود کو اپنے محبوب کے حوالے کرتی ہے تو اسے
بد مقاصد بڑی دور تک جاتے ہیں۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ دنیا جہا
خود کو میرے حوالے کر رہی تھی اس میں کسی بڑے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ
ایسی ادھوری تخلیق تھی کہ اس کے وجود کے کسی حصے میں گناہ کا کوئی دردانہ
میں اسے دیکھ سکتا تھا، اس سے محبت کر سکتا تھا، اسے آغوش میں لے کر
دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا اور اسے چوم سکتا تھا اور بس اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا
وہ سدا ساگن تھی۔ اس دنیا کا کوئی مرد اس کے ساتھ ساگ کاسفر میں کو
میرے نصیب سے مجھے ایسی محبوب ملی تھی جسے میں صرف ایک تصویر کی
رکھ سکتا تھا اسے بانسوں کے ہار پہنا سکتا تھا لیکن کبھی یہ شکایت زبان پر نہیں

اس رات میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے ہلکا سا بخار تھا ایسے بخار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو پھر بھی چڑھتا اترتا رہتا ہے مگر میں اندر ہی اندر جس بخار میں جھنک رہا ہوں اب ناقابلِ برداشت ہو چلا تھا۔ تمام دن اس انتظار میں گزارا کہ رات آئے گی تو وہ برے کمرے میں آئے گی۔ جب رات آئی تو مجھ پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اب آزمائش کا وقت آ رہا ہے، صبح تک مجھے بے لوث محبت کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ وہ اپنے غم سے تیار کیا ہو اسان لے کر آئے گی، میرے ساتھ بیٹھ کر کھائے گی میں بستر لیٹ اٹھوں گا تو وہ میرے ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ مجھ سے ٹھنڈے ٹھنڈے موضوعات پر گفتگو کرے گی میں اسے آغوش میں لوں گا، وہ انکار نہیں کرے گی میں اسے پیار کروں گا، وہ ٹرائے گی، میں اپنے جذبات کا اظہار کروں گا، وہ گھبرائے گی میں ضد کروں گا، وہ دامن ہار کر نکل جائے گی۔

بس یہی روز کا معمول تھا۔ میں محبت کی اس محدود یکسانیت سے بے زار ہو گیا تھا۔ وہ جی تھی کہ اسے دیکھ کر بغیر قرار بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے دور رہ کر سکون نہیں ملتا تھا لہذا میں اپنے مہر کو آزماتا تھا۔ کبھی ایسا ہو تاکہ میں خند کا ہنسنہ کر کے آنکھیں بند کر لیتا تاکہ وقت مختصر ہو جائے۔ کبھی اس سے ناراض ہو کر کڑواہٹ بدل لیتا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ناپار پوری باتوں سے میری ناراضگی دور کر دیتی تھی۔

اس رات وہ آئی تو میں ان پر اسرار جنازوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے چھاتیہ تمہارے کیسے رشتے دار ہیں جن کی گھر والیاں کہیں باہر سے وفات پا کر آتی ہیں وہ ان کا جنازہ اٹھانے کے لیے مخصوص لوگ آتے ہیں؟

وہ میری جانب چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا کیا ممائی کی شکر میں نہیں تھی؟

”مگر میں تھی، ہو سکتا ہے کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کہیں سے لائی گئی ہو۔ پھیلی رہا ہو پکا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ احمد دین کی بیوی کی لاش بھی کہیں سے لائی گئی ہو۔“

میں اسے صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں ہونے والی میت کے متعلق بتانے لگا۔ موسیٰ بھائی سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی کسی قدر گھبراہٹ تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر سوچی رہی

ہو جاتے یا پھر بہت مجبور ہو کر ان کو روری کتابوں میں اپنی ہوس کی داستان لکھ کر دیتا لیکن وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے وصال سے زیادہ بھری گزرا تھا۔

اب تک میں حوصلے اور ضبط سے کام لے رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ بڑے لوٹ اور بغیر کسی لالچ کے بھی کی جاسکتی ہے یا پھر میں دوسرے مسائل میں اپنا لہجہ کر بھلا رہا تھا۔ اس دوران میں پھر زلچکا کی التجا پر دوبارہ ایسے جنازوں کو کھانا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ صمدو چاچا کا ذکر میں کر چکا ہوں، دوسری بار موسیٰ بھائی ہاں میت رکھی تھی۔ وہ کراچی کے رہنے والے تھے۔ سال بھر میں لاہور کے گئے ہاں تھے، اچھرے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا۔ اس بار انہوں نے اپنے بڑے بتایا تھا کہ ان کی بیوی آج رات کی ٹرین سے لاہور آ رہی ہے لیکن آج رات کی بیوی اپنے پیروں سے چل کر نہیں آئی چار آدمی اس کی لاش لے کر آئے۔

اس لاش کو دینی لوگ لے کر آئے جو صمدو چاچا کی مرحومہ کو ہسپتال سے لے کر اس لاش کو اسی بوڑھی عورت نے غسل دیا جو صمدو چاچا کی بیوی کو غسل دے چکی اگر وہ مثل پورے کی غسالہ تھی تو تقریباً آٹھ میل دور اچھرے میں آئے والی لاش دینے کیوں آئی تھی؟ لاشوں کو لانے والے وہ مخصوص لوگ کون تھے؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اس وقت پیدا ہوئے جب تیسری بار زلچکا کے اس کے منہ بولے ماموں احمد دین کے ہاں جنازہ اٹھانے گیا۔ اس بار لاش کھینچ کر نہیں آئی تھی۔

احمد دین کرشن مگر میں پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی سخت پردے میں رکھتا تھا پردوس کی چند عورتوں نے ایک آدھ بار اس بیگم صاحبہ دیکھی تھی۔ بیگم بڑی تک چڑھی اور مغرور تھی اس لیے محلے کی عورتوں سے دور ہو سکی۔ احمد دین کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا وہ محلے پردوس والوں سے خود بھی دور اپنی بیگم کو بھی کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اسی لیے بیگم کے جنازے کے دو چار آدمی ہی نظر آئے۔ باقی دینی لوگ تھے جنہیں میں صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی دیکھ چکا تھا اور وہ غسالہ بھی میری جانی پہچانی تھی۔

برتنے ہیں مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔

”نہیں زلیخا! میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اور بات ہے تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔“

”میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”کیا؟ اس نے پوچھا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”کیا وہ عورتیں بھی تمہاری طرح سدا ساگن تھیں؟“

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی سترنم بنی تھی۔ وہ رس بھری گفتگوائی ہوئی، بنی خستہ جذبات کو چھیڑتی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

”آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ جیسی عورتیں ہر دوسرے خیمے کے گرد میں پیدا ہوتی ہیں؟ میں تو ایک عجوبہ ہوں اور عجائب الحکومات ہر جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں لاکھوں کی آبادی میں مجھ جیسی دو چار اور موجود ہوں مگر میں انہیں نہیں جانتی۔ آپ خود ہی سوچئے اگر وہ سدا ساگن ہو تھیں تو معدود چاچا کی شریک جات یا داشتائیں نہ بنتیں۔ ہمارے متعلق ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔“

”دورست کہہ رہی تھی یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔ اگر میں زلیخا کو شریک حیات بنانا چاہتا تو اس کی ہاں اور محلے والے کبھی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ پاک روح ہے اور پاک روح کسی انسان کی نفسانی خواہشات کا شکار نہیں ہو سکتی۔“

میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو حسن سراپا میرے جذبات کو پکار رہا تھا۔ میں نے ہر نفس بدل کر کہا۔

”تمہارے متعلق سوچنا بھی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہیں شریک حیات بنانا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے اس لیے کتراتے ہو کہ ابھی تک ہمارے درمیان وہ گمراہ اور انوثہ رشتہ قائم نہیں ہوا ہے جس کے بعد ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے۔“

”آپ نے پھر وہی باتیں چھیڑ دی۔“ اس نے شکایت کی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے کر پوچھا ”کیا صرف باتوں سے زندگی گزر جائے گی؟“

اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر کہا ”جو میرے اختیار میں ہے اس سے میں انکار

پھر آہستگی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کا

برے کو سمجھنے والا خدا ہے۔ ہم کسی کو سمجھ کر یا سمجھا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔“

جانتی ہوں کہ آپ کو اگر کوئی خوشی یا غمی میں بلائے تو ضرور جانا چاہیے۔ مرنے والے

چاری کوئی بھی ہو اس نے زندگی اچھی طرح گزار دی ہو یا بری طرح۔ برے انسان کا

آخری وقت پر اسے کاندھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ انہیں کاندھوں کے ٹکڑے

ہیں اگر آپ کی نیکیاں صرف اچھوں کے لیے ہیں اور بروں کے لیے اتنی نفرت ہے

آخری وقت کاندھا دینا بھی گوارا نہیں ہے تو آئندہ ایسی جگہ نہ جائیں۔ میں لگی

آپ سے التجا نہیں کروں گی۔“

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ناراض ہو گئی ہو۔ میں نے کہا۔

”میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم جہاں کو کی میں جاؤں

مگر میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تمہارے یہ نام نہاد رشتے دار کوئی سنگین جرم کر

ہیں۔“

”نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں وہ مجرم نہیں ہیں۔“

”پھر وہ لاشیں کس کی ہوتی ہیں؟“

”چند گناہ گاروں کی جن کا بوجھ اٹھا کر قبرستان تک جانا کوئی گوارا نہیں کرتا۔“

میں نے تعجب سے اسے دیکھا پھر اپنی سمجھ کے مطابق کہا ”اس کا مطلب یہ

معدود چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کی داشتائیں تھیں۔“

”ہاں۔“

فرار اور کے لیے اطمینان ہو گیا کہ میں..... سچائی تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر بر-

میں بات آئی کہ بھلا داشتائوں کے لیے ایسی رازداری کی کیا ضرورت ہے؟ کتنے

مند داشتائیں رکھتے ہیں اور اس سانچ میں معزز کھلاتے ہیں ان کی داشتائوں کو آؤ

کاندھا دینے والے بھی سیکڑوں مل جاتے ہیں ان کے جنازے کبھی ایسی رازدار

اٹھائے نہیں جاتے۔

میری یہ باتیں سن کر اس نے جواب دیا ”میں نہیں جانتی کہ وہ ایسی رازدار

کبھی کو یاد کرتی ہوں اور آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں آپ کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے جسے میں اپنا کہ سکوں آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

میں اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن کے اطراف سے ہٹا کر ذرا دور ہو گیا "میں تمہیں غیب سمجھتا ہوں۔ سمجھنے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ آج تک میں تم سے قریب رہ کر تمہارا باب تم مجھ سے دور رہ کر ترپتی رہو۔ میں تم سے دور چلا جاؤں گا تب ہی تمہیں معلوم ہو گا کہ ترپ اور بے چینی کیا ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر میں اپنی چھیل پھینکے گا۔ وہ مجھ سے بھڑکت گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کیا اور دھکا دے کر مٹی پر گرادیا پھر نرئی سے چلا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"بالے۔ بالے!" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں آگن میں آیا تو وہ کمرے کے دروازے پر آئی۔

"رک جائیے خدا کے لیے رک جائیے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے میں مر جاؤں گی۔"

درد میں آواز میں التجا کر رہی تھی تاکہ اس کی آواز دوسرے آگن میں نہ پہنچے جہاں اس کی ہل مری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

بچہ تیزی سے چلتی ہوئی آگن میں آئی اس وقت تک میں دروازے کے باہر چلا آیا تھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے میں نے دروازے کو باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے آنسوؤں اور التجاؤں سے پھر کھل جاؤں گا۔ وہ بند دروازے کے پیچھے سے ہولے ہولے مجھے پکار رہی تھی اور مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر میں وہاں سے ہٹ کر اس کی آواز سے دور ہوتا چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ بھی جدائی کی ترپ اور جلن کی اذیتوں کو سمجھ لے تب ہی اسے میرے جذبات کا شدت سے احساس ہو گا۔ میں درکشاپ میں آکر سو گیا۔

"رات میں نے بڑی بے چینی سے گزار دی۔ کبھی سوتا رہا۔ کبھی جاگتا رہا میں اسے رلا کر آتا تھا اس لیے اس کی آنسو بھری آنکھیں بار بار نگاہوں کے سامنے محوم رہی تھیں۔" وہی عجیب کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ سہو کو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آیا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ صرف لباس بدلنے آیا ہوں اور آج رات کو بھی واپس نہیں آؤں گا۔

"واپس ہاں کے ساتھ میرے کمرے میں آگئی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا پھر

نہیں کرتی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔" گار نہیں بن سکتی۔

"تم چاہتی ہو میں ہمیشہ ترپتا رہوں؟"

"گناہ کے لیے ترپنا نادانی ہے۔"

"انسان ایسی نادانی نہ کرے تو فرشتہ بن جائے گا۔" میں نے اسے چوم لیا۔

اس نے کسما کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میری گرفت ہمیشہ مضبوط تھی لیکن میں جان بوجھ کر ڈھیل دیا کرتا تھا اس لیے کہ وہ میری آغوش سے لٹکا نہیں رہتی تھی صرف میری دست درازی پر مجھے روکتی اور سمجھاتی رہتی تھی۔

وہ ایک ایسی آگ تھی جس میں حرارت نہیں تھی۔ اس کی پہلی اور آخری ڈال بھی تھی کہ میں اس سے ٹوٹ کر پیار کروں۔ وہ ایک شمع کی طرح دالمانہ محبت کی آغوش تھی کہ پروانہ آئے، پروانہ دار اس کا طواف کرے۔ اس سے کچھ نہ مانگے اس کے ترپتا رہے اور ترپنے کی سکت باقی نہ رہے تو خاموشی سے جل کر مری جائے۔ اس کے بعد بھی وہ جلتی رہے گی۔ اس دنیا میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو جلتی ہیں، جلاتی ہیں اور آگ سے ذرا بھی واقف نہیں ہوتیں۔

میں اس کی بے بسی سے جھنجھا گیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بار بار کبھی اور کبھی سمجھیں کرنے لگی تو میں نے اسے پر سے دھکیل دیا اور منجی سے اٹھ کر کمرے میں پہلے بھی اس سے ایسا سلوک کر چکا تھا۔ اسے پر سے ہٹا کر اور کمرے بدل کر اسے منہ پھیر لیتا تھا مگر اس رات اسے بستر پر تنہا چھوڑ کر اٹھ گیا تو یوں گھبرا کر دیکھنے لگا کہ میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں نے جھلا کر کہا "میں سمجھ گیا ہوں کہ تم صرف اپنا سے مجبور ہو کر رہا آتی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اگر ہوتی تو تم میرے ہاتھ سمجھتیں اور میری خوشیوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتیں مگر تو دور کی باتیں ہیں، تم میری ایک چھوٹی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتیں۔"

وہ ترپ کر بستر سے اٹھی اور میری گردن میں بائیں ڈال کر پٹ گئی "میں آ محبت کرتی ہوں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب آپ سامنے نہیں ہوتے ہیں تب

”میں مدتے“ میں واری، تمہارا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔ زلفا کی بھی یہی حالت ہے۔
میں سب جانتی ہوں، زلفا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس نے کیا بتایا ہے۔ میں اس کی زبان سے سنتا چاہتا
تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”میں زلفا کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ وہ میری وراثت ہے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ”وراثت کا مطلب کیا ہوا؟“

”اس کا مطلب ہے اپنے جنس کی تلاش کرنا۔ جن گھروں میں ولادت ہوتی ہے وہاں
جنس کی رسم میں ہم ناچنے گانے ضرور جاتی ہیں۔ کوئی بلائے یا نہ بلائے مگر ہم وہاں پہنچ کر
مذکر کرتی ہیں کہ ہمیں بھی خوشی منانے کا موقع دیا جائے۔ پڑھے لکھے گھرانوں میں ہمیں
ابارت نہیں ملتی۔ مگر پڑھے لکھے ہیں کتنے؟ ہم ان کی طرف نہیں جاتیں اگر جانے کا موقع
دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ میں دولت مند گھرانوں میں بھی زنجوں کو ڈھونڈ نکالوں گی۔
ثانیہ اسی دُور سے وہ ایسی خوشی کے موقعوں پر ہمیں نہیں بلائے۔ ہماری بجائے رنڈیوں کو
نچلاتے ہیں اونہ!“

اس نے اس طرح منہ بیکار اونہ کیا جیسے وہ رنڈیوں سے افضل ہو اور محض ناقدری
کہا دے انہیں اونچے طبقے میں جانے کا چانس نہیں ملتا ہے۔
”مگر ہم اپنی قدر کرنا جانتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے ہاں ایک سدا سا گن
پیدا ہوتی ہے۔ ہم وہاں پھنسی کی رسم میں ناچتے گاتے پڑھ لکھتی ہیں کہ کوئی ایسی مخلوق پیدا
ہوئی ہے جس کا شمار نہ مردوں میں ہے نہ عورتوں میں۔ وہاں ہم یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس
دنیا میں آخر اگر ہم خسرے بن گئی ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے قدرتی طور سے بھی
ہلکی جیسی تیری جنس پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ قابل نفرت نہیں ہے تو پھر ہم سے کیوں
نفرت کی جاتی ہے۔ کوئی مرد کے نقش قدم پر چلتا ہے کوئی عورت کے نقش قدم پر۔ ہم سدا
سا گن کے نقش قدم پر چلتی ہیں کیا میں غلط سمجھتی ہوں؟“

میں نے آگے کر جواب دیا ”میں تمہارے مسائل پر بحث نہیں کر سکتا۔ تم زلفا کے
مخفیہ کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”ہاں میں زلفا کے بارے میں کہہ رہی ہوں، تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہماری

اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اس کی پروا نہ ہو۔ اس ایک نظر میں میں نے اس کے چہرہ
اڑی ہوئی رنگت، بکھری ہوئی زلفوں اور سوچی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ کچھ
رات جاگتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹا پچھلی رات تم گھر نہیں آئے تھے؟ میں نے صبح اٹھ کر دیکھا
تلا پڑا تھا۔“

”جی ہاں“ میں نے جواب دیا ”آج کل کام بہت زیادہ ہے“ میں درکشاپ میں
کروں گا۔“

وہ میرے جھوٹ کو سمجھ گئی۔ میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر
اسے موقع نہیں دیا۔ اتنی تیزی سے کمرے کے باہر چلا آیا جیسے واقعی کام بہت زیادہ ہے
وہاں ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے باہر دروازے پر آگ لگا
ورکشاپ میں وقت گزارنے چلا آیا۔ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے ملے
سے چاہتی ہے۔ اس کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ دور درو کر اسے
والا نسخہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ایک بوڑھا خسر میرے پاس آیا۔ مجھے خسروں سے خفا
ہے۔ وہ اپنے بے ڈھنگے جسموں پر عورتوں کے لباس پہن کر اتنے بھدے اور بے
ہیں کہ میں انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن وہ زلفا کا ہم جلس تھا وہ گھنٹوں اور
پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا لیکن میں نے کبھی اس خسرے سے بات نہیں کی تو
اچانک ہی پہلی بار میرے پاس آیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ زلفا کے بار
والا یقیناً اس کا کوئی پیغام لایا ہے۔

میں ملازموں سے ذرا دور درو ورکشاپ کے ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا۔ ایک
میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ وہ خسر میرے سامنے ایک لکڑی کی چکی پر بیٹھ
بولا۔

”تم تو مجھے جانتے ہو میرا نام اختری ہے میں ابھی زلفا کے پاس سے آئی ہوں
کہہ کر اس نے میری آنکھوں کو گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں تو
بلا میں لیتا ہوا بولا۔

نے اس کا دل نہیں توڑا اور اسے اپنا بنا کر رکھا تو میں جنہیں سب کچھ بتا دوں گی کہ میرے
اور زلیخا کے درمیان کتنا اہم رشتہ ہے اتنا اہم کہ میں کسی موقع پر بھی اسے بدنام نہیں کرنا
ہاں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو۔ کسی بات پر ناراض
ہو کر کچل رات سے گھر نہیں جا رہے ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے پاس جاؤں
اور تم سے مت اور صحبت کروں کہ راتوں کو گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ ایک محبت کی ماری
نہلا اظہار کر رہی ہے۔ جاؤ بالے! اس کا دل نہ توڑو۔ وہ بہت کمزور دل کی لڑکی ہے۔ اسے
بہت ہی محبت ملتی ہے کسی کی ناراضگی کبھی نہیں ملتی۔ یہ تم ہو کہ اس سے ناراض ہو کر آئے
۔۔۔ تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکتے گی۔ اپنی جان کرو گدگالے گی۔ ابھی یہاں
سے بڑھ کر چلے جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

اس کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ میری توقع کے مطابق
ہوئے لیے تپ رہی تھی۔ میری ضرورت محسوس کر رہی تھی اور میں بھی چاہتا تھا۔
ایک گھنٹے کے بعد میں درکشاپ بند کر کے گھر واپس آیا تو تمام محلے میں رات کی
اڑھی چھائی ہوئی تھی۔ گلی سنسان تھی اور بچے پان والا دکان کے پچھلے دروازے سے
اُڑا کر رہا تھا۔

میں اتلا کھول کر اندر آیا اور دروازے کو بند کر کے جب کمرے میں پہنچا تو وہ میرے
غلام بنی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے قدموں سے لپٹ کر
رہنے پڑنے لگی پھر میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ رورہی
تھی اس کی محبت اور دیوانگی نے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ کسی کو
یہ محبت کرنے والی ہستی مل جائے تو وہ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے یہ میں اس رات سمجھ

میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ میری
نوا میں ایک ننھی بچی کی طرح ہنسنے اور شکایتیں کرنے لگی میں اسے پکارتے نکا اور
بھنگا۔

”نپ مجھے جھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے کیوں چلے گئے تھے؟“

زندگی کو بھی سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو کسی دن زلیخا بدنام ہو جائے گی۔“
اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ بدنام ہو جائے۔ میں نے کہا۔
وہ ہنسنے لگا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ”زلیخا مجھے رازدار سہیلی سمجھ کر سب کو بتا
ہے۔ نہ بھی بتاتی تو میں کچھ کم نہیں ہوں“ اڑتی چڑیا کے پر گھن لیتی ہوں۔ بھلا بھلا کر
ماننے والی بات ہے کہ راتوں کو تمہارے ساتھ سوئے اور صبح پاک باز عورت کی لڑ
اٹھے۔ وہ اپنی پاک بازی بتاتی ہے مگر میں نہیں مانتی۔ اگر میں یہ بات بھلا دوں تو زلیخا
پاک روح سمجھ کر اس کی عزت کرتے ہیں وہ عزت مٹی میں مل جائے گی اور لوگ
تمہاری طرح پیشہ ور غنٹ سمجھنے لگیں گے۔“

میں نے غصے سے اسے دیکھا میرے جی میں آیا کہ ارادہ کر اس کا بچہ نکال دلا
ایک سیدھی سادی شریف عورت کو بدنام کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اسے غصے
نفرت سے دیکھتا رہا اور ضبط کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس پر ہاتھ اٹھانا دانشمندی نہیں
یہ خسرے اول درجے کے بے شرم اور ذہیت ہوتے ہیں۔ وہ مار کھا کر سامنے ٹوک
جائے گا اور ہاتھ ہلا کر مجھے اور زلیخا کو کوسے گا۔ میرے عشق کی داستان نام ہو کر
بدنام ہوگی۔ جس لڑکی کو تمام محلے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا آنکھوں میں ہنسیاں
میں اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے میرے گمڑے ہوئے تیور دیکھ کر کہا ”میں زلیخا کی دشمن نہیں ہوں اگر
ہوتی تو بچپن ہی سے اسے اپنی ٹولی میں اٹھا کر لے جاتی کیونکہ جہاں کوئی سدا سا گدا
ہوتی ہے اس دروازے پر ہماری ٹولی دھرتا دے کر بیٹھ جاتی ہے کہ اس سدا سا گدا
ہمارے حوالے کر دیکھو کہ وہ ہماری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔“

ہوتا یوں ہے کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوتی ہے اس کے والدین اس کی اصلیت پ
ہیں۔ باپ شرم سے کسی کو بتا نہیں سکتا کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اکثر بیٹی ہی مشہور کرتی
زلیخا کی اصلیت کو میں نے پہچان لیا تھا پھر میں اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں جا کر شور مچانا
سارے محلے والوں کو خبر ہو گئی۔ زلیخا بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی
باپ جاہل تھا مگر بہت پیسے والا تھا۔ میں نے اس سے سمجھو کیا۔ ایک ایسا بچہ
کے متعلق ابھی میں جنہیں نہیں جاسکتی کیونکہ تم زلیخا سے ناراض ہو کر آئے ہو۔

اٹھا اور اس کے پہلو میں لیٹ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی
”تم صرف کل سے تڑپ رہی تھیں، میں چھ ماہ سے تڑپ رہا ہوں۔ اب تمہیں میری
انگلی کا احساس ہو گیا ہو گا۔“

وہ خاموشی رہی۔ شاید اس لیے نہیں بول رہی تھی کہ کوئی بات میرے مزاج کے
خلاف ہوگی تو پھر میں روٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اس کی خاموشی میرے لیے سودمند تھی۔ میں
اس خاموشی مجھ سے کھیلنے لگا۔

چاندنی چاندنی آنگن میں اتر رہی تھی اور اس کی دھندلی سی روشنی کمرے کی تاریکی سے
کھیل رہی تھی۔ اس دھندلکے میں زلیخا کا وجود کچھ چھپ رہا تھا اور کچھ جھلک رہا تھا میرے
بانہ پر جنبش پر چھینے اور سنسنے والی کو دریا فت کر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے بے باک
باغلوں کو پکارتی تو میں اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں میں ڈوبتا ابھرتا اور اسے سمجھاتا۔
مجھ سے نہ شراب میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔ گناہ کے تصور کو ذہن سے نکال دو۔
میں نہیں مدق دل سے اپنا رہا ہوں اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو اس قہر ت کو پیشہ
کے لیے ختم کرو۔ مجھے کیسے دور چل جانے دو۔“

دور ہونے کے ذکر پر وہ گھبرا کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح خوف
دیا تھا اس لیے وہ میری بے باکیوں پر برائے نام احتجاج کر کے ہار جاتی تھی۔ میرے
دوٹے پہننے مجھے نہیں حجاب کے پردے ہٹا گیا۔ اس کے نازک بدن کی ملامت سے آشنا
ہو گیا کچھ دیر بعد مجھے سمجھنے کا احساس ہوا کہ کمرے کی نیم تاریکی میں ہوس کی پنگاؤں جھلک
رہی ہے، اندھیرے کی دیواروں سے گھرا رہی ہے، پھنچ پھڑا رہی ہے مگر اسے دیوار کے اس
پارہانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

میں ہوش سے بے گانہ ہو رہا تھا، ہوش ہونے کے لیے مزید نشے کی ضرورت تھی۔
نشہ بھی ہوتا ہے جو نیکان والا فروخت کرتا ہے لہذا پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں اس
دکان کے پچھلے دروازے پر گیا اور نشے کی انتہا کو چھو لیا۔ اف! کیسا خالم اور کیسا مہربان نشہ
تھا۔ میں ان فیملی لمحات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ لمحات جبکہ میں خود کو اور ساری دنیا کو اور
نیکادری کو بھلا بیٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ اپنی بانسوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

”یہ دیکھنے کہ تم میرے بغیر کس طرح ترپتی ہو؟“

اللہ! آپ نے بہت ظلم کیا ہے میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہو گئی تھی۔
لگ رہا تھا کہ میری جان نکل گئی ہے میری زندگی میرے پاس نہیں ہے، آپ کے ہاتھ
مٹتی ہے اور میں بالکل خالی ہو گئی ہوں۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔
پاس مگر تھی۔ ماں جی پوچھتی رہیں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے، صبح سے میں نے ہر کون
نہیں ہے مگر میں انہیں بتاتی رہی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو جی نہیں چاہتا
جانے آپ میں کیا جادو ہے کہ آپ کے بغیر بھوک پیاس۔“

میں نے اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی آواز گھٹ گئی پھر
اسے جوم کر کہا ”اور باقی باتیں بعد میں ہوں گی تم صبح سے بھوک ہو۔ جاؤ روٹیاں
میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا“ اس نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے
بانسوں میں ڈال کر بولی ”ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کھو کر بڑی مدت کے بعد پایا ہے، چھوڑ دو
جی نہیں چاہتا۔“

میں نے اسے سمجھا بھجا کر روٹی لانے کے لیے بھیج دیا اور منجی پر اکر بیٹھ گیا
دیر کے بعد وہ سالن اور روٹیاں لے کر آئی، ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے
کھانے لگے۔ کبھی میں نوالہ بنا کر اسے کھلاتا تھا اور کبھی وہ مجھے کھلاتی تھی۔ اس وقت
بڑی دنیا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اس کائنات میں صرف ہم دو زندہ
والے تھے۔ ہمارے علاوہ کوئی دنیا کوئی ہستی اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بول رہی
سن رہا تھا۔ میں محبت کے گنگنائے وعدے کر رہا تھا وہ خوشی سے پھولی نہیں ساری
کھانے کے بعد اس نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا پھر میرے پہلو میں اکر بیٹھ
پچھلی رات سے اب تک کے ہجری کی داستان سنانے لگی کہ کس طرح اس کی خنداز
دن کے وقت بھی وہ سونہ سکی میرے انتظار میں اب تک جاگتی رہی۔ میں نے اٹھ
”تمہیں اب سو جانا چاہیے چلو یہاں لیٹ جاؤ میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا اور سوچ سوچ بڑے پاس آکر لائٹ آف کر لی
اندھیرا پھیل گیا، نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ اس تاریکی اور خاموشی میں
بول رہی تھی کہ ایک مسکند دیکھا بدن کھٹ لے رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ

صاف ستھرا سرخ رنگ کا لباس تھا۔ وہ ہمیشہ سرخ لباس پہنتی تھی کیونکہ سدا سہاگن تھی اور ایک پاک روح تھی، ہمیشہ پاک صاف رہتی تھی۔ وہ پاک روح ہو یا نہ ہو لیکن میں ندامت سے مراجہہ تھا کہ اس کی پاکیزگی کی کو دبدبہ لگا گیا تھا۔

اس کی ہاں روٹی ہوئی کرے میں آئی۔ ایک شخص نے پوچھا۔

”ہاں جی ایسے کل شام تک اچھی بجلی تھی پھر چاچا تک اسے کیا ہو گیا ہے؟“

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ”کیا بتاؤں بیٹا! پوسوں رات کو تین بجے میری آنکھ کھلی تو آنگن میں شعل رہی تھی، صبح اس کی آنکھیں ستاری تھی کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ کل تمام دن اس نے کچھ نہیں کھایا، کل رات کو ایک بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا یہ آنگن میں شعل کر رہی ہے۔ پاک صاف رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدھی رات کو غسل کیا جائے نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں پوچھتی رہی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ لباس بال کر مل کر لٹ گئی تب سے اٹھاتی ہوں تو اٹھتی نہیں بات کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی ہائے میری بچی کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ دو راتیں گزر گئیں، دوسرا دن گزر رہا ہے اور یہ اب تک جاگ رہی ہے۔ ہائے رہا ایسے جاگتی رہے گی تو مر جائے گی۔ لوگو! کچھ کر دے یہ معصوم تھماری کام آتی رہی ہے آج تم اس کے کام آؤ اسے کسی طرح بچاؤ۔“

ہاں جی کی باتیں سن کر میرے دل پر کیا گز رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں سمجھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غلطی میں کروں گا اور بچتا تو اسے کے عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گی۔ وہ جسے بچپن سے سمجھا گیا تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے اس دنیا کی کوئی غلامت اسے چھو نہیں سکتی، وہی معصوم لڑکی آنکھیں کھولے سکتے کے عالم میں اس غلامت کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دامن پر لگ گئی تھی۔ اس نے آدھی رات کو غسل کیا تھا، صاف ستھرا لباس پہنا تھا، بستر پر سفید اہلی چادر بچھائی تھی پھر بھی احساس گناہ کا دبدبہ اس کے داغ سے نہیں مٹ رہا تھا۔ میں ندامت سے سر ہٹا کر منہ کی قریب آیا اور اسے آواز دی۔

”نہ لیا“

وہ ایسے خاموش رہی جیسے اس کے کان اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سن رہے ہو۔ میں نے منہ کی سرے پر جھک کر اسے پھر ایک بار بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

”نہ لیا، ہوں بالے میری طرف دیکھو۔“

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ جب جوش اور جذبے سرور پر مگنے تب احساس ہوا کہ جسے میں جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں، اسے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کے ساتھ ایک غیر انسانی سلوک کیا ہے۔ میں بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ ہنچکیاں لے کر کھڑی رہی۔ شرمندگی سے میری زبان نہیں کھل رہی تھی، میں نے خاموشی سے اسے نہ دیکھا اور چپ کرانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ ہٹا دیا انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک غلامت کو اپنے جسم سے جھٹک رہی ہو پھر وہ کھنکھناتی منہ کی سرے پر منہ کی اپنے لباس کو درست کیا اور کراہتی اور کانپتی ہوئی آنکھ کرکھی۔ نیم تاریکی میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی اور سسکیاں لیتی کراہتی ہوئی قدم پر ڈنگاتی اور سنبھلتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں جا رہی ہے؟ میں اسے روکنا چاہتا تھا، ایک بار سینے سے لگا کر قسلی دتا چاہتا تھا۔ میری زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں ایک مجرم کی طرح خاموش رہا اور وہ چلی گئی۔ دوسری صبح بیدار ہوا تو آنگن دھوپ پھیل گئی تھی۔ دوسری طرف آنگن میں کچھ مردوں اور عورتوں کی باتیں کرنے آوازیں آ رہی تھی پھر کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر میرا دل دھک سے رو گیا۔ ”زیلنا کے گھر میں کوئی عورت کیوں رو رہی ہے؟ یہ سوال میرے داغ میں چھلنے لگا۔ میں دروازہ کھول کر اس آنگن میں گیا، وہاں کھلے کی عورتیں تھیں کچھ جانے پا کر لوگ تھے اور ان کے درمیان زلنہ کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

ایک نے جواب دیا ”زیلنا پر سکتہ طاری ہے کچھ بولتی نہیں ہے۔ پتہ نہیں۔“

ہو گیا ہے؟“

میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے کمرے میں آیا، وہاں بھی مرد عورتوں کی بھڑکنا سب ہی اسے چاہتے تھے اس لیے اس کے دکھ میں شریک ہونے آگئے تھے اور آوازیں دے دے کر اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ اپنی منہ پر لٹٹی ہوئی چھت کی جانب تک رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں لگتا تھا کہ ویدے پتھر ہو گئے ہیں۔ بستر پر سفید چادر چھٹی ہوئی تھی۔ اس کے

پہنچی تھی اس لیے آپ کی خاطر اسے قبول کر لیا۔“

اب آپ اس پر بحث نہ کریں۔ میرے پاس دقت بہت کم ہے اور مجھے بہت گہری غیبت آ رہی ہے۔ ایسی غیبت مجھ جیسی عورت کو ایک ہی ٹھوکر کے بعد سلا دیتی ہے۔ آپ میری باتیں غور سے سنیں۔ معدود چاچا موسیٰ بھائی اور احمد دین کے آئندہ کبھی کوئی میٹ ہو تو آپ وہاں نہ جائیں۔ آج کے بعد میں خسروں کی پابندیوں سے آزاد ہو جاؤں گی۔ وہ لوگ خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں۔ آپ سب اس دنیا میں خسروں کا وجود دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کب مرنے ہیں اور کہاں دفن ہوتے ہیں؟

یہ ایک لمبی داستان ہے اخترازی نے مجھے بتایا ہے۔ وہی خسر جو کل آپ کے پاس گیا تھا اسی نے میرے ابا جان سے کہا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے ورنہ میرے جوان ہونے پر مجھ پر بد فعلی کا الزام لگائیں گے۔ مجھ جیسی ہستی جو نہ مرد ہے نہ عورت اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو ایک باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ خسروں کا ڈھیٹ پن مشہور ہے۔ انہیں لات جوتے مار کر بھی ان کی زبانیں بند نہیں کی جاسکتی۔ یہ خسرے جس شہر میں رہتے ہیں بڑے اتحاد سے ایک جماعت بنا کر رہتے ہیں۔ اپنی کمانی کا کچھ حصہ ایک ننڈ کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ہر شہر میں ان کے خاص ملازم ہوتے ہیں جو آدمی رات کے بعد مرنے والے خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی کوئی عزیزہ بنا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔

معدود چاچا موسیٰ بھائی اور احمد دین جیسے شوقین مزاج رکھیں کسی جوان خسرے کو اپنی داشت بناتے ہیں تو اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے کفن و دفن کا انتظام وہ خود کریں گے۔ تو میری رات کے بعد معدود چاچا اور موسیٰ بھائی کی داشتاؤں کی لاشیں انہی خسروں کے گھر سے نکل گئیں۔ اسپتال یا کراچی سے ان کی بیویاں نہیں آئی تھیں۔ پھر یہ خسرے مجھ جیسی سدا سا گلوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہماری ان پیدائشی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہمارے والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خسروں کے کفن و دفن کا بندوبست کریں ورنہ وہ سدا نہماں گے۔ جوان ہو کر بدنامی کی زندگی گزاریں گی۔ میرے ابا جان راضی ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے مرنے والے خسروں کے کفن و دفن کے لیے چندہ دیتے رہے۔ کئی بار چوری چھپے انہیں پانہ حارے کر بھی آئے۔

اس کے پھیلے ہوئے دیدے ذرا۔ ادھر سے ادھر ہوئے وہ مجھے دیکھنے لگی۔ جب اس کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں اس کی آنکھوں میں دیرانی تھی۔ مجھے دیکھنے کی بات آئی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ دور کھڑے ہوئے افراد منجی کے قریب اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرکت ہوئی ہے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کتنی محبت اور شکایت بھری نظروں سے مجھ پر رہی تھی۔

اس کی ماں نے قریب آ کر کہا ”ماں صدقے، میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ میرے لباس کو دیکھا جسے میں پچھلی رات سے پہنہا تھا۔ پھر وہ بڑی اتفاق سے بولی۔ ”خسارے لپیٹا۔“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا مارا۔ اس پاکیزگی کے سامنے میں نے خود کو دنیا کا بے غلیظ انسان محسوس کیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”اچھا میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔ میں تمہیں سلاؤں کا تم سوجاؤں گا؟“ ”ہاں!“ وہ پھر چھت کی جانب گھورنے لگی۔

میں فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آیا۔ جلدی جلدی غسل کیا۔ ہوئے کپڑے پہنے۔ کچھ لوگ میرے آئینے میں آکر کہہ رہے تھے کہ میں براخونہ ہوں۔ پاک روح مجھ پر مرہاں ہے اور میری موجودگی میں سونا چاہتی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے تم لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہو۔ میں ڈنڈا ویاغ سے گناہ کا احساس منانے جا رہا ہوں۔

جب میں وہاں پہنچا تو اس کی ماں تمام لوگوں کو کمرے سے باہر لا آئی تھی۔ آواز نہ ہو اور بنی سکون سے سو جائے۔ میں منجی کے سرے پر بیٹھ گیا اور اس کے بڑی محبت سے تمام کر کہا۔

”نہ لپٹا! تم گناہ کا احساس کر رہی ہو اور میں ندامت سے مر جا رہا ہوں۔“ اسے بھول جاؤ۔“

”کیسے بھول جاؤں۔ محبت کے نام پر میں کچھ دے رہی تھی، آپ نے کہا روح کی پاکیزگی دے رہی تھی، آپ نے جسم کی غلاط دی۔ میں آپ کو بھلائی“

ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ابا جان نے مرنے سے پہلے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں ان خسروں کی ضروریات پوری کرتی رہوں ورنہ میری نیک نامی پر حرف نہ لگا۔ میں اس نصیحت پر آج تک عمل کرتی رہی۔ سدا سہاگن پاک ہستی کبھی جالانیہ مجھے اپنے وجود کے آئینے کو صاف رکھتا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ الزام تراشی ہو کر آپ کی محبت نے مجھے زندگی بھی دی اور موت بھی۔ میں جھوٹی عزت و احترام کے سلا نہیں جی سکتی۔ پاکیزگی کا جو آئینہ سب سے زیادہ عزیز تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میں نے اپنے محبوب کی خوشی پوری کی ہے مگر دل نہیں مانتا۔ جب میں ہر ایک طور پر مکمل عورت نہیں ہوں تو میں نے کیسے خوشی پوری کی؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ نمد سہاگن ہو کر سہاگ کی بیچ پر جاؤں؟ آج مجھ میں اور ایک خسرے میں کوئی فرق نہ ہے یہ تو جہنم میں کیسے برداشت کروں؟ میں قانون قدرت کے خلاف آپ کی بیچ پر جلی گئی۔ وہ خسرے شریعت کے خلاف نماز جنازہ سے گزر کر دفن ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کیسے تماشے ہوتے ہیں۔ میرے مالک! میرے محبوب! مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں نے غسل کرنا آپ نے غسل کر لیا۔ اب وہی پرانی آرزو ہے کہ آپ مجھے چاہیں۔ مجھ سے محبت کر ایسی محبت جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ کیا ایسی محبت اس دنیا ہے؟ میں اس پر جبک گیا اور اس آئینے کی طرح صاف اور شفاف چہرے کو اٹھایا۔

میٹھا زہر

”ہاں! ہر محبت کے پیچھے ایک غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اب مجھے نصیحت ہے۔ میں تم سے بے لوث محبت کروں گا تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا تمہارا ہر بار کی ہر طلب پوری کروں گا میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔“

اس کے لبوں پر پھینکی سی بے جان سی مسکراہٹ آئی اس نے آنکھیں بند کر لیں وہ سو رہی تھی۔ باہر لوگ دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ کبیں ایسا اچانک نہ ہو جائے۔ کمرہ بھی خاموش تھا میں بھی خاموش کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ سو رہی اور میرا دل رو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی بٹ سے گری نیند اٹھتی تھی۔ نیند خواہ کتنی ہی گہری ہو میرا ایمان ہے کہ وہ قیامت ضرور اٹھے گی۔

کمانی وہ ہوتی ہے

جو ایک تہذیب کے اس مخصوص دور کو اپنے

اندراجیشہ زندہ رکھتی ہے۔

ہنجاہ کی زندہ تہذیب کی زندہ کمانی

اس کا اختتام نہایت ہی چونکا دینے والا اور

نا قابل فراموش ہے۔

و خود بھی اپنے پنڈ کا ایک گہرو جوان تھا۔ چیتھے ہوئے رنگوں کی قیص اور چیتھ کی
 رنگی لگی پہنتا تھا۔ چھ مرنے کی زمینداری میں جہاں جاتا تھا اپنی رعیت سے حاکموں جیسا
 ملک کرتا تھا۔ اگر کوئی بغاوت پر اتر آتا تو زوردار بیک لگا کر اسے لٹکارتا تھا۔ کبھی اپنی
 طاقت سے اور کبھی جاگیردارانہ حکمت عملی سے اس باغی کو کڑی سزائیں دیتا تھا۔ تعلیم کا
 مردوں سے روانہ نہ تھا، زندگی کے اہم مسائل لاشیوں سے، رانگلوں سے یا دولت سے
 ملے جاتے تھے لیکن بقول شاعر

سرخ پوش یہ لب بام نظری آید۔

نہ برور و نہ برادری نہ بزرری آید

و جو حسینہ نظر آ رہی تھی وہ نہ تو طاقت سے نہ آہ و زاری سے اور نہ ہی دولت سے
 مائل ہو سکتی تھی لہذا پہلی بار اس نے دولت بھرے داغ کے بجائے محبت بھرے دل سے
 ہوا کا دوشنی اور داؤ چھ سے نہیں بلکہ پیار و محبت سے اپنائی جاسکتی ہے۔

اس وقت وہ گلبرگ کی ایک شاندار کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ سامنے
 ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے عمارہ عورتوں کی بھیڑ میں کبھی نظر آتی تھی اور
 کبھی کوٹھی کے پچھلے حصے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ برآمدے کے دوسری
 طرف کوٹھی کے پردے سے احاطے میں میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دور دور کے پنڈوں
 سے آئے ہوئے زمیندار، پنواری اور تحصیل دار اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھے خوش
 گہلوں میں مصروف تھے۔ ان میں واجد کا باپ چوہدری جناب علی بھی تھا اور اس کا دشمن
 نئی عمارہ کا باپ چوہدری کرم دین بھی تھا۔ دونوں کے شانوں سے ریوالور اور گولیوں کی
 پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر
 اس طرح مونچھوں پر آؤ دے رہے تھے جیسے وہ ریوالور کے بجائے مونچھوں سے فائر کرنے
 کا ارادہ کر رہے ہوں۔

دور آمد سے اتر آیا اور لان میں ٹھلنے لگا۔ ٹھلنے کا صرف بہانہ تھا، وہ آہستہ آہستہ
 کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت جب دو بوڑھے مزید دوشنی کے لیے پر
 تیار رہتے، وہ عمارہ کی طرف دوستی کا پہلا قدم اٹھا رہا تھا اور دل ہی دل میں شہت چاچا
 کو براہیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے دو دشمنوں کا پورا خاندان اٹھ کر اس کوٹھی میں آگیا

بیٹھا زہر

عمارہ کو دیکھتے ہی کوٹھی صورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہو گیا۔ وہ
 اب سے پہلے محض اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ لڑکی بے مد
 ہے، اپنے معیار کی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جاسکتا ہے اور اسے
 جانے کا وقت آئے تو اپنی عادت کے مطابق اسے بھلایا بھی جاسکتا ہے مگر میں نا
 کے سامنے اسے دیکھتے ہی خود تصویر کی صورت گم سم ہو گیا۔ وہ اوپر سے قافی تھا
 بیکل بن کر رہ گیا۔

عمارہ کی تصویر کو اس نے ایک ہی زامیے سے دیکھا تھا اور اس وقت وہی ٹلا
 برنگے لباس پہنے ہوئے عورتوں کی بھیڑ میں مد ہزار پہلوؤں سے جلوہ نکلتی تھی۔
 طرف شادی کی رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ مہمان عورتوں کی خاطر مدارات کے لیے لا
 ادھر بجلی کی طرح چمب دکھا کر چمپ رہی تھی۔ کبھی اس زامیے سے، کبھی اس
 سے ٹکا ہوں کی پیاس بڑھا رہی تھی۔ وہاں اور بھی ڈیڑھ ساری لڑکیاں تھیں۔ ایک
 طرح دار، کوئی سج و سج میں ہیر سیال، کوئی حسن میں زلیخا اور کوئی اداؤں میں شیریں
 عمارہ کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تول میں بھی بھاری تھی اور مول میں بھی۔ اس کے
 میں محض حسن واداکی فتنہ گرمی نہیں تھی۔ رعب حسن اس لیے بھی طاری ہوا
 چک نمبر دو سو تیس کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔

واجد چک نمبر دو سو تیرہ کے زمیندار چوہدری جناب علی کا بیٹا تھا۔ وہ ایک
 بیٹی سے مرعوب نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں جو پچھل سی گنج گئی تھی وہ محض اس
 دشمن کی بیٹی تھی اور اس کے داؤ چھ سے دور تھی۔ جو چیز دوسرے سے باہر ہوا
 دل زیادہ چمکتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ اس البر و سیاتی لڑکی کے لیے کچھ زیادہ ہی بنا
 تھا۔

لے شور مچاؤ کیا ہو گا؟

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ وہ تمہارے قدموں میں لوٹے گی
نہاری برسات پر آتنا و صدقہ کا کے گی۔ میں نے اس کے دماغ میں کیسا زہر گھولا ہے، یہ
بڑے طاقت نہیں ہے۔ تم اب جاؤ اور مالی کے کمرے میں اس کا انتظار کرو۔“

یہ کہ کر نازنین خالہ نے اس کی پیشانی کو چوم لیا پھر تنبیہ کے انداز میں بولی۔
”دیکھو جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے لے کر چلے جانا ہے اگر تم ناکام ہوئے تو
اپنے باپ کا قصہ بھی جانتے ہو وہ تمہاری ناکامی پر وراثت نہیں کریں گے۔“

یہ کہہ کر وہاں سے جلدی جلدی قدم پر بڑھاتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ واجد
نورانی ہر تک وہاں گم مسم کھڑا رہا۔ اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ اپنی قسمت
پر اہل خالہ کا عمارہ اسے مل رہی ہے، وہ حیران تھا کہ پلک جھپکتے ہی نازنین خالہ نے اس
کے لیے مارے راستے ہموار کر دیئے تھے وہ پریشان تھا کہ اب آگ اور خون کے دریا سے
وادی کے ساتھ کس طرح گزر سکے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مالی کی کوٹھی میں آگیا اور ایک چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔
اس کے آگے عمارہ کی محبت تھی اور پیچھے برسوں پرانی دشمنی اور نفرتیں تھیں۔
اب وہ محبت اور دوا منداری سے عمارہ کو نہیں اپنا سکتا تھا۔ نازنین خالہ اور چوہدری
باب علی کی نفرتوں کا سارا لے کر ایک باپ سے جبراً اس کی بیٹی کو چھین سکتا تھا۔
وہ کتنی برس پیچھے پرانی نفرتوں کی طرف پلٹ گیا۔

کچن برس پہلے انسان کسی حد تک آسودہ اور خوش حال تھا۔ کھانا، کپڑا اور ضروریات
زندگی کی دوسری چیزیں قدرے سستی تھیں مگر محبت اس وقت بھی تنگی تھی۔

جہاں دن زور و زور زور کا جھڑا ہو وہاں سے محبت کا گزر نہیں ہوتا۔ جناب علی اور کرم
دونوں کے خاندانوں میں پشت پشت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں کی زمینیں ایک سرحد
پر ملتی تھیں اس لیے کبھی زمینوں کے لیے مقدمے بازیاں ہوتی تھیں کبھی نہری پانی کے
لیے انہماں اور راستوں پر چلتی تھیں۔ جب ان جھگڑوں سے بھی قرار نہ آتا تو پھر کسی
اورت کے لیے کوئی نفاذ کھڑا ہو جاتا تھا۔

دونوں زمینداروں کی حویلیوں میں عورتوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کبھی شہنشاہوں کے

تھا۔ اگر وہ بھی اپنے گھروالوں کے ساتھ یہاں نہ آتا تو کبھی عمارہ کا ویدار نصیب نہ ہوا
زندگی میں پہلی بار کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی ترپ پیدا نہ ہوتی۔

کوٹھی کے پیچھے سروٹ کو ارٹرز کے قریب نازنین خالہ سے سامنا ہو گیا۔ نازنین خالہ
خلاف ایک دوسرے کو آنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ٹھک گئے تھے۔ نازنین خالہ
چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس پاس اور
دشمنوں میں سے کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہے تو انہوں نے آگے بڑھ کر واجد کا
نگایا۔

”میرے بچے! تمہیں اپنے کلیجے سے لگانے کے لیے ایک مدت سے نرم رہی
یہاں کوئی آنے کا تو نہیں؟“

”نہیں۔ میں خوب سوچ سمجھ کر آیا ہوں، ابھی وہاں مجرا شروع ہونے والا ہے
طرف کوئی نہیں آئے گا۔ کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”ہاں میں سوچ رہی تھی کہ کسی طرح تم سے یا تمہارے لیے سے ملاقات ہو جا
خدا کا شکر ہے کہ تم ادھر آ گئے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کل ہوتا ہے، وہ آج ہی ہو جا۔
دیکھو سامنے مالی کا کمرہ ہے، تم وہاں جا کر بیٹھو۔ میں سب انتظام کر چکی ہوں وہاں کمرہ
آئے گا۔ میں ابھی جا کر وہاں عمارہ کو بھیجتی ہوں۔“

عمارہ! واجد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ جس کی تلاش میں وہ بھٹکتا ہوا یہاں
تھا وہ آپ ہی آپ اس کے قریب پہنچنے والی تھی۔ نازنین خالہ نے پوچھا۔

”تم نے عمارہ کی تصویر دیکھی تھی؟“
”جی، جی ہاں۔ ابھی ابھی اسے دیکھا ہے وہ بہت اچھی ہے۔“

”بس تو ٹھیک ہے جو کل ہوتا ہے وہ آج ہو جائے۔ تم آج ہی اسے لے جاؤ۔“
”جی!“ وہ چونک کر بڑی حیرانی سے اپنی خالہ کو دیکھنے لگا۔ خالہ نے پوچھا۔

”تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا انتقام نہیں لو گے؟ آج سے نکلیں اور
چوہدری جیسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا تم اپنی خالہ کا انتقام لینے کے لیے چوہدری کی بیٹی
سے چھین کر نہیں لے جاؤ گے؟“

”آں۔ ہاں۔ لے جاؤں گا مہ۔ مگر یہاں تو چاروں طرف لوگوں کی بھڑک ہے!“

ریو اور دور ایک بوڑھا ملازم تھا۔ وہ چاروں طرف سے اٹھی ہوئی رانگٹوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جناب علی کے اُتو میں نے اس کے ریو اور کو ان لوڈ اور کار کے پیلوں کو بچھ کر کیا اس کی دانت سے خریدی ہوئی طوائف کو اٹھا کر چپ میں ڈالا اور راستے کی دھول اڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ تو بن ناقابل برداشت تھی۔ اگر اس کے ساتھ بھی مسلح آدمی ہوتے تو وہ ایک طوائف کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتا کیونکہ اس وقت وہ محض ایک طوائف نہیں تھی، بلکہ غور تھی، دشمن کے مقابلے میں جیتنے والا ایک تمغہ تھی۔ زمینداروں کی شان و شوکت ان کی زمینوں سے یا ان کی وراثتوں کی تعداد سے پہچانی جاتی ہے۔ اور جناب علی نے اس کی پہچان بڑا کر ڈالا تھا۔ اس وقت کرم دین مجبور تھا کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک عورت کا خریدار تھا جو چور دروازے سے خریدی گئی تھی لہذا بنان کی نظروں میں وہ خود بھی ایک مجرم تھا اس لیے مہر کر کے رہ گیا۔

یہ خبر در در کے زمینداروں تک پہنچ گئی کہ چوہدری جناب علی سب سے خوب صورت میرے کو کرم دین کے پہلو سے اڑا کر لے گیا ہے۔ کرم دین بے بدنامی اور جگہ ہسانی کی جملے سے برداشت کر رہا تھا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے حواریوں نے مشورہ دیا کہ جناب علی سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی سے کسی حسین لڑکی کو اغوا کیا جائے۔ لیکن کوئی اونچا شکار کرنا چاہتا تھا۔ حویلوں میں غریب کسانوں کی بیوی بیاں ہوتی ہیں خواہ کتنی ہی خوب صورت ہوں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جو چیز مفت مل جائے وہ چرائی نہیں جاتی۔ وہ کوئی قیمتی نایاب ہیرا اٹھا کر لانا چاہتا تھا جو اس طوائف کی فکر کا ہوا اس سے بھی زیادہ مہنگا ہو۔

ایک سال تک وہ مہر کرتا رہا۔ اس دوران جناب علی کی بیوی کچھ عرصے تک بیمار رہ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ ان دنوں واحد پانچ برس کا تھا۔ وہ مرنے کے بعد جناب علی کا نام لیا اور جائیداد کا وارث چھوڑ گئی تھی۔ اگر وہ دوسری شادی نہ کرتا تو کوئی فتنہ نہ پڑا کیونکہ عورتیں تو ہر وقت ہوس کی دستر خوان پر موجود رہتی تھیں لیکن اس کی ہونٹیں مانی یعنی واحد کی خالہ نازنین بے حد حسین تھیں۔ ایسی حسین عورت کسی دوسرے کی آنکھوں میں جاتے یہ جناب علی کو منظور نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر کے پاس اپنی سالی کے

گیلری ہوتا ہے جہاں ملک بھر کی حسینائیں ہالی کے طور پر جمع کی جاتی ہیں اور ہر ایک حویلی ایک بیگم رکھتی ہوتی ہے جہاں کسانوں کی بیوی بیاں خدمت گزار کی کے لیے جاتی ہیں پھر ان کا خون پسینہ نچوڑنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

جناب علی اور کرم دین کی حویلوں میں جو خاندانیں آیا کرتی تھیں ان کا نام ہو سکتا تھا کیونکہ ایک بیمار یا بوڑھی ہو کر جاتی تھی تو دوسری چار اس کی جگہ آجاتی جس طرح خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں مرنے والوں کی تعداد کم اور پیدا ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے اسی طرح حویلوں میں بڑھاپے کی طرف جانے والیاں کم اور بچہ جوانی کی طرف آنے والیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ ان کے نام باندھا رہتے تھے۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کون باپ کی خدمت کے لیے سامور بھی لورہ کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ آقاؤں کی غلطیوں کی وجہ سے بچاریاں لورہ ہو جاتی تھیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے زمیندار بھی خطا کے پتلے تھے۔

اگر یہ بات اپنی اپنی زمیندار کی تک محدود ہوتی تو جھگڑے فساد کی نوبت نہ کیونکہ اپنے بھتیگوں کی فصل سے بھوک مٹانے کا حق ہر زمیندار کو پہنچنا ہے۔ گویا ان اور شان کا سوال تھا کہ کس کے پاس سب سے زیادہ زر خیز زمین ہے؟ کس کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے اور کس کے پہلو میں سب سے زیادہ حسین عورت ہے؟ یہ مقابلہ ہر سال لاہور کی ہیرا منڈی میں ہوا کرتا تھا۔ اس منڈی کی کٹاوریافت کے لیے دونوں طرف سے بڑھ چڑھ کر بولیاں دی جاتی تھیں۔ کوئی کت کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بولیاں اس حد تک بڑھ جاتی تھیں کہ دس ہزار کی گڑا بڑا میں پڑ جاتی تھیں۔ جناب علی ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنے کا عادی تھا۔ جب دیکھا کہ محض آن کی خاطر دولت ضائع ہو رہی ہے تو ایک بار اس نے مقابلے میں لڑنے کو چھوٹ دے دی۔

چوہدری کرم دین نے جیت کے نشے میں یہ نہیں سوچا کہ دشمن آسمانی ہے کھانچے پیچھے کیوں ہٹ گیا ہے؟ وہ تو اس وقت پتہ چلا جب وہ بازار حسن کار منگی طوائف کو ساتھ لے کر سیزن گزارنے کے لیے مری جا رہا تھا۔ راستے میں ان کے مسلح اُتو میں نے اسے روک لیا۔ وہ پہلے سے محتاط نہیں تھا اس کے پاس مرنے

جس طرح میں مری کے راستے سے خالی ہاتھ واپس گیا تھا اسی طرح تو اپنی اجڑی ہوئی برات لے کر اتلی ہاتھ یہاں سے واپس جائے گا۔

نازنین کا باپ ڈنگا تے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا جناب علی کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”بیٹا! میں مجبور ہو گیا تھا۔ چوہدری کرم دین نے ہندوق کے زور پر نکاح پڑھوایا ہے۔ دیکھ بھی ہوا زبردستی ہوا۔ مگر اب نازو چوہدری سے راضی ہے۔ شریف زادوں کو تقدیر کی کڑی آفتوں سوئے دیتی ہے، وہ ساری زندگی اسی کا دم بھرتی ہیں اور کسی دوسرے کا نالہ نہ کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں یہاں جھڑا فساد نہ لو۔ تم بھی میرے ولاد ہو میرے غریب خانے میں آؤ۔ میری خوشیوں میں شریک رہو۔“

اس نے غصے سے جھلا کر کہا ”تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں۔ میں یہاں سے اتنا واپس لے جا رہا ہوں۔ اس بے عزتی کے بعد میں کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں۔ لیکن میری یہ ناکامی کرم دین کو بڑی ہمتی پڑے گی۔ میں بہت جلد اس کا یہ قرض ادا کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ گھوڑی پر سوار ہونے لگا۔ کرم دین نے مگر ج کر کہا۔ ”جناب! دیکھ جا۔ پہلے میری برات تمہارے سامنے سے گزرے گی تاکہ تجھے بھی ملو کہ کسی کو بے بس کر کے اس کی عزیز ترین شے چھین کر لے جانی جائے تو دل پر کیا لڑتی ہے۔“

”جناب علی نے چاروں طرف انھی ہوئی رانگلوں کو دیکھا، موت کے دہانے پر کھڑے اور کرم دین کے حکم سے انکار کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ گھوڑی سے نیچے اتر آیا پھر چل کر آئے۔ تھوڑی دیر بعد دو کمار نازو کی ڈولی اٹھا کر باہر آگئے۔ کرم دین کے نکلی آگے آگے ہنگامہ تاج رہے تھے اور پیچھے پیچھے نازو کی ڈولی جناب علی کے سامنے سے لڑتی تھی۔

نہیں کے احساس سے آوی مر نہیں جاتا۔ مجبوراً صبر کرتا ہے اور انتقام لینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جناب علی نے بھی قسم کھائی کہ وہ کرم دین سے ایسا عبرت ناک

لے پیغام بھیجا۔ وہ ایک آزمودہ ولاد تھا انکار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے رشہ نکاح اور نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

نکاح کے دن جناب علی بڑی شاندار بارات لے کر گیا۔ اس کی حویلی سے سزا تک ڈھول تاشے بجاتے رہے اور بارات میں شریک ہونے والے گھوڑوں کی گیت گاتے اور ہنگامہ تاج رہے۔ سسرال والوں نے بھی خوب رونق لگائی تھی۔ چھوٹے سے پنڈ کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔ دلہن کی ڈیوڑھی سے چپاس گز کے فاصلے کے اطراف رانگلوں پر دروازوں کو جان کھڑے ہوئے تھے اور سسلائی کے طور پر رانگلوں کی زبان سے دلہا کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ راستے کا ایک موڑ پر بارات دروازے پر پہنچی تو اچانک جناب علی کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس کے کھلے دروازے پر چوہدری کرم دین دونوں ہاتھ کر پر رکھے ہنستا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر تاشوں کی آواز مٹ گئی۔ شادی کی جگہ موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

چوہدری کرم دین نے ایک بڑک لگا کر کہا۔ ”اؤئے جناب! یہاں سے وہاں تک رانگلیں گھن لے۔ یہ سب میرے بند۔ میرے ایک اشارے پر تیرا قہر بنا دیں گے۔ میں ہمیشہ اونچا شکار کھیلنے کا عادی ہوں۔ طرح ذلیل نہیں ہوں کہ ایک بازاری عورت پر ہاتھ ڈالوں۔ تو جس شریف زادی کا آیا ہے، میں اسے تیری نگاہوں کے سامنے لے لے جاؤں گا۔ بول اپنے جوانوں۔ میرا راستہ روک لیں۔“

جناب علی نے اپنا سہرا فوج کر پھینک دیا اور گھوڑی سے اتر کر بولا۔ ”چوہدری! تو مجھے نہیں قانون کو لگا رہا ہے۔ یاد رکھ تو ایک بازاری عورت سے عدالت نہیں پہنچ سکا لیکن میں ایک شریف زادی کو اغوا کرنے اور اس کی بے کرنے کے جرم میں تجھے کڑی سے کڑی سزا دلا سکتا ہوں۔“

چوہدری کرم دین نے ایک فلک شکاف قہر لگایا۔ تھوڑی دیر تک اس کے سامنے سارا ماحول گونجتا رہا پھر اس نے کہا۔

”بے وقوف میں وہی کھاتا ہوں جسے میں آسانی سے ہضم کر لیتا ہوں۔ کلہاڑی نے نازنین سے نکاح پڑھوایا ہے وہ ذہنی، جسمانی اور قانونی طور سے میری بیوی

”تم تک مجھے یو نہی، سلاقی رہو گی۔ مجھے ایک بیٹے کی ضرورت ہے، بیٹا پیدا کرو“ نہیں تو میں دوسری لے آؤں گا۔ نازنین واقعی اسے بھلا رہی تھی اور بچوں فقیروں کے ہاں جا کر تعویذ گنڈے کر رہی تھی مگر گاؤں کی ایک تجربے کار دانی نے بتا دیا تھا کہ وہ بانجھ ہے اس سے اولاد نہیں ہوگی۔

یہ سننے ہی کرم دین چار ماہ کے بعد ایک بی لڑکی بیاہ کر لے آیا۔ عورت اپنے مریکی ایشیوں کو تو برداشت کرتی ہے مگر نکاحی بیباہی سوکن کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ بس ماسے نازنین کا دل کھٹا ہو گیا۔ اسے اپنی وفاداری اور کرم دین کی کچھلی زیادتی یاد آنے لگی۔ ایک تو اس نے جبراً بندوق کے زور پر نکاح قبول کر دیا تھا اور جبکہ وہ جسم و جان سے ہاں دیتی تھی تو وہ محض ایک بیٹا پیدا نہ کرنے کے جرم میں اس کے اوپر سوکن لے آیا

دو فیسے سے تھلائی رہی، کبھی عمارہ پر غصہ اتارتی اور کبھی اپنی سوکن سے جھگڑتی تھی۔ جناب علی کو اپنے قبر کے ذریعہ وہاں کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ خبر کرم دین کی بی لڑکی کا ملازم بشیرا تھا۔ جناب علی نے بشیرا کے ذریعہ نازنین کو کھلا بھجھا کر جھنجھالانے سے نھاری ہو گئی ہوئی تقدیر نہیں بنے گی۔ کرم دین مطلب کا بندہ ہے، صرف تمہارے من و شباب کا رسیا ہے۔ شباب ڈھلتے ہی تمہیں حویلی کے ایک کونے میں بٹھا کر بھول جائے گا۔ اگر تم اس کا مانع درست کرنا چاہتی ہو تو عمارہ سے محبت کرو۔ اتنی محبت کرو کہ وہ تمہارے اشاروں پر ناچنے لگے۔ وہ ظالم باپ کی ستائی ہوئی ہے تمہاری محبت پا کر وہ تمہارے ہاتھوں سے زہر بھی پینے کے لیے تیار ہو جائے گی۔“

نازنین نے ایسا ہی کیا۔ وہ رفتہ رفتہ عمارہ کو اپنی محبت کا بیٹھا زہر ملانے لگی۔ جیسے جیسے وہ بچپن سے جوانی کی طرف بڑھتی گئی، نازنین سے اس کی محبت اور عقیدت بھی بڑھتی گئی۔ باپ نے اسے در سے میں نہیں پڑھایا تھا اور نہ ہی حویلی میں بٹھا کر پڑھانے کے لیے لکھی مائٹر کھاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چالاک ہو جاتی ہیں، انہیں ہزار پھانسیوں میں رکھو پھر بھی چھٹیاں لکھ کر عشق بازی کرتی ہیں لہذا عمارہ کو چالاک رہنا چاہیے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی بیٹی کو جس کے پلے باندھے گا اسی کے ساتھ وہ بے زبان گائے کی طرح چلی جائے گی۔

انتقام لے گا کہ اس کی آئندہ سلیس بھی جناب علی کا نام سن کر تھراؤں گی۔ پھر مناسب موقع کا انتظار ہونے لگا۔ چوہدری کرم دین بہت محتاط تھا وہ اپنی کمزوری سے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ تین سال بعد اس کی کمزوری سے عمارہ پیدا ہوئی۔ عورت کی عزت کو کھلونا سمجھنے والے بیٹی کے وجود کو اپنے دل سے سمجھتے ہیں۔ کرم دین عمارہ کی پیدائش پر جھلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک بڑا دلدار ڈالیں۔ ایک ماہ تک حویلی میں نہیں آیا۔ نازنین کو لے کر دوسرے مکان میں چلی۔ جناب علی نے جب عمارہ کے متعلق سنا تو خوشی سے اچھل کر کہا۔

”ابا! اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔ اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے کرے گا۔ اب چوہدری منہ کی بیٹی کو بھری جوانی میں نہ اٹھایا تو میرا نام چوہدری بن جائے گا۔“

ابھی عمارہ کے جوان ہونے میں دیر تھی۔ برسوں کا انتظار اور مہر و حق کی فوج تھی۔ دشمن کو ذلت کی موت مارنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑا ہے۔ انتظار ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر رفتہ رفتہ اپنی سازش کو دشمن کی دلیر تک پہنچا دینا۔ دشمن کی دلیر پر اس کا ایک ہی ہوش تھا، وہ نازنین تھی، جس سے سالی اور بھولی کہا تھا۔ پرانے رشتے کی محبت اور محبت نہیں جاتی۔

نازنین کی بہن مرگئی تھیں بہن کا بیٹا واجد زندہ سلامت تھا جسے گلے لگا کر تستی تھی مگر وہ زمینداروں کی دشمنی نے واجد تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے شروع شروع میں نازنین نے جناب علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چوہدری کرم دین کے پاس بہت خوش تھی۔ ایک سال بعد عمارہ کی ماں چلی گئی۔ لیے وہ تمام چوہدرانی بن کر حویلی میں راج کر رہی تھی۔ دولت اس کے قدموں چوہدری اس کا دیوانہ تھا۔ اس کی رعیت میں جتنے بھی لوگ تھے ان کی تقدیر کے ایک اشارے پر جنتی اور گزرتی رہتی تھیں۔ پھر وہ کیوں جناب علی کی باتوں پر نصیب کی آپ دشمن بن جاتی؟ اس لیے اس نے جناب علی کا ساتھ نہیں دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلتے لگا۔ عمارہ جب بھی کرم دین کے سامنے آتا جھڑکیاں دے کر بھاگتا تھا اور جھنجھلا کر نازنین سے کہتا تھا۔

نہیں ہے؟“

عمارہ نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”آپ پر بھروسہ نہیں کروں گی تو اور کس پر کروں گی۔ اس دنیا میں میرا اور کو ہے؟“

”ہاں میرے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے۔ باپ کتنا ظالم ہے وہ تم کو دیکھ رہی ہو۔ بہت عجیب سی بات ہے کہ میں سوتیلی ہوں مگر سگوں سے زیادہ چاہتی ہوں وہ سب ہے سگی سوتیلوں کی طرح تم سے نفرت کرتا ہے۔ تم بہت بد نصیب ہو عمارہ!“

وہ اپنی بد نصیبی پر ہمیشہ روتی اور کڑھتی رہتی تھی اس وقت بھی اس کی آنکھوں پر آنسو آگئے۔ نازنین نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔

”سگی کیس کی۔ روتی کیوں ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بات انہو اداے شادی کرلو تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ وہ خوب صورت ہے دولت مند ہے تمہارے لیے زندگی کی ساری خوشیاں خرید سکتا ہے۔ یو لو اس سے ملو گی؟“

وہ ہولے سے بولی ”ہم۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کو معلوم ہو گیا تو وہ جان سے مار ڈالے گا۔“

”جب تمہارے ساتھ تمہاری زندگی کا محاذ ہو گا تو تمہارے دل سے سارا ڈر اڑ جائے گا۔ واجد تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور تم سے نکاح پڑھائے گا اس کے ہاتھ تمہارے ابا تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گے تم حشت بیگ کو جانتی ہو؟ وہ جوا پکڑوں کی مل کے لیے یہاں کپاس کا سودا کرتے آتے ہیں وہ چوہہ دری جناب علی سے کپاس کی فصل کا سودا کرتے ہیں۔ دونوں زمینداروں سے ان کے کاروباری تعلقات انہوں نے اگلے ہفتے اپنی بیٹی کی شادی میں ہمیں لاہور بلایا ہے۔ ادھر سے جناب علی واجد بھی آئیں گے میں موقع دیکھ کر تمہیں واجد سے ملاؤں گی یا جناب علی سے کہو کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر واجد کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا دے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”پھر وہی ڈر کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں تباہی کی طرف لے جاؤں گی؟“

”نہیں۔ آپ میری بہت اچھی اہی ہیں۔ ابا مجھ سے دشمنی کرتے ہیں لیکن آپ

لیکن نازنین اسے ایسا سبق پڑھا رہی تھی جو کہ انہیں بھی نہیں پڑھا سکتی تھیں۔ جوانی میں غلبہ بھی بدل جاتے ہیں اور خیالات بھی۔ انہی کی مناسبت سے عمارہ کو عشق و محبت کا داستانیں سنایا کرتی تھی۔ ایسی داستانیں جن میں باپ ظالم ہوتا تھا اور بیٹی مظلوم۔ وہ بے محبوب سے ملنا چاہتی تھی لیکن باپ اس کے راستے کا پتھر بن جاتا تھا۔ کہانی سنانے کے دوران کسی خوبو عاشق کا ذکر آتا تو نازنین چٹکارے لے کر کہتی ”ہائے ہائے وہ ایسا زب صورت تھا جیسے واجد ہے۔ تم واجد کو دیکھو گی تو بس دیکھتی ہی رہ جاؤ گی میں کسی دن تمہارے ابا سے چوری اس کی تصویر منگوؤں گی۔ تم دیکھنا وہ ایک دم شزارہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ لڑکی جس سے محبت کرتی تھی وہ نوجوان دشمن قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا۔“

کہانی ایسے نفسیاتی انداز میں سنائی جاتی تھی کہ عمارہ کی نگاہوں کے سامنے کہانی کا ہر کردار جسم ہو جاتا تھا۔ ہر کہانی کا دل اسے اپنے باپ کی صورت میں نظر آتا تھا اور میرو کا مور کرتے وقت واجد کی خالی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد نازنین نے واجد کی تصویر منگوا کر چپکے سے اسے دے دی۔ تصویر بچنے لگی کہانیوں کے تمام شزارے چپکے پڑ گئے۔ جتنے رازدارانہ طریقے سے وہ تصویر آئی تھی اتنے ہی رازدارانہ انداز سے واجد اس کے دل میں آکر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ کی ان تختی پر محبت کی ایک نئی کہانی لکھنے لگا۔

اب وہ تھی اور واجد کی تصویر تھی۔ جب بھی اسے تمنا نصیب ہوتی وہ اپنے صندوق سے اسے نکال کر دیکھنے لگتی۔ رات کو بستر پر جب تک جاگتی اسے دیکھتی رہتی۔ نیند آ جاتی تو اسے دھڑکنے ہوئے سینے سے لگا کر سو جاتی۔

ابک رات نازنین نے پوچھا ”واجد سے ملو گی؟“

اس نے شرما کر منہ چھپا لیا۔

”تو کمپو میں ہزار بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ مجھے سوتیلی ماں نہ سمجھو۔ میں تمہاری بہن ہوں۔“

”آپ۔۔۔ آپ بہت اچھی ہیں۔“

”ہاں میں اچھی ہوں تو مجھ سے اپنے دل کی بات کیوں چھپاتی ہو؟ کیا مجھ پر بھروسہ

بچوں سے آنکھیں ملا کر باتیں نہ کر سکیں۔ جب تک انسان دوسروں کو بچانہ رکھے خود کو
لوٹنا نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ اس ماحول میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو کتابوں اور درسگاہوں
سے کبھی نہیں ملتی۔

لیکن وابد کے دل میں ایک ذرا سی شرافت کہیں سے بھولے ہوئے ہو چکی تھی۔ بعض
اوقات ایسا ہوتا ہے کبھی مولوی کے گھر میں شیطان پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی شیطان کے گھر
میں مولوی۔ اس کی نیک نیتی دور دور تک مشہور تھی کہ وہ پرانی ہونہیوں کے سامنے سے
نظریں چمکا کر گزر جاتا ہے۔ نہ کسی کو چھوڑتا ہے نہ کسی سے باتیں کرتا ہے۔ اتنی بڑی حویلی
میں جہاں رنگارنگ لڑکیوں کا میلہ سالگارتا تھا وہاں کوئی کھب جانے والی ہوگی مگر وہ کسی کی
آزد نہیں کرتا تھا۔

چوہدری جناب علی نے جب بیٹے کو لڑکیوں سے کتراتے دیکھا تو تشویش پیدا ہوئی۔ نر
پڑ جوانی میں پہچانا جاتا ہے، کہیں بیٹے کے روپ میں وہ بیٹی کی خصلتیں لے کر تو نہیں آیا
ہے؟

کسی نے کہا ایسی بات نہیں ہے دراصل وابد نے لنگوٹ باندھ رکھی ہے، صبح و شام
اکاڑے میں جاتا ہے اب کے سال ونگل میں حصہ لینے کے لیے لاہور جائے گا۔ جناب
علی نے ہلکا کر حکم دیا۔

”نارند اس کی لنگوٹ۔ زمیندار کا بیٹا ہو کر پہلوان بن رہا ہے الو کا بچھا۔“
حکم حاکم مرگ مغالبات کے مصداق الو کے بچے کی لنگوٹ انا دی گئی۔ اسے رنگیلے
اور زرد دل لوگوں کی محبت میں بٹھایا گیا۔ جب ان کی رنگین اور سنگین باتیں سن کر اس کی
طبیعت میں رنگ گنے لگی تو اسے کچھ دنوں کے لیے تجربے کا درد ستوں کے ساتھ لاہور کی
رنگین گلیوں میں بھیج دیا گیا۔ زمینیں کس طرح خریدی جاتی ہیں وہ بچپن ہی میں سیکھ چکا
تھا اور کس طرح خریدی جاتی ہے وہ جوانی میں سیکھنے لگا۔

جناب علی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کی دولت کو ٹھپے پر ضائع ہو بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا
تھا کہ شہر کے منہ کو خون کا چمکا لگ جائے اس کے بعد کوٹھے کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ ان
کا اپنی کوٹھی میں عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ بعض کوٹھی اور کوٹھے میں بس اتنی ہی فرق ہوتا
ہے کہ کوٹھے سے تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور کوٹھی میں اس تعلیم سے ساری زندگی

مجھ سے دشمنی نہیں کر سکتیں۔ میں یہ سوچ کر ڈرتی ہوں کہ نہ جانے وہ لوگ مجھ سے کیا
سلوک کریں گے۔“

”اچھا سلوک کریں گے کہ تم وہاں سے واپس آنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے لانا
خواہ جناب علی کے دشمن بن گئے ہیں مگر جناب علی تمہیں یہی سمجھ کر محبت کرنا ہے
تمہیں آنکھوں میں بٹھائے گا، دل میں جگہ دے گا اور وابد تو ہمیشہ تمہیں اپنے بچے
لگا کر رکھے گا اور اس طرح پیار کرے گا۔“

نازنین نے اسے سینے سے لگا کر چوم لیا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے شرم سے ہونٹیں
ہونٹیں۔

سازش کتنی دھیمی، کتنی میٹھی اور کتنی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے یہ ایک ان پڑھ لڑکا
اور معصوم و سبائی لڑکی نہیں جانتی تھی۔ خوابوں سے کون نہیں بھٹکتا؟ وہ بھی بلکہ
تھی۔

عشق یہ کمائیوں کے پچکنے راستے پر کون نہیں بھٹکتا؟ وہ بھی پھسل رہی تھی۔
انجام سے بے خبر۔



مالی کے کمرے میں روشنی نہیں تھی کوٹھی کے چلنے بچھنے قسموں کی ہلچلی
روشنی وہاں تک پہنچنے پہنچنے دم توڑ رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں وابد سر جھکائے چلا رہا
ہو چکا تھا۔

دور کوٹھی کے اگلے حصے سے ہارموشم اور طلبے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مقررہ
جسٹکار اور نفعی کی ڈوبتی ابھرتی لے میں کوئی باقی جی بھرا پیش کر رہی تھی۔ وابد ایک کھلا
شوہن تھا۔ ناچ رنگ اور شراب و شباب کے نشے میں ڈوبے رہنے کی عادتیں تھیں۔
میں ملی تھیں۔ اس کے خاندان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا دستور نہیں تھا۔ ان کے
کتابیں پر حاکم عمر ضائع کرنے کے بجائے زراعت کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ ذوق
بانجھ زمینوں کی شناخت، فصلوں کی بوائی کسان کی طریقے، ایک کسان کے پیسے
کمال زمین کی بیچائی ہو سکتی ہے، کھیت مزدوروں کو آجھا پینے کھلا کر کس طرح زراعت
جاتا ہے اور کس طرح ان کی ہونہیوں کو مسل کر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی عزت

استفادہ کیا جاتا ہے۔
لیکن واجد اپنے باپ کی امیدوں کے مخالف جا رہا تھا۔ کوٹھے کی رنگینوں میں ڈنڈے کے باوجود پنڈ کی شریف ہونٹوں سے بدکتا تھا۔ اس کی پرہیزگاری جناب علی کی تکمیل نہیں آئی۔ اس نے غصے سے کہا۔

”اس گدھے سے جا کر کو اگر مولوی بن کر رہے گا تو چودہری کرم دین سے انتقام لے گا۔ اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے وہ کسی کے ساتھ چلی گئی تو میں اس مردود کو بٹائے سے انکار کر دوں گا۔“

باپ کا پیغام بیٹے تک پہنچا دیا گیا بلکہ عمارہ کی ایک تصویر بھی اسے دے دی گئی اور اپنے شکار کو اچھی طرح پہچان لے۔ یہ تصویر بس یونی سی تھی کسی سیلے میں ڈال کر ڈونڈ کی اتاری ہوئی تھی۔ روشنی اور سائے کے احتراج سے تصویر کے حسن کو جس طرح نکھار جاتا ہے وہ بات اس میں نہ تھی پھر بھی چہرے کے کھینکے نقوش خسار آلود آنکھوں کی کلم اور جسم کی شادابیاں واضح تھیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تب بھی واجد اپنی توبہ ڈر کیونکہ وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق انتقام لینا اس کا سب سے بڑا فرض تھا اور فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات نیکی اور بدری کی تیز نہیں کی جاتی۔

تصویر کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ لڑکی حسین ہے، اپنے معیار کی ہے، اس کے ہاتھ تھوڑا سا دقت گزارا جاسکتا ہے اور اسے بھولنے کا وقت آئے تو جس طرح اٹھائیں بھلا دیا جاتا ہے اسے بھی بھلایا جاسکتا ہے۔ لیکن عین نگاہوں کے سامنے آنے کی صورت اور بولنی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہو گیا۔

وہ چارپائی سے ہڑدا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عین نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔ دروازے پہلے ایک تاریک سایہ نظر آیا۔ پھر کوٹھے کے سرخ تختے روشن ہوئے۔ عمار کا چہرہ دانے کی طرح کھل گیا۔ وہ چیخ کی چادر میں لپٹی سر جھکائے کھڑی تھی۔ سرخ تختے گئے، سبز روشن ہوئے، اس کا چہرہ ناگن کی پختی جلد کی طرح سبزی مائل ہو گیا۔ ہاتھ ہوئی ایک قدم آگے بڑھی اور کمرے کے اندریوں آگئی جیسے کوئی ناگن خاموشی سے اس کے لیے رگ جال تک پہنچ گئی ہو۔

سبز تختے بچھ گئے، زرد روشن ہو گئے۔ حلقہ چہرے پر پارسیت کا رنگ پھایا۔

”تم بہت اچھی ہو عمارہ۔ بہت اچھی اور بہت معصوم۔ تمہارے بھائی نے
خرید لیا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی دشمنی اور ان کی آپس کی نفرتوں کو بھول کر تمہیں
سے اپنا رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو گی؟“
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”تم میرے لیے اپنے آپ کو اپنے رشتے داروں کو اور اپنے گاؤں کو چھوڑ دو گی؟“
وہ سر ہلا کر بولی۔

”ہاں۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟“
”نہیں۔ میں آخری سانس تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا جب میں مردہ
توں۔“

عمارہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”تو میں بھی مر جاؤں گی۔“ واجد نے اپنے
پر رکھی ہوئی گلابی پتیلی کو چوم لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کی محبت و توجہ
سرشار ہوتے رہے پھر کمرے کے باہر کسی کی آہٹ سن کر چونک گئے۔ انہوں نے
دروازے پر آکر کہا ”کیا تم لوگوں کو خطرے کا احساس نہیں ہے۔ چلو نکلو میاں۔“
گیٹ پر بشیر انتظار کر رہا ہے وہ تمہیں جہاں لے جائے وہاں چلے جانا۔“
واجد نے کہا ”لیکن میں تو عمارہ کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں۔“
”نہیں!“ نازنین نے سخت لہجے میں کہا ”تمہارے ابا نے کھانا بھیجا ہے کہ تم
بشیر کے ساتھ جاؤ گے۔ رائل پارک میں تمہارے کہیں رہنے کا انتظام ہو گا۔
صبح آکر تم سے ملیں گے تم دونوں کی حفاظت کرنا۔ ان کا فرض ہے وہ جیسا کہتے ہیں
کرو۔ چلو جلدی میاں سے نکل جاؤ۔“

واجد نے عمارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں بھی وہ رات گزارنی تھی اور وہ سکی۔
زمینوں پر چلے جانا تھا لہذا اس نے نازنین خالہ سے بحث نہیں کی چپ چاپ ملارہا
وہاں سے نکل گیا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ لکشمی چوک اور رائل پارک میں اچھی خاموشی
تھی۔ تلاش بین سینما گھروں کا طواف کر رہے تھے کچی عمر کے چھوکرے جن کو
بھاگ کر فلموں میں بیرو بننے کے لیے آتے تھے وہ ہوٹلوں میں برتن دھو رہے تھے۔

کچا بے تھے جو ہوٹلوں کے باہر بیٹھے ہوئے غلاب فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں
کی بچی کر رہے تھے اور کچھ لڑکے رائل پارک کے دفتروں میں سوڑے کی بوتلیں پھینچ
رہے تھے۔ رائل پارک کی دفتروں میں گھروں سے بھاگ کر آنے والیاں لڑکیاں بھی
نہیں اٹھ رہی فلموں میں چائس لینے والی ماڈل گرلوں بھی اور اوپر عمر کی ایسی عورتیں جو بیڑا
شہی میں غیر قانونی طور پر دلالہ کھاتی تھیں لیکن فلمی دنیا میں قانونی طور سے انہیں ایکسٹرا
پلاز کا پانا تھا۔

ان دفتروں میں عورتوں کی کھٹکتی ہوئی ہنسی اور مردوں کے گونجنے مگر جتنے ہوئے قہقہے
للاؤ رہے تھے۔ سوڑے کی بوتلیں کھل رہی تھیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے شراب کے
پلے اور پانی کی جھلکی باہر آرہی تھیں۔ وہیں ایک گلی کے آخری دفتر میں عمارہ اور واجد
پانیت کی پہلی رات گزار رہے تھے۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی کبھی ان کی میٹھی سرگوشیاں ابھرتی
تھیں اور پارک کے کسی نازک موڑ پر پہنچ کر گرم ہو جاتی تھیں۔ بند دروازے کے باہر بشیر
بچے کوئی نفلے کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

فصلا پانچ برس پہلے نوکری کی تلاش میں پنڈ چھوڑ کر یہاں آیا تھا اور تب سے فلم کے
دفتر میں چھپا کر کام کر رہا تھا۔ اس کی رہائش اسی دفتر میں تھی۔ ان دنوں اس کا
محب آؤٹ ڈور شوٹنگ میں گیا ہوا تھا اس لیے میدان خالی دیکھ کر اس نے بشیر کے
بازت دے دی تھی کہ وہ کسی بھی چھوکرے کو یہاں لاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نفلے نے
جے کاش لاکر پر چھا تو نے کہا تھا کہ وہ بڑی (عورت) تیری ہے پھر وہ زمیندار کا بیٹا وہاں
بکرا رہا ہے۔“

بشیر نے جواب دیا ”وہ بڑی میری ہے۔ جب پولیس یہاں آئے گی تو مجھے یہی بیان
دیا ہو گا۔“ نفلے نے لا پرواہی سے کہا ”یہاں پولیس کبھی نہیں آئے گی۔ یہاں جتنے دفتر
ہاں ہیں سب تھانے والوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اس لیے یہاں کبھی پولیس کا چھاپہ
نہیں پڑتا۔“

”وہ اور بات ہے۔“ بشیر نے کہا ”پنا چوہدری جناب علی دور تک پہنچا ہوا ہے
بلکہ تھانے دار سے سب باتیں کر لی ہیں۔ ابھی یہاں پولیس آئے گی۔ تجھے تو کسی بات

جنت رہی ہو گئی ہے۔ آپ کا لڑکا ابھی تک نہیں آیا ہے۔“
 ”ہاں آئی ہوگا اگر پانچ منٹ تک نہیں آیا تو میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔ آپ
 لہذا خیال رکھیں کہ لڑکی حوالات میں ضرور پہنچ جائے اور اخباروں میں اس کا نام جلی
 نامی ملے ہو جائے۔“ جناب علی نے کہا۔

”اب ہو جائے گا، فکر نہ کریں۔“ تھانیدار نے کہا۔

”ایک بات کی فکر ہے چوہدری کرم دین بیٹی کو یہاں سے لے جانے اور خود کو بدنامی
 پانے کے لیے آپ کو بڑی سے بڑی رقم دے گا۔ میں دو ہزار آپ کو دے چکا ہوں،
 کے بعد کرم دین آپ کو جتنی بھی رقم دے گا میں بھی اتنی رقم نقد ادا کروں گا۔ میں
 ہوں کہ وہ اپنی ساری دولت اور ساری زندگی داؤ پر لگانے کے بعد بھی بدنامی سے نہ بچ
 سکتا۔“

”ایک ہے ایسا ہی ہوگا“ آپ اطمینان رکھیں۔“ تھانیدار نے کہا۔

ان دنوں واجد بیڑے کے ساتھ وہاں آگیا۔ جناب علی نے تھانے دار سے کہا۔

”یہ میرا لڑکا ہے، میں اسے لے جاتا ہوں۔ اب آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔“

تھانے دار نے کمری نظروں سے واجد کو دیکھا پھر کہیں سے باہر آکر اپنے سپاہیوں کے

وہاں سے چلا گیا۔ واجد نے حیرانی سے پوچھا ”اباجان کیا بات ہے؟“

”کو نہیں تم میرے ساتھ آؤ۔“ وہ تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر جانے لگا واجد
 نے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

”آؤ، کو تو بتائیے یہ اسپر کس کہاں گیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ عمارہ

الکلی ہے، میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ جناب علی اپنے پرانے مائل کی کار

کا انٹرک گیا اور دروازہ کھول کر بولا ”چلو بیٹھو۔ وہ بعد میں آجائے گی۔“

واجد نے ایک دم بچے ہٹ کر کہا ”نہیں وہ میری خاطر اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر آئی

میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاسکتا۔“ جناب علی نے غرا کر کہا ”تم میرے حکم

کا کر رہے ہو۔ جانتے ہو وہاں تھانے دار گیا ہے اس کے ساتھ ہمیں بھی حوالات

نہ لگا دیئے گا۔“

واجد کے چہرے پر سختی آگئی ”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے چوہدری سے بدلہ لینے

لے ہال ہو گیا ہے۔“

کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے تجھے دو سو روپے دیئے ہیں۔ اگر تجھے
 مصیبت آئے گی تو چوہدری تجھے اور پیسے دے گا۔ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا۔
 فضلے نے حقے کی لے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تجھے اپنی فکر ہے یا نہیں؟ وہ زمیندار کا چھو کر وہاں پیش کر رہا ہے اور

میں اس لڑکی کے ساتھ بدنام ہو کر جیل جائے گا۔“

”مفت میں نہیں۔ چوہدری مجھے محظوظی رقم دیتا رہتا ہے۔ آگے بھی دیتا رہے گا

کون سا نیک نام ہوں۔ اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی کے ساتھ بدنام ہونا بھی بڑے

بات ہے۔ ذرا ٹائم دیکھ، بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میں میرا انتظار کر رہے

ہم۔“

”یہاں دفتر میں گھڑی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ایک بج رہا ہے۔“ بیڑا

کر اٹھ گیا اور دروازے پر آکر دستک دینے لگا اندر سے واجد کی آواز آئی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں بیڑا!“

”بھاگ جاؤ یہاں سے۔ چپ چاپ سو جا۔“

”مالک بہت ضروری کام ہے چوہدری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

اس بار کوئی جواب نہ دیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد کمرے کے اندر دو فنی ہو گئی

مطلب تھا وہ کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ بیڑا معنی خیر نظروں سے

دیکھنے لگا۔ واجد نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

”کہاں ہیں اباجان؟“

”وہ ادھر ایک ہوٹل میں بیٹھے ہیں، آپ کو بلارہے ہیں۔“ واجد تھوڑی دیر

رہا پھر اس نے پلٹ کر کہا ”عمارہ دروازہ بند کرلو، میں ابھی آتا ہوں۔“

آگیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ اس نے بڑی محبت اور حسرت سے بند دروازہ کو

اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ عمارہ کو چھوڑ کر جائے لیکن جیسا کہ اس کی محبت کہتا

ہے، اس کے حکم سے انکار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بڑی بے ملالت سے ہوٹل

جائے لگا۔ ہوٹل کے ایک کہیں کے باہر دو سپاہی ایک میز پر بیٹھے ہائے

کہیں کے اندر جناب علی ایک تھانے دار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تھانے دار نے

نہ جو لوگوں کی عمر کسلائی ہے وہ پہلے شرماتی ہے۔ مرد کو صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن وہ شرماتا۔

خانے دار نے کرسی پر پلو بٹلے ہوئے جناب علی سے کہا ”چوہدری صاحب آپ کا فوری اظہار کر رہا ہے کہ اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔ میں کیا کروں بتائیے اب تو لڑکی ماؤ لڑکے کو بھی خانے لے جانا ہوگا۔“ جناب علی غصے سے واجد کو دیکھنے لگا۔ واجد

”ابنہ صاحب! اباجان سے مت پوچھئے میں آپ سے احتجاج کرتا ہوں کہ مجھے عمارہ کے حالات میں مداخلت نہ کیجئے۔ میں اسے چاہتا ہوں میں اس سے شادی کروں گا۔ میرا دل ہے اس لیے مجھے کسی کا ذر نہیں ہے۔“

جناب علی نے غصے سے کہا ”تم ایک چمور کی طرح چوہدری کے سامنے سر جھکانا نہ۔ لیکن میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم جیل چلے جاؤ لیکن یہ نہیں ہے کہ چوہدری اتنی بڑی بدنامی سے بچ کر نکل جائے۔“

واحد نے پوچھا ”میں جیل جاؤں گا تو کیا آپ کی بدنامی نہیں ہوگی؟“
 ”ہوگی مگر وہ ایک بدنامی ہوگی۔ ہزار گناہ کے بعد بھی مرد کی نیک نامی کو نہیں ہٹاتی۔ لیکن عورت ایک بار بدنام ہو جائے تو اس کے دروازے پر رشتہ مانگنے تو کیا توڑنے کی بھی نہیں جانتے۔ اب اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ چوہدری ساری ایک بچی کا بوجھ اٹھائے پھرے گا اور اپنے برابر کے لوگوں سے نظریں ملا کر بات نہیں کرے گی۔“

خانے دار نے اٹھ اٹھا کر جناب علی سے کہا ”چوہدری صاحب! آپ میرے سامنے دشمن سے انتقام لینے کی باتیں نہ کریں۔ یہ قانون کے خلاف ہے مجھے جو کچھ کرنا ہے اسے معافی سوچ بچ کر کروں گا۔ آپ چپ چاپ تماشا دیکھیے۔“
 اسے میں دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی سپاہی کی آواز سنائی دی۔

”جناب! چوہدری کرم دین حاضر ہے۔“
 ”ابھار اور سٹ کر کوٹے میں چلی گئی۔ جناب علی اپنی کرسی پر فخریہ انداز میں اکڑ جا رہا تھا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ خانے دار اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا کی جانب جا رہا تھا۔ جناب علی نے کہا۔

”ہاں اس نے سیکڑوں براتیوں کے سامنے میری بے عزتی کی تھی۔ نہ لڑائی نہ دوستی نکاح پر بھگا کر میری غیرت کو لٹکا رہا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کے شکار کھیلوں گا۔ آج میری قسم پوری ہو رہی ہے۔“
 ”آپ چوہدری سے انتقام لینے کے لیے ایک معصوم لڑکی کو بدنام کر رہے ہیں۔ کماں کا انصاف ہے۔ عمارہ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔“
 ”نازنین نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی تھی۔ کہیں سے زبردستی کیوں کی تھی؟ تم مجھ سے بحث نہ کرو چلو میرے ساتھ۔“

واجد نے بے بسی سے کہا ”چھی بات ہے میں آپ سے بحث نہیں کروں انتقام لیجئے لیکن میں عمارہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے رائل پارک کی طرف جانے لگا۔ جناب علی نے کار کے دروازے کو ایک جھٹک کر دھکے مارے۔
 ”الو کا بچھا۔“



کمرے میں کمری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر خانے دار بڑا دوسری کرسی پر جناب علی تھا اس کے پیچھے بشیر اور فضلہ ہاتھ باندھے کمرے کے دار کے قریب گھڑا ہوا واجد سر جھکا کر عمارہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔
 وہ ایک کونے میں چینٹ کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی اور ہنسنے پر چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنی زندہ لاش پر آنسو بہا رہی تھی۔
 وہ ایسی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کسی سے نفرت نہیں کی تھی بلکہ اس کی نفرتوں کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ وہ ایسی بے نیاز تھی کہ اس نے کبھی کسی سے کہا اور جب اپنے محبوب سے ایک اعتماد کا رشتہ لے کر محبت کی امانت سونپ دی۔ بدنامی کے کانٹوں پر لا کر بٹھا دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کا باپ آنے والا تھا۔ خانے دار نے کرم دین کو ایک سپاہی بھیج دیا تھا عمارہ کو اس بات کا خوف نہیں تھا کہ اس کا باپ اسے موت اب اسے آسان نظر آرہی تھی لیکن ذلت اور رسوائی کی جو موت اتنی شرمناک تھی کہ شرم سے نظریں اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ عجیب کا

ابن ابی اسیہ وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں۔ وہ جو انتقام کی آگ ہوئی ہے
نازبت کی بجلی میں سگتی رہتی ہے۔

شمت بیگ نے جناب علی سے شکایت کی چوہدری صاحب آپ نے عمارہ کو میرے
رے لا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ کو کم از کم میری عزت کا خیال کرنا چاہیے تھا۔
جناب علی نے کہا ”میں کسی کو لے کر نہیں آیا ہوں عمارہ ہی واجد کے ساتھ آئی ہے۔
جو وہاں حالات میں جائیں گے اور ان کے دماغ درست ہو جائیں گے۔“
شمت بیگ نے حیرانی سے کہا ”تو جب ہے آپ ابھی معاملے کو مراد ختم کرنے کے
لئے اپنے بیٹے کو بھی حالات میں بھیجنا چاہتے ہیں؟“

جناب علی نے غصے سے کہا ”یہ نالائق میرا بیٹا نہیں ہے۔ جب تک یہ میری مخالفت
کرے گا اس وقت تک میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔“
”پر ایسا تو ہوئی؟“ شمت بیگ نے پوچھا ”کیا واجد آپ کی مرضی کے خلاف عمارہ
بلا لیا ہے؟“

واجد نے شمت بیگ سے کہا ”چاچا جی! بابا جان یہ چاہتے تھے کہ میں عمارہ کو یہاں
پر رکھ دوں۔ لے کر چھوڑ دوں اور خود ان کے ساتھ پنڈ واپس چلا جاؤں۔ لیکن مجھے نہ
دری صاحب سے دشمنی ہے اور نہ ہی میں عمارہ کو کسی مصیبت میں تنہا چھوڑنا چاہتا
ہوں۔ مجھے حالات کی دھمکی دے رہے ہیں حالانکہ یہ حالات تو کیا میں عمارہ کے ساتھ
لے کر نکلے تو بھی بچنے کو تیار ہوں۔“ چوہدری کرم دین نے چونک کر اسے دیکھا وہ
بہت ہی گھبرائی نہیں سکتا تھا کہ واجد ایک دشمن کی بیٹی کے لیے اپنے باپ کی مخالفت کرے
ایک کرم دین کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ اپنے دشمن سے اس کے بیٹے کو چھین
لے گا۔

ابن ابی اسیہ نے کہا ہے۔ بدنامی کے بعد بھی عمارہ کو کسی نہ کسی کے پلے بانڈ دینا ہی ہو گا پھر
اسے کیل نہ اسے منسوب کیا جائے جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے
ہیں۔ اس سے بڑا انتقام اور کیا ہو گا کہ ایک بیٹے کو اس کے باپ سے چھین لیا جائے۔
دونوں کا دل داغ ہوتا ہے، بڑھاپے کا سارا ہوتا ہے۔ جناب علی کی کراہیک دم سے
بائے۔ کچھ اوقات دشمن تیرے نہیں مرنے، نکوار سے نہیں مرنے، گھر میں ایک
بڑا بڑا کر کے رہتے ہے مر جاتا ہے۔ بیٹی خدا کی دین ہے دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہے جو

”چوہدری کے پاس ریو الوور ہے وہ یہاں آتے ہی مجھ پر حملہ کرے گا۔ کیا
ریو الوور لے گئے۔“

تھانے وار ٹھٹک کر دروازے پر رک گیا۔ اس نے اپنے سپاہی کو تھانے
چوہدری سے ریو الوور لے لو۔“ تھوڑی دیر بعد آواز آئی ”جی حضور ریو الوور
اب تھانے وار نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک سپاہی کے پیچھے چوہدری کرم
شمت بیگ کھڑے ہوئے تھے۔ کرم دین کے چہرے پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔
یہ اس نے اندر آنا چاہا تھا۔ تھانے وار نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”ٹھہریو! آپ ادھر دیوار کے پاس کھڑے ہو جائیے۔ اگر آپ نے گولی
میں بڑی سختی سے چیش آؤں گا۔“

شمت بیگ نے کہا ”آپ اطمینان رکھیے ہم خود نہیں چاہے کہ گولی
بات اس کمرے سے باہر جائے۔“ وہ دونوں اندر آ گئے۔ کرم دین کی نظریں
اپنے دشمن پر گئیں۔ وہ طنز انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہلکا
اس نے کوٹے میں دیکھی ہوئی عمارہ کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا
زیادہ بڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے کھٹے کانپنے لگے وہ ذرا سا لڑکھڑایا پھر شمت
لے کر مستقبل گیا۔ اس نے دل میں کہا۔

”آہ! اسی دن کے لیے میں بیٹی کی پیدائش پر جنم لایا تھا۔ میں تیرے
سے نہ ہی دشمنوں کی چال سے لیکن ایک بیٹی کی لغزش نے مجھے بے موت اور
جناب علی کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکا۔ میں یہ تو بہن کیسے برداشت کر لیا
کے جوش میں آکر بیٹی کے گلے گلے کر دوں تب بھی یہ بدنامی ہو کر رہے گی
کی غلطی کو معاف کر دوں پھر بھی وہ زندہ لاش کی طرح میرے گھر پر پڑی رہے گی
مگر اسے قبول کرنے نہیں آئے گا۔“

مجھے ہنتا کر دیا گیا ہے میں نہ تو دشمن کو مار سکتا ہوں اور نہ ہی خود
کیونکہ میں بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ میں آخری دم تک جناب علی
کی کوشش کرتا رہوں گا۔

ایسے وقت بھی وہ انتقام کے متعلق سوچ رہا تھا حالانکہ اسے اپنی بچی
متعلق سوچنا چاہیے تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی کو اور کسی کی ہونے والی دیکھ

تھانے وارے انکار کر دیا۔

رشت کی رقم بڑھتی گئی۔ تھانے دار جناب علی کی طرف دیکھتا گیا اور انکار کر گیا۔
اب علی کی خاموش نظرس کہہ رہی تھیں کہ میں اس سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں لیکن
وہی نیت کے لیے میڈیکل رپورٹ ضرور حاصل کرنی ہوگی۔

گرنے میں سہمی ہوئی عمارہ کی سسکیاں جھڑھو گئیں۔ اس کے بہت سے حامی اور ہمدرد
نے ہر لمحہ خواہ مخواہی تھی۔ بعض اوقات اپنیوں کی ہمدردیاں کام نہیں آتیں، صرف دعا کا
بدکا سارا دیا جاتا ہے کہ شاید قبول ہو جائے۔ اس نے سسکتے ہوئے دعا مانگی۔ ایک
لڑکی ہلکی بہت سی دھیمی سی آواز اس کی دل کی گہرائی سے نکلی۔
”رہا! بیٹوں۔ پچالے۔ رہا۔!“



دوب اپتال کے برآمدے میں یوں بیٹھے تھے جیسے عدالت کے دروازے پر عمارہ کی
ذر کا فیصلہ سننے بیٹھے ہوں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس فیصلے کو
بلا بلا سنا لیا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ اور اس غلطی کی سزا کسے نہیں ملتی؟ سزا ضرور
لنا چاہیے لیکن اسے اشتہار بنا کر ایک لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے، اس کے
بارے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہ یہی چاہتے تھے جہاں تک بدنامی ہو چکی
ہے وہاں سے آگے نہ بڑھے۔

چوہدری کرم دین نے کراچے ہوئے کہا ”خدا مددگار ہے وہ ہماری عزت رکھے گا۔“
حشمت بیگ نے تائید کی ”ہاں جب تمام سارے چھوٹ جاتے ہیں تو ایک اسی عالم
آپ کا سارا رہ جاتا ہے۔“ داجدان سے ذرا دور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا
”مولا میں رہا ہوں مگر عمارہ ایسی نہیں ہے، زندگی میں پہلی بار اس سے ایک غلطی
ہو گئی ہے، مجھے میرے برکانے پر۔ تو اس کی سزا مجھے دے، اس مظلوم کو بچالے اس کے
کروے دامن پر جو دم لگا ہے، اسے مٹا دے۔ تو قادر مطلق ہے، تیرے لیے ناممکن کو
ممکن بنا دیتی بات نہیں ہے۔“

کہہ کم بخت انسان کو کس وقت خدا یاد آتا ہے؟ جب کہیں سے بچنے کی کوئی صورت
نظر نہیں آتی تو وہ ایک مجھڑے کی تنہا کرتا ہے۔ لیکن خدا اب کیا کر سکتا تھا؟ کیا طبی
معالجے کو لگا دیا یا میڈیکل رپورٹ کو بدل دیا؟ عقیدے کے مطابق یہی سوچا جاسکتا

عورت اپنے خاوند کو دیتی ہے میں خواہ مخواہ بیٹی کی پیدائش پر مجبور کیا تھا۔

اس نے واجد سے کہا۔

”بیٹے تم سمجھدار ہو۔ مجھے بھی تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ اگر تمہارا اب
عاق کرتا ہے تو کمرے دو۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔“

حشمت بیگ نے خوش ہو کر تھانیدار سے کہا ”جناب لڑکی راضی ہے لڑکا
راضی ہے اور لڑکا بھی راضی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کہ
کو آگے نہ بڑھائیں۔“

”نہیں جناب!“ جناب علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ”میں راضی نہیں ہوں
اس معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گا۔“

تھانیدار نے کہا ”میں کسی کا مشورہ نہیں سنتا چاہتا۔ میں قانونی کارروائی کا
لڑکے اور لڑکی کو فاشی کی الزام میں گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔“ فاشی، ہر لمحہ
بیگ اور داجد پریشان ہو کر تھانیدار کا منہ ٹکٹنے لگے اس نے کہا۔

”بیشیرے اور فیصلے کے بیان کے مطابق واجد اور عمارہ تین کھنٹے تک اس کو
بند رہے۔ اس کمرے کی تاریکی میں وہ کیا کرتے رہے؟ یہ میڈیکل رپورٹ
ہو جائے گا۔ میں اس لڑکی کو طبی معائنے کے لیے ابھی اپتال بھیجتا ہوں۔“

چوہدری کرم دین چکر اکر رہ گیا۔ بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی۔ یہ تو ذلت اور
انتہا ہے کہ اس کی بیٹی طبی معائنے کے لیے اپتال جائے گی۔ اس معائنے کی
تھانے میں پہنچے کی پھر وہ تھانے سے نکل کر اخباروں میں شائع ہوگی اور جناب
ایک ایک پنڈ اور ایک ایک زمیندار کے گھر تک پہنچے گی۔ وہ چکر اکر کر رہی
گیا۔ حشمت بیگ نے تھانے دار سے التجا کی۔

”جناب! یہ ایک شریف لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو اب
ہو سکتی ہے۔“

تھانے دار نے جواب دیا ”مگر یہ شریف لڑکی ہے تو پھر گھبرانے کی کیا
میڈیکل رپورٹ بھی اسے شریف کے گی۔ اگر یہ بد چلن ثابت ہوگی تو تھانیدار
معاف نہیں کرے گا۔“

چوہدری کرم دین نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر آگے بڑھا دی۔

ہے کہ اچانک زلزلہ آئے گا اور معائنہ ملتوی ہو جائے گا یا بے چاروں کی رہنمائی نہ ملے گی۔
میتھولو جیکل میسٹ کے دوران خوردبین کا لینس ترخ جائے گا۔

آج کے دور میں یہ سب باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ طبی سائنس ایک اعلیٰ حقیقت: روحانی نظریات سائنسی حقیقت کی مضبوط چٹان کو نہیں توڑ سکتے۔ لیکن دور رسائی اور حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے دعائیں مانگ کر اپنے دل کو تسلیاں دے رہے تھے۔ اسپتال کے ایک کمرے میں پارٹیشن کے پیچھے عمارہ ایک بیڈ پر لاش کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ اوپر چھت سے لٹکا ہوا الیکٹریک فین تیزی سے گردش کر رہا تھا اور وہ دیر سے بج رہا تھا۔ چمکے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کا دل زور مارتا۔
”میں گناہ گار ہوں۔ کیا میں گناہ گار ہوں؟“

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ جس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنا کنواہ نہ کر لیا، گناہ گار ہو گئی۔ اگر یہ سچ ہے تو مجھے سزا ملنی چاہیے لیکن سزا دینے سے پہلے یہ ضرور آ چاہیے کہ میں اس مقام تک کیسے پہنچی؟ جب میں پیدا ہوئی تو جب اعلیٰ میری حال، انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ میری سوتیلی ماں سستے عشق کا زہر قطرہ قطرہ میرے دل میں ڈالتی رہی۔

میں جس ماحول میں تھی وہاں عورتیں مرد کے ایک اشارے پر بک جاتی تھیں۔ حویلی نہیں تھی، میرے باپ کا سبایا ہوا ایک چمکے تھی۔ یہ چمکے ہر شرمیں ہے، ہر گناہ ہے اور ہر عیاش مرد کی منہ می میں ہے۔ تم اس چمکے میں اپنی بیٹی کو پالتے ہو اس کے ساتھ رنگ رلیاں مانتے ہو اور دعا مانگتے ہو کہ جی کسی مقام پر طبی معائنہ تک نہ پہنچے تم ذلیل قسم کے احمق ہو! اس کے غلام! بیٹی کے دلال! تمہاری تہذیب اپنے ہی خیر آپ خود کشی کر رہی ہے۔

”میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ رحم کی بجائے بھی نہیں مانگتی۔ جہاں انصاف نہ ہو انصاف کیا مانگتا؟ میں خدا سے کہتی ہوں اگر میں مظلوم ہوں، اگر میرے دل میں اور شرافت ہے، اگر میں گناہ گار نہیں بنی بلکہ بنائی گئی ہوں تو مجھے تیری رحمتیں ملنا چاہیے۔“

رہا! میں طبی سائنس کی ٹھوس سچائی کو نہیں جانتی صرف ایک سچائی کو جانتی ہوں وہ تو ہے۔ مجھے بچالے۔“

اس کی ہلکی جھپک گئیں۔ اسی وقت ایک لہڈی ڈاکٹر پارٹیشن میں آگئی اس نے ایک رٹنا پر ڈال اور رٹنا پر سے زر کا دستانہ اٹھا کر بائیں ہاتھ میں پھنسنے لگی۔ باہر انتظار کرنے والے بچے اپنی سے برآمدے میں ٹھہر رہے تھے۔ تھانے دار نے جھلا کر کہا ”لعنت، میری تمام رات ضائع ہو گئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔“
رٹنا پر ڈالنے کے کہا ”ڈاکٹر! صاحبہ ابھی اندر آگئی ہیں، تم سے کم ایک گھنٹہ اور انتظار کرو۔“

تھانے دار پاؤں پٹختا ہوا ڈاکٹر یاری کے کمرے کی جانب چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر یاری نے اس نے کالڈ کا ایک پر زہ وار ڈیوائس کو دیتے ہوئے کہا ”یہ ڈاکٹر یاری کو دے۔ لڑکی کا معائنہ نہیں ہو سکتا۔ سننے والوں کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ مروتوں کی ہی آنکھیں بازیاں لگا ہوں کے سامنے جھللا گئیں۔ چوہدری کرم دین مارے خوش قسمت بیک سے پٹ گیا۔ اس وقت کسی نے نہیں سوچا کہ ایک ناممکن سی بات ممکن ہو سکتی۔“

پھر اچانک ذرا ہوش میں آتے ہی دوڑتا ہوا ڈاکٹر یاری کے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر تھانے سے کہہ رہا تھا۔

”لڑکی خوش نصیب ہے اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو نہیں ملے گی۔“
تھانے دار نے کہا ”کیوں نہیں ملے گی۔ میں قانوناً آپ سے مطالبہ کر سکتا ہوں۔“
”آپ ضرور مطالبہ کر سکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ڈاکٹر اس لڑکی کی میڈیکل رپورٹ دے کے گا اور وہ اس لیے کہ اس کا مینڈ شروع ہو چکا ہے۔ طبی سائنس مجبور ہے۔“



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئینہ خانہ

ہم اس دنیا کے ایسے آئینہ خانے میں جی
 رہے ہیں جہاں ہمیں اپنے گھناؤنے کردار
 کا ہر پہلو نظر آتا ہے۔ بشرطیکہ ہماری
 آنکھیں دیکھنا جانتی ہوں۔

نہان سے نکل جاتی وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھی۔ مگر افسوس صد افسوس کہ نئی نسل کے نوان لڑکے اور لڑکیاں اب خود ہی اس کو لیں، لالچوں، تفریح گاہوں اور بس کے اوڈوں پر اپنے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ اگر ماں باپ سیدھی طرح مان گئے تو ان کی بزرگی کا بھرم رہ جاتا ہے۔ دہرہ دہرہ عدالت میں پہنچ کر اپنے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے کورٹ میں سول میجسٹریٹ کو میرج یا خا نہ خراب میرج کر لیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کہیں سے لوگ جائے مگر کسی سے لوٹ نہ لگے۔
بچے اسی طرح لو میں ج تک پہنچ جاتے ہیں۔ دو برس پہلے ہماری برادری کا ایک بڑا بڑا لڑکا
سے زہرت حاصل کر کے مرنا آیا تھا۔ جب وہ ہمارے ملک خدا داد میں تھا تو محض ایک
بچہ تھا۔ لڑکا آتے ہی بار بار ماسٹر بن گیا۔ وہ اپنے ساتھ حجامت بیٹا کی جدید
شہیں اور ایک عدد گوری گوری میم لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔
”اس میم کا کیا مصرف ہے؟“

اس نے جواب دیا ”میں مشینوں سے حجامت بنائوں گا۔ وہ اپنے خوب صورت ملائم
انہوں سے ساج کرے گی اور تبسم کی جلیاں گرائی ہوئی چمپی کیا کرے گی۔ تم مردوں کی
پالم کو نہیں سمجھتے ہو۔ پرائم کے معنی جانتے ہو؟ اونہ، تم کیسے جانو گے۔ تم تو کبھی لندن
ملا گئے۔ یہی بس سمجھ لو کہ حجام سے باربر ماسٹر بننے کے لیے پیچ پیچ میں انگریزی کالیک آؤہ
نکارنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی پان کھانے والی کتنی ہی اماں جانیں اور حقہ پینے
والے! اب جان اسی طرح محی اور ڈیڈی کے خطابات پر پیچ پکے ہیں۔ اللہ نے جاپا تو تم بھی
اکہ بار بریں جاؤ گے۔“

”تم پر اہم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟“

”ہاں، اہم کا مطلب ہے مسئلہ۔ مردوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حجامت بنوانے وقت

مکان کی حسین عورت کی قربت چاہتے ہیں۔ اگر عورت پانچ روپے کے بجائے پچیس

روپے کی حجامت بنادے تو وہ خوش ہو کر مستقل گاہک بن جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے

مائل بہ بے کہ انہیں کہیں آرام سے بیٹھ کر عشق کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ میں ان

بوجھ بھٹنوں کے لیے میرا ایک بڑی سی دکان کھولوں گا اس دکان کے دو حصے ہوں گے۔

ایک حصے میں لڑکیاں اپنی زلفوں کو کرلنگ، شبی اور بیل اپ بنوانے آئیں گی۔ دوسرے

آئینہ خانہ

میں اس دنیا کے ہر ملک، ہر شہر اور ہر بازار میں پایا جاتا ہوں۔ میرے دم سے قرآن کی خوب صورتی قائم ہے۔ بے شک خداوند کریم نے اچھی صورت دے کر پڑا پایا۔ میں ان صورتوں پر جھانڈ پھیرتا ہوں، انہیں بتا سنوارتا ہوں، ان کی حرمت کرتا ہوں۔ ان کی اچھی طرح حجامت بنانے کے بعد ان کو سنوارنا اور نکھارنا ہوں۔ اب آپ مجھے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟

میں ایک حجام ہوں۔ اگر آپ کمائیاں پڑھ کر انسانوں کے مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا نام سن کر ناک بھون نہ چڑھائیں۔ میں آپ ہی کی دنیا کا آدمی ہوں۔ آپ کا کیا انسان ہوں۔ فیشن ایبل عورتوں کی تراشیدہ زلفیں، کمان جیسی بھوئیں، غریب ہوئے بچنے چرنے اور مردوں کے سولجر کٹ کمان کٹ اور ہی کٹ جیسے زائیدہ کلین شیوڈ چرنے یہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں کی معنائی کا نتیجہ ہیں۔ آپ کا لاکھ لاکھ شکرا ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے آپ کی دنیا میں پیدا کیا اور جانوروں کے گھر اہم ہستی سے محروم رکھا۔

جب انسان عمار کے زمانے سے نکل کر تمدنی دور میں داخل ہوا تو کبا
بندروں اور درجہوں سے الگ نظر آنے اور خوب صورت بننے کے لیے سب
میری ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب بھی میری محبت اور
سے خلیفہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اپنے پاس بٹھایا جاتا تھا۔ گھر لوہا مل اور
مغل میں شریک کیا جاتا تھا۔ غریب گھرانہ ہو یا امیر گھرانہ، شادی بیاہ کے موقع
موجودگی لازمی ہوتی تھی۔ جب رشتوں کی بات چلتی تو آگوا کے طور پر میں ہی کم
لڑکے اور لڑکی کے متعلق چمان پھینک کرنے اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے
خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ پھر اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق ہر

نیز اہم کر دے جائے گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ سیکنا تھا۔ ویسے تو میں حجامت کے فن میں پہلی سے استاد کامل تھا مگر وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھتا اور ان سے منہنے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں اس کا شاگرد بن گیا۔ لندن جانے سے پہلے اس کا نام رمنو بنائی تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ اپنے نام کو توڑ موڑ کر باربر ماسٹر مزی بن گیا تھا اور اب یہاں آکر مزی ہیئر ڈرننگ اور بیوٹی پارلر کے نام سے ایک بڑی وکان کھول لی تھی۔ وہاں کیا تھی آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف سٹیکم کے صاف و شفاف آئینے لگے ہوئے تھے۔ وہاں آنے والے گاہک کہیں بھی کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے وہاں پہلی بار کھڑے ہو کر یہ گمان حاصل کیا کہ ایسی جگہ انسان کو اپنا ہر پہلو نظر آئے گی تب بھی وہ خود کو نظر انداز کر کے دوسروں کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ میں نے وہاں سوئی کو پہلی بار ہر طرف سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک ایک زاویے سے متقابل بن کر اپنی طرف کھینچتی ہے۔

سوئی اس انگریزی حسینہ کا نام تھا جو مزی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ دروازہ ڈھکی ہوئی تھی۔ بدن میں گوشت اور چربی کی اتنی بہتات تھی کہ اسے سوئی کے ہائے نیچی (مکڑی) کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کی جگہ کوئی دسی عورت ہوتی تو دہنے کی طرح مہدی نظر آتی مگر وہ لباس کے اندر کو ریٹ بلیٹ باندھ کر پیٹ کے لٹکے ہوئے کٹ کو سمیٹ کر پچا لیتی تھی۔ کمر کو پتلی بنا کر اس میں خم پیدا کر لیتی تھی۔ اس طرح کو لے خود بخود ابھرتے تھے۔ سینے کے ابھار کو ان کی بھولی ہوئی بلندی پر قائم رکھنے کے لیے ذمہ کے بریزر پینڈ استعمال کرتی تھی۔ جتنی ہوشیاری سے بدھکی مال کی پینٹنگ ہوتی ہے اور اسے خوب صورت بنایا جاتا ہے، اتنی ہی ہوشیاری سے وہ پیک ہو کر ہمارے گھٹنم آئی تھی۔

ہمارے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک مثالی حسن ہے۔ ایسی ایسی طرح دار حسینائیں ہیں کہ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے حسن نظر چاہیے مگر ہماری نظرس لوٹ پوٹ کر بدھکی پینٹ پر ہی ٹھہرتی ہیں۔ مے مزی نے ہماری اسی کمزوری کو سمجھ کر سوئی کو یہاں ابھرت لیا تھا۔ میں خود اس کے قریب رہنے کے باوجود اسے آئینے کے ایک ایک زاویے سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے کے لیے یوں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ ہماری دکان کے خوب

مجھے میں نوجوان اپنا حلیہ درست کرانے آئیں گے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک ڈرائنگ روم ہوگا۔ وہ آنے سامنے صوفوں پر بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کریں گے۔ آنے سامنے بیٹھنے سے کوئی خوشگوار حادثہ پیش آجائے تو اس کی ذمہ داری ہمارا ہوگی۔ اگر ہوگی بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے بھی تو ہمارے باپ دادا اگوا بن کر لڑکیوں کو شادی کے مرحلے تک پہنچاتے تھے۔

میں نے قائل ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا ”واقعی“ تاکہ ادھر سے پکارا دھرے تاکہ ہی پکڑی جائے گی۔ ہمارے باپ دادا کا انداز پرانا تھا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ غلو بہت کچھ سیکھ کر آئے ہو۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہم ہیئر ڈرننگ اور بیوٹی کے خوب صورت اڈے بنا کر اگوا کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے فیملی مان لیا۔ تم مجھے اپنا شاگرد بنالو۔“

”وہ نہ۔ یہ استاد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا تاکہ تمہیں انگریزی کا ایک ٹوہہ چاہیے تم مجھے ماسٹر کہہ سکتے ہو۔“

”اچھا استاد! ماسٹر کہا کروں گا۔“

”اول ہونہ۔ اس طرح ماسٹر نہ کہو۔ ماسٹر کے ماکو ذرا ٹیڑھا کر کے لے“

میں نے ذرا سامنے ٹیڑھا کر کے مے مزی کہا۔ وہ خوش ہو کر سمجھانے لگا۔ ”دیکھو۔ میں تمہیں انسانوں کے ٹیڑھے پن کا راز بتاتا ہوں۔ انسان نے کبھی کسی چیز کو سیدھا رکھنے کی کوشش ہی نہیں۔ الفاظ بہت لاثم اور ناک ہونے انسان تو فداوی تہذیب کو بھی جگہ جگہ سے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے اسے ان کی حجامت کرتے کرتے انہیں آدمی کی شکل دی تھی۔ یہ پھر ادھر سے ادھر ہو کر بھی بن گئے۔ عورت کو پردہ سکھایا تو اس نے سیدھے سادے برقعے کو اپنے شہابی حصوں کے مطابق تراش کر اسے میکسی برقعہ بنایا۔ اس طرح ہر چیز کو کڑو سے بعض اوقات ایک نیا حسن پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اچھا خاصہ حسن بن جاتا ہے مگر مے مزی کہنے میں برا حسن ہے؟ ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ شکایت نہیں کی کہ اسے مے مزی کہتے تھے

چو کھر جاتا تھا۔ کام کے دوران ہمیں اپنے گاہکوں سے باتیں کرتے رہنے کی عادت سی گئی ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

”اپنی بات آپ کے والد صاحب تو بڑے بڑنس مین ہوں گے؟“

ہم اپنے گاہکوں کو بھائی جان اور باجی کہتے ہیں خواہ وہ عمر میں ہم سے کتنے ہی چھوٹے ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

”میرے والدین مرجھے ہیں ہمیں اکیلی ہوں۔“

”آپ کا کرتی ہیں؟“

”ہمیں ایک انگلش اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اس کے علاوہ دو ریٹس زادویوں کو ٹیوشن دیتا ہوں۔ ہر ماہ بارہ سو روپے مل جاتے ہیں۔“

روز روز گاہکوں سے بے تکلفی بڑھتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے بتایا کہ وہ واجد نامی ایک خوب نوجوان سے محبت کرتی ہے، جب وہ ٹیکنیکل کالج سے پاس ہو کر کہیں ملازمت کے لئے گاؤں کی شاوی ہو جائے گی۔ ایک بار واجد نے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا تھا کہ وہ انوکھو وغیرہ کیسے استعمال نہیں کرتی ہے؟ ان کے بغیر چرو کچھ روکھا پیو کا سا نظر آتا ہے۔ جب اپنے چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ اس کی کسی سہیلی نے بھگایا، اسے تھریڈنگ کرانا چاہیے تب سے وہ ہماری دکان کی مستقل گاہک بن گئی۔ مگر وہ دل کی حسن پرستی عورتوں کو بیوی پار کار راستہ دکھاتی ہے۔ اگر واجد بھیلے پر تنقید نہ کرتا تو کبھی اس طرف نہ آتی۔ جیلے نے ایک دن بتایا کہ جب سے وہ تھریڈنگ کے بعد واجد سے ملنے لگی ہے تو وہ مجھ پر انداز میں اس کے چہرے کی صابحت اور گیسوئے ورازی فریبی کرنا رہا ہے۔ بار بار ستر مری نے جیلے سے کئی بار کہا۔

”تب کے بال واقعی خوب صورت ہیں۔ اگر آپ کبھی بال ترشوانا چاہیں تو سیدھی ہمارے پاس آئیے گا، ہم بالکل مفت آپ کے بالوں کو تراش کر سیٹ کریں گے اور آپ کو وہ روپے بھی دیں گے۔ ہم ضرورت مند عورتوں کو سو روپے سے زیادہ نہیں دیتے مگر آپ کے بال ایکسٹرا آرڈنری ہیں۔ ایکسٹرا آرڈنری سمجھتی ہیں؟ ہاں یاد کیا، آپ تو انگلش لکچرر۔ ضرور سمجھتی ہوں گی۔“

جیلے نے مسکرا کر جواب دیا ”میں ایک ہی بات سمجھتی ہوں کہ میرے بال واجد کو بے

صورت و شنگ روم میں جوان لڑکے لڑکیاں آنے لگے تھے۔ وہاں ایک طرف کے کمرے لڑکے اپنی حجامت ہوانے کی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھے لڑکیوں کو کتکتے رہتے تھے۔ لڑکیاں سامنے میز پر رکھے ہوئے میگزین اٹھا کر ان کی گردانی کرنے کے بہانے شرابی، لچاقی اور نظرس چراقتی رہتی تھیں۔ بڑی رات کو ماحول تھا۔ پہلے پہل کنواری نظرس یونی جھکتی ہیں اس کے بعد دیکھنے والوں کو کھانسی جاتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جھکنے والے ہر دوسرے نمبرے روزانہ سیلون میں پہنچ جاتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی حجامت نہیں ہوا سکتے تھے اس لیے کبھی کروانے اور کبھی ہیر ڈانگ کے بہانے آتے رہتے تھے۔

آئینہ خانہ میں روزانہ کتنے ہی چہرے نظر آتے تھے۔ ہر چہرہ اپنی ایک کہانی مانا وہاں جیلے نام کی ایک لڑکی اکثر آتی تھی، اسے اپنے نام کی مناسبت سے حیدر بجا چاہیے تھا مگر وہ خوب صورت نہیں تھی، بد صورت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی اس سے نہ دیکھتا تو نفرت سے بھی نہ دیکھتا۔ جس طرح گوشت کا ٹانہ ہو تو سبزی سے گڑا ہے۔ اسی طرح وہ بھی گڑا ہے۔ اس کے قائل تھے، بالکل ہی گئی گڑی نہیں تھی۔ جیلے نے اس کے ساتھ بالکل نا انصافی نہیں کی تھی۔ اس کی زلفوں کو بے حد خوبصورت تھا۔ ایسے گھنے اور لانے بال تھے کہ پیچھے گھنٹوں تک آتے تھے۔ ریشم کی ملائت اس کی زلفیں تو نازک سے جذبوں کی طرح ملائم تھیں، جوانی کے ہر خطرہ کا موڑا خم کھاتی ہوئی تھیں اور ایسی گہری سیاہ تھیں کہ اس تاریک صحرائیں کوئی بھی سناہ بھول سکتا تھا۔

میں نے بار بار ڈرائر سے بال خشک کرنے کے دوران انہیں بار بار جھو کر دیکھا سیدھی مانگ نکالتی تھی اور بڑی خوب صورتی سے چوٹی کو گوندھتی تھی۔ جی ہاں! ہاں! بالوں کے اسٹائل بدلنے نہیں آتی تھی۔ وہ صرف تھریڈنگ کی محتاج تھی۔ میں بتانا تھریڈنگ کیا ہوتی ہے اکثر عورتوں کے چہروں پر مہین ملائم روئیں ہوتے ہیں جو کہ نہیں آتے مگر ان کی موجودگی سے چہرے کی صابحت اور چمکنا ہٹ مارتا ہے۔ ہوا ہوئے دھاگے سے ایک خاص تکنیک کے ذریعے یہ روئیں صاف کر دیے جاتے ہیں بعد چہرے کی قدرتی چمکناہٹ اور اجلاہٹ نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دھوا

اکر میرے لیے جیلہ کے بالوں کی دگ تیار کروے تو میں دو گنی قیمت دوں گی۔ پورے تین ہزار روپے۔“

مجھے میڈم کی یہ خریدنے والی ذہنیت بہت بری لگی۔ یوں تو جیلہ کے بال ہم بھی خریدنا ہمارے گھر ہمارے خریدنے کے انداز میں کبیر نہیں تھا۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ گولی اپنے بال کو اتنا چاہے تب ہم اسے دو سو روپے دیں گے لیکن میڈم ہمارے آگے تین ہزار کا ہار ڈال کر ایک طرح سے لچاری تھی اور بھرکاری تھی کہ ہم کسی طرح جیلہ کو بال کو اپنے پر راضی کر لیں۔

کی پوچھتے تو مجھے جیلہ سے دلی لگاؤ تھا۔ آپ اسے عشق نہ سمجھیں۔ بچے عشق یا سنی بہت سے قطع نظر ہمارے دلوں میں کبھی کبھی کسی کے لیے اچھائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہی جذبہ مجھ میں تھا۔ اس بے چاری جیلہ کے پاس کیا تھا؟ وہ حسین نہیں تھی، دل غمی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے انتظار کے بعد اسے دل نشین بننے کے لیے ایک واجد کا دل لہغاب دوا واجد کی نظروں میں حسین بن کر رہنے کے لیے ہمارے ہاں آکر اپنے چہرے کو بھڑائی پونچھتی رہتی تھی۔ اس طرح وہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں بن جاتی تھی مگر اتنی دیکر کہ مطمئن ہو جاتی تھی۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ جس عورت کو ایک محبوب کا پارل جلائے وہ آئینے کے سامنے اپنی آنکھیں کھودیتی ہے اور محبوب کی آنکھوں سے اپنا جلوہ دیکھتی ہے۔ پس آئینہ وہ ہوتی تھی، پیش آئینہ واجد ہوتا تھا اور چپکے چپکے اس کے دل میں کہتا تھا ”بس مجھے اتنا ہی حسن چاہیے جو صرف میری نگاہوں میں ساکر رہے۔ میں ایسی ہی محدود دولت چاہتا ہوں جسے کوئی چرانے کی کوشش نہ کرے۔ جب مجھے بہت زیادہ حسن کی تمنا ہوگی تو میں تمہارے دل میں جھانک کر یہ گیان حاصل کر لوں گا کہ ایک خوب صورت چہرہ بوجھاپے میں مر جاتا ہے مگر ایک خوب صورت دل کبھی نہیں مرتا۔ لہذا کئی قسمی طرح معمولی صورت کی تھی مگر اس کے دل کی خوب صورتی آج بھی نہ ہاتھ آتوں میں دھڑکتی ہے۔“

میں میڈم کی بات کر رہا تھا۔ جو بوجھاپے میں جوانی کا پیوند لگانے کے لیے جیلہ کے بالوں کو دگ پھینا جاتا تھی۔ یعنی جیلہ کے پاس جو ایک حسن تھا اسے بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ شرمیلی طرز کے لائے بالوں کو مغربی اسٹائل سے تراش دیا جاتا تو بیچاری شرمیلی رہتی نہ

حد پسند ہیں وہ اتنے لائے بالوں کی وجہ سے مجھے ہزاروں کے مجموعے میں پہچان جاتا ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے شرم کر اردن جھکالی۔ میں اس کے پیچھے دوسرے آئینے کے مقابل دوسری عورت کے بال سیٹ کر رہا تھا لیکن اس آئینے میں بھی جیلہ نظر نہ آتی۔ اس کی شرمیلی سوچ بتا رہی تھی کہ اس کا دلہا کنواری زلفوں کی خوشبو میں کھنسی لگا چھاؤں میں لائی زلفوں کی جج پر اور کالی زلفوں کی رات میں کیسے صبح کرے گا۔

اس شرمیلی کو سوچنے دیجئے۔ جب وہ زندگی کے کسی نئے موڑ پر پہنچے گی تو ہم بھی بھی وہاں پہنچا دوں گا۔ اب آپ دوسرا آئینہ دیکھیں۔ اس آئینے کے درو میڈم فون دوسرے تیسرے دن آکر بیٹھتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق میڈم کی عمر کچھ ہوگی لیکن عورت کو عورت ہی پہچانتی ہے۔ سوئی نے مجھ سے شرط لگائی کہ میڈم برس سے بچنے کی نہیں ہیں کچھ اوپر ہی ہوں گی۔ چونکہ وہ دولت مند ہیں اچھا کمال اور ہیں، کسی بھی فکر میں دلی نہیں ہوتیں اور ڈانٹک کی وجہ سے موتی نہیں ہوتیں ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی دولت سے جوانی خریدنے کے لیے یوں پارل کر تھیں۔ کبھی بالوں کی سفیدی کو چھپانے کے لیے بلیک یا براؤن کلر کی ڈانٹک لگاتی کبھی خوب صورت بالوں کی دگ سیٹ کراتی تھیں۔ ایسے وقت انہیں انڈیا آجاتی۔ ایک دن وہ مجھ سے بولیں۔

”وہ لڑکی یاد ہے؟“ وہ جو برسوں اس آئینے کے سامنے تھریڈنگ کروا رہی تھی۔ انہوں نے جیلہ کا حلیہ بتایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”جی ہاں۔ اس باجی کا نام جیلہ ہے۔ وہ ایک انگلش اسکول میں پڑھیں۔“ وہ کچھ بھی ہو۔ ”میڈم نے پہلے ناگوار سے کہا۔ پھر حسرت سے بولیں۔ ”کتنے خوب صورت ہیں۔ ایسی قدرتی ملائت اور چمک میں نے کسی کے بالوں کو دیکھی ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک انگلی کے اشارے سے مجھے اپنے قریب جھکے۔ ”جب میں ذرا قریب جھک گیا تو وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

”تمہارا بار بار سٹر مرزی مجھے اصلی بالوں کی دگ پندرہ سو میں دیتا ہے۔ اگ-

لے لے تھے اس لیے بوڑھے رشتوں کا تقدس اور جوان خوابوں کا حسن فنا ہو چکا تھا۔

آئینہ تو ابھی بہت کچھ دکھائے گا۔ ذرا دم لے۔ مجھے دوسرے آئینوں میں بھی ایسے دے۔ اس آئینہ خانے میں ایک عزت مآب رئیس احمد فدوی کی بھی نظر آیا کرتے تھے ایک شاندار امپالا میں ان کی چودہ برس کی صاحبزادی مہ جیوں برقع پہن کر آتی تھی۔ بات کچھ میں نہیں آتی کہ پردہ کرنے والیاں بیوی پارلر میں کیوں آتی ہیں؟ کیونکہ ان کی اور بیویوں کے بالکل ہی متضاد عمل ہیں۔ وہ ہمارے ہاں سے بن سنور کر برقع کی چار اوڑھنیوں کی طرح نمائش جذبے کی تسکین کرتی ہیں؟ گھر کی چار دیواری میں جو تعزیمات نافذ ہیں ان میں صرف عورت کو عورت دیکھتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں بھی مقابلہ حسن و قبح میں عورتیں ایک دوسرے سے برتر ہونے کی پوری کوشش کرتی ہیں لیکن فطرتاً مرد کی ہو اور عورت کبھی عورت کو اپنا آپ دکھا کر مطمئن نہیں ہوتی کیونکہ خالق کائنات عزت کو شعر کے حسن اور اس کی نزاکت میں ڈھال کر مڑو کی زبان کو شاعری کا کلمہ بنا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو عورتیں اشعار کی نوک پلک درست کرنے کے لیے بیوی پارلر کا پتہ نہ دیتی۔

مہ جیوں کو ابھی مکمل عورت نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ وہ چودہ برس کی بچی تھی اور بن کے خانے میں قدم رکھنے کے لیے آئینہ خانے میں آئی تھی۔ اس کے پاس ساٹھ برس کا بوڑھے باپ رئیس احمد فدوی کی بے انتہا دولت تھی اور قدرت کا دیا ہوا بے لاش حق تھا۔ یاد سنگھار کے بعد وہ فتنہ قیامت بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ بچنے کے لیے چلتا ہے اس لیے وہ بھی جیلہ کے بالوں کو دیکھ کر ترستی تھی۔ رئیس احمد فدوی اپنی لڑائی کی ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وہ یاریر ماسٹر مزی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر مجھ کے لیے جیلہ کے بالوں کی دگ تیار کی جائے گی تو وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرے گا۔

جیلہ کی دگ دشمن نہیں تھی مگر اس کے بال بال دشمن تھے۔ وہاں آنے والی سب ہی دشمنوں کی دولت مند عورتیں اس کے بالوں کو حسرت سے مگر کینہ پرور نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ ”جیلہ کے فرش پر قالین، ٹاٹ میں عمل کا پونڈ اور سانولے بے پادری لٹکی ہوئی تھیں۔ جیتسی۔ مانا کہ پھول کسی کے بالوں میں نہیں کھلتے مگر انہیں

مغنی۔ یہ انسان یوں تو دوسرے انسان کی جیب سے اس کا آخری پیسہ اس کے کون آخری نوالہ اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھینتا ہی ہے لیکن دوسروں سے مجھے عمل میں دیوانگی ایسی ہے کہ وہ کسی معمولی صورت والی کے حسن کی آفریں ہو جیسا کہ چھین لیتا ہے۔ کیا میڈم اس کے بالوں کو اپنے سر پر سجا کر از سر نو جوان بن سکتی ہے؟ مگر دوسروں سے کچھ چھین لینے کی انہی خواہش کی تکمیل ہو جاتی۔

ہیر کنگ سیلون اور بیوی پارلر کے مروانہ حصے میں ایک خیر و نوجوان کو دیکھتے ہیں سوئی کو میرے تعاون کی ضرورت نہیں ہوتی ہے تو میں مروانہ حصے میں چلا آتا ہوں۔ نے اس خیر و نوجوان کو اکثر اپنے سیلون میں ایسے وقت دکھا تھا جب میڈم فیوضا پہنچتی تھی۔ وہ دونوں وینک روم میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی اپنی باتیں کرتے تھے۔ انتظار کے دوران وہ نوجوان اپنے صوفے پر بیٹھا ہوا میڈم کی طرف دنگ تھا۔ میڈم تعارفی عرفان سے کام لیتے ہوئے کبھی کسی انگریزی رسالے کی باتیں کر لیتی تھی، کبھی صوفے پر یہ پہلو سے وہ پہلو بدل کر اپنی خزاں رسیدہ عمر کو کہیں کہیں سے بچا کر کوشش کرتی تھی۔

میں اس نوجوان کو آئینہ خانہ میں بھی دیکھتا تھا اور ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس کا حکو (فخرو) تھا۔ اکثر ناموں سے بھی ان نام والوں کے کردار اور ان کی زندگی کی کو تک عکاسی ہو جاتی ہے۔ فخر خود اپنے نام کو صحیح طور سے زبان تک نہیں لاسکتا تھا۔ اپنی موجودہ زندگی پر فخر کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ہوٹل کا ہیرو تھا۔ اسے تنہا روزانہ اوسطاً چھتیس روپے ٹپ کے طور مل جاتے تھے۔ یہ بات میڈم کو معلوم تھا۔ اس لیے کہ فخر صرف خوش شکل ہی نہیں، خوش پوش بھی تھا۔ اس کے غائب ہونے کا کر کوئی اسے ہوٹل کا ہیرو نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آمدنی کی بات نہیں ہے نمائش بڑا باتیں ہیں۔ ہوٹل کا ہیرو کیا، مستر اور چمار بھی سمجھوئی سراج کے نمائش آئیے نہیں نہیں جاتے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ میڈم پچاس سے اوپر تھیں اور فخر چھتیس سے نیچے میڈم کے دل میں ممتا ہونا چاہیے تھی اور فخر کی آنکھوں میں کسی حسین کم سن لڑکے خواب کی چمک ہونا چاہیے تھی۔ مگر وہ اندھی خواہشات کے بازار میں خرید و فروخت

جب ایک انسان محنت، ہنر اور صلاحیتوں سے بالکل ہی خالی ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ خاندان کا
ملک اور گھر میں سے اونچا ہو جاتا ہے۔ خود ہماری برادری میں جو نائی سیلون میں حجامت
کرتے ہیں وہ خود کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائیسوں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہر
بہر فرقتے اور ہر برادری میں ہوتا ہے۔ انسان کو برابر رہنے کے بجائے بڑا بننے کی
یاد دینی ہے کہ اس نے (نعوذ باللہ) خدا سے بھی برتر ہونے کی کوشش کر ڈالی۔
ان اور شادادسی ذلیل کو شش میں اپنی بلندی سے قبر کی پستی میں چلے گئے۔

بڑے امیر یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ جب تم اپنی حیثیت بدل کر اور بڑے بن کر جہاں
نجانے جاؤ گے وہاں وہ تم سے کچھ اور اونچے بن جائیں گے۔ وہ صرف حجامت بخوانے
وہاں ہمارے سامنے سر جھکاتے ہیں لہذا اپنی نسلی کے لیے ان کی حجامت بخاتے رہو
ان کے سر جھکاتے رہو۔ جب یہاں انگریز کی حکومت تھی تو انگریز ہم سے برتر تھے
ہے آتے تھے اور اس ملک کے تمام لوگوں کو حقارت سے کالا آوی کہتے تھے۔ کسی کو
اکے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے علاقے میں انگریز بہادر تھے ان کے پاس
دلی کے لیے ایک بہت سی تیز رفتار کالی گھوڑی تھی۔ ایک بار انہیں ہمارے علاقے کی
دلی لڑائی لگئی۔ انہوں نے اسے اپنی ریڑھ نشی میں بلوالیا۔ وہ دن اور دو راتوں تک گوری
پہنہ چلا۔ تیسرے دن جنگل میں اس کی لاش ملی۔ اسے گولی مار دی گئی تھی۔ پتہ نہیں
ہاں تو بے چاری حکم کی بندی تھی۔ آقا کے کسی حکم سے انکار نہیں کیا ہو گا۔ اس ظلم
مخالف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ کس کی مجال تھی کہ انگریز بہادر کے خلاف چوں بھی
رہا۔ جب وہ صاحب یہاں سے جانے لگے تو ریاست کے ایک راجا بھار نے ان سے
دعائے کی کہ ان کی کالی گھوڑی اسے نشانی کے طور پر دے دی جائے۔

”جو جس پر ہم سواری کرتا اس پر کالا آوی سواری ہی کرنے سکتا۔“

بر کہ کر انگریز بہادر نے کالی گھوڑی کو اسی وقت گولی مار دی۔ پھر اسے بھی جنگل میں
چھوڑا۔ یہ ہے انسان کے برتر بننے کی داستان بیٹے اتم مغرور انسانوں کی دنیا میں جس
مہر بہرہاں سے اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو۔“

بہر اسٹور مزی کے بوڑھے باپ نے اسے اپنے طور پر بہت سمجھایا لیکن وہ اونچا
ان کے لیے لندن چلا گیا۔ ہمارے سیلون اور یوٹی پارلر میں جب رات کے آٹھ بجے

شاخ سے تو ذکر بالوں میں سجایا جاسکتا ہے۔ پھر اس جیلہ کے بال اس کی صورت نے
ہمارے حسن کی جلوہ سامانی میں اضافہ کیوں نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں۔
حسن میں اضافہ کرنے کی ضد ضرور تھی اس لیے ہر طرف سے بولیاں بڑھ رہی تھیں۔
میں سب سے زیادہ دولت مند میڈم فیروزہ اور رکش احمد فدوی تھے۔ میڈم نے ہمارے
دیکھ کر چار ہزار کی بولی دی۔ رکش احمد فدوی نے چھ ہزار تک چھلانگ لگائی۔ میڈم
چلا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر سات ہزار تک پہنچ گئی۔

چلے بولیاں بوہنے دیجئے۔ اس آئینہ خانے میں اب ہمیں بھی دیکھیے ”آزم
ان آئینوں میں ہر پہلو سے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ہمارے
جانے سے پہلے ر منو نائی تھا اور کسی سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر
حجامت بخاتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مہنگائی لوگوں کی حجامت نہیں ملتی تھی۔
محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔ ر منو کو اٹھائیں برس کی عمر میں ایک رکش لڑکی
عشق ہو گیا تھا۔ کہاں ایک رکش زاوی اور کہاں ایک نائی کہاں آسمان اور کلہاڑ
ایک خدا ایک رسول کو ماننے اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو
فرش سے اٹھا کر عرض پر بٹھادیا جائے۔ ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ ساتی جیبت
تمذیب اور زندگی گزارنے کا معیار دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب عقل اپنی لائو
پالی ہوئی بیٹی کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائی کے لیے باندھنا گوارا نہیں کر سکتا۔
بوڑھے باپ نے اسے سمجھایا۔

”بیٹا اپنی حیثیت کو دیکھو۔ سرائی کر آسمان کو دیکھو گے تو گردن دکنے لگی۔
”نہیں بابا! اگر میں آسمان تک پہنچ جاؤں تو پھر گردن نہیں دکنے گی۔ میں؟
پیشہ چھوڑ دوں گا کوئی دسرا دھندا کروں گا۔ اپنی حیثیت بدل دوں گا۔“

”پیشہ بدلنے سے کیا حیثیت بدل جائے گی؟ جب بھی تمہارے باپ دادا کو
تم نائی ہی کہلاؤ گے۔ کیا تم اپنے باپ دادا کو بھی بدل دو گے؟“
ر منو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچپن سے ضدی تھا۔ عشق میں ناکامی ہوئی

بن گیا۔ اس کے باپ نے کہا۔
”یہ دنیا اپنی ابتدا سے ایسی ہی ہے۔ ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے بڑے

دست اور ہندو سمجھ کر میرے سامنے رمزی کی شکایت کرتی تھی کہ وہ اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے کی دھمکی دیتا ہے۔

اب کیا بے وقت وہ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے رمزی سے چھوٹنے کے بعد سارا تلاش کر رہی ہو لیکن میرے لیے اتنی بڑی میم کو پالنا ہاتھی پالنے کے برابر تھا اس لیے میں اسے دور سے دیکھ کر خوش رہتا تھا۔ ایک صبح میں کام کے اوقات کے مطابق دکان پر آیا تو دکان بند تھی۔ اس کی چابیاں رمزی کے پاس رہتی تھیں۔ وہی سوئی کے ساتھ صبح آکر دکان کھولا تھا۔ جب دیر ہو گئی تو میں خیریت معلوم کرنے اس کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ لاہری میں گیا اور ہاسٹر رمزی نے آکر دکان کھول دی۔ لیکن کوٹھی میں سوئی سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے بڑی ایزی ہوئی حالت میں دیکھا۔ وہ پنک کے پاس فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سلاشب خواتین کا لباس تار تار تھا اور ایسی بے لباس تھی کہ بدن کا تار تار نظر آ رہا تھا۔ اس وقت پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آئینہ خانے میں ہر پیلو سے صحت مند اور جوان نظر آنے والی اندر سے کتنی کھوکھلی اور خزاں رسیدہ ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے من کر خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے چھج کر بولی۔

”جیو ہاں سنس اگٹ آؤٹ۔“

میں جلدی سے آؤٹ ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں آکر جیرانی سے سوچنے لگا کہ میں نے آئینہ خانے میں نظر آنے والی اسی سوئی کو دیکھا تھا یا سوئی کی بوڑھی ماں کو؟ نہیں سچائی زہر سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی فیشن زدہ جوان عورتیں اپنے بزدلی کی خفائی میں خود اپنی ہی اماں جان نظر آتی ہیں لیکن مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا ہانگی۔ لیکن ہی عورتوں کے دم قدم سے ہمارے بیوی پارلر کا کام چلتا ہے۔ میں تو زنی دیر کی سوئی کا انتظار کرتا رہا پھر سمجھ میں آ گیا کہ میں نے ایک عورت کے اندر جھانک کر اس کے زہر کو نہیں پہچانی ہے وہ ابھی سامنے نہیں آئے گی۔ مجھے بھی اس کا سامنا نہیں کرنا ہے لہذا میں دکان پر واپس چلا آیا۔ وہاں ہاسٹر رمزی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی آگ نہیں آیا تھا ورنہ وہ جبرا مسکراتا رہتا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا ”صبح تم اتنی دیر کیوں آئے ہو؟“

”ہاں میں وقت پر آیا تھا پھر تم سے چابیاں لینے تمہاری کوٹھی کی طرف جانا پڑا۔ ابھی

سناٹا ہو جاتا ہے“ اس وقت سے ستر رمزی لندن اور انگریزوں کے بارے میں بحث کرتا رہتا تھا۔ ایک رات جب سوئی موجود نہیں تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”سے ستر ایہ سوئی تمہارے ہاتھ کیسے لگی تھی؟“

اس نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد جواب دیا ”سوئی جیسی لڑکیاں لندن کے گلیوں میں مل جاتی ہیں۔ جس سیلون میں“ میں کام کرتا تھا وہاں سوئی بھی کام کرنے لگی تھی۔ خود ہی میری طرف مائل ہونے لگی تب مجھے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ سوچا یہ سوئی اسی انگریز کی بیٹی، پوتی یا نواسی ہوگی جس نے ہمارے گاؤں کی گوری کا گھوڑی کو برتری کے غور میں گولی ماری تھی۔ تارنخ کے اس موڑ پر اب مجھے زہرہ موقع ملا تھا اس لیے میں انگریز بہادر کی نگری سے سوئی کو یہاں لے آیا۔“

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے محبت یا کسی مرہبان جذبے کے تحت نہیں اپنایا تھا۔ بلکہ بہت پرانا انتقام لینے کی غرض سے انتقام لینے کے لیے اکثر عورت ہی نشانہ بنتی ہے، انصاف کی نظر سے دیکھا تو تارنخ کے اس موڑ پر گوری مظلوم تھی اور تارنخ کے اس موڑ پر سوئی مظلوم نہ تھی۔ آئیے اب اس آئینہ خانے میں ذرا سوئی کو دیکھیے۔

مجھے سوئی سے اکثر خفائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بوسے بوسے عورتیں کبھی مجھے اور کبھی ہاسٹر رمزی کو دوگ لگانے اور ٹپکس لگانے کے لیے آگے کرتی تھیں۔ جب ہاسٹر رمزی ان خدمات کے لیے دکان سے باہر جاتا تو سوئی مجھے آگے بارے میں بہت کچھ بتاتا کرتی تھی۔ یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ عورت بہت کچھ بتاتا باوجود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔

ابتدا میں اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ زلفوں کو زائے سنوارنے کا کام محض اس نے مشغلے کے طور پر دیکھا تھا۔ پھر حالات سے مجھ ملازمت کر لی۔ اس وقت تک وہ معصوم اور اچھوتی و شیرازہ تھی۔ ہاسٹر رمزی اس کا پہلا مرد تھا۔ یہ دعویٰ ہر عورت کرتی ہے لیکن سوئی جیسی بھاری بھر کم عورت ہ کرے تو مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ ویسے میں کسی عورت کا دل نہیں توڑا۔ بلکہ کی طرح سوئی کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتا تھا اس لیے وہ مجھ سے بہت خوش رہا۔

اور صورت میں ہی مرحوم کا بیٹا بنائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ لڑکی ابھی بڑھ رہی ہے یا لڑکی
 آدھڑ پٹیلے ہی سے کہیں ملے ہو چکا ہے۔ اس طرح شریفانہ انداز میں باتیں بنا کر ٹالنا بہتر
 ہے اور شہنائے والے کی حیثیت پر تنقید کرنا بہتر ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انہوں نے مجھے
 دے گا یا نہیں کہ کر ڈیل کیا تھا۔“

مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ غصے سے منھیاں بھیجنے رہا تھا
 ”ہاں میں ٹائی ہوں مگر انسان بھی تو ہوں۔ دوسرے انسانوں کی طرح میرا دل بھی تو آرزوؤں
 کا گھر ہے۔ اگر میں اونچی کوالٹی کی آرزو کرتا ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ اس کوالٹی کو چھوٹے
 کے لیے کتنی آزمائشوں سے گزرنا ہو گا؟ فریاد کی طرح تیشہ لے کر جٹانوں کے سینے سے دودھ
 کی نرنگائی ہو گی یا قارون کا خزانہ لانا ہو گا؟ یہ لوگ انسان ہو کر انسانوں کو نہیں سمجھتے کہ وہ
 کیا مافی ہوتا ہے اسے آزمائش میں جھلا کیا جائے تو وہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔
 میں نے بھی اپنی حیثیت بدل دی۔ اب کون ہے جو مجھے فٹ پاتھ کا ٹائی کہہ سکتا ہے۔
 میرے پاس ایک شاندار کوٹھی ہے، گھر ہے، انکم ٹیکس والے میری صحیح آمدنی تک نہیں پہنچ
 سکتے۔ ”دروالو الیگ چیریک بیک گھوم کر میرے دروازے پر ہوا کیا؟“ اگر حیثیت دولت سے بنتی
 ہے تو میں دولت مند ہوں۔ اگر شرافت سے بنتی ہے تو میں نے اپنی ذات سے آج تک کسی
 کامل نہیں دکھایا۔ کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں کی اور اگر حیثیت مذہب سے بنتی ہے تو
 اللہ اللہ میں مسلمان ہوں اور آخری نبیؐ کی امت سے ہوں۔ اس کے باوجود اپنے اعلیٰ
 نادانوں پر غر کر کے والے مجھے یا تو مسلمان نہیں سمجھتے یا انسان نہیں سمجھتے صرف ٹائی کہتے
 ہیں۔“

”تمہاری ان تھک کوششوں کو دیکھنے کے بعد اب میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان اپنی
 جود سے اپنی حیثیت بدل سکتا ہے۔ دیکھو باا کہنیں کے ارب پتی مالک کو کوئی موجی نہیں
 لکھا۔ اس لیے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں اس کے نام کا ڈنکا بجاتا ہے۔ ہمارے ملک میں
 جودت مند آؤنٹک ڈرائی کلیٹک کی بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں کوئی انہیں دھوبی نہیں
 کتا۔ کوئی سوسائٹی میں انہیں گلے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح تمہیں بھی کوئی ٹائی نہیں کے
 ایک بار قسمت آزماء تم شریف آؤ ہو کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مانگو۔ لیکن
 نہیں میں تمہیں غلط مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ تم ایک گوری میم کو بیاہ کر لے آئے ہو۔“

وہیں سے آ رہا ہوں۔“
 اس نے چونک کر پوچھا ”کیا سوئی تمہارے سامنے آئی تھی؟“
 ”ہاں نہ نہیں۔“ میں بوکھلا گیا کہ جواب کیا دوں؟ پھر میں نے سچ کہہ دیا ”گاہرہ“
 سامنے نہیں آئی تھی میں اس کے سامنے پہنچ گیا تھا۔“
 اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”تم بے وقت
 پہنچے! تم بغیر دستک دیے کوٹھی کے اندر کیوں گئے تھے۔ یہ آؤٹ آف اینی کٹ ہے۔
 کٹ کا مطلب جانتے ہو؟ نہیں تم حجام ہو، تم کیسے جانو گے۔“
 میں نے کہا ”میرا گریبان چھوڑ دو ورنہ یہ سوئی کے لباس کی طرح تار اور ہلکا
 گا۔“

وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے رکھی ہوئی ریو الیگ چیریک
 بڑا۔ پھر دیر سے چھاڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میری ان آنکھوں نے
 دیکھا ہے اور کہاں تک دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔
 ”مجھے آج معلوم ہو گیا کہ تم لندن کے کباز خانے سے سوئی کو کتنی خوب صورتی
 ساتھ پیک کر کے لائے ہو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ہماری برادری میں فوجی اور
 صورت لڑکیوں کی کمی ہے؟“

”تم میرے ذاتی معاملات میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ جو میں نے بہتر سمجھا
 کیا۔“
 ”اگر بہتر سمجھ کر کیا ہے تو پھر تم نے سوئی کو مارا کیوں؟ اس کے کپڑے کپڑا
 ڈالے؟ نہیں جو حماقت تم کر بیٹھے ہو اسے اپنی ذات تک محدود رکھ کر دنیا داروں سے
 رہے ہو۔“

وہ ریو الیگ چیریک دوسری طرف گھوم گیا۔ میری طرف پشت کر لی۔ مجھ سے
 چھپا لیا۔ اس کے بعد کہنے لگا ”کیا میں نے لندن جانے سے پہلے اپنے ہی ملک کی
 مذہب کی ایک لڑکی کا رشتہ نہیں مانگا تھا؟ مجھے وہاں سے رشتہ نہیں ملا حثارت کی۔“
 ”تم اپنی حیثیت سے زیادہ مانگ رہے تھے۔“ میں نے کہا۔
 ”نہ کمو حیثیت کی بات نہ کرو۔ شریفوں کے ہاں جب کوئی لڑکی کا رشتہ مانگتا ہے

ہا ہوں۔ اگر میں اپنی موجودہ حیثیت سے بہت بلند ہو کر اپنے ملک میں نہیں جاؤں گا تو
اپنی بیٹہ کو بھی نہ پاسکوں گا۔

پلے ہل سوئی کو اپنی توہین کا احساس ہوا کیونکہ وہ میرے دروہی اور میں اسے
فرمانروا کہا تھا۔ ٹینہ خواہوں سے زیادہ دور تھی پھر بھی میں اسے ترجیح دے رہا تھا۔ اس
نہ وہ مجھ سے کئی ماہ تک ناراض رہی، مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی۔ مجھے کب
لپکا ہوا تھی۔ میں تو اپنا بیگ بنیٹس بڑھا رہا تھا اور اسے آئے دن گناہوں کی دلدل میں
نہیں دے دیکھ رہا تھا۔

دو روزہ کال گرل، ماڈل گرل اور بزنس گرل کی حیثیت سے اتنی عام ہو گئی کہ
اگر اور کبوں کے ہیرے اور ٹیکسی ڈرائیور معقول کمیشن پر اسے بزنس پہنچانے لگے۔
نوامت برس تک میں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس دوران میں نے خواہوں کو بہت آہستہ
ن کی طرف پھرتے دیکھا جیسے جیسے جوانی کی چمک ماند پڑتی جاتی تھی ویسے ہی ویسے اس کے
لب کے سامان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پہلے وہ ہلکا سا سوسائٹی میک اپ کرتی تھی پھر
نہ پلے آنے والے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے گہرا چینی ہوا میک اپ کرنے لگی۔

جوانی اور بڑھاپے کے درمیان سفر کرنے والے اس سچائی کو نہیں سمجھتے کہ عمر کبھی
بے طعنے نہیں کرتی، اندر سے کھوکھلا کرتی ہے۔ جب بڑھاپے کی گرد اندر سے اڑنے
لگتی تو سوئی کو کھانسی، کھانسی پھر کھانسی کے ساتھ بخار بھی آنے لگا۔ اب وہ پھر میری دوست
تھی کئی کیونکہ وہ بیماری میں اسے مجھ جیسے ہمدرد کی ضرورت تھی۔ دن بدن گاہک ٹوٹ
پڑتے تھے، کئی کرتی جاری تھی، میک اپ اور دو اؤں کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔
اسے اس سے سیدھی اور کھری بات کہہ دی۔

”کچھ سوئی! میں ٹینہ کا عاشق بن کر آیا تھا۔ اب بزنس مین بن گیا ہوں۔ میں
نہیں ہمارے جوان اور صحت مند بتانے کے لیے اپنی محنت کی کمائی کا ایک پونڈ بھی خرچ
نہیں کر سکتا۔ اگر گناہوں کے رانے سے واپس آ جاؤ تو میں دوسری طرح تمہاری مدد
کر سکتا ہوں یعنی تھیں بہترین دگ بیٹانے کا فن سکھاؤں گا“ اس سے تمہاری آمدنی بڑھ
جائے گی۔“

”مجھ سے یہ فن سیکھنے لگی۔ میری لاعلمی میں گناہ کے رانے پر چلتی رہی۔ اس عرصے

وہ اچانک ہی قہقہے لگانے لگا ”شادی۔۔ اور سوئی سے بابا بابا۔“
”آخر اس میں قہقہے لگانے کی کیا بات ہے؟“ میں ٹھوٹتی ہوئی نظروں سے اسے الگ
لگا۔

جب قہقہوں کا طوفان مگر مگر گیا تو اس نے کہا ”میں نے تم سے اور اپنی برادری کے
دوسرے لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ میں سوئی کو لندن سے بیاہ کر لایا ہوں۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے؟“

”نہیں، مجھے غلط نہ سمجھو۔ خدا گواہ ہے کہ میں گناہ کار نہیں ہوں۔ میں نے کیا
کبھی ایک رات بھی سوئی کے ساتھ نہیں گزارا۔ ہم دونوں کے بیڑوں میں ایک ہی
اسے یہاں کیوں لایا یہ بھی سن لو۔ سوئی ایک غریب والدین کی بیٹی ہے۔ سہولت
میں جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اب وہاں غریبی، بھوک، افلاس اور گلاب کی
چھائی رہتی ہے۔ سوئی نے شرفناہ زندگی گزارنے کے لیے ہیرہ و رنگ کا کام سیکھا
لیکن تکلیف دہ رشتوں کی وہی پرانی کہانی ہے یعنی ماں اندھی، باپ بیمار اور لاغر اور
آوارہ اور بد معاش لہذا سارا بوجھ اور ساری ذمہ داریاں ایک لڑکی کے کاندھے پر آجائے
ہیں۔ سوئی کو کال گرل بننا پڑا۔ وہ میرے ساتھ جس سیلون میں کام کرتی تھی وہاں
والے کسی گاہک سے معاملہ طے ہو جاتا تو وہ ڈیوٹی کے بعد اس کے ساتھ چلی جاتی۔“

”تمہارے ساتھ کبھی نہیں گئی؟“

”نہیں۔ میں اپنی پارسائی جتاؤں کا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ میں اپنے دل کا مال
ہوں۔ میرے دل و دماغ پر بیس برس کی عمر سے صرف ایک ہی حینہ نقش ہو کر رہا ہے
تم سمجھو؟ نہیں سمجھو۔ میں بتاتا ہوں۔ وہی حینہ جس کا نام ٹینہ ہے اور جس سے ملک
اس وقت محبت کی جب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دو ٹکے کاٹا کرتا تھا۔ میں ٹینہ کا ذکر کرنا
کروں گا پہلے سوئی کی بات پوری ہونے دو۔“

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ کال گرل بن گئی اس نے کئی بار میرے ساتھ بھی جوئی کیا
سے آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے صاف طور پر کہہ دیا۔

”سوئی میں تمہارے لندن میں دولت کمانے آیا ہوں۔ میں ضرورت کے
کھاتا ہوں اور ضرورت کے مطابق پنشن ہوں۔ کوئی تیسرا شوق نہیں کرتا۔ ایک ایک

کاڑو کو دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ وہ آنے والوں کو دھوکہ اس لیے نہیں دے سکتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے پرس میں صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ وہ سرخ گاڑاؤں کے دماغ کا چھوڑا بن گیا تھا۔ ایک عورت کو چیلنج کر رہا تھا کہ اب وہ کچھ بھی نہیں رہی اور ایسا تو بین امیز چیلنج کوئی عورت برواشت نہیں کرتی۔ وہ جھجلا کر کہنے لگی کہ اب رہائے گی۔ میں نے پھر اسے سمجھایا۔

سوئی انتم سمجھتی ہو کہ تمہیں کوئی خریدنے آئے تب ہی تمہاری قیمت اور اہمیت واضح ہوگی۔ یہ غلط ہے۔ اپنی قیمت لگانا چھوڑ دو۔ جب کوئی خریدنے آئے اور تم بکنے سے انکار کرو تو اس کے بعد ہی تمہیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ لوگ کس طرح دیوانہ وار تمہاری آواز کرتے ہیں اور حسرت سے تمہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ تم بکنے والی عورت نہیں ہو۔

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ بکنے کا خیال میں نہیں لے گی۔ میں نے کہا۔

اب میں پاکستان جانے والا ہوں۔ اگر تم کہنا ہوں سے توبہ کرلو تو میں تمہیں اپنے مائے باپوں کے پاس بھیج دوں گا۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ تم کال گریل بن کر زندگی گزار چکی ہو۔ وہاں جہیں عزت ملے گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کروں گا اور تم میرے سیلون میں بنگلہ کام کرو گی اس کا معقول معاوضہ دوں گا۔

وہ دونوں تک سوچتی رہی، کبھی کبھی پرس کھول کر سرخ کاڑو کو دیکھتی رہی۔ آخر اس نے فیملی شادیاں میرے ساتھ پاکستان جانے کی۔ اس وقت تک میرے دل میں یہی بات تھی کہ میں سوئی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں۔ جو عزت وہ اپنے وطن میں کھو چکی تھی اسے مجھے اپنے وطن میں بحال کرنے جارہا ہوں اور اس کے لیے ایک معقول روزی کا ذریعہ پیدا کر رہا ہوں لیکن اپنے وطن کی زمین پر پہنچنے ہی ان نیک مقاصد میں میری ذرا سی خود غرضی شامل ہو گئی۔ یعنی وہی دوسروں سے برتر ہونے والا جذبہ میرے دل میں چمکنے لگا۔

میری رازداری والے جانتے تھے کہ شینہ کا رشتہ نہ ملنے کے باعث میں ضد میں آکر اپنی جیت بڑھانے لگا ہوں۔ اب لوگ پوچھنے کہ اپنی حیثیت سے اونچے مقام پر میں نے کیا پایا؟ ان کی فہمی کے لیے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے میں نے کہہ دیا "سوئی"

میں اس کے ماں باپ مرچکے تھے بھائی جیل چلا گیا تھا اس کے باوجود اس کے اقربان گئے تھے۔ مزید ایک سال بعد وہ وی ڈی ٹرینمنٹ کے لیے اسپتال پہنچادی گئی۔ ٹرینمنٹ سمجھتے ہو؟ تم تو کبھی لندن نہیں گئے تم کیسے سمجھو گے میں سمجھا ہوں۔

وہ مجھے سمجھانے لگا کہ لندن میں جو بازاری عورتیں بیاریوں کا گھر بن جاتی ہیں ان کو منوعہ قرار دے کر ان کا باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ جب سوئی اسپتال سے باہر آئی تو اس کے پرس میں ایک سرخ کاڑو تھا۔ وہ کارڈ ظاہر کرتا تھا کہ سوئی زیر علاج ہے لہذا اس سے دور رہیں۔ ایسی عورتوں کو اسپتال سے ملنے والے سبز سرخ، نیلے یا کسی رنگ کے کارڈ اپنے پرس میں رکھنے پڑتے ہیں تاکہ ان کے قریب آنے والے پرس کھول کر انہیں اور خطرے سے آگاہ ہو جائیں۔ جس عورت کے پرس میں ایسا کارڈ نہ ہوتا ہے اسے پڑنا ہے اور بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوئی وہ سرخ کاڑو لے کر میرے پاس آئی اور جھماک کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کارڈ ایک عورت کا اعمال نامہ تھا۔ حالانکہ اس کاڑو پر صرف چند الفاظ درج تھے لیکن سرخی بتا رہی تھی کہ وہ آٹھ برس تک کس طرح اپنے لہو کا قطرہ قطرہ ہوس کے دریا پاتی رہی ہے۔ وہ کارڈ خطرے کا سرخ سنگٹل تھا۔ وہ کارڈ بے حیائی کے حامی کارڈ طبی و حلالی کے دوران سوئی کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تھا۔ وہ ایک آئینہ تھا۔ آئینہ اس میں اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ذرا بالائے نظری سے دیکھا جائے صرف سوئی کا نہیں بلکہ پورے گھناؤنے معاشرے کا شافی کارڈ تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی آمدنی کے دوران ختم ہونے والے اب ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ سیلون میں محنت کرے اور حلال کی کمائی کما لے۔ وہ نہیں تھی، محنت کرتی تھی لیکن اخراجات بہت بڑھ گئے تھے کیونکہ وہ بیمار ہو کر ہونے کے باوجود اپنے چہرے کو میک اپ کے لوازمات سے اور بھدے جسم کو بیلٹ، فوم کے بریزر اور دوسری پینڈنگ کے ذریعے خوب صورت اور پرکشش بنا رکھی تھی۔ عمر کتنی ہی ہو، حالات کیسے ہی ہوں، اکثر عورتیں اپنا آپ دکھانے خیر، والوں کی خاموش نگاہوں سے داد وصول کیے بغیر زندہ نہیں رہتیں۔

اس کے ظاہری حسن و شباب سے متاثر ہو کر لوگ اس کے پاس آتے تھے

جیسی خوب صورت میم بیاہ کر لایا ہوں۔ شینہ جیسی اب ہزاروں لڑکیاں مجھے مل چکی ہیں بھائیو! میں نے سوچا کہ اس قوم کی لڑکی بیاہ کر لاؤں جو ہم پر سو سال تک حکومت کرتی ہے۔ اب میں اس میم پر حکومت کرتا رہوں گا۔

جھوٹی شان اور اپنا بڑا پن کون نہیں دکھاتا؟ سب ہی اس لعنت میں مبتلا ہیں۔ میں اسی برتری دکھاتی ہے جس سے سوئی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور نہ ہی اس کو غرور کو نہیں پہنچتی ہے۔ اگر پہنچتی تو وہ سرخ کارڈ کے مرتلے تک نہ پہنچتی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ہم ایک کوشی میں رہیں گے لیکن ہمارے بیڑے روم الگ ہوں گے۔

باربر ماسٹر رمزی یہ کہہ کر ذرا چپ ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔
”تم سمجھ رہے تھے کہ میں اتنی خوب صورت میم کے ساتھ رانچی گزارنا نہیں۔ اب تمہیں یقین آجانا چاہیے۔ اگر شیطان برکائے تب بھی ہمیں کراں کے نہیں جاسکتا کیونکہ وہ ایک کارڈ یافتہ عورت ہے۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر تم نے اسے اس قدر کیوں مارا کہ کپڑے تک چاڑھا؟“
باربر ماسٹر رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دیکھے دسے دلی سے بولا۔
میرے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے۔ کل رات مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ میرے کیوں آئی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی کال گرل کے پاس شادی کا رڈ نہیں ہوتا۔ اندرونی بیماری کا اشتہار اس کے پرس میں نہیں ہوتا اس لیے وہ بھی یہاں آکر کارڈ سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے لندن چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے اس لعنتی کارڈ کے پڑے کر دیئے تھے اور وہ جو خود وہاں اندر سے پڑے پڑے ہوئی تھی یہاں آکر پارس کی طرح اسمبل ہو گئی ہے۔“

وہ غصے سے مٹھیاں بھیج کر بولا ”میں یہ فریب برداشت نہیں کر سکتا۔ کل رات کو کوئی سے غائب رہی۔ صبح واپس آئی تو میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ تب مجھے بتایا کہ وہ یہاں دکان میں آنے والے گاؤں کو پھانسی ہے۔ اب سوسائٹی کے بیٹی پارلر کے مالک نے اسے پھانسی لیا ہے“ اسے اپنے ہاں کام کرنے کا بہت بڑا تعزیر لہذا وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔“

باربر ماسٹر رمزی کے چہرے پر غصہ کم اور دکھ کی پرجھائیاں زیادہ تھیں۔ وہ بولا۔

”ملائیے ایک گراہ عورت کو راہ راست پر لا رہا تھا مگر وہ پھر گراہی کی طرف جا رہی تھی اس اور اسے ہونا چاہیے تھا۔ دراصل ہماری اجتماعی زندگی گزارنے کے طور طریقے ہی ایسے ہیں۔ ہم غلط ہیں کہ آرائشی حسن کے لیے بیوی پارلر سجا کر بیٹھتے ہیں، تم غلط ہو کہ تم رات کو ہی وقت پوچھتے ہو جب وہ اپنے حسن و شباب کی ایک ایک نوک ہلک درست کے بیٹی پارلر سے باہر آتی ہے۔ جب تک حسن پرستی رہے گی عورت خود نمائی کے غلام بن جائے گی۔“

”میں نے اپنی مرضی کی مالک تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی“ اسے کوئی نہیں لگتا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے شینہ کے متعلق پوچھنا چاہا کیونکہ رمزی نے ایک اتار دھری چھوڑ دی تھی۔ لیکن شینہ کے بارے میں کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بیوی پارلر کا رخ کرنا اور جیلہ اندر آگئی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے، میں نے آگے بڑھ لیا۔

”تبی بانی باق پورے تین ماہ کے بعد آئی ہیں۔“
وہ دلی سے اپنے چہرے کا پینہ نہ پوچھتی ہوئی آئینے کے سامنے ایک ریو الونگ چیر کر تکیہ تکیہ مجھے بتاتے لگا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔ میں نے تھریڈنگ کے دوران ”تبی بانی“ کی بات ہے آپ پریشان نظر آ رہی ہیں؟“

”تبی بانی“ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی ”میں بہت پریشان ہوں۔ میرے دن رات کا دل دھڑکا رہا ہے۔ یہ لوگ میرے بالوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

پہلے تو میڈم بیڑہ میری سیلی بن گئیں۔ حالانکہ وہ عمر کے لحاظ سے میری ماں بن سکتی تھیں۔ لیکن انہیں بوڑھی کہہ کر دکھ نہیں پہچانا چاہتی تھی۔ انہوں نے سیلی بننے کے بعد

اپنے گھرانے اور رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ پہلے میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ پر اتنی مہمان کیوں ہیں۔ میں میڈم کی کوشی میں پہنچی تو ڈائمنڈ نیکل پر پرکاشمے پڑے ہوئے تھے۔ مجھ جیسی تھالڑکی کے لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے پوچھا ”تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ؟“

میں نے کہا ”آپ نے کھانے کا ایسا انتظام کیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو ہی نہیں

گے۔

”مٹا کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے پاس ہی ایک بالوں کی خوب صورتی ہے۔ یہ صورتی تمہارے سر سے جھڑ جائے گی تو اپنے محبوب کو دکھانے کے لیے تمہارے کچھ نہیں رہے گا۔“

میڈم نے بے سب کچھ غصے میں کہا تھا مگر کچھ کہا تھا۔ میں خوب صورت نہیں ہوں۔ یہ بھیجیں سے جانتی ہوں اور بھیجنے سے یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے بال بہت خوب ہیں اتنے خوب صورت کہ حسین ترین عورتیں بھی یہ زلفیں دیکھ کر احساس کمتری محسوس کرتی ہیں۔ جب سے واجد کی نگاہوں نے مجھے پسند کیا ہے تب سے کئی بار میں غم ضرور میں اپنے بال کاٹ کر خود کو دکھاؤ پتہ چلا کہ اس طرح واجد کو دکھانے کے لیے اس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لیے میں اپنے بال کبھی نہیں کٹاؤں گی۔ آخر میں جب عورت ہوں۔ میرے پاس بہت سہمی، بال برابر تو خوب صورتی ہونے میں اپنے بالوں کو پیش کر سکوں مگر یہ دنیا والے پیار کی خوب صورتی کو نہیں سمجھتے۔ محبت کا سر نہ بڑھ جاتے ہیں۔“

جیل کی بات سن کر میں نے کہا ”ہاں باجی! ہماری اس دنیا میں سب ہی جہاں ہیں۔ اپنے دل کا طریقہ دوسرے کی حجامت بناتے رہتے ہیں۔ اچھا تو پھر آپ نے میڈم کو کیا کہا۔“

”میں نے انکار کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر آنے لگی تو میڈم فیروزہ نے غصے سے کہا ”تم بالوں پر نازناؤ؟ کسی دن کوئی زبردستی کاٹ کر لے جائے گا تو بھتی نظر آؤ گی۔ اس دن میڈم کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکی مگر ایک دن جب میں اسکول سے بچوں کو پڑھا رہی تھی تو بد معاشر میرا پیچھا کرنے لگے میں نے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی لٹکائی، دوا بار بار اس طرح قہقہی چلا رہا تھا جیسے خیال ہی خیال میں میرے بال کاٹ رہا ہو۔“

”ہاں! میں نے حیرانی سے کہا ”کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم نے ان بد معاشوں کو ہانپے جیسے کہا ہو؟“

”میں بھی یہی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن میں میڈم کے منہ پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ

”میں کھانے کی نہیں، تمہاری دوسری ضرورتوں کی بات کر رہی ہوں۔“

چار دس ہزار روپے کی ضرورت ہو تو مجھ سے ابھی لے سکتی ہو۔“

میڈم کی بات سن کر میرا ہاتھ کا قلعہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ میں دوا سے پورے فائدے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی کیونکہ واجد میکینیکل کالج سے فیلڈر ماسٹر ہیں۔ سعودی عرب میں انہیں پانچ ہزار روپے کی ملازمت مل رہی ہے لیکن عربی سعودی عرب لے جا رہی ہے وہ چھ ہزار روپے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میرے پاس بڑے دو ہزار روپے ہیں۔ ایک ہزار میں نے اسکول کی ہیڈ ماسٹر سے قرض لیے ہیں۔ ہزار کا بندہ دست نہ ہو سکا۔ میڈم نے فرائڈل دکھائی تو میں نے کہا۔

”آپ واقعی سہیلی بننے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ مجھے تین ہزار روپے کی ضرورت ہے۔“

”میں دوا کے اندر یہ رقم واپس کر دوں گی۔“

میڈم نے کہا ”واپس کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم تین ہزار کیا چاہو؟“

جاؤ مگر جیل پلینز اپنے یہ بال تھوڑے سے کاٹ کر دے دو۔“

میں ایک دم سے پریشان ہو کر اس کا منہ ٹکٹنے لگی وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں ”ہم آپہیں میں سنبھلاں ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے کام نہ آتے۔ ہمیں روپے کی ضرورت ہے اور مجھے ان ریشمی زلفوں کی، ہم اسی طرح ایک اور ضرورت پوری کر سکتی ہیں۔“

”مگر میں یہ بال نہیں کاٹ سکتی۔ یہ واجد کو بے حد پسند ہیں۔“

”کیا وہ پسند کرنے والا تمہاری تین ہزار روپے کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؟“

”میں اپنے واجد کے لیے ہی روپے مانگ رہی ہوں۔ اس رقم سے ان کا کچھ نہ ہو گا۔“

”اچھا تو یوں کہو۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا۔

”تم اپنے محبوب کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہو۔ دیکھو عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے کیا غلام مستقبل سنوارنے کے لیے اپنے بالوں کی قربانی نہیں دے سکتیں؟“

”میں تو اپنی جان بھی دے سکتی ہوں لیکن واجد مجھے کبھی بال کاٹنے کی بات

”مکمل نے توبت ختم کر دی ہے۔“

”مکمل ہے ہم دوسری بات کریں گے۔ کل میڈم سے مہ جہیں کی ملاقات ہوئی تھی۔
ہم نے بتایا ہے کہ تمہارا منگیتر سعودی عرب جانا چاہتا ہے شاید تمہیں اور تمہارے منگیتر
کو انڈیا لانے سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ تمہیں اخبار کے ذریعے پتہ چل جاتا کہ کچھ فراڈ
پلاٹوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر انہیں غیر قانونی طریقے سے لالچ میں لے جاتی
ہیں اور کن دیر ان محرام میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہیں۔“

مکمل نے کہا ”ہاں میں نے یہ سنا ہے مگر بوجہ کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں
ہیں۔ سب ہی فراڈ میں ہوتے۔ پھر یہ کہ وہ مرد ہو کر انجانے خطرات سے ڈر جائیں تو
کی ایک شاندار مستقبل نہیں بناسکیں گے۔“

”لیکن جیلہ! اگر میں ایسے انتظامات کر دوں کہ خطرات کا شہ ہی نہ رہے اور ایک پیسہ
نہایت کے فیصد بوجہ وہاں پہنچ کر سات ہزار روپے ماہوار کمائے لگے تو کیسا ہو؟“

مکمل نے بڑی بے یقینی سے پوچھا ”سات ہزار روپے ماہوار؟ مہ! مجھے یقین نہیں
آتا کہ یہ ملازمت کس طرح دلوائیں گے؟“

رکیش احمد ندوی نے فخریہ انداز میں کہا ”مکمل ایسٹ میں میرا سب بڑا کاروبار ہے میں
مہ سے تقریباً کالیفرنڈوں گا۔ واعدہ کے یہاں سے جانے کے تمام اخراجات میں برداشت
لوں گا۔ تمہاری قسط کے لیے واپسی کا ٹکٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر وہ
اڈا اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ تو وہ کسی وقت بھی بہ آسانی واپس آسکے گا۔ اور کوئی
فریب نہ ہوگا؟“

مکمل ہنسی طرح الجھ کر رہ گئی۔ بچپن سے جن بالوں کو اپنا غور بناتی آئی تھی، میں انہیں
بوسے لے کر اپنے ہاتھ پر شکن لائے بغیر کٹوا سکتی ہوں مگر ایک خوف میرے دل میں ہے
کہ میں ان کے بغیر واعدہ کو الوداع کہنے اور پورٹ جاؤں گی تو ملاقات کے آخری لمحے اور
ہاتھ کی ہلکی گھڑی میں میرے پاس ایسا کوئی حسن نہیں ہو گا جسے وہ آنکھوں میں سجا کر لے
جائے۔ میں بہت جلد بھولنے والی چیز بن جاؤں گی۔ کوئی عورت نہیں چاہتی کہ اس کا
پہلے والا انکھوں سے اوچھل ہوئے ہی اسے بھول جائے۔ میں کیا کروں؟ اپنی محبت کو
اڈا کر کے کے لیے میرے پاس صرف زلفوں کی ذخیرہ ہے۔

صاف مگر جائیں گی۔ بہر حال میں نادان بچی نہیں ہوں کہ ان بد معاشوں سے کچھ
بال کٹوا دیتی۔ میں نے چلتے چلتے راستہ بدل دیا۔ گھر جانے کے بجائے اس رات پڑ
جہاں آگے ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ان بد معاشوں کے قدم سب بڑے جیلہ
پولیس اسٹیشن کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے
بھاگتے چلے جا رہے تھے۔“

”یہ آپ نے بڑی عقلمندی کا کام کیا باجی! لڑکیوں کو اس حد تک کچھ
چاہیے۔“

جیلہ نے کہا ”اس دن کے بعد وہ بد معاش دوبارہ نظر میں آئے لیکن اس بار
مجھے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں رگاڑا پھر لوگ کیوں میری ذرا نیو
کو کاٹ کر پھینکنا چاہتے ہیں۔ کسی کی ناک کاٹ کر کسی کے منہ پر تیراب پھینک کر
کے سر سے بال فوج کر کیوں بد صورت بنایا جاتا ہے؟ اور دوسروں کو بد صورت
انسان کیسی غیر انسانی سرسٹیں حاصل کرتا ہے۔ ابھی صبح کے وقت میں یہاں آؤں
رکیش احمد ندوی نے میرے قریب اپنی کار روک دی۔ کار کی اگلی سیٹ پر ان کے
جیس پر قہقہہ پسینے نقاب الٹائے بیٹھی تھی۔ وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”جیلہ! باجی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کار میں آجاسیے ہم آپ کو پہنچا دیں گے
اب بڑے آدمیوں کی مہربانیاں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہ
چھو کر بھی میرے بالوں کے پیچھے پڑ جائے گی۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے انکار
احمد ندوی بھی التجا کرنے لگے کہ میں مہ جہیں کی بات مان لوں۔ مہ جہیں نے ان
کو خوشامد انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ وہ بھی کار کی پہلی
میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بیٹھتی ہی بولی۔

”اللہ باجی! آپ کے بال کتنے خوب صورت ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں بہت خوش
ہوں۔“

”لیکن میں اپنے بال نہیں کٹواؤں گی۔“

میری صاف گھڑی پر پہلے تو وہ دونوں چونک گئے۔ پھر رکیش احمد ندوی نے
کہا ”دش آل رائے! ہم کسی اسٹیک بار میں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے

رب پٹے گئے تو میں سولہ تارخ کو بال کنوائے یہاں آجاؤں گی۔"

دوسرا حکم کر جانے لگی۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی موت کا دن اور تارخ مقرر کر کے جاری ہو۔ بارہ ماہ سردی نے پوچھا۔

"اپنی آپ سولہ تارخ کو صبح کو آئیں گی یا شام کو؟"

دشام کو آنے کی بات کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماہ سردی نے میرے قریب آکر ہنسی سے کہا۔

"یہاں آنے والی خواتین کے لیے یہ خیر بے حد دلچسپ ہوگی۔ آج سے ہم ہر خاتون کے سامنے منگھو کے دوران سولہ تارخ کا ذکر ضرور کریں گے مگر یہ نہیں بتائیں گے کہ جیلہ کنائے کی یا شام کو۔"

"ہبائے نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت فرق پڑے گا۔ تم نہیں جانتے یہ برٹس پالیسی ہے سولہ تارخ کو دیکھ لینا اور تین ماہ صبح سے آکر بیٹھ جائیں گی۔ کوئی بال کنوائے کوئی بالوں کے اسٹائل میں پہنچانے یا ہیر کرک کے لیے یا وگ سیٹ کرانے کے زمانے یہاں جیلہ کو دیکھنے آئیں گی لہذا اس روز ہماری چاندی ہوگی۔"

میں سمجھ گیا۔ کچھ خواتین اسی لیے آئیں گی کہ انہوں نے جیلہ کے بالوں کے لیے کوئی کوئی بولیاں دی تھیں اور جیلہ نے انکار کیا تھا۔ اب وہ طے دینے یا چکے چکے بننے آئیں گی کہ اسے آخر کتنا پڑا۔ کچھ اس کی صورت دیکھنے آئیں گی کہ وہ بال کنوائے کے بعد کبھی بد صورت لگتی ہے۔ اپنی خوب صورتی پر ناز کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ بال کی بد صورتی کا تماشا نہ دکھا جائے۔

جب وہ دن گزر گیا اور دکان بند کرنے کا وقت آیا تو ماہ سردی دن بھر کی آمدنی کا حجب کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

"مے سڑا صبح تمہاری باتیں اور صوری رہ گئی تھیں۔ تم شینہ کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

ماہ سردی آمدنی کا حساب بھول گیا۔ نوٹ گنتے گنتے شینہ کے نام نے گنتی بھلا دی۔ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیلہ باقی!"۔ مہ جیہ نے کہا "آپ گھبراہٹی کیوں ہیں؟ بال کانٹے کے بعد ہاتھ کتنے ہیں۔ جب آپ کے واجد صاحب سال دو سال بعد واپس آئیں گے تو بے گلاب میں پھر کی حسن اور گھمار پیدا کر چکا ہوگا۔"

"میں اپنی پریشانی کسی کو نہیں سمجھا سکتی۔ ایک شرط پر تمہاری بات مان لی کہ یہ کہ جس دن واجد یہاں سے جائیں گے۔ اس کے دوسرے دن میں نہیں یہ بال کنوائے دے دوں گی۔"

"ڈن!"۔ مہ جیہ نے خوش ہو کر رئیس احمد فدوی سے کہا "کیوں ڈارلنگ؟"

"میں ہنسی اٹاؤں"۔ رئیس احمد فدوی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ میں حیرانی سے دونوں کا منہ دیکھنے لگی، کیونکہ میں انہیں باپ بیٹی سمجھ رہی تھی وہ ایک دوسرے کو ڈارلنگ اور ہنسی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا "معاف کیجئے گا! میں کہتی ہوں کہ آپ دونوں میں رشتہ کیا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ یہ میری جان سے زیادہ عزیز شریک حیات ہے۔"

"اور یہ میرے سر تاج ہیں۔" مہ جیہ نے کہا۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چودہ برس کی بیوی ساٹھ برس کا شوہر۔ دونوں کا اس رشتے کا تعین نہیں آتا، مگر یہ سوچ کر یقین کرنا پڑا کہ اتنی کم سن بیوی کو خوشی کے لیے ہی ایک بوڑھا خاوند میرے بالوں کو اتنے منگھے داموں خرید رہا ہے اور مارڈن ہونے کے باوجود اپنی بیوی کی کم سن چھپانے کے لیے اسے برف پستانا رہا۔ انہیں باپ بیٹی نہ سمجھیں جبکہ ہم بھی سمجھ رہے تھے۔

جیلہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر کے لیے چپ سی لگ گئی۔ بھی کیا کہتے تھے۔ قانون کے مطابق لڑکی سولہ برس سے کم ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا۔ احمد فدوی جیسے ساٹھ برس کے دولت مند چودہ برس کی تو کیا چار برس کی لڑکی کا بیانیس تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ جیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے چہرے پر افسوس ہوئے آئینے میں دیکھنے لگی۔ تھریڈنگ کے بعد اس کی سانولی رنگت گھر آئی گئی۔ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"مگر رئیس احمد فدوی کے وعدے کے مطابق واجد اس ماہ کی پھر نہ آئے گا۔"

دنی پرے لے کتنی بڑی گالی بن گئی ہے۔ اسی لیے اب میں تمہیں گالی نہیں دے رہا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کر رہا ہوں اگر تمہارا کوئی خط کسی کے ہاتھ لگ جائے تو شینہ خواہ خواہ دبا دیا جائے گی۔ اب بھی ہم اسی امید پر رہتے جا رہے ہیں کہ کبھی تو ہماری برادری میں سے کوئی شینہ کو اپنی رلمن بنانے کے لیے آئے گا۔ خدا کے لیے ہمیں اس امید کے سوا کچھ ہی ہے۔“

ایک بوڑھے باپ کا خط پڑھ کر میں شینہ کی عمر کا حساب کرنے لگا۔ شینہ مجھ سے ایک سال بچتی ہے میں اسے بچپن سے جانتا ہوں میں اکتیس برس کی عمر میں لندن گیا تو وہ تیس سال کی کنواری تھی اور جب لندن سے سات برس بعد اس کے باپ کو خط لکھا تو وہ ستریس سال کی ہو چکی تھی اور اب دس برس بعد آیا ہوں تو وہ چالیس برس کی کنواری اب تک برادری کے سسٹم کی بند بٹھکی میں ساکن بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔“

ماہر مزدی پھر دیوالنگ چیز پر آکر آرام سے بیٹھ گیا پھر ایک کمری سانس لینے کے بعد ”میں نے اپنی برادری والوں میں برتری حاصل کرنے کے لیے جھوٹی شان دکھائی کہ ایک انگریز قوم کی لڑکی بیاہ کر لایا ہوں لیکن اس سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میری برادری کے لوگ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ سوئی بھی اب جا چکی ہوگی اور شینہ ریم و رواج کے ذمے کنویر میں پڑی ہوئی ہے۔ ساری زندگی جدوجہد کرنے کے بعد میں خالی ہاتھ ہوں۔“

میں نے کہا ”اے سزا اگر تم پہلے ہی ہماری برادری میں کسی لڑکی سے شادی کر لیتے تو یہ لڑکی اور ابھی نہ ہوتی۔“

”یہ تو سی بات ہوئی کہ گھر میں روٹی کھالیتے تو باہر بھوکے نہ مرتے۔ لیکن محبت ایک لڑکا کا گھرا تو نہیں ہوتی کہ گھر کے چولے پر بی پک کر پیٹ میں اتر جائے۔ محبت تو کیسے لگ ہو کتنی ہے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی برادری ہو، کوئی بھی مذہب ہو وہ محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنا اجلا پن قائم رکھنے کے لیے ریم و رواج کی چار دیواری پر غلبہ بھرتے رہتے ہیں ان کے گھروں کی بوڑھی کنواریاں اپنے سفید بالوں کو گنتی رہتی ہیں ان کے باوجود میں کہوں گا کہ محبت کی حرارت جو ان ہوگی اور مجھے سدا جو ان رکھنے کے لیے بڑیاں کٹنی ہے کہ وہ میرے لیے کنواری بیٹھی ہے۔“

”شینہ ایک تحریک ہے جو محبت کے نام سے میرے اندر پیدا ہوئی۔ اس نرگس مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اس اونچے مقام تک پہنچایا۔ جب میں لندن میں اپنی ملازمت چھیننے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اب شینہ کے والد کو فٹ ہو جانا چاہیے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے، میں نے انہیں بڑی عاجزی سے لاکھ انہیں سمجھا یا کہ میں اپنی محنت سے کس مقام پر پہنچ رہا ہوں۔ اگر اشرف انکوئی کے لیے محنت اور ایمانداری لازمی ہے تو مجھے اشرف اور سختی سمجھ کر شینہ کو انعام کے پر میرے نکاح میں دے دیں۔“

اس نے نوٹوں کو سمیٹ کر جب میں رکھنے کے بعد کہا ”انعام میں یہ کاغذ کے ٹکڑے مل جاتے ہیں مگر محبت نہیں ملتی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے خط کا جواب آئے گا۔ آئے گا بھی تو اس میں میرے لیے غصہ بھری گالیاں لکھی ہوں گی لیکن خلاف توقع باپ نے بڑی عاجزی اور نرمی سے لکھا کہ میں اسے رشتہ مانگنے کے لیے خط لکھ کر اپنی کوبہ نام نہ کروں۔ اس نے اپنے خط میں مجھے بتا کہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”بیٹے! شینہ جب سے جوان ہوئی تب سے ہم اسے ساکن بنانے کے خواب رہے ہیں۔ خواب اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اپنی برادری سے باہر ہم اس کی شادی کر سکتے۔ جب میں دولت مند تھا۔ ان دنوں شینہ فی بی کی مریضہ تھی۔ اس کے برادر برادری کے کتنے ہی نوجوانوں کا رشتہ آنا تھا لیکن ہم پہلے اس کا علاج مکمل کر لیا تھا لہذا رشتہ مانگنے والے شینہ کی صحت یابی کا انتظار کرتے تھے۔ اسی انتظار میں وہ بیمار کی ہو گئی، ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہمارا اسکے گھر ہے کتنی برس کے بعد ہاتھوں ہاتھ بی جا جائے گی۔

مگر اچانک ہی کاروبار میں ایسا نقصان ہوا کہ گھر کا سامان بکتے لگا۔ شینہ فوٹ ہو گئی مگر غریبی کا دوگ لگ گیا۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ غریبی اس دنیا کی سب سے اور چھوٹ کی بیماری ہے۔ رشتہ مانگنے والے شینہ کی فی بی سے نہیں بھاگتے تھے کہ سے گھبرا کر بھاگ رہے تھے۔

ایسے وقت تم رشتہ مانگتے آئے تو میں غصہ سے پاگل ہو گیا۔ میں نے تمہارا زعم میں گالی دی۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اپنی ہی برادری والے

کے ساتھ رہیں اور رئیس احمد فدوی بھی تھے۔ ہم نے وقت ضائع نہیں کیا۔ جیلہ پانچ کے سامنے بیٹھ گئی تو ماسٹر رمزی نے اس کے بالوں کو شانے کے نیچے ایک فیتے پٹوہ دیا۔ یونی پارکر کی محدود فضا میں کمری خاموشی چھا گئی۔ جہاں ہمیشہ عورتوں کو پھرت ہوتا تھا۔ وہاں ایک عورت کو اس کی اگلی خوب صورتی سے محروم کر کے روت دیا جا رہا تھا۔

مڑے ہوئے فیتے کے نیچے بالوں پر قبضی چلنے لگی۔ کرر کرر کرر کی آواز سے قبضی کے ریشمی دل کو کاٹتی جا رہی تھی۔ آئینے میں ماسٹر رمزی، ہم جہیں اور رئیس احمد جیسے کئی ہی قاتلوں کے چرے نظر آ رہے تھے ذرا سی دیر میں کٹے ہوئے گیسو آئینہ بنے۔ اس طرح بچھا کر رکھ دیئے گئے جیسے جیلہ کی لاش رکھی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر پتلیاں اٹھاتے دیکھا تو دیکھا نہ کیا۔ جولا کی مردہ ہو کر بھی زندہ رہے وہ بڑی بھیاں نظر آتی تھیں۔ اب اپنے مشاہدے کو کلام میں لائیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ بالوں کو اٹھانے سے یا ان کا اشکال بدلنے سے چرے کس طرح بدل جاتے ہیں۔ جیلہ کا یہی خاکہ چرے کی جوانی اور تازگی مرگئی تھی۔ اب وہ کم عمر و شیزہ کے بجائے عمر رسیدہ زندگانی دے رہی تھی۔ گھٹائیں چھٹ جانے کے بعد آسمان نکلا ہو جائے تو دیکھنے کے لوگوں میں رہ جاتا۔

اب ایک کر کے سارے قماشائی چلے گئے۔ ماسٹر رمزی نے رئیس احمد فدوی کو سمجھا کر دیکھنے کے دوران بہت سے بال ضائع ہو جاتے ہیں لہذا اتنے بالوں سے صرف ایک دو تار ہو سکے گی۔ ہم جہیں نے اس بحث کو طول نہیں پکڑنے دیا۔ وہ ایک ہی لے لے لے راضی ہو گئی کیونکہ ایک ہی دوگ سے اس کی ضد پوری ہو رہی تھی۔ وہ اپنے باغیچہ کو لے کر چلی گئی۔ جیلہ اس وقت بھی گم سم آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو دیکھ رہی تھی۔

”ایمانی! میں نے تو وہ چونک گئی۔ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ہم نے تمام بچیاں بچاویں۔ تمام آنے لگیں۔ اندھے ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو پھر انہیں انسانی چروں کی بصیرت حاصل ہو گئی۔ بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی سولہ تاریخ آگئی۔ اس صبح سب سے پہلے پانچ آنہیں اور ماسٹر رمزی سے خوش آمدانہ انداز میں کہنے لگیں۔

”ماسٹر! تم بہت بڑے سن آ رہو اگر چاہو تو جیلہ کی لائی زلفوں سے لاگو کرنا ہو۔“

”مشکل ہے میڈم! جناب رئیس احمد فدوی صاحب نے زلفوں کا پورا لانا نہیں ہے۔“

”خریدنے سے کیا ہوتا ہے تم ان سے کہنا کہ ایک ہی دوگ تیار ہوگی۔ میں نے پانچ ہزار روپے دیئے ہوں۔ تم ان کے علم میں لائے بغیر وہ سری دوگ تیار کرنا۔“

”وہ اپنے پرس سے روپے نکال کر منٹے لگی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔
”آپ اور ہم جہیں ہماری مشعل گاہک ہیں اگر ہم جہیں نے آپ کو جیلہ دوگ میں دیکھ لیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی۔“

”تم فکر نہ کرو“ اگر کبھی اس نے دیکھ لیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں نے دوسرے ملک سے منگوائی ہے، کیا اتنی بڑی دنیا میں جیلہ جیسے بال اور کتا جاسکتے؟“

وہ پانچ ہزار کی رقم ماسٹر کے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئی۔ یہ اگرچہ ہم جہیں ہوتی مگر بے ایمانی کہاں نہیں ہوتی؟ جیلہ سے کب ایمانداری کا سوا ہوا ایمانی کو جائز اور وقت کا تقاضا ثابت کرنے کے لیے اسی طرح سارے ایمانوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

شام تک عورتیں آتی رہیں اور جیلہ کے انتظار میں ہماری تکیاؤں شام کو وہ آئی تو اس کے لیوں پر اواس اواس مسکراہٹ تھی۔ اواس اواس! واجد جاچکا تھا اور مسکراہٹ اس لیے تھی کہ وہ اپنے محبوب کے لیے قربانی

”بچ چلے گئے؟“

”ہاں بانی! سب چلے گئے۔“

”کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا؟“
 بڑا ہی زہریلا سوال تھا۔ مطلب نکل جانے کے بعد کون پہچانتا ہے۔ ہم بے شک اس کا منہ کھٹکے گئے۔ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی ”اب میرے چہرے سے میرا عمر کا پتہ چل رہا ہوگا۔ میں پورے اکتیس برس کی ہوں۔“
 یہ کہہ کر اس نے اپنے پنڈ بیگ میں سے برقع نکالا پھر اسے پہننے لگی۔ برقع پہننے کے بعد وہ اپنی ٹھیکہ داری میں سمجھ میں نہیں آیا کہ برقع میں چھپنے والی نے اپنی ٹھیکہ داری چھپائی اگر وہ نہ بتاتی تو ہم اسے زیادہ پختیس برس کی کنواری سمجھتے مگر ہمارے سمجھانے کے لیے اکتیس کا ہندسہ ہمارے ذہن میں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

”مے سڑا یہ اچھا نہیں ہوا۔ جیلہ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے میرا سر موڑنا گیا ہو۔ چاری کو بد صورت بنا کر دنیا والوں کو کیا ملا؟“

”کسی کو بکاؤ کا ایک عجیب طرح کی سرسٹیں حاصل ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ تنہا ابتدا سے پہلے انسان ہنستا نہیں جانتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کسی بات پر ہنس کر شخص کے چہرے پر کالک مل دی۔ اس کا لکڑہ چہرے کو دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ کسی پر کچھڑا چھال کر یا بد صورت بنا کر اس کے پڑے اندر کرنا اپنے مقام سے گرا کر خوب ہنسی آتی ہے۔ آج تک جتنے چٹکے یا لطفے گھڑے گئے ہمارے غور کرو تو پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حماقتوں کی تشبیہ کر کے اس کی بد صورتی پیش کر کے یا اس کی توہین کر کے دوسروں کو ہنساتا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوتا ہے جن میں عورتوں کی توہین کی جاتی ہے۔ بے شک ماؤں کے متعلق لجنہ کو گئے ہوں گے عمر وہ قاتل اشاعت اس لیے نہیں ہوتے کہ انسان اس سے پید ہو رہا ہے۔ ان کا دودھ پیتا ہے۔ بس اسی مقام پر ہماری خود غرضی کا ثبوت مل جاتا ہے۔“

ماسٹر مرزی بڑے موڈ میں بولتا رہا۔ وہ اس لیے اچھے موڈ میں تھا کہ اس روز زیادہ کمائی ہوئی تھی۔ میڈم فیروزہ سے جو پانچ ہزار کی ادائیگی ہوئی تھی اس کی وجہ سے مجھے پانچ سو روپے کر بولا ”جاؤ صبح کرو اور یہ نہ سوچو کہ ایک کو فوج کرنے سے سب کچھ ہو جاتی ہے۔“

ماسٹر مرزی بڑے موڈ میں بولتا رہا۔ وہ اس لیے اچھے موڈ میں تھا کہ اس روز زیادہ کمائی ہوئی تھی۔ میڈم فیروزہ سے جو پانچ ہزار کی ادائیگی ہوئی تھی اس کی وجہ سے مجھے پانچ سو روپے کر بولا ”جاؤ صبح کرو اور یہ نہ سوچو کہ ایک کو فوج کرنے سے سب کچھ ہو جاتی ہے۔“

”میڈم کیا کر رہی ہیں؟“
 ”میں انکار کر رہی ہوں۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

لہذا لو عمر کی ان کے ہونٹوں کی لمبورنگ لالی بتا رہی تھی کہ وہ اپنے گیارہ برس کے بچے
نہیں کر سکتی ہیں۔

میں نے سنگار میز کے پاس پہنچ کر پلاسٹک کی ڈبی پر سے کپڑا ہٹایا۔ اور جیلہ کے بالوں
دل لک کے سامنے رکھ دی۔

”اگلی تھی خوب صورت دگ ہے۔“ وہ بالوں پر ہولے سے ہاتھ پھرتے ہوئے
کہا۔

”پلاسٹک کی ڈبی پر یہ بال اتنے خوب صورت لگ رہے ہیں، جانے میرے سر پر
باجوڑی کونسی گے چلو اسے جلدی سے سیٹ کر دو۔“

اس لمبے میڈم مجھے پلاسٹک کی ڈبی نظر آئیں۔ جو صرف کرائے کی خوب صورتی سے
دل لگاتی ہے۔ میں نے اس دگ کو اٹھا کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ احتیاط سے سیٹ

نے لگا۔ جیلہ کے سیاہ بالوں کا کنن پرستانے لگا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ بار بار آئینے میں
بالوں کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔

”کون مجھے دیکھتے ہی دیوانہ ہو جائے گا۔“
”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو تمہارے سیلون میں آتا ہے۔ آج بھی آیا تھا میں نے اسے چوبیس آنے کے
بالکے۔ جب بھولا بھالا سا جوان ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے اسی لیے

میں تک اس کا نام نہ پوچھ سکی۔“

”اس کا نام بھکڑو ہے۔“ میں نے کہا ”یعنی فخر الدین محمد خود اپنا نام صحیح طور پر ادا
کر سکتا۔ اپنے آپ کو بھکڑو کہتا ہے زرا جاہل ہے۔“

میڈم نے آئینے میں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر شاید خیال آیا کہ گھور کر دیکھنے سے
انہوں کا ایک لب تیز جائے گا، ابھی ابھی جو مصنوعی پلکیں لگائی ہیں وہ اپنی جگہ سے ڈھیلی

پڑاؤ کی طرح ہلکتی ہے بولیں۔

”اگر وہ جاہل ہے تو تمہیں اس کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔ میں اسے پڑھاؤں گی،
لوگوں کو سوسائٹی کے قائل بنائوں گی۔ جب وہ عمدہ سا سوٹ پہن کر میرے ساتھ کار میں

لوگے گا تو ساری دنیا حاسد بن کر ہمیں دیکھتی رہے گی۔ شاید میں اب تک اسی لیے

”تو پھر تم ہی یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کچھ تو وقت گزرے گا۔ یہ جتاؤ کیا میڈم انہوں
کو کسی میں تمہارا ہتی ہیں؟ مجھے یہاں کوئی ان کا رشتے دار نظر نہیں آ رہا ہے۔“

ملازم ایک ٹھنڈی سانس لے کر قائلین پر بیٹھ گیا، پھر کہنے لگا۔
”میڈم کسی رشتے دار کو یہاں بغیر اجازت آنے نہیں دیتیں۔ انہیں تمہارے نمبر

آتا ہے۔“

”کیا انہوں نے کبھی شادی نہیں کی؟“
”بارہ برس پہلے ان کا ایک شوہر اور ایک بچہ تھا۔ شوہر غریب تھا مگر غیرت مند غلام

میڈم کو منع کرتا تھا کہ وہ کلب وغیرہ نہ جایا کریں۔ اس بات پر آئے دن جھگڑے ہوتے
رہتے تھے۔ وہ ایک غریب شوہر کو حکمران کی حیثیت سے برداشت نہ کر سکیں۔ طلاق لے

انہیں یہاں سے نکال دیا۔“
”اور بچہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی اپنے باپ کی گود میں چلا گیا۔ پتہ نہیں وہ باپ بیٹے کہاں چلے گئے۔ چار
گیارہ برس کا ہو گیا ہو گا مگر میڈم کی آنکھ سے کبھی اس کے لیے آنسو کا ایک قطرہ نہیں

پہ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ کوئی ماں ایسی سنگدل بھی ہو سکتی ہے۔“
میں نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تنہائی میں اپنے بچے کو یاد کر کے روتی ہو۔ عورت کب نا
خالی نہیں ہوتی۔“

”بھئی آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ جو عورت اس عمر میں بھی سنگار جیز کا
اپنے ہی آپ کو دیکھتی رہتی ہو وہ کسی عاشق کے بارے میں تو سوچ سکتی ہے کہ بچے

بارے میں سوچ کر بوڑھی نہیں بن سکتی۔ میں اپنی زبان بند رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر بڑا
نکل گئی تو۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میڈم نے بیڈروم سے آواز دی کہ مجھے اور
دوا جائے۔ میں اندر پہنچا تو ان کی خواب گاہ تیز قسم کی دلاجاتی خوشبو سے منکھ

میڈم نے جوانی کا ہر رنگ اپنے اوپر لینے پونے کے لیے بڑا کمر ایک اپ کیا تو
بڑھاپے سے جوانی کی طرف آنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں نہ لوگوں

کنواری تھی کہ مجھے فخر الدین جیسا محبوب ملنے والا تھا، بلکہ ملنے والا ہے۔
مجھے بڑا غصہ آیا، کم بخت ہمیں اندھا سمجھتی تھی کہ ہم اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ
نہیں ہیں۔ اس کی عمر اور اس کے جموٹے کنوارے پن کو نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے
محفل سے پوچھا۔
”اگر آپ فخر الدین سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں پیشگی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔“
وہ فوراً ہی بوڑھی دادوں سے جوان لڑکیوں کی طرح شرانے لگیں۔ میں نے کہا
”فخر الدین آپ سے زیادہ شرمیلا ہے اگر آپ بھی شرانیں گی تو ہجرت آنے لگی۔“
بڑھ گئی۔ آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں۔“

انہوں نے بدستور شرانے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے پھر کہا ”تپاؤ
جوڑا بڑا ہی رونا ناک ہے، بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزرے گی۔ پھر آپ ایک بچے کی
بن جائیں گی۔“
”اے سب سب۔۔۔ بچہ۔۔۔“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں، اچانک ہی گماہ بری چلا
پسند ان کی نگلیں میں پڑ گیا۔ اگر کوئی سنگدل ماں ہو، اس کے دل میں بچے کی یاد اور آنکھ
میں آنسو نہ ہوں، تب بھی زندگی کے کسی موڑ پر ایک لمحے کے لیے اس کی گونگی
ضرور اٹھتا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے میڈم کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوا تھا۔
ہی لمحے وہ منبھل کر مسکرانے لگیں۔ اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی بکھرالہ
لڑکا ملے آیا ہے۔ وگ ان کے سر پر سیٹ ہو چکی تھی وہ دائیں بائیں محوم کر آئینہ منڈ
ہوئی بولیں۔

”وٹڈر فل۔ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ خود پر مرٹھے کوئی چاہ رہا ہے۔ اب نذرانگی
روم میں بیٹھو، اگر بیشک میں دوبارہ گزیر ہوئی تو میں تمہیں بلاؤں گی، مگر نہ کوئی
نقصان نہیں ہو گا میں ذیل معاوضہ دوں گی۔“
میں نے ڈرانگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ملازم فخر کو خواب گھکی لڑا
لے جا رہا تھا۔ میں نے فخر کی عمر کا حساب لگایا۔ وہ بیس بائیس برس کا جوان ہو گا۔
آدمی عمر سے بھی کچھ کم ہو گا۔ مگر اس وقت یہ صداقت نظر آ رہی تھی کہ شرمیلی
سے اندھا ہوتا ہے۔

ملازم نے فخر مجھ سے چائے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ وہ کسی کام سے
لوٹی کے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھی کی دیرانی اور سانے میں یہ جتن
ہٹنے لگا کہ میڈم کی خواب گاہ میں کیا ہو رہا تھا؟ مجھے وہ تماشا دیکھنا چاہیے، اگرچہ یہ
بڑا نکاحی حرکت ہوگی لیکن خواب گاہ میں کون سے اخلاق کا مظاہرہ کیا جا رہا ہو گا؟ تھوڑی
برک میں نے خود کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ
لہ ڈرانگ اور بیڈ روم کے درمیان ایک کارڈور تھا۔ جب میں کارڈور میں پہنچا تو
دب گاہ کا دروازہ بند نظر آیا۔ مگر کڑی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے میڈم کی آواز منتشر
آ رہی تھی۔

”تم بہت شرمیلے ہو۔ میں چار ماہ سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آگے بڑھو گے، کچھ بولو
گے، انہیں نے تمہیں بلایا ہے تو تم یہاں تک آئے ہو۔ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟“
میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کی آڑ سے دیکھا سانس ہی ایک صوفے پر
پام ٹھو کے ساتھ پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی اور خرواہل کل سنا ہوا سا کہہ رہا تھا۔
”حق ہاں ڈر لگتا ہے کیونکہ میں گریب ہوں اور آپ۔۔۔“
میڈم نے فوراً ہی بات کاٹ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”ایسی بات نہ
دو اگر تم غریب ہو تو میں غریب پرور ہوں۔ میں تمہیں اچھی طرح بولنا سکھاؤں گی۔
میں ایک سے ایک عمدہ لباس پہناؤں گی، میری دولت تمہاری ہوگی۔ میں بھی تمہاری
دائیں ہاتھ سے آپ کو چھوٹا سمجھتا چھوڑ دو۔“
چھوڑ دوں گا میں کیا کروں۔ بچپن سے مجھے محبت نہیں ملی۔ میرا باپ شرابی، جواری
اور بی بی بی بی بی پر غلم کرتا تھا۔ غلم کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے وہ برداشت نہ کر سکی۔
بہنیں بدو برس کا تھا تو وہ مر گئی۔ اس کے بعد میں گھر سے بھاگ گیا محبت کی تلاش
لہ۔“
نہ تو کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولی ”تم بہت دکھی ہو، میں تمہارے دکھ
بریل کی۔“
”آپ بڑی مہربان ہیں۔ پہلے ہی دن آپ کو دیکھا تو ایک دم سے اپنی اسی کا چہرہ سامنے
آگیا، بڑا نا تھا کہ میں گریب آدمی ہوں اور آپ۔۔۔“

لی سکیں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پر ایک ٹیم عیساں حسین عورت
لڑاکم کے زانو سر سر رکھے لیٹی ہوئی شراب کے بھرے ہوئے جام کی طرح چٹک رہی تھی
اور منہ پر جواہی کے خالی جام سے آنسو چٹک رہے تھے۔

تب ریکارڈ پلیئر سے ایک خاص میوزک کی ترتیب کے ساتھ قہقہے سنائی دینے لگے۔
بڈم بوکلا کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے دنیا والے ان پر ہنس رہے ہوں۔ اس
وقت صاف طور پر ان کا چہرہ نظر آیا۔ آنسوؤں سے کابل دھل کر رخساروں پر کالک پھیلا
ہاتھا۔ سنوئی پٹلیں جھنجھکی تھیں آنکھوں کا شاعرانہ حسن مرگیا تھا۔ ہونٹوں کی سرخی
ٹل گئی تھی۔ چہرے کے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو گئے تھے جیلہ کے بال سر سے اڑ گئے
نہ کی سے بیک نامک کر خوب صورتی لاؤ یا بیوٹی پارلر سے خریدو وہ زیادہ دیر تک ساتھ
نہ رہتی۔ جو اصل چہرہ ہے وہ بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اٹھک سی وہ اپنے خضاب رسیدہ بالوں کو لمبی میں جکڑ کر قہقہے لگانے لگیں۔ ریکارڈ
پلیئر کی موسیقی سے ابھرنے والے قہقہوں کے پیش منظر میں وہ ایک چیل کی طرح سی ہی
ہی ہستی جاری تھی "سی سی سی۔ جوانی جاتی ہے تو چھڑاتی کیوں نہیں " سی سی سی اور جب
نہا نہیں ہے تو چھڑ جاتی کیوں ہے۔ سی سی سی میں نے اپنے بچے کی محبت کا گلا گھونٹ دیا
اگر کوئی مجھے بچنے والی نہ سمجھے۔ سی سی سی میں نے شوہر کو چھوڑ دیا تاکہ کنواری نظر آؤں۔
میں بڑی ہوں، شوہر سے خالی۔ سی سی سی میں میں ماں ہوں بچے سے خالی۔ میں کنواری ہوں،
دہلی سے خالی۔ سی سی سی اری اور حرام زادی جوانی! میری ساری دولت لے کر ایک بار ایک
لے کے لیے آجا۔ نہیں تو چھو کرے ماں کہہ کر گالی دیتے رہیں گے۔"

میڈم کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا۔ اب اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ میں ان
سے معاوضہ مانگوں گا تو وہ مجھ سے جوانی مانگیں گی جبکہ ہم بیوٹی پارلر میں بیٹھ کر ممنوعی جوانی
فوت کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ عارضی طور پر کسی کو جوان بنا کر اس کے
جہاے کا فائدہ لیں مگر غم لپکا کہاں ہوتا ہے وہ تو بوجھ بننے بننے پاگل بنا دیتا ہے۔ میں اس
پاگل مہرت کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

اس دن کے بعد میڈم نے ہماری دکان میں آنا چھوڑ دیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہاں
نہ رہا ہو گا۔ فخر بھی میڈم کے ڈر سے ہماری دکان کا راستہ بھول گیا۔ ہمیں گاؤں

میڈم گھبرا کر پولیس "یہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو؟"
"اب میں بکواس نہیں کروں گا۔ خود کو چھوٹا نہیں سمجھوں گا۔ مجھے اپنے بچے
لگا بیٹھے امی۔"

زنان کی زوردار آواز کے ساتھ فخر کے منہ پر طمانچہ پڑا۔
"سور کے بچے! مجھے اسی کہتا ہے۔ کیا میں تجھے بوڑھی نظر آتی ہوں؟ دیکھ لے کٹلی
تیرا منہ لوچ لوں گی تیری زبان جلا دوں گی۔"

وہ غصے کی شدت سے بچ بچ اس کا منہ نوچنے لگیں۔ اس کے بالوں کو لمبی میں جکڑ
جھٹکے دینے لگیں۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے اوہرا اوہریوں ہی ہاتھ جلا رہا تھا کہ ہاتھوں کی انگلی
اگر جیلہ کے بالوں کی دگ گر پڑی تھی، طبل کا باریک کرتہ پھٹ رہا تھا، چہرے سے بلب
اب کا پلاسٹر اکھڑ رہا تھا مگر میڈم کو ہوش نہیں تھا۔ وہ پاگل ہو رہی تھیں۔

"دیکھ لے گا چھو کر باقی کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ اپنی حیثیت سے اونچا اڑنے
کے کتے کیلئے۔ اتنے دنوں سے تو مجھے ماں سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں تیری آنکھیں پھوڑا
گی۔"

ماں کی بجلی سے بڑی اور کوئی بجلی نہیں ہوتی۔ فخر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس
ماں کہہ کر کون سی بجلی دے دی ہے۔ اگر اسے اتنی ہی عقل ہوتی تو وہ ایک دولت مند
زورہ عورت کے چہرے پر اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھتا۔ ماں سے مشابہت رکھنے والا چہرہ تو
بستی میں تلاش کرنا۔ بہت دیر تک مار کھانے کے بعد آخر اس نے بوکلا کر میڈم کو
دیا۔ وہ صوفے پر گر پڑیں۔ وہ بھانسا ہوا خراب گاہ سے باہر کارڈور میں آیا۔ مجھے دبا
ایک ذرا ٹھنک گیا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے جھلکی ہوئی تھیں۔ چہرہ
لاٹے ناخنوں کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔

اس کے گالوں اور ہونٹوں پر جا بجا خون کے ننھے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ہال
کے بجائے سرخ لبوں کے پوسے نظر آتے تھے اگر وہ صرف ماں نہ کہتا "محبوب کہہ
وہ اپنے چہرے کو پونچھتا ہوا ہواں سے بھاگ گیا۔ میں پلیٹ کر کھڑکی کے پار کچے
وہ صوفے پر جس انداز میں مری تھیں "اسی طرح پڑی ہوئی دونوں ہاتھوں سے منہ جھا
رہی تھیں۔ دہر ایک ریکارڈ پلیئر سے انگریزی گانے کی دھیمی دھیمی آواز ابرار

فریادوں، باہ بعد ایک دن اچانک ہی جیلہ آگئی۔ میں اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ سڑمڑی نے اسی وقت دکان کھولی تھی اس لیے کوئی گاہک نہیں تھا۔ صرف وہ تھی اور ہم تھے۔ دوسرے گاہکوں کے آنے تک اطمینان سے باتیں کر سکتے تھے۔ میں نے آئینے کے سامنے ایک ربوہ لونگ چپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئیے باجی! آپ ایک مدت کے بعد آئی ہیں۔“

”ہاں“ ایک مدت تک مجھے تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی مجھے دیکھنے والا نہ تھا۔“

دو کڑی پر آئینے کے سامنے اپنے دو ربوہ بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اس کے بالوں کو کھلایا۔ اس کی زلفیں بڑھتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھیں۔ ان میں وہی حسن اور ریٹیم جیسی بات تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ کے واجد صاحب واپس آگئے؟“

”وہ گئے کب تھے۔“

”کیا مطلب؟ کیا وہ سعودی عرب نہیں گئے؟“

”ہاں گئے تھے مگر ایک ہفتے میں واپس آگئے۔ انہوں نے مجھ بال کٹی کو دیکھا تو بدل ہو گئے۔ ناراض ہو گئے کہ میں نے بال کیوں کٹوائے حالانکہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ اتنی جلدی کیوں آگئے۔ انہوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر بچے گئے کہ واپس آکر اطمینان سے جواب دیں گے۔“

مگر وہ چارہ دن تک غائب رہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان کے گھر گئی تو دروازے پر آواز ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں کیا پریشانی ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتائے؟ میں تو پیشہ آڑے وقت میں ان کے کام آتی رہی۔ اگر رئیس احمد فدوی نے ہرگز کا قریب دیا تھا تو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں ان سے نہ لیتی لیکن کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا کہ ان میں سے کسی نے۔“

کتے کتے اس کے حلق میں آواز اٹک گئی ”ایک دن میں نے واجد کو مدہ جبین کے ماہر ٹانگ کرتے دیکھا۔“

”مدہ جبین کے ساتھ؟“ میں نے اور سڑمڑی نے ایک ساتھ حیرانی سے کہا۔

کے چھوٹے کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ پرانے جاتے ہیں تو نئے آتے ہیں۔ نئے گاہک اپنے جلو میں نئی داستانیں لے کر آتے ہیں کیونکہ یہی پارلر ڈرننگ سیلون ایسی جگہ ہے جہاں مرد، عورتیں اپنا کوئی عیب، اپنی کوئی بد صورتی یا بال چھپانے آتے ہیں۔ ہر حال مجھے موجودہ داستان سے منہ نہ دیتے۔

اچھے اور خوب صورت کردار ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ جیلہ مجھے ہمیشہ یاد آتی تھی۔ بے غیر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے خون کے رشتے سے کٹ گیا ہوں۔ میں ہر روز انتظار کرتا تھا۔ وہ ہم سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہم نے اس کی راضی اس کے بال کاٹنے تھے۔ وہ ماہ گزر گئے پھر چار ماہ گزر گئے۔ وہ نہیں آئی۔ مدہ جبین آگئی تھی میں نے اس سے پوچھا۔

”باجی! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ جیلہ باجی آج کل کہاں رہتی ہیں؟“

یہ سوال کرتے وقت میں آئینے میں دیکھ رہا تھا کیونکہ مجھ کے آئینے انہر شفاف ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانا چاہے تو نہیں سکتا۔ وہ جیلہ کا نام سن کر بہت ہولے سے چوک گئی۔ پھر بہت جلدی سنبھل کر عارفانہ سے پوچھا۔

”کیون جیلہ؟“

اس سوال میں کتنا غور تھا، ایک دولت مند لڑکی کے لیے جیلہ یاد رکھی جانے والی نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

”وہی جیلہ باجی جن کے بالوں کی دگ آپ اکثر۔۔۔“

”اوہ اچھا اس کالی کو کوئی بد صورت سے لڑکی۔۔۔ کو پوچھ رہے ہو۔ کیا میں لڑکیوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ اپنا کام کرو۔“

میں چپ چاپ اس لڑکی کے بال سیٹ کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلاب اس کی گلے میں بہرے کا نیلکس تھا۔ ہماری کمزور انگلیاں اتنی قیمتی گردن کو نہیں سکتیں لہذا مبرا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مدہ جبین نے جس طرح جھنجھلا کر جواب دیا تھا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بد صورت لڑکی سے تھوڑی سی خوب صورتی اور حمار لے کر کتری کا شکار ہو گئی ہے۔

وہاں میٹروں لوگ دھوپ میں کام کر رہے تھے، جبین کی نظروں میں کوئی بھی انسان نہیں تھا۔ وہ میرے ہاس کی بیوی تھی اس لیے مجھے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ ایک گاڑی میں بٹاکر ایک چھوٹی سی شاندار کوٹھی میں لے گئی۔ اس کار کو ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی تاکہ ڈرائیور نہ سمجھ سکے۔ اس کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بھوی ہے اور محض میری ڈاڑھی تک آئی ہے۔

کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں نے پڑن ہو کر کہا ”آپ کی بے تکلفی مجھے تنگی پڑے گی۔ میری ملازمت خطرے میں چاہئے گی۔“

جیلہ! تم نے اسے دیکھا ہے وہ چھوٹے سے قد کی لڑکی ہے تمہاری طرح میرے کمرے تک نہیں آتی۔ اس نے ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر کہا ”یہاں آؤ“ میں قریب گیا تو میری گردن میں بانٹیں ڈال کر بولی ”ملازمت کی تم فکر نہ کرو۔ یہ ملازمت بھی میں نے ڈال دی ہے۔ وہ بڑھار نہیں احمد فدوی میرے اشاروں پر پانچا ہے، تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دونوں مل کر اسے ختم نہیں گے۔“

میں تقریباً چھ گھنٹے تک اس کوٹھی میں بند رہا۔ کیسٹ ریکارڈر سے ڈانس کے لیے ہٹ نمبر کا آرکسٹرا بھرتا رہا اور ہم اس ہڈی کو چبانے سے پہلے خود تپتے رہے۔ وہ نہیں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بوڑھا فدوی ڈانس نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ہارپسٹک کے بعد ہی ہانپنے لگتا ہے۔ زندگی میں اور ہے کیا؟ ایک نوجوان خوب پارٹنر اور اس کے بعد ڈانس اینڈلی میری۔۔۔“

شام کو ریکس احمد فدوی درکنگ لوکیشن سے واپس آیا تو وہ جبین نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ جبین مجھ سے دور رہی پھر ریکس احمد فدوی نے مجھے اپنے بیڈروم میں بلایا۔ میں کمرے میں پہنچا تو وہ جبین اس کے ماتو ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریکس احمد فدوی نے کہا

”میرا جلد! آج میں نے اپنے جزل منجر سے تمہارے متعلق بات کی ہے اس نے کہا

”ہاں شاپنگ سینٹر کے باہر ریکس احمد فدوی کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھیں تھے۔ واجد اور وہ جبین بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دکان سے باہر آئے اور کڑک کڑک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ واجد اتنا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے جیسے واقعی سات ہزار ہولار کا ہوں گا۔ میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا مگر انجان بن گئے۔ میں گم گم کر رہی تھی۔ میں نے بیچ بازار میں اپنے آنسو کیسے ضبط کیے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کمرہ روٹی اتار روٹی کہ واجد نے کبھی ہنسیا بھی نہ ہو گا۔“

”یہ آپ پر بڑا ظلم ہوا ہے باجی! واجد صاحب کو شرم آنا چاہیے۔“

”ہاں! انہیں شرم آئی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی مغالطی پیش کرنے کی دوسری ٹاکتیک آئے اور سر جھکا کر کہنے لگے ”تمہیں معلوم ہے جیلہ! جب تم مجھے والوں کے آگے آئی تھیں تو ریکس احمد فدوی اور وہ جبین بھی وہاں موجود تھے۔ وہ جبین عجب لگاؤ کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”مائی گڈنس جیلہ نے یہاں نہیں بتایا کہ تم اتنے ہنسنے لگے ہو۔“

میں نے مسکرا کر کہا ”یہ آپ کا حسن نظر ہے۔“

وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگی ”مگر تمہارے پاس حسن نظر کی کمی ہے اس لیے مر رہے ہو۔ اگر میں تمہیں یہاں اچھی ملازمت دلا دوں تو کرو گے؟ یہاں میرا تمہارا اچھا وقت گزرے گا۔ تم اونچی سوسائٹی میں پہنچ جاؤ گے۔“

”مختصر! ہر شخص اونچا اڑنا چاہتا ہے۔“

میں وہ جبین سے کھل کر باتیں نہ کر سکا کیونکہ جیلہ تم آگئی تھیں۔ اس فلائٹ کے ذریعے جدہ چلا گیا۔ تیسرے دن وہ جبین اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ گئی تو میں بھی سمجھا کہ ریکس احمد فدوی اپنے کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں۔ آتے ہی جزل منجر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں آؤٹ ڈور لوکیشن میں کھڑی ہوں اور ایک کے نقشے کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ وہ جبین وہاں پہنچ گئی۔ اس نے تھوٹے سا منے سے ہناتے ہوئے کہا۔

”کیا جانوروں کی طرح دھوپ میں کام کر رہے ہو؟ چلو میں تمہیں انہیں ہوں۔“

ہاتھوں میں جانتا ہوں۔ اس لیے تم میری بیوی بن کر رہو گی اور نہ جسیں گرل فرینڈ بن کر ہارے گی۔“

میں نے غصے سے چیخ کر کہا ”چلے جاؤ یہاں سے اگر لوگ ایسے ہی جیتے ہیں تو میں نرالی اس دنیا میں جینے سے انکار کر دوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر مائیں لے کر لے کر لوں گی۔ گیٹ آؤٹ۔“

موزارڈ بار گیٹ آؤٹ کہہ دے تب بھی عورت اس کے قدموں سے نہیں جاتی۔
میں نے ایک بار کہا تو وہ چلے گئے۔ اس لیے کہ گیٹ کے باہر دولت اور خوش حالی ہاتھ بولا لے کر لڑی تھی۔ کہتے ہیں زلفوں کی زنجیر بڑی مضبوط ہوتی ہے مگر میں نے وہ بھی اس کے لیے کاٹ ڈالی۔“

واڈ بٹائی ہوئی آنکھوں سے آئینے کو دیکھنے لگی۔ یقیناً آئینہ وحند لا رہا ہو گا۔ ماسٹر رمزی کا ۳۳ سے بھول جائے کب تک روٹی رہیں گی۔
وہ اٹھ کھڑی ہو گئی ”میں صرف اپنے لیے نہیں اس کے لیے بھی رو رہی ہوں کہ اب کہہ بنا کے چلے میں اپنی جوانی کے دوران بکنا رہے گا۔“
بکہ کہہ کر وہ چلی گئی آئینہ خالی ہو گیا۔



ہے کہ یہاں کام زیادہ نہیں ہے اس لیے تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے، تمہارا لڑکا یہاں نہیں، ہم نے جیل سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کر دیں گے۔“

مہ جیوں نے کہا ”ڈارلنگ! تم جیل سے کیا ہوا وعدہ نہیں بلکہ میری خواہش کا مطابق ایسا کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی۔“

وہ جانے کے لیے اٹھ گئی۔ بڑھے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”سوری ہوں معاف کر دو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ میں تمہارے حکم کے مطابق واجد کو اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔“

مہ جیوں نے اپنی بات منوالی اور میں ایک ہنستے کے اندر اس کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ یہاں میں رئیس احمد فدوی کا سیکریٹری ہوں لیکن حقیقتاً مہ جیوں کا بوائے فرما ہوں۔ وہ بوڑھا ہوس پرست، دولت مند اپنی حسین اور کم سن بیوی کو کھوٹا نہیں چاہتا سوچتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو دنیا بھی کسے گی کہ بوڑھا تھا اس لیے وہ بیوی پر لگام نہ ڈال سکا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا لہذا اس نے مجھے اپنا لڑکا بنا کر لگام ڈال دی ہے۔“

واجد اپنی آپ بیتی سن رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ میں کہہ بھی کیا تھی۔ جنہیں میں نے ٹوٹ کر چاہا اور جن کے لیے اپنی ایک خوب صورتی کو توڑ کر بھروسہ بن گئی، جب انہوں نے خود ایک الگ راستہ چن لیا تو میں کیا بول سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

”تم بولتی کیوں نہیں؟ کچھ بولو مجھے جتنی باتیں سنا سکتی ہو سناؤ۔ میں صرف یہاں نہیں، احسان فراموش بھی ہوں مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ سمجھ لیتا کہ فی زمانہ کیا ہو نا ب آگے بڑھتے وقت پیچھے نہیں دیکھا جاتا، اوپر چڑھتے وقت نیچے گرنے والوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے باوجود میں تم سے ملنے آیا ہوں۔“

”آپ نے بڑا احسان کیا مگر اخلاقی قدروں کو بھلا کر یہاں نہ آتے تو اچھا ہو نہ۔“
”اخلاق اور انسانیت کا معیار دولت والے ہی بناتے ہیں۔ یہ بات تمہاری بھو نہیں آئے گی۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا، میں تم ہی شادی کروں گا۔ شادی سے پہلے مگر جائیداد اور دولت کے ذرائع کس طرح پیدا

آدمی کا باپ

وہ میرا باپ تھا۔
 میں اس کا باپ بن گیا۔
 پھر وہ اس کا باپ بننے لگا۔
 ایک شرمناک سوال کہ
 ہم آدمیوں کا باپ کون ہے؟

بھی طبقے ہوتے ہیں۔ نچلے طبقے میں جو شیم اور رضیہ ہوتی ہیں وہ اونچے طبقے میں پہنچ کر شے کی اور راضی بن جاتی ہیں۔

شے کی زندگی بدل گئی۔ نام بدل گیا حتیٰ کہ بیمار اور لاغر جسم بھی ڈبل روئی کی طرح محنت مند ہو گیا۔ بس اسی مقام پر اگر جوان بیوی اور بوڑھے خاوند کا فرق نمایاں ہو گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بے زاری سے ”اوندہ“ کہہ کر خاوند کے بیڈ روم سے نکلی اور اپنے بیڈ روم میں اگر ذرا آنسو بہا کر سو گئی۔

کوئی مرد اپنی عورت کی نظروں سے گرتا پسند نہیں کرتا حالانکہ اس میں مرد ذات کی ذہین لاپٹو نہیں نکلتا اگر کوئی عقلمند بوڑھا کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کی حماقت کرے تو مرد اور لڑکی کی نہیں بوڑھی برادری کی غلطی ہے۔

دیے ڈاکٹر نے سوچا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے جو وہ اس نے شے ی پر آزمائی ہے وہی خیر اور استعمال کرے گا اور شے ی کی طرح جوان اور زندہ جاوید ہو جائے گا۔ دوا کا فارمولا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اسے تیار کرنے کے لیے سکون و تحمل اور ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی اور اس کا تمام سکون شے ی نے ورہم ورہم کر رکھا تھا۔ جب بھی وہ بکی ہوئی نعل کی طرح اس کے سامنے لراتی، وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ایسی حالت میں وہ اپنے لیے آب حیات کیسے تیار کرنا؟ اگر مختلف دواؤں کے اوزان اور ترکیب میں کوئی لکڑ ہو جاتی یا خالی رہ جاتی تو وہی آب حیات اس کے لیے سم قاتل بن جاتا۔

اس نے جھنجھاکر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے شے ی کی موت کا سامان کرنا چاہیے۔ نہ رہے گا بانی نہ بجے گی بانسری۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے فارمولے پر عمل کرے گا۔ شے ی کیا چیز ہے لہذا زندگی حاصل کرنے کے بعد اسے لاکھوں حسینا میں مل جائیں گی۔

لیکن پہلی کوشش میں وہ ناکام ہو گیا۔ وہ زہریلا انجکشن شے ی کے جسم میں کیا اور پانی بن کر نکل گیا۔ دوسری بار ایسا ہوا کہ شے ی آدمی رات کو تنہا باغیچے میں نسل رہی تھی ڈاکٹر نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ریو اور میں سالنر لگایا پھر ایک ماہر نشاندہ بازی کی طرح بیوی چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ شے ی کے حلق سے چھین لکھیں پھر وہ لڑکھائی کرکھائیں پر گر پڑی۔

ڈاکٹر نے ریو اور کو ایک جھاڑی میں چھپا دیا، اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا اس کے

آدمی کا باپ

ڈاکٹر عظیم صدیقی جانتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ شے ی نہیں ہو گی۔ پھر بھی اس نے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی تمام کوششیں کر ڈالیں۔ پہلا کوشش یہ تھی کہ اسے ایک نہایت ہی زود اثر زہریلا انجکشن دیا تھا۔ شے ی نہیں جاتی تھی کہ خاوند اس کی جان کا دشمن ہے، اس نے چپ چاپ انجکشن لگوا لیا۔ زہر اس کے جسم کے اندر سرایت کر گیا۔ چند لمحوں تک اسے اپنے اندر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی اس نے ہاتھ روم میں جا کر تے کر دی۔ اس کے بعد اس نے پانی منہ میں لے کر کھلی منہ پوچھتی ہوئی کھانا پکانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ عظیم صدیقی پریشانی سے سونا اپنی شریک حیات کو اپنی حیات سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دینے کا بہترین طریقہ کیا ہوا شے ی کا اصل نام شیم بیگم تھا وہ نچلے طبقے سے بیاہ کر لائی تھی۔ ڈاکٹر عظیم نے دو مقاصد کے تحت اس سے شادی کی تھی۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ شیم سزاوارک حسین دو شیرہ تھی۔ ڈاکٹر پچپن سال کا بوڑھا تھا۔ اس عمر میں انہی حسین لڑکیاں نہیں کر سکتی تھی لیکن شیم اس سے شادی کے لیے راضی ہو گئی کیونکہ وہ ڈاکٹر نانا سلطان کے مملکت مرض میں مبتلا تھی۔

ڈاکٹر کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بیمار محبوبہ پر ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر تجربے سے صحت مند ہو جاتی تو یوم آخر تک زندہ سلامت رہتی ورنہ اس کے افسوس نہ ہوتا کیونکہ اسے ملنے کیس ہو گیا تھا اور اس کا مرنا یقینی تھا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر کا تجربہ کامیاب ہو گیا اور بد قسمتی سے اس پر ایک جا ہمیشہ کے لیے مسلط ہو گئی۔ پہلے پہل اس کی جوانی کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا کہ دونوں وہ اپنے کامیاب تجربے پر نازاں و شاداں تھا۔ سب سے پہلے اس نے خوشی بیگم کا نام بدل دیا اور اسے پیار سے شے ی کہنے لگا۔ انسان کے طبقوں کی طرح

لاخود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑھئی نے بھی آکر اسے پکڑ لیا۔ وہ دو طرفہ لٹیل میں ترپنے لگی، پھٹنے لگی۔ اگرچہ اس میں جوانی کا زور تھا۔ اس کے باوجود وہ عورت لہاس میں عورت کی نزاکت تھی اور جلد ہی خائف ہو کر شکست کھا جانے والی کمزوری ہاتھ دلوڑھوں نے اسے پکڑ کر زور دیا تاہم اس کے اندر ٹھونس دیا پھر اس کے ڈھکنے کو لکے اسے ہر طرف سے لاک کر دیا۔

نہت کے اندر سے کھٹکھٹ کی آواز آرہی تھی۔ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر بڑھری تھی اور کچھ کتنی جاری تھی لیکن اس کی آواز منہاٹ کی طرح باہر آرہی تھی۔

دو ٹھونس خانے سے باہر آگئے۔ آئندہ کل تک ڈاکٹر کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر ہٹنے والی بے چینی سے کڑھت بدل بدل کر رات گزار دی۔ دوسرے دن وہ خانے میں باہر سے تاہم بالکل خاموش نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور تاہم ہاتھ لگا کر کہنے لگا۔ گہری خاموشی تھی۔

خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا۔ اندر سے کچھ ایسی سرسراہٹ سنائی دی تھی کہ اس کی زندگی کے آخری بستر پر گڑھیں بدل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے ناگواری سے تاہم پر دستک دی۔ دستک دیتے ہی جیسے اندر کھلبلی مچ گئی۔ وہ اندر سے تاہم کی دیوار پر ہاتھ مارنے لگی۔

وہ جلتا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تاہم پر ایک زور کی لٹات مارتے ہوئے بولا۔

”مٹی جان کا عذاب بن گئی ہے۔ لیکن میں بھی ضد کا پکا ہوں۔ اسی میں تجھے قید لیا، ڈھکنا ہوں کب تک زندہ رہے گی۔ تڑپ تڑپ کر مرے گی۔“

کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا خانے سے باہر آگیا اور بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹھٹھنے

نہم کو بڑھئی اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”میں عورت سے اس طرح پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ ہم آج رات اس تاہم کو جنگل لے جا کر ایک گہرے گڑھے میں دفن کر دیں گے، کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ جنگل کے

قریب آیا۔ اس وقت تک شے ی انھہ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے بدن سے ریوڑ کی لیک لگی یوں نکال رہی تھی جیسے پاؤں میں ہتھما ہوا کاٹنا نکال رہی ہو۔ بدن میں کئی سولوں گئے تھے۔ جہاں جہاں سوراخ تھے وہاں خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اگرچہ زیادہ تعداد میں خون بہنا چاہیے تھا لیکن وہ تمام سوراخ آپ ہی آپ بھرتے جا رہے تھے۔ فوم کے ٹکڑی انگلی گڑھ دیتے سے وہاں انگلی کا نشان نہیں پڑتا۔ فوم جلدی اپنی صحیح حالت میں آجاتا ہے یہی حال اس کے فوم جیسے پٹیکلے بدن کا تھا۔ ڈاکٹر اپنے ساتھ سے پینے پوچھے لگا۔

شے ی اس کے لیے دن رات کا عذاب بن گئی۔ جیسے جیسے دن گزرنے لگے شے ی مزاج بدلنے لگا۔ وہ اس لیے بیاہ کر نہیں آئی تھی کہ ایک خوب صورت ڈیکوریشن ہو بلکہ اس کے گھر میں سچی رہے اور خاوند اسے دور سے دیکھتا رہے۔ آخر وہ عورت تھی کی اپنی ضروریات اور جذبات تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کی عمر ایک جگہ ٹھہر گئی تھی۔ ڈاکٹر کے بڑھاپے میں مزید پانچ سال کا اضافہ ہو گیا تھا اس کے چہرے کی حیران کن اور گہری ہو گئی تھی۔ شے ی کے چہرے پر اور بدن کے شکوہوں پر وہی ستر سال کی لٹل اور رہنمائی تھی۔ لہذا اس کا بھگتنا فطری امر تھا۔ وہ دوسروں کے بازوؤں میں کئی کئی طرے چٹختے اور پھول کی طرح ٹھٹھنے لگی۔

ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبرز ہو گیا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک بہت ہی مفید شیشم کی ٹکڑی کا تاہم بنانے والے بڑھئی کو اچھی خاصی رقم دے کر اپنا رازدار بن کر کیونکہ آئندہ اس تاہم کو قبر کی میں پہنچانے کے لیے اسے ایک معاون کی ضرورت تھی۔

جب تاہم تیار ہو گیا تو ڈاکٹر شے ی کو باتوں سے بہلا تا ہوا مکان کے خانے لے کر آیا۔ تاہم کھلا ہوا تھا اور شے ی کے حسین وجود کا انتظار کر رہا تھا۔ قریب ہی یو کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے شے ی کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”چلو اب اس میں لیٹ جاؤ۔“

”نہیں!“ وہ گہرا کر بولی ”کیا تم مجھے اس میں بند کر دیتا چاہتے ہو؟“

”ہاں“ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی قبر میں بھی زندہ رہو گی یا مر جاؤ گی؟“

”نہیں۔ میں جیتے جی قبر میں نہیں جاؤں گی۔ چھوڑ دو مجھے۔ جانے دو۔“

نے ہمارے گھر بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

”دونوں ڈرتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دیتے جا رہے تھے۔ وہ گئے کے بعد جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر ان کی دین ڈنگا گئی تھی پھر وہ گھنے درختوں کے درمیان آکر رک گئی۔
ڈاکٹر نے اپنی رست واپس میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ بڑھی بچھلے دروازے کو غل کر کدال اور نیچے کو نکال رہا تھا۔ پھر وہ دونوں دین سے دور آکر گڑھا کھودنے لگا۔ دین کے ہاتھوں میں کدال تھی وہ کھود رہا تھا اور ڈاکٹر نیچے سے مٹی اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔

ایک زندہ عورت کے لیے قبر کھودی جارہی تھی، نیچے سے مٹی ہٹاتے وقت ڈاکٹر سوچ با تھا کہ ایک قبر میں دو انسانوں کے سونے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ شے کی تو وہاں قیامت کی ہو رہی ہے گی لیکن اس کے ساتھ وہ بڑھی بھی قیامت کی فیند سونے گا۔ اتنے بڑے روم کے ایک رازدار کو زندہ چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ اس قبر میں تمام راز و فن برپا ہیں گے تب ہی وہ اطمینان سے اپنے لیے آب حیات تیار کر سکے گا۔
چوٹ کی کمری قبر تیار ہو گئی۔ وہ دونوں دین کے بچھلے حصے سے تابوت کو کھینچے ہوئے قبر کے کنارے تک لے آئے پھر اسے گمراہی میں دھکیل دیا۔ وہ لڑھکا ہوا نیچے جا کر قبر کی مٹی پر گیا۔ ڈاکٹر نے نیچے کو اٹھاتے ہوئے بڑھی سے کہا۔

”جور اچھا کر دیکھو اور سنو کیا وہ طبلہ بجا رہی ہے۔“

وہ قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک گیا اور توجہ سے سننے لگا۔ آواز آرہی تھی۔ صاف پہل رہا تھا کہ شے کی تابوت کی دیواروں پر ہاتھ مار رہی ہے۔

بڑھی نے صرف چند لمحوں تک وہ آواز سنی۔ وہ چند لمحوں کے لیے کافی تھے۔ اس کے انہوں میں وہ پہلے بلند ہوا اور بڑھی کی کھوپڑی نشان بن گئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلا۔ قبر کے کنارے لڑھک گیا۔ دوسری بار نیچے کا پھل اس کی گردن میں اتر گیا۔ گردن ٹوٹی گئی تھی وہ تڑپ رہا تھا اور مٹی اس کے لمبے بھیک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے وہ لاش قبر میں لڑھکا دی۔

”وہ“ کی آواز کے ساتھ وہ لاش تابوت پر جا کر اوندھی ہو گئی۔ دو انسانوں کی

کسی حصے میں زمین کے اندر وہ چھپا کر رکھ دی گئی ہے۔ نہ کسی کو معلوم ہو گا نہ وہ اسے کھود کر باہر نکالے گا۔“

وہ بہت دیر تک اسے اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا۔ جب رات گہری ہو گئی تو ڈاکٹر میں گیا وہاں سے اپنی دین میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے بچھلے دروازے پر بڑھی کدال اور نیچے لے کر آگیا۔ وہ دونوں دین کا پچھلا دروازہ کھول کر کوٹھی کے آگے پھر وہاں سے یہ خانے میں پہنچے۔ تابوت پہلے کی طرح بظاہر خاموش نظر آیا۔ جب وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے یہ خانے سے نکالنے لگے تو اس تابوت میں ہرگز نہ اندر ہاتھ مار مار کر دستک کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ اسے باہر نکالا جائے۔

مگر وہ دونوں اس کی التجا سے صوم ہونے والے نہ تھے اسے خاموشی سے غبر لے جا رہے تھے۔ اس ذہنی تابوت کو یہ خانے کی میزبانیوں سے لوہے پر چھانے وقتا پسند آنے لگا۔ وہ بانپ رہے تھے اور زور لگا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں تو سانسیں درست کرنے کے لیے رک جاتے تھے۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد وہ خانے سے نکال لائے۔

کوٹھی سے باہر لا کر اسے دین میں رکھتے وقت بھی خاصی دشواری پیش آئی۔ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ انہوں نے دین کے بچھلے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور پھر آکر بیٹھ گئے۔

اندھیری رات کی خاموشی میں دین تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔ اس خاموشی کے بچھلے حصے سے کبھی کبھی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر سے کہا ”سالی کے ہاتھ بھی نہیں دیکھتے“ طبلہ بجاتی جا رہی ہے۔ ہم سے جڑی اسے تابوت میں بند کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کو رسی سے اچھی طرح چاہیے تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کوئی کار والا ہمیں اور نیک کرتے وقت اس طبلہ نہ سن لے۔“

بڑھی گھبرا کر کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
”ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ آگے پیچھے کوئی گاڑی نظر نہیں آتی اور اتنی رات کو بھلا اس دیران راستے میں کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا؟“

انہا ایک ہندو کی طبعی عمر ستر سال کی نہیں ہوتی کوئی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ نازل شدہ ت سے اس لیباریٹری کے کمرے میں اچھل کود رہا ہے اور اپنی ہندو کے خاص ایئر کنڈیشنڈ لیباریٹری میں عیش کر رہا ہے۔

اس نے سرگھا کر اپنی ہندو کی طرف دیکھا۔ وہ بے چاری ایک جانب چپ چاپ لٹی ٹی تھی۔ اس کے چھوٹے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر معلوم ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ روانہ نکال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے باپ بننے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔ یہ اس کی گامی بچہ ہندو نہیں تھی۔ ستر سال کے عرصے میں کتنی ہی آنکی تھیں اور اپنی فانی عمر اڑا چکی تھیں۔ ہندو سمجھتا تھا کہ وہ جو ماں بننے والی ہے وہ بھی کسی دن عیش کے لیے منت ہو جائے گی اور اس کی جگہ پھر ایک نئی ہندو اس کا دل بھلائے آجائے گی۔

اس نے سرگھا کر ڈاکٹر عظیم صدیقی کو دیکھا۔ اسے یہ طویل عیش و عشرت کی زندگی ہم صدیقی کے دادا نے اپنے تجربوں سے دی تھی۔ اس کے دادا عظیم صدیقی نے آب و تاب کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ انسان ازل سے ابدی زندگی کی تلاش میں بھٹک رہا اور اس کے لیے طبی سائنس میں نئے نئے چھ نکادینے والے تجربات کر رہا ہے۔ خوش فہم عظیم صدیقی نے آب و تاب تیار کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہاں جدید طبی دوائیں، بے داغ فولاد کے آلات اور مشینیں وغیرہ نہیں تھیں اور ایسی ہیئر کنڈیشنڈ لیباریٹری بھی نہیں تھی۔ عظیم صدیقی چٹائی پر بیٹھ کر ہاؤنڈے میں دوائیں پیٹنے لگے تھے۔ کمال وہ چٹائی پر بیٹھے کا زمانہ اور کہاں یہ لیباریٹری کی ایئر کنڈیشنڈ دیا۔ ہندو نے انسان کے داغ کو اور اس کی تہذیب کو کتنی ہی کوششیں بدلتے دیکھا تھا۔

بہر حال عظیم صدیقی نے آب و تاب تیار کر لیا تھا اور اسے اس ہندو پر آزما کر اس بات کو ثابت کر لیا تھا کہ اس دوا میں انسانی جسم کی مناسبت سے کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ ہمارے ہندو کی طرح ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اس خیال کے تحت اس نے مختلف دواؤں سے اس آب و تاب میں تھوڑی سی تبدیلیاں کیں۔ اسے اپنی تجربات پر بڑا اعتماد اور اکتاہٹ تھی۔ وہ اس آب و تاب کو نوش کر گیا۔

ہندو نے اس لیباریٹری میں بیٹھ کر عجیب عجیب تماشے دیکھے تھے۔ عظیم صدیقی نے اس تماشے ہی اس آب و تاب کو نوش کیا تھا۔ فوری طور پر اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا

مغربائش نکل آئی۔ ایک تابوت کے اندر زندہ تھی، دو سرا تابوت کے اوپر مردہ تھا اور پہلے سے مٹی اٹھا اٹھا کر قبر کے خالی پیٹ کو بھر رہا تھا۔

گڑھا بھر گیا۔ زمین پہلے کی طرح ہموار ہو گئی۔ وہ پہلے کو ایک طرف رکھ کر دیکھ کر زمین سے کان لگا کر سننے لگا۔ آواز نہیں آرہی تھی۔ منوں مٹی کی یہ جچی ہوئی ٹی۔ اس نے وہ سپاٹ قبر ساؤنڈ پروف ہو گئی تھی۔ اب اس دنیا کا کوئی فرد شے کی آواز نہیں سنا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے تک وہاں بیٹھا رہا پھر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔



ڈاکٹر عظیم صدیقی کے عملی تجربے کو وہ تینوں بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس دن تینوں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

”عظیم صدیقی آب و تاب تیار کر لے گا؟“

”میں شک“ کی ہلکی آواز کے ساتھ سفید دھوس کا ایک چپکا صراحی سے ڈاکٹر لیباریٹری کی صاف ستھری فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ شیشے کی صراحی سے دھنکے کاٹے پر عظیم صدیقی میز سے لگا کھڑا تھا، اس کی نگاہیں صراحی کے پینڈے پر مرکوز تھیں، زرد رنگ کا محلول نظر کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صراحی میں سے وہ سفید دھواں غائب ہو رہا تھا۔ شاید زرد رنگ کے محلول میں جذب ہو رہا تھا۔

وہ تینوں اس عمل کو یک نگہ دیکھے جارہے تھے، صرف وہی نہیں بلکہ لیباریٹری کا ایک گوشے میں آہنی سلاخوں کے چھپے بیٹھا ہوا ایک ہندو بھی اس عملی تجربے کو نظر دیکھے جارہا تھا۔

ایک ہندو کو بھلا سائنسی تجربات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ لیکن کتنے جن کو قیام ہندو کی عادتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں اس تماشے کو خاص طور سے دیکھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

ہندو عظیم صدیقی کے تجربے کو سمجھ یا نہ سمجھ لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے دیکھا تھا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ عظیم صدیقی ہمیشہ کی طرح اس دوا کو بھی اس پر آزمائے گا۔ وہ کمرے کی آہنی سلاخوں کے چھپے تقریباً ستر سال سے بیٹھا ہوا اس لیباریٹری کو

لیکن ہر روز جب وہ لیبارٹری میں آتا تو پہلے سے زیادہ کمزور اور بیمار بننا دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ لیکن قریبی دو تین طلبہ بجا رہی تھی یا نہیں۔ اس گڑھے کو کھود کر طلبہ سننے کی جرات نہ ہی اندر کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو آزما کر اس آبِ حیات کے دھوکے سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن ایک روز اس لیبارٹری میں خونِ حوکِ کر مر گیا۔

اس کے بعد عظیم صدیقی کے باپ سلیم صدیقی کی باری آئی۔ سلیم صدیقی نے اپنے باپ سلیم صدیقی سے ہونے والی غلطیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اس آبِ حیات میں ایسی خامیاں نظر آئیں جنہیں دور کے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ پھر بندر نے سلیم صدیقی کو اسی لیبارٹری میں تجربے کرتے اور آبِ حیات مل جانے والی کمی کو پورا کرتے دیکھا۔ اسی لیبارٹری میں اسے خوشی سے مغلوب ہو کر زندگی کا جام چڑھاتے اور اپنے باپ کی طرح دم توڑتے دیکھا تھا۔

اور اب عظیم صدیقی کی باری تھی۔ لیکن وہ اتنا جلد باز نہیں تھا اور اس کو اگر نابالغیات بنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسی کامیابی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے سے پہلے خود پر آزما کر اپنے دادا اور باپ کے عمر تک انجام تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

وہ بیس برس کی عمر سے اپنے باپ اور دادا کے ساتھ اس لیے باریشی میں کام کیا کہ ہاتھ کاڑھ ملا اس کے ہاتھ آجائے۔ وہ خود ہی زمین اور عظیم سائنس دان یعنی اسے تجربات سے گزرتے ہوئے پینتیس برس ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا: یہ دیکھ کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچ رہی تھی کہ آج عظیم صدیقی اس دنیا کے صوبہ کی زبانیت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ تجربات کو سمو کرنے سے قبل عالم علم اور سب سے انوکھے تجربے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

تیار کیا تھا پھر اسے اپنی جوان اور حسین بیوی شے می پر آزمایا تھا۔

اس آج حیات کو شے می پر آزمائے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح
 نہیں چاہتا تھا۔ اگر شے می اسے نوش کر کے مر جاتی تو دوسری بیوی آگے نہ اٹکتی تھی اور اگر
 جاوید ہو جاتی تو وہ اسے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ شے می دور بہت دور کسی جنگل میں
 مٹی تلے دبلی پڑی تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہو کر باپ
 ہوگی۔

وہیں۔
وہیں عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد مجھ کو
دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی نہیں
ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے مٹی بکھر
کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پتھروں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔
نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دے۔
وہیں عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد مجھ کو
دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی نہیں
ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے مٹی بکھر
کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پتھروں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔
نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دے۔

لیکن ہر روز جب وہ لیبارٹری میں آتا تو پہلے سے زیادہ کمزور اور بیمار بنا کر سامنے آتا۔ وہ ہن اندر کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو آزما کر اس آب حیات کے دل سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن ایک روز اس لیبارٹری میں خون ٹھوک کر مر گیا۔ اس کے بعد عظیم صدیقی کے باپ سلیم صدیقی کی باری آئی۔ سلیم صدیقی نے اپنے باپ سلیم صدیقی سے ہونے والی غلطیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اس آب حیات میں ایسی خامیاں نظر آئیں جنہیں دور کیے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ پھر بندر نے سلیم صدیقی کو اس لیبارٹری میں تجربے کرتے اور آب حیات مل جانے والی کمی کو پورا کرتے دیکھا۔ اسی لیبارٹری میں اسے خوشی سے مغلوب ہو کر بے حیات کا جام چڑھاتے اور اپنے باپ کی طرح دم توڑتے دیکھا تھا۔

اور اب عظیم صدیقی کی باری تھی۔ لیکن وہ اتنا جلد باز نہیں تھا اور اس ڈاکٹر سے پہلے خود پر آزما کر اپنے دادا اور باپ کے عبرت کا انجام تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ بیس برس کی عمر سے اپنے باپ اور دادا کے ساتھ اس لیبارٹری میں کام کیا یعنی اسے تجربات سے گزرتے ہوئے پینتیس برس ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے باپ اور دادا کی زہانت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ تجربات کو سمو کر نئے سرے سے آبِ حیات تیار کیا۔ یہ وہی آبی حیات ہے جسے آج کل کے سائنس دان کی زہانت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ تجربات کو سمو کر نئے سرے سے آبِ حیات تیار کیا تھا پھر اسے اپنی جوان اور حسین بیوی شے بی پر آزمایا تھا۔

اس آج حیات کو شے کی پر آزمائے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح مہجنا دولت مند ہوتے ہیں، وہ بھی دولت کے اعتبار سے رئیس اعظم تھا۔ رئیس اعظم نہیں چاہتا تھا۔ اگر شے کی اسے نوش کر کے مر جائے تو دوسری بیوی آنکشی بھی لگا کر، دنگے گاڑو اور دنیا میں ختم تھا۔ تھا اس لیے تھا کہ نہ تو اس نے جوانی میں شادی کی جاوید ہو جاتی تھی۔ تو وہ اسے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ شے کی دور بست دور کسی جنگل میں لہاؤ نہ ہی ہوتا ہے میں کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ مہجنا دولت مند تھا اتنا ہی کہجوس بھی تھا۔ مٹی تلے دبی پڑی تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہوگی یا نہ ہوگی۔ نہ کہہ سکتا تھا کہ باپ کی طرح اولاد بھی لالچی ہوگی لہذا اتنی ہوگی۔

وہیں۔
وہیں عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد مجھ کو
دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی نہیں
ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے مٹی بکھر
کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پتھروں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔
نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دے۔
وہیں عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد مجھ کو
دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی نہیں
ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے مٹی بکھر
کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پتھروں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔
نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دے۔

برے لیے ہے۔

”اے لباربٹری کی خاموشی میں عظیم صدیقی کا قبضہ گونجنے لگا۔ وہ صراحی کی گروں کو الٹی ٹیٹلی میں بکڑے ہوئے کہہ رہا تھا ”میرے معزز دوستو! دیکھو! دیکھو! میں نے آبِ حیات تیار کر لیا ہے۔ یہ دنیا والے میرے دادا جان اور میرے ابا جان کو دیوانہ کہتے تھے تاہم مجھے بھی چنچہ چنچہ دیوانہ کہتے ہوں مگر ہم دیوانے نہیں ہیں۔ دیوانے تو بھنوں اور فریاد بچے بائشی جنہوں نے محبت کے نام پر اچھی بھلی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ میں اپنی دھن کا اہل۔ ایک طویل مدت کی محنت اور جدوجہد کے بعد میں نے قیامت تک زندہ رہنے والی دوا بنا لی ہے اور اس کا فارمولا میری یادداشت میں محفوظ ہے۔“

یہودی جس نے خوشی سے کانپتے ہوئے کہا۔

”اے عظیم صدیقی! میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ تم اس آبِ حیات اہلے باہتہ فروخت کرو۔ میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہوں۔“

ہارڈی اور سون چونگ کروڑھے جس کو دیکھا لیکن عظیم صدیقی مسکراتا ہوا پیشے لالیک ٹوکس کی طرف چلا گیا اور اس میں صراحی کو حفاظت سے رکھنے لگا۔ جیسے بڑی باتی سے بولی برصائے لگا۔

”دلاکھ ڈالر لے لو۔“

عظیم صدیقی جواب میں قہقہے لگنے لگا۔

”نہی لاکھ چار لاکھ۔ تم ہی کو کہ اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟“

اس نے بدستور ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تم اپنی تمام دولت بھی میرے قدموں پر رکھ دو تو بھی میں اس قیمت نہیں کروں گا۔ میں اسے خودی نوش کروں گا اور امر ہو جاؤں گا پھر تاقیامت اہل ناک حسین لڑکیوں سے شادی کرتا رہوں گا۔ اس بندر کی طرح جو اس کٹرے میں ستر ملے اس میں گر رہا ہے۔ ایک بندر یا مچھلی ہے تو دوسری آجاتی ہے۔ اسی طرح میری اہلہ لڑکیاں طبی عمر گزار کر مر جائے گی تو دوسری آجائے گی یعنی بیویاں مرنے جائیں گی اور نہ ہونے والی اولاد پیدا ہوتی جائے گی۔ چند صدیوں میں اس زمین کے بچے بچے پر صرف برے ہی بچے ہوں گے۔ اس وقت میں اس دنیا کے آدمیوں کا واحد باپ کہلاؤں گا۔“

پھر وہ عظیم صدیقی کی شہرت سن کر سماں آیا اور اس سے دوستی کاٹنے لگا۔ اس سالہ بندر کو دیکھا تھا اور شے ہی جیسی بلڈ کینسر کی مریضہ کی حیرت انگیز صحت و رپورٹ پڑھی تھی اور اب اس کے سامنے جو آبِ حیات تیار ہو رہا تھا اسے وہ بڑی قیمت دے کر خریدنا چاہتا تھا۔

زندگی۔ ابدی زندگی۔ وہ شیشے کی شفاف صراحی کو گھور رہا تھا اور انتہائی ہوشیار جذبے کے تحت اس طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا جس طرح سانپ ڈسنے سے پہلے جو ہے۔ اس کی نگاہوں کا نشانہ ٹھیک صراحی پر تھا۔

ہارڈی اور جیس کے درمیان سون بارڈلے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی۔ تھی اور اس کا جسم شراب سے بھری ہوئی بوتل کی طرح نشہ انگیز تھلا۔ ہارڈی کی نگاہ تھی۔

اس وقت وہ اپنے خیالات کی دنیا میں بالکل تھا کھڑی تھی۔ اس کے آنکھیں لگا تھا، صرف ایک شیشے کی شفاف صراحی تھی جس میں سرخ رنگ کا سیال نہیں لے ہاؤ اپنی ہر لہر کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے شے کی سودا بہار جوانی دی ہے۔

شے ہی کہاں ہے؟ آبِ حیات نوش کر کے کہاں غائب ہو گئی؟ سون نے بڑے عظیم صدیقی سے کہا تھا اور عظیم صدیقی نے ہر ایک کو یہی جواب دیا تھا کہ وہ جوانی اور زندگی کے غور میں مجھے بھونٹتی ہے اور اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

عورت کچھ نہیں چاہتی۔ وہ دولت نہیں چاہتی، وہ دین نہیں چاہتی، دنیا نہیں کیونکہ یہ سب چیزیں مرد خود ہی اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے بشرطیکہ وہ جوان ہو۔ حسن اور منہ زور جوانی سے مرد پر حکومت کر سکتی ہے۔ اس کی دولت چھین سکتی ہے اور توبہ شکن اداؤں سے اس کی عاقبت خراب کر سکتی ہے۔ عورت صرف اپنی چال چلن طویل چاہتی ہے۔

سون اپنے تازہ رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کیا ان روزگار بھی بڑھاپے کی جھرواں پڑ جائیں گی؟ وہ کانپ سی گئی۔ عورت اپنے برے افعال سے کانپتی بڑھاپے کے تصور سے کانپ جاتی ہے۔

”نہیں۔ میں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ صراحی کا وہ سرخ سیال میرے لیے۔“

اس کے بوڑھے ہونٹ سون کے جوان لبوں میں پوسٹ ہو گئے۔ اس طویل بوسے کے دوران وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔
 ”بے وقوف ڈاکٹر! جس طرح تم ان ہونٹوں کے قریب آئے ہو اسی طرح آب حیات کو لہر جام بھی ان لبوں کو چومنے آئے گا۔“
 بندر ان کی طرف دیکھ رہا تھا خوشی بارہا تھا اور اچھل اچھل کر اور چیخ کر کسی خطرے کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔



نومی رات گزر چکی تھی۔ لیبارٹری میں زیر و پا در کالبل روشن تھا۔ جس کی روشنی پورے مٹی مٹی سی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر لیبارٹری بند کرتے وقت بندر کی خاطر زیر و پا در لب روشن رکھتا تھا۔ اس وقت بندر اپنی بندرہ کے ساتھ مزے کی نیند سو رہا تھا۔ اچانک کئی ٹپکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

ایک سایہ لیبارٹری میں حرکت کر رہا تھا۔ وہ اچھل کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں پر ہاتھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا۔

سارنگ کے اسکرٹ اور بلاؤز میں سون بارڈلے کے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی لیبارٹری کے وسط میں اگر چند لمحوں تک دم سادھے کھڑی رہی اور گہری نظروں سے وہاں طرف کا جائزہ لیج رہی۔ پھر وہ قدم جما کر آہٹ پیدا کیے بغیر شیشے کے شوکیس کے لٹائے اور اسے کھول کر آب حیات کی صراحی کو باہر نکال لیا۔

سرخ سیال کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیات جادوؤں کی مسرتوں سے چپکنے لگیں۔ اس نے مرقی کو کینز پر رکھ کر اپنے دہشتی بیگ سے شیشے کی دو ٹیکلیں نکالیں۔ ایک ٹنگلی میں سرخ لہو لہا ہوا تھا اور دوسری ٹنگلی بالکل خالی تھی۔

مرقی کے آب حیات کو ٹنگلی میں ڈالنے لگی۔ جب صراحی کا آخری قطرہ بھی ٹنگلی میں ٹپکا تو اس نے ٹنگلی کو اچھی طرح بند کر دیا اور پہلی ٹنگلی کے سرخ سیال کو خالی صراحی میں ڈال دیا۔

اس جبین عورت کے بیٹھے لبوں پر کڑوی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے صراحی لپٹا لپٹا کر شوکیس میں بند کر دیا۔ پھر شیشے کی دونوں ٹیکلیوں کو اپنے دہشتی بیگ میں رکھ

”پھر یہ کہ میں صرف زمین پر نہیں رہوں گا چاند پر بھی جاؤں گا اور وہاں ایک ٹیڈا قائم کروں گا۔ دنیا بھر کے اخبارات میری تصویریں شائع کریں گے۔ اپنے گھروں میں ٹا کی جگہ میری تصویریں لگایا کریں گے اور مجھے اپنا ایور گرین باپ سمجھ کر میری پوجا کرنے رہیں گے۔“

اس کی باتیں ہارڈی مین کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ ایک ایشیائی باشندہ سائنسی دعوئیں اس سے بازی لے جائے یہ بات ناقابل برداشت سمجھا لے کر بیچ و تاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس نوجوان حیات کو ضرور حاصل کرے گا۔ عظیم صدیقی کو موقع نہیں دے گا کہ وہ اسے نوش کر لے لیکن اس وقت اس نے اخلاقی مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر عظیم صدیقی! تم واقعی عظیم ہو، میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔“
 ”شکریہ“ عظیم صدیقی نے کہا ”میرے دوستوں! اکل کی تاریخ بہت لمبی ہے مٹی کی سیبوں میں تم لوگوں کو کل صبح میرا آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ کل صبح تک یہ آب حیات استعمال کے قابل ہو جائے گا۔ میں تم لوگوں کے سامنے اسے نوش کروں گا تاکہ انسانی رپورٹوں کو تم بھی یہ بیان دے سکو کہ عظیم صدیقی ایک عظیم سائنس دان ہے۔“
 سون اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی اسے اور کبھی شوکیس کو دیکھ رہی تھی۔ اب حیات رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک ادائے ناز سے مسکراتی ہوئی عظیم صدیقی کے پاس آ گیا اور اسے قاطحانہ انداز سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”میری جان عظیم! تم نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی اتنی زبردست کامیابی پر محض زبانی مبارکباد دینا ایک طرح کی سنجوسی ہے، میں تم کو یہ ہوں، میں بڑی فراخ دلی سے مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔ زبان سے نہیں اپنے گلاب ہونٹ کی حرارت سے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ عظیم صدیقی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کے بل اٹھ گئی۔
 کے گفتگو چرے کو اپنی سانسوں کے قریب دیکھ کر عظیم صدیقی نے جذباتی لمبے لمبے کہا۔
 ”واقعی یہ مبارکباد کا سب سے خوب صورت انداز ہے۔ میں چاند کی دستانہ مبارکباد کے بعد مبارکباد دینے کا یہی طریقہ رائج کروں گا۔“

ابک انگلی سے بندر کی ٹھوڑی کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرے بے زبان دوست! اب میں تمہارے ساتھ قیامت تک زندہ رہوں گا اور فرار! اب اس مراچی کے آب حیات کو پی کر ہمیشہ کی نیند سوجائے گا۔ اس آب حیات کو ہم اپنی نوش کر سکتا ہوں لیکن میں نہ کھانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اس مراچی کی دوا پینے سے پہلے لگاؤ بدلی کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے طبی نقطہ نظر سے کوئی اہم تبدیلی کی تو میں بالکل طبی آب حیات میں وہی تبدیلی لاؤں گا۔ پھر اسے پی کر زندہ جاوید ہو جاؤں گا۔“

بہ کہ کردہ ابدی زندگی کے نقشے میں جھومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بندر کی نیند اچانک ہو گئی تھی اس لیے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تھائی سے اٹا کر بندر یا لیا چاہا۔ اس کی ستر سالہ زندگی میں وہ دوسویں بندر یا تھی۔ اس کے آقا جانتے تھے کہ انسان اور بندر کی ضروریات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ شاید ڈارون نے درست کہا تھا کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے انسان بن گئے۔ ڈارون نے ارتقائی منزلیں ذکر کیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ جہاں کی منزلیں طے کرتا ہوا انسان دوبارہ بندر بن سکتا ہے یا نہیں؟

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک بار پھر کھانا سنائی دیا۔ بندر نے سلاخوں کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھا یہودی جیمس تھا۔ اس کی دونوں ہاتھ لبادے میں چھپے ہوئے تھے۔ جیمس نے میز کے قریب آکر لبادے سے ہاتھوں کو نکالا تو اس کی گرفت میں دو ہتھیں تھیں ایک بوتل میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری بوتل خالی تھی۔

پھر اس نے بھی وہی عمل دہرایا۔ مراچی کے سیال کو خالی بوتل میں بھر کر اس نے دوسری بوتل کے سرخ سیال کو مراچی میں انڈیل دیا اور مراچی کو پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ کر دونوں بوتلوں کو پھر لبادے میں چھپالیا۔

ابدی زندگی کی دوا مفت حاصل کرنے کی خوشی سے وہ پھولا نہیں سارہا تھا۔ اس نے بندر کے سامنے دانت نکال کر کہا۔

”میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ڈاکٹر کو لاکھوں ڈالر دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ابے او بندر کی اولاد! اپنی زبان سے اگر اپنے آقا کو بول سکتا ہے تو بول دیتا کہ اب اس مراچی میں قدر رکھا ہوا ہے۔ میں یہ آب حیات مفت لے جا رہا ہوں اور اسے زہر بھی مفت دیئے

کردہ سبک خرابی سے چلتی ہوئی کٹہرے کے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

”مہر مکنی! کل تم اپنے مالک کا حشر دیکھ لیتا۔ اس نے قیامت تک زندہ رہنے کی دوا کی تھی لیکن اب اس مراچی کی دوا کی کردہ قیامت کے دن ہی آنکھیں کھول گئے گی۔ اسی وقت اس دوا کو نوش کر سکتی ہوں لیکن ڈاکٹر نے اسے پینے کے لیے جو دقت مقرر کر کے اسی وقت مجھے نوش کرنا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو۔ کل میں یہاں آؤں گی اور اس کا طریقہ استعمال دیکھوں گی۔ ویسے یہ آب حیات میں مفت نہیں بلکہ جاری ہوں، میں نے اس کے لیے ایک بوسے کی قیمت دوا کی ہے یہ احمق مرنے نہیں جائے کہ ایک عورت کا بوسہ بعض اوقات کتنا منگنا پڑتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے بندر کو ایک بوسہ دیا پھر فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی لباری گلی سے چلی گئی۔

بندر بہت دیر تک اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ شاید اس حقیقت پر غور کر رہا تھا کہ انسان کو اس کی طرح دوسروں سے چھیننے اور جھپٹنے کا عادی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بندر لالچہ کوئی بھی چیز چھین کر بھاگ جاتا ہے اور انسان اسی چیز کو دھوکے اور چال بازی سے حاصل کرتا ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد پھر ایک کھانا سنائی دیا۔ لباری گلی کے اندر دروازے کے قریب پھر ایک سایہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب سے گزرا تو بندر نے نہ پہچان لیا۔ وہ بارڈی مین تھا۔ اپنی ملک کا عظیم سائنس دان۔ وہ بھی آب حیات چراتا تھا۔ وہ سائنسی ددڑیں عظیم صدیقی سے پیچھے نہیں رہتا چاہتا تھا اس لیے وہ عظیم موجد ایجاد پر اپنے نام کی چھاپ لگا کر شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے شوکیس سے مراچی نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے لالچہ کوٹ کی جیب شیشے کی دو ٹکلیاں نکال کر ان میں زیر و پاوری روٹنی میں دیکھنے لگا۔ ایک ٹکلی میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری ٹکلی بالکل خالی تھی۔

اس نے مراچی کے سیال کو خالی ٹکلی میں بھرنے کے بعد دوسری ٹکلی کے بالکل مراچی میں انڈیل دیا اور اسے پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ دیا۔ پھر شیشے کی دونوں ٹکلی لالچہ کوٹ کی جیب میں چھپ چکیں۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کٹہرے کے پاس آکر

ہانے کے بعد اس مکمل آب حیات کو یا دوسرے لفظوں میں اس مکمل زہر کو ایک گلاس
لٹا دیئے گا۔

اڑائی اور جیس دم سادھے کھڑے تھے۔ عظیم صدیقی نے گلاس اٹھا کر قعرہ لگاتے
ہوئے کہا۔

”آب حیات۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ آسانی کنائیں کتنی ہیں کہ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے
بیکواس ہے میں موت کو شکست دے رہا ہوں اور ابدی زندگی کا مزہ چکھ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے زہر کے جام کو ہونٹوں سے لگالیا اور اسے غٹاٹ پینے لگا۔
”ٹوک۔۔۔“ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا۔ جام چھوٹ گیا
اور ٹوک۔۔۔ ٹوٹنے لگا۔ اس نے ٹوکھڑاتے ہوئے میز کا سارا لیا لیکن اس کے تمام جسم

کے اندر ایسی آگ پھیل رہی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اوندھے منہ گر پڑا۔
دوم توڑ رہا تھا اور جیس قعرہ لگا رہا تھا۔

”ہا۔۔۔ میرے دوست! کاش کہ تم میری بات مان لیتے اور میرے ہاتھوں سے
ذرات کر دیتے مگر تمہاری مانتوں کا شکریہ۔۔۔ تمہارا ایجاز کہ وہ آب حیات مجھے مفت
مائل ہو گیا ہے۔ پچھلی رات میں نے اسے صراحی سے نکال کر اس میں زہر بھر دیا تھا۔

ہا۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عظیم صدیقی پیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ بارڈی
لب جیس کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جیس نے اس سے پہلے آکر صراحی کا

آب حیات نکالا تھا یا اس کے بعد۔ اگر وہ پہلے آیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جیس سے
دعا کا ماننے والا ہے۔

جیس اس وقت اس خاص نکلی سے تین قطرے ایک بوتل میں ڈکا رہا تھا۔ بارڈی نے
اس سے پوچھا۔

”کیا تم پچھلی رات یہاں آئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔ جیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کس وقت؟“

”صبح ہونے سے کوئی دو گھنٹے پہلے۔“

جارہا ہوں۔ میں کل آکر اس کی موت کا تماشا دیکھوں گا۔ ہی ہی ہی۔“
وہ جیسے سروں میں ہنستا ہوا لیباریٹری سے چلا گیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور وہ بے چارہ بندر کسی اداس فلسفی کی طرح
پرہاتھ رکھے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری صبح لیباریٹری پھر آباد ہو گئی۔ رات کی تاریکی میں جو لوگ عظیم صدیقی کے
دشمن بن کر آئے تھے وہ اب دوست بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے لیکن لوگوں

سوں بارڈی نے نہیں تھی۔ عظیم صدیقی نے مسکراتے ہوئے بارڈی سے پوچھا۔
”کیا بات ہے آج تمہاری خوب صورت سیکرٹری نہیں آئی؟ ہائے کل کے پورے

لذت مجھے ابھی تک یاد ہے۔“
بارڈی مین نے اپنی رست و اچ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جائے لیکن یہ غور غمل
کے سامنے میک اپ کرنے بیٹھتی ہیں تو پھر وقت کا خیال نہیں رکھتیں۔“

”بہر حال میرے لیے وقت کی پابندی لازمی ہے۔“ عظیم صدیقی نے شوکتی
صراحی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

بارڈی اور جیس کے دل دھڑکنے لگے۔ آج ایک عظیم سائنس دان ان کے زہر
ہلاک ہونے والا تھا۔ انہوں نے آج تک کسی کو ایک لمبا غنیمت بھی نہیں مارا تھا لیکن!

زندگی کی خواہش انہیں قاتل بنا رہی تھی۔
ڈاکٹر عظیم صدیقی نے ریک کے مختلف سوراخوں میں لٹکی ہوئی شیشے کی ٹنگلا

سے ایک نکلی کو نکال کر کہا۔
”مشر بارڈی! اس نکلی میں کون سا سیال ہے؟ اسے میرے سوا کوئی نہیں ہانتا۔

نے اپنی ڈائری میں آب حیات کا جو فارمولا لکھ رکھا ہے اس میں اس نکلی کا ذکر نہیں
”صاف نہیں کیا ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی کمی کے باعث میرے باپ دادا کو موت کے

میں جانا پڑا۔ اس کے صرف تین قطرے صراحی میں ڈکا دیئے جائیں تو یہ آب حیات
ہو جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تین قطرے صراحی کے سیال میں ڈکا دیئے۔ پھر صراحی کو ابھرا

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بیٹا

اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو ایزیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کئے لگا۔

”میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب یہ دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار دیا۔

”آفس!“ ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے

نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سسلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کیے گیا

چھینکتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک

کئی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے عمارت سے دونوں لاشوں کو بکچے

ہوئے کہا۔

”بہ وقت لاپٹی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنس دان

تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم

تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے رائے بھی بھول

کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔“

وہ حاصل کیے ہوئے آب حیات میں اسی خاص نگلی سے تین قطرے ڈکائے۔

”یہ ہے اصلی آب حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس داں جس نے اس آب حیات

فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمائی کے اندیرے میں جا چکا ہے، اب میری شہرت کا

ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو لے گا

ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سبک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت

ہاں ہی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بیٹا

اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو ایزیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کئے لگا۔

”میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب یہ دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار دیا۔

”آفس!“ ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے

نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سسلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کیے گیا

چھینکتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک

کئی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے عمارت سے دونوں لاشوں کو بکچے

ہوئے کہا۔

”بہ وقت لاپٹی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنس دان

تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم

تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے رائے بھی بھول

کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔“

وہ حاصل کیے ہوئے آب حیات میں اسی خاص نگلی سے تین قطرے ڈکائے۔

”یہ ہے اصلی آب حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس داں جس نے اس آب حیات

فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمائی کے اندیرے میں جا چکا ہے، اب میری شہرت کا

ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو لے گا

ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سبک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت

ہاں ہی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بیٹا

اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو ایزیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کئے لگا۔

”میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب یہ دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار دیا۔

”آفس!“ ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے

نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سسلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کیے گیا

چھینکتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک

کئی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے عمارت سے دونوں لاشوں کو بکچے

ہوئے کہا۔

”بہ وقت لاپٹی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنس دان

تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم

تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے رائے بھی بھول

کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔“

وہ حاصل کیے ہوئے آب حیات میں اسی خاص نگلی سے تین قطرے ڈکائے۔

”یہ ہے اصلی آب حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس داں جس نے اس آب حیات

فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمائی کے اندیرے میں جا چکا ہے، اب میری شہرت کا

ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو لے گا

ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سبک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت

ہاں ہی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بیٹا

اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو ایزیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کئے لگا۔

”میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب یہ دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار دیا۔

”آفس!“ ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے

نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سسلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کیے گیا

چھینکتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک

کئی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے عمارت سے دونوں لاشوں کو بکچے

ہوئے کہا۔

”بہ وقت لاپٹی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنس دان

تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم

تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے رائے بھی بھول

کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔“

وہ حاصل کیے ہوئے آب حیات میں اسی خاص نگلی سے تین قطرے ڈکائے۔

”یہ ہے اصلی آب حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس داں جس نے اس آب حیات

فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمائی کے اندیرے میں جا چکا ہے، اب میری شہرت کا

ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو لے گا

ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سبک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت

ہاں ہی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے

درمیان آکر گر پڑی۔ اب چوتھی لاش کا بھی اضافہ ہو گیا۔
لیبارٹری میں سناٹا چھا گیا۔ بندر آئروں ہمیشہ اپنی دونوں تھیلیوں پر ٹھونڈا
ایک فلسفی کی طرح سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

انسان اسی طرح دوسروں کی زندگی جھینتا رہے گا اور اپنی زندگی سے بھی لاپرواہ رہے گا۔ وہ سب مر گئے اور وہ بندر انسانوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مرے
اس دنیا کے فنا ہونے کا تماشا دیکھنے کے لیے زندہ رہ گیا۔ لیبارٹری سے باہر نکلتے
لگا۔ سال گزر گیا صدیاں بھی گزرنے لگیں۔ وقت کے ہاتھوں نے اس لیبارٹری کو
بکاڑ دیا۔ اسے کھنڈر بنا کر آثار قدیمہ کے کھاتے میں لکھ دیا۔ وہ بندر پہلے جیٹا کرپٹ
پھر عجائب گمر بھیج دیا گیا اس کے بعد وہ ایک دن موقع پا کر عجائب گمر سے فرار ہو گیا۔
جان سکا کہ وہ ناقیمت بھٹکنے کے لیے کہاں چلا گیا ہے۔

اس عرصے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا تھا۔ کتنے ہی برا عظیم سمندر کی تہ میں پلے
اور کتنے ہی سطح سمندر پر ابھر آئے تھے۔ اس وقت بھی انسانوں کے درمیان ایک
کو قتل کرنے کا عمل جاری تھا۔ ایک انسان دوسرے انسان کو ایک مذہب دوسرے
کو اور ایک قوم دوسری قوم کو کبھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتی۔ جب سے انسان
زندہ رہنے کے تمدنی اصول سیکھے ہیں تب سے دوسروں کو مارنے کی تدبیر بھی

کامیابی سے آزماتے آئے ہیں۔ ان دنوں ہتھول اور بندو قبیلے پرانے زمانے کی چیز
تھیں۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے توڑدراخت کرنے گئے تھے۔ انسانوں
طریقوں سے مارنے کے لیے لیزر شعاعیں بھی کام میں لائی گئیں۔ لیکن ہواباز
انسان ہلاک کرنے کا نیا ہتھیار ایجاد کرتا تھا اور دوسرا اس سے بچاؤ کی تدبیر کر لیتا تھا۔
آخر چند بڑے بڑے دماغوں نے یکجا ہو کر سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دنیا کی
کم کرنے کے لیے دوسروں کو جبرا ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا طریقہ نہ پایا
لوگ خود ہی راضی خوشی مر جایا کریں۔

اس مقصد کے لیے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ سے پہلے
معلوم ہوئی کہ زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی بدل گئی ہے۔ کبھی
درجہ حاصل کرنے میدان جنگ میں جاتا تھا اور اپنی خوشی سے مرنا تھا۔ کبھی

فیت کے باطن پر کھیل جاتا تھا مگر اب اس کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ مرنے مارنے
بالے بذات اور احساسات کی طرف بھٹکتا بھی نہیں تھا۔

ہر ایک عالم فاضل عمر دراز مومن نے کہا کہ انسان کی فطرت بدل سکتی ہے لیکن جو چیز
انہوں میں ملتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے نہیں جاتی۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ عورت
بے عورت پر مرنا آپس بھر بھر کر راضی خوشی مرنے کی عادت اس کی ٹھنی میں پڑی ہے۔
ان کے لیے دستورِ ہوا آدم سے شروع ہوا اور ہزار ہا سالوں کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔
اس کے پچھلے کراس دور کی حسین و جمیل عورتوں کو ایک نئے ہتھیار سے آراستہ کیا
ایک بول تو وہ ہتھیار عورتوں کے پاس پہلے سے موجود تھا صرف اس میں دھار پیدا کی گئی۔
انہیں استعمال کرنے کے نئے طریقے سکھائے گئے۔ ان کی غزالی آنکھوں میں کچھ ایسا
نئی کسم کسم رکھا گیا کہ وہ حسینا میں جسے آنکھ مارتیں وہ ہائے کے ساتھ مرجاتا۔ پہلے
انہوں نے انداز میں مرنے سے اب جی جان سے مر کر اس دنیا سے رخصت ہونے لگے۔

اس طرح انسان گھٹنے لگے۔ چونکہ وہ راضی خوشی مر رہے تھے اس لیے دنیا کی آبادی
تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد بڑے بڑے دماغوں کو اپنی ایک غلطی کا علم ہوا۔ وہ
گھبراہٹ میں کہ عورتیں قاتل تھیں اور مرد مقتول اس طرح مردوں کی تعداد گھٹ رہی تھی
ان دنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس غلطی کی تلافی کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے دماغوں نے ایک مختلف
پلان پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کے جسمانی نظام سے وہ خانہ نکال کر پیچھنک دیا جہاں مادہ
انہیں آباد ہے اور بچے پرورش پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدائش کا عمل رک گیا۔
قدرت کے نظام میں ذرا بھی تبدیلی ہو تو انسان کی تہذیب بے سرمدل جاتی ہے اب کوئی
ان مذہب وال نہیں بنی تھی اب عورت محض داشتہ تھی کیونکہ جب عورت وارث نہ
پالے اور ایک نسل کو آگے نہ بڑھائے تو پھر پوری کے رشتے کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی
ہے لہذا عورت صرف اس مصروف کے لیے رہ گئی کہ وہ رات کو ساتھ سوتے اور دن کو

نفسِ ہمدی کے بعد مردوں اور عورتوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی۔ ہر ملک میں لوگ
انہوں کی تعداد میں رہ گئے۔ کچھ بڑے دماغ اپنی عمر گزار کر مر گئے جو بچ گئے انہیں

لے جیجی کریں کہ ایک عورت ہزاروں سال سے مٹی کے نیچے دبلی ہوئی ہے اور ہوا اور
دھنکے کے بغیر کچھ کھائے پئے اب تک زندہ ہے۔“

نوجی نے جواب دیا۔

”مٹی نہیں جانتا کہ وہ کیسے زندہ ہے البتہ منطق سے سمجھا سکتا ہوں۔ مچھلی روشنی اور
اکثر سمندر کی تہ میں زندہ رہتی ہے ایک کیرا روشنی اور ہوا کے بغیر مٹی کی تہ میں زندہ
ہے۔ دونوں کی زندگی کے لیے قدرتی طور پر خوراک ملتی رہتی ہے اس دیشیرو میں بھی
ہند اور مچھلیوں کی سی خاصیتیں ہیں۔ قدرت کا اپنا ہمد ہے جسے ہم اور تم نہیں سمجھ
ہندم نے آج تک جتنی بھی سائنسی ترقیاں کی ہیں وہ دوسروں کو ہلاک کرنے اور خود کو
بچانے کے لیے کی ہیں۔“

نوجی کے دلائل سننے کے بعد وہ اس مقام پر گئے جہاں وہ تابوت دفن کیا گیا تھا۔ دنیا کی
ہر مٹی ہی مختصر تھی اور وہ تمام مختصر آبادی اس جگہ آکر جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد بھی
اور عورتیں بھی تھیں لیکن کوئی بچہ یا نوجوان نہیں تھا کیونکہ نصف صدی سے پیدائش
لگ رہا تھا۔ پچاس برس پہلے جو جوان تھے وہ اب اسی نوے سال کے بوڑھے ہو گئے

”اب اس جگہ کو باری باری کھود رہے تھے کہ بڑھاپے کی وجہ سے مسلسل کدالیں
لا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں تمک کرنا پڑے گئے تھے پھر یہ کہ ہزاروں سال کی مدت
اس جگہ مٹی اور پتھروں کا اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹی سی پہاڑی نظر آتی تھی۔

اس پہاڑی کے اطراف انسانوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ رات کے وقت کھدائی کی رفتار
بڑھ گئی۔ ست رفتار کی کے باوجود یہ یقین تھا کہ صبح تک وہ تابوت برآمد ہو جائے گا۔

اس رات چند سمجھدار اور چالاک انسان ایک خیمے میں آکر کچھ خاص قسم کے
تیل کے لیے جمع ہو گئے۔ تیل کا کنواں ہو، سونے اور میرے کی کان ہو یا عورت کی قبر
بھی کوئی نایاب چیز کھود کر نکالی جاتی ہے تو عالمی سیاست میدان عمل میں آجاتی ہے۔
بڑھوٹے والی شے ہی ان کے لیے ایک نایاب عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جو اس
بائے لے انسانوں کو جنم دے سکتی تھی۔

اس خیمے میں چار بڑے آدمی یا چار بڑی طاقتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک

لوگوں نے مار دیا کیونکہ ان کی ہی وجہ سے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب اس دنیا کی
عورت ایسی نہیں تھی جو ماں بن سکتی اور اس دیر ان ہونے والی دنیا کو پھرتے سے بچاؤ
آباد کر سکتی۔

کوئی ہے ایسی عورت؟

اس دنیا کے بچے کچھ لوگ ایسی کسی عورت کو تلاش کرنے کے لیے ملک ملک
خاک چھاننے لگے لیکن ایسی کوئی عورت نہ ملی۔ اس دنیا میں جو عورتیں رہ گئی تھیں
پڑے ریکارڈ کی طرح تھیں جن میں سے پرانے جانے پہچانے سرنگٹے تھے مگر کسی سا
سے لوری کی حشرم آواز نہیں آتی تھی۔

پھر ایک نوجی نے بتایا کہ ایسی ایک عورت ابھی اس دنیا میں موجود ہے جو ابھی
ہے اور اس دنیا کی آبادی کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

اس نوجی نے اپنے علم کی قوت سے ہزاروں سال پیچھے ماضی کی تہ در تہ میں ہلکا
دیکھا تو اسے زمین کے ایک غلطے میں منوں مٹی کے تلے ایک تابوت نظر آیا۔ اس غلطے
کہا۔

”میں اپنے علم کی آنکھ سے ایک ایسی حسین دیشیرو کو دیکھ رہا ہوں جس کے حسن
مثال ہماری دنیا کی کوئی عورت پیش نہیں کر سکتی۔ میں اپنی سچی قوت سے جاسکا
اس تابوت میں اس کے سانسوں کی سرد گرم گونج رہی ہے۔ وہ ہزاروں سال سے زندہ
اور زندہ رہے گی۔“

ایک سائنس دان نے بے یقینی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک عورت ہزاروں سال سے کیسے زندہ ہے؟ ہم نے جہاں
سائنسی ترقیاں کی ہیں۔ سمندر کی تہ سے ہم آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچے ہیں۔ ہم
کے کتنے ہی اسرار بے نقاب کر چکے ہیں۔ قدرت کے صرف دو راز ایسے ہیں جہاں ہم
پہنچ سکے۔ ایک تو یہ کہ ربر کی مصنوعی عورت سے اصلی بچے پیدا کرنا اگرچہ ایسی عورت
بچے پیدا ہوئے تھے مگر وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے اس کو
ہمیں ناکامی ہوئی۔ ہماری دوسری کوشش یہ تھی کہ ہم ابدی زندگی حاصل کر لیں
کو ششیں ہر زمانے میں ہوتی رہیں مگر آج تک کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔“

طاقت نے کہا۔
 ”اس دنیا کی پرانی آبادی تقریباً ختم ہو چکی ہے جو رہ گئے ہیں وہ لولہ پڑا کے
 مرجائیں گے۔ اب نئی دنیا کے نئے انسان اس عورت کی کوکھ سے جنم لیں گے جو
 دستیاب ہونے والی ہے لہذا ہمیں آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ عورت ہم میں
 کس کے بچے کی ماں بنے گی؟ یعنی آئندہ دنیا کے آئندہ آدمیوں کا باپ کون بنے گا؟“
 ”میں بنوں گا۔“ دوسری طاقت نے کہا۔ ”کیونکہ میں بھی ایک بڑی طاقت ہوں۔“
 تیسری اور چوتھی طاقتوں نے بھی یہی دعویٰ کیا کہ وہ اس دنیا کے بڑے ہیں۔ ان
 دنیا میں صرف ان کی اولاد پھیلے گی اور پھلے پھولے گی۔ ایک طاقت نے کہا۔
 ”ہم میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ ہم آئندہ دنیا کے باپ بنیں۔ ہم
 طاقتوں نے اگر الگ الگ اپنے متعلق خود غرضی سے فیصلہ کیا تو پھر ہمارے درمیان
 چھڑ جائے گی۔ ہم اس دنیا کی ابتدا سے لڑتے آئے ہیں اس لڑائی جھگڑے کا نتیجہ
 ہمارے سامنے ہے۔ ہم تعداد کے لحاظ سے برائے نام رہ گئے ہیں اگر جنگ چھڑ جائے
 سب ہمارے جاکیں گے۔ اس دنیا میں ہم انسانوں کا یہ آخری وجود ہے۔ اس کے بعد
 ایک بھی آدمی کا بچہ نظر نہیں آئے گا لہذا دانش مندی یہ ہے کہ ہم آپس میں اس
 عورت کو بانٹ لیں۔ پہلے ہم میں سے کسی ایک کے پاس رہے گی۔ ایک سال کے
 جب وہ بچے کا باپ بن جائے گا تو پھر وہ عورت دوسری طاقت کے پاس چلی جائے گی۔“
 دوسری طاقت نے سر ہلا کر تائید کی۔
 ”ہاں ہزاروں سال پہلے جب کہ دنیا آباد ہوئی تھی اور جب انسان تہذیب کا
 اور شرم و حیا کے معنی نہیں جانتا تھا، ان دنوں بھی عورت مختلف وقتوں میں مختلف
 کے سرداروں کے بس بچے پیدا کرنے کے کام آیا کرتی تھی۔ ہماری اس دنیا کی
 تھی۔ انتہا میں بھی وہی بے شرم تہذیب آئی ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجبور ہی ہے۔
 دانش مندی ہوگی کہ وہ عورت ہر سال ہم میں سے ہر طاقت کے پاس رہے۔ یہ اچھا ہے
 دنیا میں صرف ہم چار طاقتوں کی اولادیں رہیں گی۔
 وہ چاروں اس دانش مندانہ فیصلے پر متفق ہو گئے۔ صبح کو دینے والے زمین کو
 تابوت تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کہ تابوت نظر آگیا ہے۔ صرف ایک ہی

چاروں اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تابوت کے اندر سے ٹھہر ٹھہر کر طبلہ بجائے گی
 اور نئی قوم تھیں۔

پہلے ہی انہوں نے اس تابوت کو سنبھال سنبھال کر اٹھایا اور اسے چار طاقتوں کے
 درمیان رکھ دیا۔ تابوت کے اوپر انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اونداھا پڑا ہوا تھا۔ اسے
 نازک لطف پیچک دیا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس تابوت کا اوپری حصہ کھل گیا۔
 بنے بے زواری سے آگے بڑھ کر دیکھا۔ اندر ایک حسین مرد جس اپنی آنکھوں پر
 ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی برسوں زمین کی مٹی میں رہنے کے بعد اب اس کی آنکھیں
 بناؤ مرنے کی عادی ہو گئی تھیں اس لیے وہ آنکھیں روشنی کو برداشت نہیں کر رہی

ہاں طاقتیں اس کے آس پاس بیٹھ گئی تھیں اور اسے بڑی نرمی سے چھو کر دیکھ
 لیں۔ ایک نے پوچھا۔

”تم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھ لیے ہیں؟ اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ ہم تمہاری خوب
 دیکھنا چاہتے ہیں۔“

شے نے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ اس نے ذرا سا آنکھیں کھولیں اور غوطی انگلیوں کی
 لیے ہلکی بار اس دنیا کے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ عجیب قسم کے لوگ تھے ان میں
 کے لیے چہرے پر تازگی اور شکستگی نہیں تھی وہ سب بوڑھے اور وقت کے طمانچے
 لگے ہوئے بھروسوں دار چہرے تھے۔ انہیں دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شے نے

انہیں ہدایت کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”تم کون ہو؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟ مجھے کیسی اندھیرے میں لے چلو یہ روشنی
 لانا انگوٹھوں میں چبھ رہی ہے۔“

انہوں نے اسے تابوت سے اٹھا کر ایک اسٹریچر پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی
 رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب اس نے
 کھلیں کھلیں تو خود کو ایک عالی شان محل کی ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں پایا۔ اس کے
 پاس دو نوکر کھڑے تھے۔ خواب گاہ میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں اس
 نے خود کو دیکھا جو اسے غسل کرانے اور نیا لباس پہنا کر دلہن بنانے آئی

نوں میں لے کر محبت بھرے مکالے ادا کرنے لگا۔

زین کی تہ میں آتش فشاں کی طرح پھیلنے والی شے کی کومالوں سے دلچسپی نہیں تھی لہٰذا اپنی مہر میں بائیس اس کی گردن میں حائل کر دیں۔ پھر اپنے لیوں کو اس کے بٹل پر رکھوا۔ بوسے کی پہلی حیل بڑی صبر آزا تھی اتنی دیر میں وہ جینے پینے ہو گیا تھا۔ خواب گاہ کے باہر اس محل کے باہر فوری طور پر ایک میٹرنی ہوم قائم کر دیا گیا تھا۔ یہ کھانا کھانوں اور نرسوں کی تقرری ہو چکی تھی۔ پرانے صحتکاروں کو بے باق بنانے کے لئے انٹنس جاری کر دیئے گئے تھے اور بوڑھی عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھ کر بھولی ہوئی رال یاد کر رہی تھیں۔

تمام لوگ نئی نسل کو خوش آمدید کہنے کے اختلالات میں مصروف تھے لیکن محل کے ”سانا تھا۔“ آدمی رات کے بعد اس دنیا کے پہلے بیٹر دم کا درد اذہ ایک جھٹکے سے کھلا نئی جھنڈا کر ”اوند“ کہتی ہوئی باہر نکلی اور اپنی خواب گاہ میں آکر اور ذرا آنسو بہا کر پھر پرکھنے سے لگا کر سو گئی۔

”ہملا بڑا“ بدامت سے مر گیا۔ سچ ج مر گیا۔ اس دنیا کو تباہ کرنے کے بعد جب اولاد ہو جائے ایک عورت کو فتح نہ کر سکے اور جب ایک عورت ”اوند“ کی ہنک آمیز بر جھی بنے گا تو اس کی حلی جائے تو اسے شرم سے مرجانا چاہیے تھا اس لیے وہ مر گیا۔

نئے دوسرے بوسے کے حصے میں آگئی۔

”مراد بڑا“ یہی سمجھدار تھا کہ وہ اپنے بوجھاپے اور شے کی جوانی کے درمیان دوئل کا مسئلہ ہے اس فاصلے کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ اتنا طویل سفر نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا نئی کو بھلا بھلا کر رکھا تھا اور اپنے خاص آدمیوں کو کسی ایسے شخص کی تلاش میں روانہ کر دیا جو اس دنیا کے بوڑھوں میں کم بوڑھا ہو۔ یعنی قدرے جوان ہو اور شے کی لکھن کا باپ بن سکتا ہو۔

محبوبہ یہ تھا کہ خفیہ طور سے باپ کوئی بنے گا۔ پھر اس گناہ باپ کو ہلاک کر دیا جائے لیکن اس طرح باپ کا ناکش اس دنیا کے دوسرے بوسے کو مل جائے گا۔

”دوسرے دن اس کے خاص آدمی دو ایسے بوڑھوں کو پکڑ لائے جو دو سروں کے مقابلے میں ایک طرف سے پچاس برس پہلے وہ نوزائیدہ بچے تھے اب وہ پچاس برس کے ہو گئے

تھیں۔ انہیں دیکھ کر شے نے کہا۔

”میں نے وہاں بھی بوڑھے دیکھے یہاں بھی بوڑھیاں نظر آ رہی ہیں آخر میں کون میں آگئی ہوں کہ کوئی نوجوان چہرہ نظری نہیں آتا۔“

اس کے جواب میں وہ بوڑھیاں اسے عجیب و غریب باتیں بتانے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ نصف صدی سے وہاں کسی نوزائیدہ بچے کی صورت نہیں دیکھی گئی ہے۔ لہٰذا میں جتنے میٹرنی ہوم ہیں وہاں پالتو کنوں اور بلیوں کے بچے جتم لینے ہیں۔ بے باق بنانے کرنے والی جتنی صنعتیں تھیں اب وہ بے باق بنانے لگتی ہیں۔ وہاں کی عورتیں بچوں سے کسی بچے کو سینے سے لگانے اور لوری سنانے کے لیے ترس رہی ہیں۔ اس دنیا کے بچوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اگر قانون قدرت کے خلاف عورتوں کی کڑا دی جائے تو یہ دنیا کس طرح اجڑ جاتی ہے۔

شے کی کوشش کر لیا گیا۔ اسے رفتہ رفتہ ہر بات معلوم ہوتی گئی کہ اتنی بڑی دنیا وہی صرف ایسی عورت ہے جس کی کھکھ سلامت ہے۔ اور وہ اس دنیا کو نئے سرے سے کر سکتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا کی آبادی اب صرف چند سو ہزار افراد مشتمل ہے جن میں نصف سے زیادہ عورتیں ہیں۔ باقی بوڑھے مرد ہیں اور لوگ رفتہ رفتہ موت کی طرف رینگتے جا رہے ہیں۔

حاصل کے بعد شے کی کو اس دور کا بہترین نیم ٹرائس بیئرٹ لباس پہنایا گیا اور کھانا کھلایا گیا پھر وہ بوڑھی عورتیں اسے اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے بیڑے لے گئیں اور اسے پھولوں کی سچ پر ہٹا کر آگئیں۔

شے کی سچ پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہی خوب صورت اور خواب گاہ تھی۔ دیواروں پر عیاں اور جذبات میں بیجان پیدا کرنے والی تصویریں تھیں۔ ہزاروں برس تک مٹی کی تہ میں ساکت و جاہد رہنے کے بعد پہلی بار شے کی میں انگڑائیاں مچنے لگیں۔ وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس دنیا کا پہلا بڑا خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوتی سی مسکراہٹ تھی۔ پھولوں کی سچ پر سترہ سال کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر گما سانس لینے لگا پھر وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ

تھے۔ انہیں مکمل بوڑھا نہیں کہا جاسکتا تھا وہ اچھے عمر کے تھے اور کافی صحت مند نظر آتے تھے۔

ان کی صحت کو دیکھ کر دوسرے بڑے کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر شے ی ان میں سے ایک کو پسند کر لیتی تو پھر اس دنیا کے بیٹوں کی ملکیت بننے سے انکار کر دیتی کیونکہ عورت کی بڑے کی بڑی بین کر کھو کھلی دنیا کی حکمرانی نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایسی مسرتور ہکی تحیکل چاہتی تھی اس کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔ وہ ایک جوانمرد کی آرزو کرتی ہے اور اسی کی آغوش میں بے اور مرنا چاہتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ اپنے بچوں کے باپ کا نام بھی غرے لیتی ہے بلکہ کسی بوڑھے کے وجود پر باپ کا جھوٹا لیل لگا کر اپنی آئندہ نسل کی توہین نہیں کرتی۔

دوسرا بڑا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے مجبور ہو کر تیرے اور بڑے بڑے سے مشورہ کیا۔ وہ بھی حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ گئے اور اپنی کمزور بیل پلٹ اعتراف کر لیا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ جب ہم سے ہماری اولاد نہیں ہوگی تو پھر یہ دنیا یا انسانوں سے خالی ہو جائے، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا لہذا اس دنیا کو ہوجانے دو۔ ہم یہ توہین برداشت نہیں کریں گے کہ کسی دوسرے کی اولاد اس دنیا پر ظا کرے۔

اب اس دنیا میں صرف دو ہی نیم جوان اور نیم بوڑھے ایسے تھے جن میں باپ نے صلاحیتیں تھیں اور جو وہاں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ تین بیٹوں کے حکم سے انہیں لڑا گیا اور ان کی لاشیں چھپادی گئیں۔ اس کے بعد شے ی کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب بھی جا کر اس دنیا کو آباد کرنے کے لیے اپنی قسمت آزما سکتی تھی۔

اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا بیٹن اس میں سکنا۔ وہاں صرف ایسے تھے جو بھسا پے کی آخری منزل پر اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ مایوس ہو کر رونے لگی۔ وہ تابوت میں دفن ہو گئی تھی۔ اچھا یہ تھا وہاں سکنا تھی۔ اب اسے قبر سے نکال کر اور اس کے جذبات بھڑکا کر اسے رونے کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ جگہ جگہ جاتی تھی کبھی فریاد کرتی تھی اور کبھی ان پر لعنت و ملامت کرتی تھی۔ "یہ کیسی دنیا ہے؟ کیا یہ ان ہی انسانوں کی دنیا ہے جنہیں اشرف المخلوقات کا ہے۔ ذرا آئینہ اٹھا کر دیکھو تمہارے مردہ چہروں پر کیسے پھٹکار برس رہی ہے۔"

تم بچے تھے کہ بچوں اور جوانوں کے بغیر تمہاری دنیا آباد رہے گی۔ کیسے رہے گی؟ ایک وقت کا نام ہے جو پھول کھلاتی ہے فصل اگاتی ہے اور عورت کو ماں بناتی ہے۔ ہفت سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ تم سب احق ہو، تم نے اپنی تقدیر کو خدا کے بجائے ہانکے ہار بڑے شیطانوں کے حوالے کر دیا۔ وہ بڑی طاقتیں تمہاری تقدیر کی مالک بن گئیں۔ انہیں انسانی موت مارتے تھے اور زندہ رکھنے کے لیے گندم کی خیرات دیتے۔ انہوں نے آبادی کم کرنے کے لیے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی کھاجا ڈوری اور اب بچت تم اپنی اور اس دنیا کی تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہو۔

وہ جال جاتی تھی فریاد کرتی تھی اور روتی تھی، روتے روتے وقت گزرنے لگا۔ رات ہوئے وقت کے ساتھ بوڑھیاں اور بوڑھے مرنے لگے۔ ان تین بڑی طاقتوں کی کمزور اولاد وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔

بقیہ دور ان ہو گئیں۔ راستوں میں دھول اڑنے لگی۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی اور بے بسی چھایا ہوا تھا۔ وہ دور ان بیستوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھٹکنے لگی۔

جنگلوں میں چھمکتے ہوئے پرندے اور غراتے ہوئے درندے تھے وہ دنیا اب انہیں سے آباد تھی اور وہاں ہر پرندے اور ہر جانور کا جوڑا تھا صرف شے ی تنہا تھی۔ ہانکے جوڑوں کا تھا وہ قیامت کے انتظار میں تنہا بھٹک رہی تھی اور قیامت کا دور دورہ بڑے نہیں تھا۔

ہانکے جنگلوں سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بلندی سے دھرتی نظر آتی تھی۔ لباس کے بغیر یہ دنیا نکلی ہو جاتی ہے اس لیے یہ دنیا نکلی نظر آ رہی تھی۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر صبح سے شام ہونے لگی۔ تب اچانک ہی اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ "ہی ہی ہی کی آواز تھی۔ آدمی انسانی ہی تھی، آدمی حیوانی ہی تھی۔" "ہی ہی ہی کی آواز تھی۔"

مانے ایک درخت کی شاخیں مل رہی تھیں اور پتیاں شور مچا رہی تھیں۔ پھر اس نے درخت سے ایک بندر چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آیا اور ایک قلابازی کھا کر کھڑا ہوا۔

شے نے حیرانی سے چلیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ وہ ایسا بندہ تھا جو دل کی تصویر کی مطابق ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسانی سراپے میں ڈھل گیا تھا اس کے بال وقت کے ساتھ ساتھ سوکے پتوں کی طرح جھڑ گئے تھے اس کے ہاتھ پاؤں کیڑے سیدھے ہو گئے تھے اور چار پاؤں کے بجائے دو پاؤں سے چلنے لگا تھا۔ وہ دو پاؤں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا سر جھکا کر کہا۔

”آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے پہچان لیا۔ آپ میری والدہ بزرگواروں سال سے پھڑے ہوئے ہیں اور آج پہاڑ کی اس چوٹی پر آئے ہیں۔“
شے می کو یاد آ گیا کہ اس کے خاوند عظیم صدیقی کے دادا نے اس بندہ کو آب پلایا تھا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔ میں تنہا تے پڑا تھی۔ اب مجھ سے باتیں کرنے والا ایک ساتھی مل گیا ہے۔“
”ہاں ہم باتیں کریں گے دیکھو یہ دنیا کیسی اجڑ گئی ہے۔“
”ہاں اب زمین پر میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“
بندر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”اب اس دھرتی پر ہم دو ہی جاندار رہ گئے ہیں۔ یہ دنیا بچوں کی ہنسی کے بڑا اس ہے آؤ ہم ایک نئی دنیا کی تیاری کریں۔“
یہ کہتے ہی اس نے شے می کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ ایک دم سے کلب نے دھڑکنے لگا۔

”آہ! کیا ڈرون کی تھیوری کے مطابق اب یہ آدمیوں کا باپ بنے گا؟“
اس خیال کے آتے ہی وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔



شیشوں کے مسیحا

ایسے مسیحاؤں کی کمائی
جو شیشوں کے نازک بدن
کو توڑتے ہیں پھر ہار پھپھتا
کرا نہیں پیار سے جوڑنے پر
مجبور ہو جاتے ہیں۔

ڈرائنگ روم کا بلب اونگھ رہا تھا۔ وہ بلب ان کی زندگی کے کمپار کی طرح اونگھتا رہتا تھا ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو ٹوٹی ٹوٹی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔
خالد نے بڑی مایوسی سے کہا۔

”ہاں بلبل ڈرائنگ روم کچھ سلیپے کا ہے۔ ایک صوفہ دس برس پرانا ہے۔ دوسرے کی لمبات برس ہے۔ تیسرے صوفے کی عمر کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی ایک ٹوٹی ہوئی انگ کو لکھ لیتا کافی ہے۔ ان کے درمیان جو سینئر ٹیبل ہے۔ اس کی سطح پر جا بجا خراشیں پائی ہوئی ہیں۔ میری خواہ سے اتنے پیسے نہیں بچتے کہ ان پر رنگ و روغن چڑھایا جاسکے۔ انگ ٹیبل کی بھی جی سی حالت ہے۔ اس کا عیب چھپانے کے لیے اس پر پلاسٹک کی چادر لٹائی گئی ہے۔ شیشے کا شوکیس برتنوں سے خالی ہے۔ وہاں تم نے شیشے کی ایک گڑیا کو بت لوں۔ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں ہر وقت یہ دھڑکنا لگا رہتا ہے کہ یہ کہیں ہٹ نہ جائے۔ اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ایسی گنتی ہے جیسے کوئی بوڑھی عورت اپنی فامی غیر بصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے پرانے زمانے کے مٹی کا کھل یا سرے سے کام چاروں بیکوئیکہ سنے زمانے کے میک اپ کے لوازمات بت بھیگے ہیں۔ اس بوڑھے ڈرائنگ روم تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”خالد! تم ہمیشہ دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو۔ دل ہوا یا کالج کی گڑیا! انہیں توڑنے کے بجائے سنبھال سنبھال کر رکھنے کا نام ہی زندگی ہے۔“
ایسا کہتے وقت وہ بڑی اداس نظروں سے شوکیس میں رکھی ہوئی کالج کی گڑیا کو دیکھ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں شبنم سی جتنے گئی۔ خالد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”ہاں! ہم تک ایک اس گڑیا سے کھیتی رہو گی؟“

وہ کہہ اور بھی کہتا جا رہا تھا مگر اسی وقت ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ اس آواز سے اس پر ہوا برس گونج اٹھیں۔

”تم قہقہے اتنی رات کو آئے ہو اور نشے کی حالت میں صوفیہ کو پھر باجی کہہ رہے ہو اگر کسی نے سن لیا تو؟“

بوڑھی ماں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم ایک قسم کا چھوٹا تھا۔ وہاں سے دوسرے کمرے کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک دروازہ خالد کے کمرے

شیشوں کے مسیحا

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر اور وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ صوفیہ کی ٹانگیں سے سراٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک آیا تھا اور وہ چابیوں کا سمجھا نکال کر مالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفیہ نے پریشان نظروں سے طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ لنگراتی ہوئی اس کے پاس آکر کھنکھناتے دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا مرنے کے باعث اسے بک بک جانا تھا۔

”آدھی سستی آسانی سے قبر میں اتر جاتا ہے مگر ایک چابی اپنے سوراخ میں نہیں جاسکتی۔ جب تک سانس چلتی رہتی ہے۔ زندگی کی چابی اسی طرح ادھر سے ادھر نکلتی رہتی۔ مالا کھلتا ہے، نہ سوچی ہوئی جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔“

وہ نشے میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
”خالد! تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ آدھی رات کو اگر بڑبڑایا نہ کوئی نہ گئی۔ لاؤ! میں دروازہ کھولتی ہوں۔“

وہ اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولنے لگی۔ خالد نے دروازے پر کہا۔

”دروازہ کھولنا۔ بتی نہ جلاتا۔ یہ اندھیزا ہماری بہت سی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔“

”اپنی کمزوریوں کی طرف سے آنکھ بند کر لینا اچھی بات نہیں ہے۔ تمہارا خانہ کہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ دوسرے کمرے میں ڈھنگ کا سامان نہیں ہے۔“

آنکھڑے ہوئے ہیں۔ تم اب اپنے کمرے میں جا کر ٹوٹی ہوئی چابی لے کر سو جاؤ۔ اندھیرے میں اس کمرے کو قبول کر لیتے ہو مگر روشنی میں اس ٹوٹی ہوئی چابی کو چاہتے۔ تم یہاں ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں سو جاتے؟“

نہل کر کالج کی گزرا اٹھائی۔ وہ جتنی عمر کی گزریا بتائی گئی تھی اس کی وہی عمر اس کے کالج کے دوستوں نے گھڑی گئی تھی۔ اس وقت پوڑھی ماں نے بڑی حسرت سے سوچا۔ کاش کہ صوفیہ کی دہلی گھر جاتی۔ وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ اسے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ اس کے قریب بیٹھنا چاہا تو ٹوٹی ہوئی چارپائی احتجاج کرنے لگی۔ وہ مجبوراً فرش پر لیٹنے لگی۔

”تم روز تو میری رات کے بعد آتے ہو۔ فضول سے نشے میں پیسے برباد کرتے ہو یہی بچا کر تم صوفیہ کو دلہن بنا سکتے ہیں۔“
”کس کی دلہن؟“

بیٹے کا سوال ماں کے دل میں نشتر بن کر چھ گیا۔ دلہما کا دور دور دور تک پتا نہیں تھا اور وہ دلہن بھی کو دلہن بنا کر بٹھائے رکھتی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو وہ دلہن بنے گی ہی۔ اسی امید نے لے لیا۔

”کسی دلہما کو بلانے سے پہلے دلہن کو ہنا سنوار کر رکھنا پڑتا ہے۔ جس گھر میں وہ رہتی ہے وہاں بھی خود ہونا سب سے سجا ہونا ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں قسطوں پر سنے صوفیہ کو بلانے سے پہلے تو وہ بچہ بچا کر دروازے کھڑکیوں کے لیے نئے پردے لے آئیں۔ یہاں دلہن کی نمائش کیے بغیر کام نہیں بننا سکتا تم اس فضول نشے میں پیسے برباد کرتے ہو۔“
دلہن نے کوٹ بدل کر کہا۔

اسی ہاسٹے سے سستا صوفہ ایک ہزار روپے میں آئے گا۔ سستے پردوں اور کمرے مارگروہن دو فن میں مزید ایک ہزار روپے خرچ ہوں گے اور میں جو سستی سی شراب پیتا ہوں اس کا پورا چھ روپے میں آتا ہے۔ میں چھ روپے خرچ کر کے اس غم کو بھول جاتا ہوں اور ایک دو ہزار روپے کہیں سے نہیں ملیں گے۔ یہ نشہ لعنت نہیں ہے بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم تک تمام محرومیوں کو بھول جاتے ہیں اور میں کو سنا روز روز پیتا ہوں۔ مگر کبھی پہنچنے جینے کے لیے شراب پی کر مرنے کی اجازت دیا کریں۔“

دلہن نے اسے نہ کہا۔ اس گھر میں میری بہو آجائے گی تو تم بہت سے غم بھول جایا کرو گے۔ اگر کبھی آپ کی بہو آئے گی تو کچھ پرانے غم بھول جائیں گے مگر بہت سی نئی

میں کھلتا تھا دو سرا دروازہ ان کی ماں کے کمرے میں لے جاتا تھا۔ تیسرے دروازے کا پیچھے باورچی خانہ تھا۔ اور چوتھا دروازہ باہر سے آنے والوں کے لیے تھا۔ صوفیہ کے لیے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ اس کا سامان ماں کے کمرے میں رہتا تھا اور رات کو وہ درانگہ صوفیہ کے فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔ ان ماں، بیٹے اور بیٹی کی سب سے پہلی اور اہم بات ہوتی تھی کہ کوئی سمان ان کے یہاں نہ آئے ورنہ اوپر سے جو خوش پوشی کا بھرم قائم ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ ماں نے قریب آکر پوچھا۔

”بناؤ تم نے صوفیہ کو باہی کیوں کہا؟“

”ای! باہی مجھ سے بڑی ہیں اس لیے میں انہیں باہی کہتا ہوں۔“
ماں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ہزار بار منع کیا ہے کہ شراب نہ پیا کرو۔ نشے میں کچا شروع کر دیتے ہو۔“

”ای! جھوٹ بول کر دیکھ لیا۔ اب تک کہیں سے باہی کا رشتہ نہیں آیا۔“
”تم پھر باہی کہہ رہے ہو۔ اتنے لیے چوڑے جوان ہو، لوگ تمہیں دیکھ کر تمہارا بہن کا اندازہ لگا لیں گے اگر تم اسے صوفیہ کہہ کر پکارا کرو گے تو تمہارے ایک نام بدلے سے اس کی عمر تم سے پانچ دس برس کم ہو جائے گی۔ بھاگتے ہوئے رشتوں کو پکڑنے کے لیے بھاگتی ہوئی عمر کو پکڑ کر جھوٹ کے شوکیس میں بند کرنا ضروری ہے بیٹے۔“

خالد کے دماغ میں نشہ گھوم رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس چکراتے ہوئے منظر میں اس نے دیکھا اس کی بہن ڈنگاتی ہوئی شوکیس کی طرف جارہی ہے۔ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ وہ نشے میں نہیں تھی ڈنگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ایک پاؤں میں معمولی سا نقص تھا۔ چلتے وقت وہ دائیں طرف ایک ذرا سی یوں جھک جاتی تھی جیسے تقدیر لائے مار کر ایک طرف گرائی جارہی ہو وہ سنبھلتی جارہی ہو۔ چال میں اتنی معمولی سی لتکڑا ہٹ تھی جو پہلی نظر میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اگر وہ چیزی سے چلتی تو یہ عیب بھی چھپ جاتا لیکن قدرت نے عورت کو کبکب لہروں کی طرح بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ سیلاب کی طرح نہیں گزر سکتی تھی۔ چلاؤ کی ایک جاذبیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔

وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے شیشے کی دیوار کو ہٹا کر بڑی محبت اور

گناہ ہے کہ سب لوگ مجھے نظر لاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔“

”تم کیوں احساس کسری میں مبتلا ہوتی ہو۔ تم تنگزی نہیں ہو۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ کوئی بظاہر جسمانی طور پر کھل ہوتا ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی چھپی رہتی ہے۔ چھپی ہوئی خرابی ظاہری عیب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دیکھو! خود کو تسلی دینے اور سمجھانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اگر تم خود کو گراؤ کی تو دوسرے لوگوں کو افسوس گئے۔ تم خود کو یہ سمجھاؤ کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو تم سے زیادہ تنگزی ہیں۔ تم ان سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کیس سے قرضہ لے کر اور قسطوں میں سامان لے کر اس ڈرائنگ روم کو سجاؤں گی۔ کراچی جیسے شہر میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ہم انسانوں کی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ تم سوجاؤ۔ فکر نہ کرو۔ فکر کرنے کے لیے ابھی میں زندہ ہوں۔“

ماں نے اس کے ہاتھ سے کانچ کی گڑیا لے لی پھر اسے شوکیس میں رکھتے ہوئے بیڑا لے گئی۔

”ہر بڑے آدمی کے گھر کا دروازہ اس کے ڈرائنگ روم سے کھلتا ہے۔ آنے والوں کو صرف ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے۔ اپنی انہی حیثیت کی نمائش کرنے کے لیے اس کمرے کو خوب سے خوب سجایا جاتا ہے۔ کسی ناول کا دریاچہ خوبصورت نہ ہو تو اس کے بعد ٹھوہنے والی کہانی کی ہیروئن کی خوبصورتی اور معیار کا پتا نہیں چلتا۔ ڈرائنگ روم کو ناول کے پیش لفظ کی طرح سجانا پڑتا ہے۔ اب میں یہی کر دوں گی۔

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھنے کے بعد بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ فرش پر بھیٹی ہوئی بڑا لپ بجا کر لیٹ گئی تھی۔ لیٹنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے سے ذرا بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ تنگزی ہی تنگزی ہے۔ لیٹنے کے بعد تو قیامت نظر آتی تھی۔ پکا ہوا بدن لباس میں چھپ کر بھی ہر طرف سے منہ زوری کرتا تھا۔ ماں سوچتی رہ جاتی تھی کہ اسے کس شوکیس میں بند کر کے رکھے۔ کھلا چھوڑے گی تو یہ کانچ کی گڑیا کسی کے ہاتھوں سے ٹوٹ جائے گی۔

دروازہ دھاتی ہوئی اور اپنی قسمت کو کوستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم بمب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ چپ چاپ چٹائی پر لیٹی ہوئی دیوار گھڑی کی ٹک ٹک سن رہی تھی۔ دیوار گھڑی زمانے کی ستانی ہوئی تھی۔ اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اس کے ذائقے

پریشانیوں اور نت نئی ضرورتیں آپ کی ہوسا ساتھ لے آئے گی۔ اہی! میں تو ٹھیک بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔ جب ایک بیوی کے لیے دل چلتا ہے تو میں کوئی نہ کوئی لیتا ہوں۔ جب ہم غریبوں کو عورت نہیں ملتی تو ظلم کی نئی ہیروئن مل جاتی ہے۔ سنبال کے اندھیرے میں وہ صرف ہمارے لیے گیت گاتی ہے۔ ہمارے لیے آہیں بھرتی ہے۔ دولت مند باپ کی بیٹی ہو کر ایک غریب سے شادی کرنے کے لیے رسم و رواج اور بڑے شان و شوکت سے بغاوت کرتی ہے۔ آخر میں مجھ جیسے غریب سے شادی کر لیتی ہے۔ سینما ہال کے اندھیرے سے نکل کر اندھیری گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے اس اندھیرے کمرے میں آجاتا ہوں۔ میرے ساتھ سینما ہال سے نکلی ہوئی دلہن بھی ہوتی ہے۔ دلہن بھی یہاں موجود ہے۔ اس کمرے کی جتنی جگہ کی تو وہ چلی جائے گی۔ جب بیٹے کے کمرے ہو موجود ہوں تو ماں کو وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ آپ چلی جائیں ای۔ کیوں میرا شوق کر رہی ہیں۔“

اس کی بیڑا ہٹ سن کر ماں اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور خود بھی بیڑا لے لی اس کمرے سے باہر آگئی۔ وہ کس کی ضرورت پوری کر سکتی تھی؟ بیٹا ایک بیوی کے بغیر بے گھر تھا۔ خالی سی زندگی گزار رہا تھا اور بیٹی سامکن بننے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی۔ لہذا بیٹے کے کمرے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ایک دولت مند ہوا سی کے کمرے میں آگئی ہو اور اس کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اس کے ساتھ۔

آگے سوچتے ہی اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ یہ آج کل کے لڑکوں کا رویہ کرنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ منج چائے کے لیے ایک پاؤ دو دو رکھا ہوا اقبال پر لیے وہ دو دو کمرے میں بھیجنا ہو گا۔ اس نے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی صوفیہ کو دیکھا والا سانا خواب ٹوٹ گیا کیونکہ بیٹی ابھی تک اپنی گڑیا کی عمر کو ہاتھوں میں لے بیٹھی تھا۔

نئے بیٹی کے پاس آکر کہا۔

”کب تک بیٹھی رہے گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے بڑا ہو گا۔ تجھے سیلیاں بنانا چاہئیں۔ دوسروں کے یہاں آتی جاتی رہے گی تو دوسرے والوں کی نظروں میں بھی آتی رہے گی۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”ای مجھے شرم آتی ہے۔ میں باہر نکلتی ہوں تو یہ سنا کر

”باقی بات دراصل یہ ہے کہ میں دن بھر مشین کے سامنے کھڑے ہو کر کام کرتا رہتا ہوں مگر میں انسان ہوں، مشین تو نہیں ہوں۔ میری بہت سی خواہشیں ہیں، بہت سی غور تم ہیں جو میری چھوٹی سی تنخواہ میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ملی تھمارے لیے کبھی ایک بھابی نہیں لاسکوں گا مگر دیکھو نا کسی سے دوستی کرنے سے میری زندگی ایک کی کسی حد تک پوری ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکی سے میری دوستی ہو گئی ہے۔“

”جہا۔“ صوفیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کون ہے وہ لڑکی؟ کہاں رہتی ہے وہ؟ میں نے اپنی بھابی بتاؤں گی۔“

”تم پھر جمونے خواب دیکھنے لگیں۔ یہاں کوئی لڑکی آسکتی ہے تمہاری بھابی نہیں آتی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ مجھے ساڑھے تین سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اس میں ہم ٹیل گاڑوا کر انیس ہوتا۔ چو تھی آئی تو ہم سب نالے کر رہ گئے۔ یہ بڑھتی ہوئی مزدگاری ہوا ہونے والی بیوی کو مجھ سے بہت دور لے گئی ہے۔ تم مجھے تقریر کرنے پر مجبور نہ کرو۔“

”ایک بات سنو۔ اس کا نام زیدہ ہے۔ دو ایک فیکٹری میں پینکنگ کا کام کرتی ہے۔ اس کا ٹنگری میری مل کے راستے میں ہے۔ روزانہ آتے جاتے ہماری جان بچان ہو گئی ہے۔ ج میں اسے دو چار گھنٹے کے لیے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے صرف باتیں کرنے کے لیے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔“

”تو پھر اسے یہاں لے آؤ۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ اسی کو یہ معلوم نہ ہو۔ انہیں معلوم ہو گا تو وہ اسے بھونانے کے بہانہ ہو جائیں گی۔ اور اس گھر میں جو خسارے کا بجٹ ہے اس میں ایک ہو کے لیے ہائٹ نہیں نکلے گی۔ دیکھو میں صرف تمہیں رازدار بنانا چاہتا ہوں۔ اسی کوچ میں نہ“

”جہا! نہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اسے کب لارہے ہو؟“

”کل لے آؤں گا۔ اسی صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے چلی جاتی ہیں۔ وہ دسپر کو تین بجائیں آتی ہیں۔ میں زیدہ کو گیارہ بجے لے کر آؤں گا۔ تم گھر میں رہتی ہو اس لیے میں تم رازدار بنا رہا ہوں۔ اسی کو نہیں بتاؤں گی؟“

”نہیں بتاؤں گی۔ اپنے بھائی کی خوشیوں کو اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی۔“

کے تمام نمبر تقریباً مٹ گئے تھے صرف پنڈولم کے ذریعے اس کی سانس چلتی تھی اور دونوں کانے ڈاکل کے سپاٹ صحرائیں اپنی زندگی کی مدت پوری کرنے کے لیے گونج رہے تھے۔ وہ کانے خود نہیں جانتے تھے کہ کس وقت کیا بجارہے ہیں مگر اس گھر کے رہنے والے دونوں کانوں کی پوزیشن دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ وقت کیا ہوا ہے۔ وہ کانے کبے اندھے سفر کی منزلیں ملے کر رہے تھے؟

صوفیہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کاش کہ میری عمر کے تمام نمبر بھی میری زندگی کے ڈاکل سے مٹ جاتے پھر اسی کے سوا کوئی یہ نہ جاسکتا کہ اس وقت میری عمر کیا بجارہی ہے۔ انسان ماہوس ہو کر کیسی کیسی امتحانہ باتیں سوچتا رہتا ہے۔ بڑا سوچنے سے کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر اس طرح زندگی کا کچھ حصہ دھوکے سے گزر جاتا ہے۔

خالد کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ اس نے دروازے سے سر نکال کر ب سے پہلے اپنی ماں کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی اسی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اور سونے والی صوفیہ کو غماز آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کے اندر جیسے سے نکل آیا تھا۔ سنہا مال کے اندر جیسے سے آئی ہوئی دلہن اس کے کمرے کے اندر جیسے سے گھرا کر بھاگ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا، خود کو ہوش حواس میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا، عزیز کے پاس آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ صوفیہ کا ایک ہاتھ چٹائی کے بستر سے باہر فرش پر آگیا تھا۔ اس کی ہتھیلی یوں کھلی ہوئی تھی جیسے بھائی سے وہ کچھ مانگ رہی ہو۔ بھائی اس کے قریب بڑ کر ذرا ہتھکچپانے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بوسھا کر بس کے ہاتھ پر رکھا تو اس وقت بری طرح کانپ رہا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ ملا تو صوفیہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے جیروانی سے بھال کو دیکھا پھر دھڑپنا سنہا لیتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”خالد! کیا بات ہے؟ تم اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”وہ بات یہ ہے کہ.....“ وہ کتے کتے جھجک رہا تھا۔

”تم پریشان کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں ایسی کیا بات ہے کہ میرے سامنے جھجک رہے ہو۔ مجھے بتاؤ اگر میں تمہارے کسی کام آسکتی ہوں تو انکار نہیں کروں گی۔“

گلیات ہے۔ اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔“
اس نے چونک کر آنکھ کھولی تو خواب کے ساتھ ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا۔ کسی نامراد
نہ جانے نہ جاننی آنکھوں کے سامنے کوئی دہلا دروازہ بند کرتا ہے نہ سوتی آنکھ کے پیچھے
اندھ ٹرسٹنٹ چمیل ہوتی ہے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ڈانگ ٹیبل پر
لڑکا ہوا ناشتے میں مشغول تھا۔ اسی اس کے پاس بیٹھی ہوئی سمجھاسی تھیں۔

”مہم پر جانے کی جلدی ہوتی ہے تو ذرا سویرے اٹھ جایا کرو۔ جلدی جلدی نوالے چبا
لکڑے کو باہر خراب ہو جائے گا۔ تم جانور تو نہیں ہو کہ بعد میں دنگلی کر کے ہضم کر لو
۔“

”اسی باہم مزدور تیل کی طرح دنگلی نہیں کرتے مگر کو لو کے تیل کی طرح محنت کے ایک
نور ہماری زندگی گھومتے رہتے ہیں۔ آپ چائے جیتی جانیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
اس کی مانی چائے کی پیالی پر جھکی تو وہ صوفیہ کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ
نہا۔ پچھلی رات رازداری کی بات ہو چکی تھی لہذا نظروں نے نظروں کو پہچان لیا۔
”کوہ اپنے بعدے پر قائم رہنا۔ امی کو کچھ نہ بتانا۔ میں گیارہ بجے زندہ کے ساتھ
لاگا۔“

شہر میں اس کی امی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا ”اتنی دیر میں خالد نے نظروں سے
کچھ سمجھا ہوا۔ پھر وہ اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے
ناتے لگا۔

”مے کہاں چلے ناشتا تو ٹھکانے سے کر لیا کرو۔“

”جی بیٹ بھر دکا ہے۔“

”پھر چائے پی لو۔“

”اسی آپ تو پیچھے پڑ جاتی ہیں چائے ڈیوٹی سے بڑھ کر نہیں ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“
ہر کسی کی پشت سے کوٹ اٹھا کر پہننے لگا۔ وہ کوٹ اس کے لیے پچھلے ہی ہفتے امریکا
نہا تھا۔ امریکا والے بڑے غریب پروردہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے غریبوں کے لیے
رک کے حساب سے جدید فیشن کے کوٹ چٹان بھیجتے رہتے ہیں۔ سردی کا موسم ابھی
نہا نہیں ہوا تھا مگر ہمارا کاموسم شروع ہو گیا تھا۔ زندہ کے ساتھ ذرا پیچھے کے لیے اس

خالد نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر
چلا گیا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا مگر صوفیہ کی آنکھوں کے دروازے کل
گئے تھے۔ نیند اچانک ہی اڑ گئی تھی وہ سوتا چاہتی تھی مگر اس کا دماغ اس کے دل کو ٹھنکے
دے دے کر پوچھ رہا تھا۔

”زیدہ یہاں کیوں آئے گی؟ ایک جوان لڑکی اس کے بھائی کے ساتھ کیوں آئے گی۔
یہاں کیا ہو گا؟“

وہ سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہ گھبرایا ہوا نظر آئے گا۔ اس
میں وہ بات ہونے والی تھی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ بات کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہ
آ رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے انکار کرتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کو شام
میں صبح ہونے لگی۔ اذان کے بعد ذرا آنکھ لگی تو اس نے خواب میں کسی اجنبی نوجوان
دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

”راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ ہم
دیکھتے رہتے ہیں تم میرے ساتھ میرے گھر چلو وہاں ہم عثمانی میں اطمینان سے پاروہ
کی باتیں کریں گے۔“

وہ خواب کے شہزادے سے کہنے لگی۔
”مجھے ڈر لگتا ہے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر کیسے جاسکتی ہوں۔ کسی نے کہا
تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

”کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم محبت کر رہے ہیں کوئی جرم تو نہ
کر رہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم ثنائی میں صرف باتیں کریں گے۔“
صرف باتیں ہی کرنے کی بات تھی وہ اپنے آئیڈیل کے ساتھ اس کے گھر میں آؤ
پھر اس کے کمرے میں پہنچ گئی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے محبوب نے دروازے
اندہرے بند کر لیا۔

اکثر خواب کلا ٹکس پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہاں
تک پہنچنے سے پہلے وہ خواب بکھر جاتے ہیں۔ جیسے ہی اس نوجوان نے دروازہ بند کر لیا
اس کی امی کی آواز نے چونکا دیا۔

”کیا تم کو گئی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی خوبصورت لڑکی قوت گویائی سے محروم
رہے گی۔“

اس کی بات سن کر وہ گھبرا گئی۔ ایک تو پہلے ہی قدرت نے اس میں عیب لگا دیا تھا اب
اسے کوئی سمجھ لیا تو کیا ہو گا؟ وہ کوئی تاثر حاصل کیے بغیر وہاں سے چلا جائے گا۔ وہ
نا مشکل سے چپکائی ہوئی بولی۔

”وہ نہیں ہیں۔“
”خدا کا شکر ہے کہ تم بولنے والی گڑیا ہو۔ میں تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ تم برائے
بڑا مومن کی چیز تعریف کی مستحق ہوتی ہے۔ تم ایک گڑیا کی طرح حسین بھی ہو اور معصوم
بھی۔“

موند کے کانوں میں شبتائی بج رہی تھی۔ اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ کوئی
ان کے ہارے میں بند کرنے کے لیے جین بجاتا ہے، کوئی اسے شبتائی کی آواز سمجھ لیتا
ہے اپنی اپنی سمجھ کی بات ہوتی ہے۔ اجنبی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
”مولے شادی نہیں کی ہے تم اس کی گھر والی تو نہیں ہو سکتیں۔ پھر کون ہو؟“

”ہم۔ میں ان کی بہن ہوں۔ بس آپ۔ آپ پہلے جائیں۔ میں دروازہ بند کروں
”چلا جاؤں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں خالد کے ساتھ مل میں کام کرتا ہوں۔ آج وہ
بازار نہیں آیا ہے۔ میں آؤں گے گھنٹے کی چھٹی لے کر اس کی خیریت معلوم کرنے آیا
ہوں۔ تم ہو کر دروازہ بند کر رہی ہو۔“

”جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جواب نہیں ملا۔ دروازہ بھی بند نہیں ہوا۔ کسی لڑکی کی
ٹانگی باؤسٹریب کچھ سمجھا دیتی ہے۔ اس نے پھر کھٹکار کر گھا صاف کرتے ہوئے کہا۔
”تم بہت اچھی ہو۔ میں پہلے بھی اس گھر کے سامنے آچکا ہوں۔ میری خالد سے باہر
بات ہو جایا کرتی تھی۔ آج پہلی بار دوشک دینے کا اتفاق ہوا۔ کتنا حسین اتفاق ہے۔
میں ایک بات مان لوں۔ پھر ایک بار اپنا چہرہ دکھاؤ۔ میں تمہاری صورت اپنے دل میں اتار
لے گا۔“

”اے کبے دل میں اتر جانے والے بول تھے۔ اجنبی نوجوانوں کے بازار سے اس

نے کوٹ پہن لیا تھا۔ اپنی شخصیت کو ذرا پرکشش بنانے کے لیے اس کے پاس اس
سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔

جب وہ چلا گیا تو صوفیہ کے لیے گیارہ بجے تک وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک
تک اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب
بجے اس کی ماں پر انہی اسکول میں بچوں کو پڑھانے چلی گئی تو باقی ایک گھنٹہ پائیں لگا
خالد کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا کہ اس کا اپنا خواب اسے پریشان کر رہا تھا۔
”توبہ۔ توبہ۔“ کیسا شرمناک خواب تھا۔ آج تک اس نے کسی اجنبی نوجوان سے
نہ کی تھی اور خواب ہی خواب میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔ توبہ توبہ
ایسا نہیں کروں گی۔“

وہ اس نفسیاتی الجھن کو نہ سمجھ سکی کہ لڑکی جس بات سے انکار کرتی ہے۔ لاشعور
طور پر خواب کے عالم میں اسی بات کا اقرار کرتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ
شرمیلی تھی اور اس قدر احساس کسری میں مبتلا تھی کہ کبھی کسی اجنبی کے قریب
گزرتے وقت بھی خود کو بالکل ہی حقیر سمجھ کر سرسری جاتی تھی۔

گیارہ بجنے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دوشک سنتے ہی اس کا دل تڑپا
وڑھ گئے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے ساتھ دوسرے گھر کا دروازہ
کر اندر جانے والی ہو۔ اس نے دروازہ کھولا تو خود کو ایک دم سے اجنبی ماحول میں لایا
اجنبی نوجوان دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آؤ لے کر اپنا
دوست کرنے لگی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟ سوچی آنکھ کے دروازے سے
جائگتی آنکھوں کے سامنے کیسے آیا ہے؟

صوفیہ نے دروازہ کھولتے وقت اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا کیونکہ وہ دروازے
دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی وہ بھی چند لمحوں تک گم صدم کھڑا رہا پھر اس نے کھڑا
صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”خالد کہاں ہے؟ میں اس کا دوست ہوں۔“
صوفیہ کے دماغ میں اس کی بات کا جواب موجود تھا مگر اس وقت وہ بولنا بھول گئی
اجنبی نے انتظار کے بعد پوچھا۔

نہا کر خاندان کی دوست لڑکی کو لے کر آئے گا تو وہ اپنی اس عارضی بھالی کے لیے ناشتے کا
پہلے کی مگر اس اجنبی نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ دونوں باتوں سے گریا کرتا تھا
اے ک آئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

دروازے پر احسن کھڑا ہوا تھا۔ اسے خلاف توقع دوبارہ دیکھتے ہی صوفیہ کی سانس اوپر
اوپر گئی۔ اسے فوراً ہی دروازہ بند کرنے یا اس کے پیچھے چھپنے کا ہوش نہ رہا۔ ہو سکتا
تھا کہ وہ ہوش رہا ہو اور یہ عقل آگئی ہو کہ بار بار دروازے پر آنے والے کو باپوس نہ کیا

اب وقت الجھے ہوئے خیالات کو سمجھنا ناممکن ہو رہا ہے۔ احسن نے مسکرا کر

میں نے دوبارہ حمیس دیکھنے کی آرزو کی مگر تم نے دروازہ بند کر دیا۔ حمیس نظر بھر کر
بائی کی منہ پر دیکھ کر اس کی ایک مرتبہ پھر دروازے پر دستک دوں۔ اب دیکھ لو کہ
میں کی مراد کس طرح پوری ہوئی ہے۔

میرزا ایک دم سے جھینپ کر دروازے کے پیچھے چلی گئی۔ اس وقت احسن کی
بہتر فہم بھی آ رہی تھی اور ایک انجانی سی مسرت کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ کوئی اسے
غور کرنے کے لیے کسی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس دروازے کے باہر کھڑا صرف اسی کے
منا رہا ہے مگر وہ خود زیادہ دیر تک اس طرح کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ سسے ہوئے
نکل دیا۔

اب اس طرح بار بار نہ آئیں۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔
مجھے بھی اپنی بدنامی کا ڈر ہے۔ پہلے میں نے اطمینان کر لیا ہے کہ یہاں آتے ہوئے
بائے نہ دیکھا نہیں ہے۔

میرزا اب چلے جائیں، میرزا دل گھبرا رہا ہے۔ اس کی آواز میں لطیف سی لرزش

پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرزا دل بھی گھبرا رہا ہے۔ مگر یہ محبت سے آشنا کرنے والی
رہن ہے۔ جب آشنائی کی بات آئی ہے تو مجھے اپنا نام بھی بتا دو۔ میں یہاں سے جانے
لے جس کس نام سے یاد کروں؟

دروازے پر پہلی بولی آئی تھی جو اس گناہ سی لڑکی کا بھلا بتا رہی تھی۔ اپنی تو دنیا
اندازہ ہونے کے بعد بھی اس میں اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ خود کو دکھانے کے لیے بیٹھا
سے سامنے چلی جاتی۔ وہ دروازے کے پیچھے ہولے ہولے لرزتی رہی۔ انہی سے
ہو کر کہا۔

”میں سمجھ گیا تم سامنے نہیں آؤ گی۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر میرا نام یاد کر لوں گی
کر لیتا۔ میرا نام احسن ہے۔ خدا حافظ۔“

اس کے بعد اس کی آواز گم ہو گئی۔ شاید وہ چلا گیا تھا۔ وہ بڑی پریشانی سے
کہ وہ سامنے کیوں نہیں گئی۔ آج کل کی لڑکیاں تو مرد سے ایک ہاتھ آگے نکل جاتی
میں پیچھے کیوں رہ گئی۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے دروازے کو بند کر دیا۔ اس کا
بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی شوکیس کے پاس آگئی۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑی
کھڑی ہوئی تھی۔ اس گریا کے سامنے بھی کوئی اجنبی آیا ہو گا مگر اس بے جاں لڑکی
کی دیوار نہیں بنائی ہوگی اس کی طرح دروازے کے پیچھے سے نکل کر اپنا کھڑا
ہو گا۔

اس نے شیشے کو ایک طرف سرکا کر گریا کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں
اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ آؤنگی کے
میں ہر ایک کو ایک نہ ایک ہم سفر مل جاتا ہے۔ زبیدہ کو بھی مل گیا۔ اور وہ اپنی لڑکی
چھپائے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

اس ڈرائنگ روم کے باہر جب تک وہ قدم نہ نکالتی سمجھنے والا اسے کوئی نام نہ
ملا۔ ماں نے اسے کئی بار سمجھایا تھا مگر وہ اپنے دماغ سے احساس کسری کو نہیں دیکھتی
اس لیے وہ کبھی کبھی بہت مجبور ہو کر باہر نکلتی تھی۔ کسی اجنبی کو دست ملا تو
ہے وہ کسی لڑکی کو سنبھلے ہاتھ سے بھی ہچکچاتی تھی اسی لیے باہر جا کر مثال دروازے
آ جاتی تھی۔ یہ تو پتا نہیں کیسے اتنی مدت کے بعد ایک اجنبی راستہ بھول کر آیا تھا
نے شرم و حیا کے باعث یا مادر دل خیال کے مطابق اپنی حماقت سے دروازہ بند کر
اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا واپس جانے پر مجبور کر دیا۔
پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ پچھلی رات سے اس نے

رات کو رات کی عمر بھرا دیتی ہے۔ یہ نہ ہو تو اس کے حسن اور اس کی شادابی پر ذرا سی بھی زانی نہیں آتی۔

دلن پڑا خوشوار تھا۔ کبھی کانوں میں شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ کبھی دل کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ رگ رگ میں نشہ سا کھل رہا تھا۔ دھک دھکا ہوا دل کی تھڑکیوں کے ساتھ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سننے ہی دل کی تھڑکیوں پر ہلچل مچ گئی۔ شاید وہ جانے والا پھر واپس آگیا تھا۔ وہ نظر داتی ہوئی دروازے کی طرف جانے ہوئے سوچنے لگی کہ اب دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنا نہیں کرے گا۔ پھر اسی دروازے کے پیچھے چلی جائے گی۔ پھر داغ نے سمجھایا کہ ایسی حماقتیں کرتے رہنے کو کر گئی ہے۔ اب بھی یہی کرے گی تو اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے بوڑھی بھانجی۔ بھلا کون عورت بوڑھی ہونا پسند کرتی ہے۔ اس نے بالکل سامنے ہو کر دروازہ کھولا۔

مگر وہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے خالد ایک سانپنی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ صوفیہ نے کچھ لاکھ دو زیدہ ہی ہوگی۔ زیدہ نے سر کے دوپٹے کو آگے کی طرف اتنا کھینچ لیا تھا کہ بالکل ہاتھوں تک اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے زیدہ کا ہاتھ تھام لیا اور

”تو اندر آ جاؤ۔ یہ دوپٹے کا گھونگھٹ یوں لگ رہا ہے جیسے بچ بچ میری دلہن بھالی“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی پھر اسے صوفیہ پر بٹھانے لگی تو خالد نے کہا۔ ”تم زیدہ سے بعد میں باتیں کر لیتا پہلے ہمیں ضروری باتیں کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کہ“

”جانتی جلدی نہیں آئیں گی۔“ صوفیہ نے زیدہ کو بٹھانے کے لیے اپنی طرف کھینچا۔ خالد اس کے ہاتھ میں آکر سرک گیا۔ گھونگھٹ والا چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔ تب صوفیہ کو یاد آئی کہ گھونگھٹ کے پیچھے چھپنے والی کی ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ اس کی ایک آنکھ پلکیں نہیں لگتی۔ مگر وہ سری آنکھ بالکل سادہ ہو کر کھلی رہتی تھی۔

صوفیہ اسے دیکھ کر سادہ ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ خالد کب زیدہ کو اس کے

گھڑیا اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ہائے اللہ کیا اب ایک نئی زبان پر میرا نام آئے گا۔ یہ سوچ کر خوشی تو ہوتی ہے مگر ڈر لگتا ہے احسن کی توجہ دے۔

”ایک گھڑیا تمہارے سینے سے لگی ہوئی ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے وہ۔ چلو اس کا نام بتاؤ۔ میرا دل اس گھڑیا کا نام پکارے گا تو تم میرے خیالوں میں آجایا کرو گی۔ کیا؟“

”صوفیہ۔“ شرماتی ہوئی زبان سے اپنا ہی نام ادا ہو گیا۔

”شکریہ۔ اب یہ بتاؤ، کیا تم روز اس وقت تمہارا ہمتی ہو؟ خالد نے اپنی اپنی کھانسی

تھا۔ وہ کہاں ہیں؟“

”وہ صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے جاتی ہیں پھر تین بجے واپس آتی ہیں۔“

”پھر ایک بار شکریہ۔ اب میں جا رہا ہوں، کل موقع دیکھ کر پھر آؤں گی۔“

صوفیہ نے گھبرا کر کہا۔ ”نہیں۔ نہیں آپ نہ آئیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”میں نے کہا تھا مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر آؤں گی۔ تم اطمینان

نہیں کرنا۔ نام نہیں ہونے دوں گا۔ خدا حافظ۔“

شاید وہ چلا گیا۔ صوفیہ دروازے کے پیچھے سے نکل کر اسے نہ دیکھ سکی۔ لڑکی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب وہ اپنے اور زیدہ کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ پتا نہیں وہ آنے والے کہاں گم ہو گئے تھے۔ خود آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی وہ دوبارہ اس کے دل کے دروازے کو کھول جائے۔ اس نے گھڑیا کو شوکیس میں رکھ کر شیشے کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب گھڑیا کی ہر سانس کی تھی۔ پہلی بار ایک مرد کی تعریفی نگاہوں نے اس کی عمر کا تعین کیا تھا۔ اس طرح کم از کم سولہ سال کی نہ سسی بیس سال کا سمجھ کر بھل گیا تھا۔ حالانکہ خالد سال کا تھا اور وہ خالد سے تین سال بڑی تھی۔ اس طرح عمر کا حساب لگاتے سال لگتا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر دیوار پر لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے کے پاس گئی۔ اسے احسن کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے اب تک کسی مرد کی نگاہوں نے توجہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل اچھوتی تھی۔ دراصل مرد کی انگلیاں اور اس کی

مکراتے دیکھ کر میری حشک دور ہو رہی ہے۔“

”کونک نیکل پر سالن اور روٹیاں رکھ رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس نے منہ
بلا۔“

مکرات کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی کہ شاید ماں نے چوری پکڑ لی ہے۔ ماں نے پھر
بلا۔“

”اب میرے پاس نہیں آؤ گی؟ کو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں۔“

”ہاں کے پاس جائے یا ماں اس کے پاس آئے“ بات ایک ہی تھی۔ وہ کترا نہیں سکتی
لی بے روپے کو سر پر سنبھالتی ہوئی ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ماں نے اس کے سر پر
ہاں کر لیا۔“

”مطمع ہوتا ہے کہ میری بیٹی کو بہت بڑی خوشی ملی ہے۔ کیا ماں کو اپنی خوشیوں میں
انہیں کو کو؟“

”ہاں نہیں ابی۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ پتا نہیں آپ میرے چہرے پر کیسی خوشیاں دیکھ
سکتی ہیں؟“

”اب میری شادی نہیں ہوئی تھی اس وقت میں بھی بہت سی باتیں اپنی ماں سے
رہتی تھی۔ ان دنوں میں اتنی خوبصورت تھی کہ اپنے ہی خاندان کے کتنے ہی چچا زاد
دادا بھوپتی زاد بھائی چھپ چھپ کر مجھے محبت کے پیغام دیتے تھے۔ ایک بار میں
مرض تھا تھی تو اچانک ہی ایک انجینی دروازے پر آ گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ
میں رہا۔ اس لیے کہ میں بے جا شرم کرنے والی لڑکی تھیں تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا تو میں
ہاں سے کہہ دیا۔ جانتی ہو وہ انجینی کون تھا؟ وہ تمہارا باپ تھا۔“

”اب ابی! میں بڑا حوصلہ دے رہی تھیں۔ صوفیہ کے دل کو اطمینان ہوا کہ اس کی ماں
بیمیں کوئی انجینی آیا تھا۔ اچھا تو ایسے انجینی جیون ساسھی بن جایا کرتے ہیں۔ ڈرنے
پات نہیں ہے۔ اگر یہ بات ماں بیٹی کے درمیان رہے تو کوئی تیسرا بدنام کرنے نہیں
سکتا۔ کوسوچتے دیکھ کر ماں نے کریدنا شروع کیا۔“

”ابا! ابی! تمہیں؟“

”ہاں نہیں۔ میں صبح سے گھر کے اندر ہوں۔“

”سامنے سے کھینچ کر لے گیا۔ وہ تو اپنی زندگی کے آئینے میں زندہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس لیے
نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو اس سے بھی زیادہ
عیب رکتی ہیں۔ لیکن وہ لڑکیاں اس کی طرح احساس کستری میں مبتلا نہیں رہتی۔ ہر
سے باہر نکلتی ہیں۔ محنت مزدوری کرتی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے جیز کے لیے ماں کو
پسند۔ وہ دل برداشتہ ہو کر یہ نہیں سوچتیں کہ انہیں کوئی جیون ساسھی نہیں ملے گا۔
میاں نے اس دنیا میں بھی کا جوڑا بنایا ہے۔ زندہ کو بھی اپنا جوڑا مل گیا تھا۔ مرنے
گھوم کر دیکھا تو خالد کے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔“

”وہ صوفیہ پر بیٹھ کر بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ انسانوں کی اس دنیا میں آگئی کے
ہی دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کراہ
دیکھنے والی کا داغ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کتنی
بڑھتا ہی جاتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کے داغ کے بند دروازے پر احسن دیکھ
دے کر بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب بہت کچھ سمجھانے سے کچھ کچھ سمجھ میں آتا تو نہ
ہی آپ شرمندہ ہو گئی۔“

”زیدہ ایک انجینی لڑکی کی طرح آئی تھی اور انجینی کی طرح واپس چلی گئی۔ مرنے
دل میں ڈھیر ساری آرزوئیں تھیں کہ وہ کس طرح اپنی عارضی بھالی سے ڈھیر ساری بائز
کرے گی مگر خالد نے اپنی باتوں میں بہت سارا وقت گنوا دیا تھا۔ اسی لیے زندہ اس
باتیں کیے بغیر چلی گئی تھی۔ خالد بھی اسے چھوڑنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے یہ علم
موقع نہیں ملا کہ اس کا ایک دوست احسن اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ تین بے جا
اس کی امی واپس آئیں تو بیٹی کو دیکھ کر ٹھنک سی گئیں۔ ماں نے پہلی بار اس چپ چاپ
رہنے والی لڑکی کے ہونٹوں پر وحشی وحشی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مسکراہٹ کل کر ماں
آئے تو عام ی خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جوان لڑکی کے ہونٹوں پر چھپ چھپ کر
کوئی خاص بات ہوتی ہے وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؟“

”زمانہ شناس بوڑھی ماں پہلے تو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔
کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ ٹوٹے ہوئے صوفیہ پر آرام سے بیٹھ گئی پھر بیٹی کو کاغذ پر
”صوفی! یہاں آؤ بیٹی! ذرا میرے پاس بیٹھو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ تمہیں چہ“

لہا ہا جان لینا کافی ہے کہ کیا کتا ہے۔ اور کیا بچتا ہے؟ اس میں سارے جہاں کے
 بچے ہوں مگر جواری نہ ہو۔ اس لیے کہ قمار بازی بہت بری لعنت ہے۔ بعض لوگ جوئے
 پرانی بیویوں کو ہار جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جواری نہیں ہوگا۔ تو یہ ہے، میں ہی
 اپنی بیوی بازی ہوں اور تم چپ بیٹھی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟
 ”حسن۔ انہوں نے خود ہی اپنا نام بتایا تھا۔“

”تم نے بھی اپنا نام بتایا ہوگا؟“

کہتے ہیں کہ مشرقی مائیں اپنی بیٹیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ ایسی باتوں سے
 بچوں کو بے حیائی کا سبق ملتا ہے۔ مگر شاید مشرقی روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ برصغیر ہوتی
 رہائی کے ساتھ لڑکے منگے ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے سے
 مائیں کا نام نہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اب روزانہ اجرت پر مزدور کی کرنے والے بھی اس
 کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں سے دولت لانے والی یا خود اپنی محنت سے دولت پیدا
 کرنے والی بیوی انہیں مل جائے۔ گھر سنبھالنے والی بھی باہر جا کر کام کرے گی تو دونوں کی
 لگائی سے زندگی گزر سکتی ہے۔ جب افراد کے سوچنے کا انداز بدلتا ہے تو ان کی روایات بھی
 بدلتی ہیں۔ معاشرے کا اندرونی ڈھانچہ بھی چپکے چپکے بدلتا ہے۔ چپکے چپکے ہماری مائیں اپنی
 بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں کہ اگر کوئی بھولے بھٹکے دستک دینے آجائے تو کس طرح نئے رشتے کا
 دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایسا چور سبق ہر گھر میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی تسلیم نہ کرے یہ
 روایات ہے۔

جب ماں حوصلہ دے رہی تھی تو بیٹی نے خاموشی سے سر جھکا کر اعتراف کر لیا کہ وہ
 اپنا نام بتا چکی ہے۔ اس وقت ماں کا دل سینے کی ہانڈی میں کھد بھا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹکے
 ہوئے مسافر کو عزت و آبرو سے دلا دینے کے لیے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ
 معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔
 ”کیا اس نے تمہیں دیکھا ہے؟“

”میں انجانے میں دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنے چلی گئی تھی۔ پھر جلدی سے
 دروازے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔“

”تم نے دروازہ تو جلدی سے بند نہیں کیا ہوگا؟“

”اچھا اچھا۔“ ماں نے سر ہلا کر کہا۔ ”تو پھر مجھے کوئی بلائے آیا ہوگا۔“

”آپ کو نہیں خالد کو۔“ وہ روانی میں کہہ گئی پھر جانے کہاں سے جھجک اُڑ گئی
 کریدنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے پھر سر ہلا کر کہا۔

”اچھا خالد کو کوئی بلائے آیا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”اس کا کوئی دوست ہوگا۔“

”جی ہاں۔ خالد کے ساتھ وہ بھی مل میں کام کرتے ہیں۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ
 آج ڈیوٹی پر۔۔۔۔۔“

وہ کہتا چاہتی تھی کہ خالد آج ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے اسی لیے اس کا ایک دوست
 خیریت پوچھنے یہاں آیا تھا۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا مگر بات زبان سے پھسل گئی
 ماں نے پوچھا۔

”تم رک کیوں گئیں؟ کیا خالد آج پھر ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے؟“

”آں۔ وہ گیا ہوگا مجھے کیا معلوم۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”تم سب جانتی ہو۔ بھائی کی باتیں مجھ سے چھپاتی ہو۔ اس نے توج پھر بند کیا
 محلے میں کہیں بیٹھا ناش کھیل رہا ہوگا۔“

”نہیں امی۔ وہ ناش نہیں کھیل رہے وہ تو۔۔۔۔۔“

”دیکھو صوفی! تم اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔ تمہاری معصومیت اور

گھبراہٹ مجھے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے؟“

صوفیہ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی اس کا دل سینے کے اندر اٹ پلٹ کر دھڑلہ
 تھا۔ اچانک ماں کو خیال آیا کہ وہ تو بیٹی کی خوشیاں معلوم کرنا چاہتی تھی اب اصل ہونہ
 سے ہٹ کر بیٹے کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔

”اچھا جانے دو۔ میں خالد سے پوچھ لوں گی۔ ابھی تو تم مجھے اپنی خوشیوں میں ڈر

کرد۔ صوفی۔ میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا دوست کیسا ہے؟ اس کے ساتھ لڑ
 کام کرتا ہے؟ اچھا کہا لیتا ہوگا۔ تم ایک ہی ملاقات میں اسے نہیں پرکھ سکتیں۔ میرا بھ

اسے پرکھ لے گا اور آج کل کسی کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ابہاں نے کہا۔

”عملی اتم اپنے بھائی کی کوئی بات چھپا رہی ہو۔“

مزید نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر فوراً ہی نظریں چرانے لگی۔ ماں نے کہا۔

”میں ماہر نفسیات نہیں ہوں لیکن اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر ماں باپ کو اتنا سلیقہ باپا کے کہ وہ ان کے مزاج کو سمجھ سکیں اور ان کی سوچ کو پڑھ سکیں۔ جب ہم کسی کی بات کرتے ہیں تو بات ختم ہونے کے بعد اسی کے متعلق سوچتے ہیں۔ ابھی میں خالد کی ناک روٹی تھی۔ لہذا اتم خالد کے بارے میں سوچ رہی ہو اور کچھ چھپا رہی ہو۔“

کچھ نہیں امی! آپ تو بس پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ آپ بھائی جان پر نکتہ چینی کرنے اور لڑائے ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ روز صبح سے شام چینی ہوئی مٹینوں کے ساتھ مشین نہیں بن سکتے۔ لوگ تو گھبرا کر دنیا سے بھاگ جانا پڑے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھی اپنی مل سے بھاگتے ہیں۔ آج بہت عرصے کے بعد انہوں نے ناخدا ابہاں سے دوست کے بعد وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ.....“

دیکھتے دیکھتے رک گئی۔ ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”دوست مذکر ہوتا ہے۔ تم مونث کے طور پر یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ اپنی ایک ت کے ساتھ۔ اپنی دوست کیا ہوتا ہے؟ یا تو تمہاری زبان کمزور ہے بعض اوقات تم کو ناخدا بتا دیتی ہو یا وہ سچ کچ کسی تائید کے ساتھ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ وہ شراب کے ناکھ کو فلفلی ہیروئنوں کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ سچ بتاؤ کیا اس نے اپنی کسی دوست کا تذکرہ تم سے کیا ہے؟“

مزید نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“

”تیرا۔“

”تیرا کہہ دینے سے میں کیسے سمجھ لوں گی کہ وہ کون ہے؟“

”اس کا ایک آنکھ نہیں ہے۔“

”کیا؟“ ماں نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ ”کیا فلم کی ہیروئن ایسی ہوتی ہے۔“

”مادری زندگی میں ایسی ہوتی ہے۔ مجھ میں بھی تو ایک نقص ہے۔“

”نہیں۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ جب وہ باتیں کرنے لگو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت دروازہ بند کرنا چاہیے یا نہیں۔“

”تم نے اچھا کیا جو دروازہ بند نہیں کیا مٹی۔ تم تو بیسویں صدی میں رہ کر بھی موبائل پر اپنی لڑکی ہو۔ تمہیں تو بچے کر کے سمجھانا ہو گا۔ ایسے وقت دروازہ بند کرنے سے تصور کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ہاں تو اس نے کیا کہا؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں بھی تمہیں کچھ سکوں۔“

اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ احسن کے بات کرنے کا انداز کیا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر ماں نے پوچھا۔

”اس نے تمہاری تعریف کی ہوگی؟“

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں خالد سے بات کروں گی۔ یہ لڑکا بالکل ہی ناگوار ہے۔ اس کی مل میں اور اس کے دوستوں میں کتنے کنوارے ہیں مگر وہ کسی کو دوست بنا کر گھر نہیں لاتا۔ پتا نہیں یہ جو احسن آیا تھا یہ کنوارا ہے یا شادی شدہ۔ میں خالد سے پوچھوں گی کہ وہ کبھی دو گھنٹی چپن سے بیٹھ کر بات ہی نہیں کرتا۔ آج بھی جلدی جلدی ناشاکر کے چلا گیا۔ ایسی جلد بازی کرتا ہے جیسے وہ نہیں جائے گا تو مل کی تمام مشینیں بند ہو جائیں گی۔ مگر سب دکھاوا ہے۔ وہ کام کرنے نہیں جاتا کہیں بیٹھ کر تاش کھیلتا ہے۔ آئے دو اسے دیکھ لیا آج کیسی باتیں سناتی ہوں۔“

صوفیہ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”امی آپ خالد سے کچھ نہ کہیں۔“

”کیوں نہ کہوں۔ کیا اسے جواری بننے کی آزادی دے دوں۔“

”امی بھائی جان تاش نہیں کھیلتے ہیں۔“

”وہ تاش نہیں کھیلتا ہے۔ ڈیوٹی پر نہیں جاتا ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟“

صوفیہ کا سر جھک گیا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی وہ ماں کو بھائی کے بارے میں سب

کچھ بتا دے۔ آخر وہ ماں ہے بیٹے کی محرومیوں اور نامرادیوں کو سمجھ کر چپ ہو جائے گی۔

جب مائیں بچوں کی خواہشیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہتیں تو چپ چاپ تماشا دیکھنے پر

مجبور ہو جاتی ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کے جھگے ہوئے سر کو دیکھ کر اس کی بہت سی چوریاں بکھڑکی

بھائی جان کے راستے میں پڑتی ہے۔ اس طرف سے آتے جاتے زبیدہ سے دوستی بڑھتی نہیں راستے میں ضروری باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اس لیے آج وہ زبیدہ کو بلالے آئے تھے۔ دیکھیے اسی آپ بھائی جان سے کچھ نہ کہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا اگر آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے مجھے اپنا راز دار بنایا ہے مگر میں کیا لکھا میرے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ آپ ان سے کچھ نہیں کہیں گی؟

”میں نہیں کہوں گی“ اسے آئے تو وہ۔ تو بے گھر میں جوان بہن ہے اور اس کے اٹل کی حرکتیں۔۔۔

”میں کتنی کتنی وہ تو ضروری باتیں کرنے۔۔۔“ صوفیہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔
”چپ رہو۔ کیا ضروری باتیں کرنے کے لیے یہی گھڑا تھا۔ کیا وہ اپنے کمرے میں پڑھا؟“

”میرے اٹل میں سر ملا دیا۔

”کیا اس نے دروازہ بند کیا تھا؟“

”میرے پھر سر ملا دیا۔ ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔“ کیسی خض لڑکی ہے۔ گڑیا کی طرح ماں میں گردن ہلائے جا رہی ہے۔ کیا یہ اندر سے کچھ نہیں سمجھتی ہوگی۔ جب میں ان کی تومیں بھی اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے رکھتی تھی اور اوپر سے بے حس بنی ہوتی تھی۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا۔ آنے دو اسے“ آج میں اسے کہوں گی۔“

”وہ بڑا تکی ہوئی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ کام کے دوران کبھی وہ اپنے کمرے پر پڑتی تھی اور کبھی باورچی خانے میں جا رہی تھی ایک بار وہ باورچی خانے سے باہر آکر لڑائی لڑی۔

”بڑے تکی تو اس کو پریشان کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے سوچتی ہوں تو لکھ بھول جاتی ہوں۔ ابھی احسن کی بات سن کر سوچ رہی تھی کہ اس ذرا تنگ روم کا طرہ بنا ہوگا۔ ہم اسے دعوت دیں گے تو وہ یہاں آکر کیا دیکھے گا؟ ہماری شکستہ حالی سے بھلا ہو جائے گا۔ گڑیا کا بھڑا ہونے سے پہلے شوکیس کو سجانا پڑتا ہے۔ مگر تمہارا بھائی یہ لکھ نہیں سمجھتا۔ وہ تو ایسے الجھا کر رکھ دیتا ہے کہ میں ساری باتیں بھول جاتی ہوں۔ ابھی

ماں کو اپنی بیٹی کی لنگڑا ہٹ یاد آگئی۔ ایک ذرا دیر پہلے وہ ساس بن کر اپنی ماں کی پیٹھ میں کپڑے نکالنا چاہتی تھی۔ ماں بن کر یاد آگیا کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ قدرت کا نکتہ ہے۔ اس مذاق کے آگے صوفیہ اور زبیدہ جیسی لڑکیاں مجبور اور بے بس ہیں۔ وہ بے شک سے پسو بند لگتے ہوئے بولیں۔

”لکھیک ہے۔ مگر میرا بیٹا بہت خوبصورت ہے“ اسے اچھے گھرانوں کی کتنی ہی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔“

صوفیہ نے جواب نہیں دیا۔ ماں اسے خاموش دیکھ کر خود ہی سوچنے لگی۔
”میری طرح دوسرے لڑکوں کی مائیں بھی اسی انداز میں سوچ سکتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو ایک سے ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے جو تمام عیبوں سے پاک ہوتی ہے پھر لکھ صوفیہ کو اپنی بسویوں بنایا جائے۔“

خود غرضی تو ہر جگہ ہے، ہر دل میں ہے، انسان کے ہر مفاد میں ہے، ماں کے دل نے سمجھایا کہ صوفیہ کے جسم میں ایسا نقص نہیں ہے جیسا کہ زبیدہ میں ہے جیسا کہ اور وہ لڑکیوں میں ہو سکتا ہے۔ اپنی بیٹی میں تو عیب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چلتے دقت لنگڑائی میں نہیں بلکہ لڑائی ہوئی مل کھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

گمراہی بیٹے کی ہو رہی تھی۔ اس نے ایسی لڑکی کو کیوں پسند کیا۔ ایسی سو کو تو ہونٹ کالا چشمہ پٹائے رکھنا ہوگا۔ اگر وہ چشمہ بار بار ٹوٹا رہا یا ہونے والے بچے توڑے رہے۔ چھوٹی سی تنخواہ میں سے چشمے کے پیسے الگ نکالے ہوں گے۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔
”آخر اس لڑکے نے زبیدہ میں کیا خوبی دیکھی ہے۔ تم انصاف سے کہو میں اسے ہر کیسے بنا سکتی ہوں؟“

”آپ بسویوں بنانا چاہتی ہیں؟ خالد۔ میرا مطلب ہے بھائی جان تو اس سے ٹھیک کرنا نہیں چاہتے۔“

”میں۔ شادی نہیں کرنا چاہتا؟ تو پھر دوستی کیوں کی ہے؟“

”صرف ضروری باتیں کرنے کے لیے۔“

”ضروری باتیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”وہ۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ اسی زبیدہ ایک فیکٹری میں پینٹنگ کا کام کرتی ہے۔

”مے کیا دیکھ رہے ہو؟ تم میری بیٹی کو سکھاتے ہو کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے۔
 نڈاری تو اڑا دیوں کو مجھ سے چھپاتی رہے۔ صوفی! تم یہاں سے جاؤ۔“
 صوفی اہل کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں نے کہا۔
 ”ہاں۔ اب بتاؤ؟“
 ”تپ سب کچھ جان چکی ہیں اور میں کیا بتاؤں؟“
 ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“
 ”آپ ایسے سوال کر رہی ہیں جس کا جواب ایک بیٹا اپنی ماں کے سامنے نہیں دے
 سکتا۔“

”ہر ایک بھائی اپنی بہن کے سامنے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔“
 ”ہی آپ میرا عاصبہ کرنے سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ
 باہر تھی ہیں؟ کیا میں ساری زندگی خواب دیکھتے دیکھتے باقیس دیکھتے دیکھتے گزار دوں؟“
 ”تم فقیس کیوں دیکھتے ہو؟ یہ فقیس اخلاق بگاڑتی ہیں۔“
 ”بے غلط ہے امی۔ ہماری عرومیاں ہمارا اخلاق بگاڑتی ہیں۔ ہم انسان فطرتاً شکاری
 ہیں اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ جب ہمارے اس فطری جذبے کی تسکین نہیں ہوتی تو ہم
 اپنی ناشائستہ اور جنگجو قسم کے بہرو کی فقیس دیکھتے ہیں۔ وہ خطرات میں گھبراتا ہے تو ہم
 ان خطرات میں گھرجاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو ٹھوکریں مارتا ہے، حالات سے لڑتا ہے اور
 لڑنے کے خاتمہ پھوس سے اپنی دولت مند حسین محبوبہ کو چھین لیتا ہے تو ایسے وقت ہمارے
 لہلہاں کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہم اپنے اس بوسیدہ مکان میں آکر سوچتے ہیں کہ
 اب کیا کیوں نہیں کر سکتے۔ پھر ہماری عرومیاں ہمیں سمجھاتی ہیں کہ اکبر سیٹھ اگر دو لاکھ
 روپے لکڑیاں تو ہم اپنی محنت سے کم از کم دو سو کمائے ہیں۔ اکبر سیٹھ کے پھلوں میں دو
 گولہ والی محبوبہ آتی ہے ہمارے حصے میں کم از کم ایک آٹکھ والی تو آسکتی ہے مگر جب
 ہمارے حصے کی بات آتی ہے تو اخلاقی قدروں کی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔“
 ”اخلاقی قدروں کو بھولا نہیں جاسکتا۔ یہ کسی غیر اخلاقی بلکہ شرمناک حرکت ہے کہ تم
 نڈاریاں بہن کو ہٹا کر اڑا رہا بتایا ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ معصوم کتنی عرومیوں کا

میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے والی تھی۔ دیکھو میں پھر بھول جاؤں گی۔ تم سچ میں کونو
 بولنا۔ خالد کی بات جھجھوڑوگی تو میں پھوس۔“
 ”امی آپ پھر بھول رہی ہیں۔ وہ خوش خبری کیا ہے؟“
 ”وہ پچھلے دو سال سے جو نیچروں کی اضافی تنخواہیں رکی ہوئی تھیں؟ وہ کل ہمیں مل
 جائیں گی۔ نئی حکومت کا بھلا ہونے پورے چوبیس سو روپے ملیں گے۔ یعنی دو ہزار چار
 روپے۔ مگر تم چوبیس سو یاد رکھو۔ اس طرح تمہیں یاد رہے گا کہ خالد کی عمر چوبیس ہی
 ہے۔ اور اس سے تم چار سال چھوٹی ہو اور ماں خالد سے روپے کی بات نہ کرنا ورنہ وہ
 پچاس ناگنا شروع کر دے گا۔ میں تمہاری شادی کے لیے یہ روپے رکھ رہی ہوں۔ مزہ
 ڈرانگ روٹم کے لیے پانچ سو روپے خرچ کروں گی۔ قسطوں پر سٹے صوفے آجائیں گے
 لٹریے بازار سے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے لے آؤں گی۔ تھوڑی سی تبدیلی
 ہو جائے تو ڈرانگ روٹم اک دم سے بدل جائے گا۔ تمہاری تقدیر بھی بدل جائے گی۔“
 یہ کہہ کر وہ پھر یاد رچی خانے میں چلی گئیں۔ صوفیہ شوکیس کی طرف دیکھ کر کہنے
 لگی۔ ”ہی ایسے منصوبے بنا رہی ہیں جیسے وہ جیج کو دھما بن کر آئیں گے۔ کیا جیج ابا
 ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے ہی اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ دھوک کی قلاب
 سکیاں گیت گانے لگیں۔ ”ہا میرا آئے گا۔“ ”بے کو چشم تصور میں دیکھتے ہی اس نے
 شرا کر چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھایا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خیال کیا
 میں پہنچ کر سب ہی اپنی نظر اڑاتی ہوئی زندگی کو بھول جاتے ہیں۔“
 خالد شام کو ڈیوٹی کے وقت کے مطابق واپس آیا۔ ماں غصے میں بھری بیٹی تھی۔
 زیادہ غصے میں بولا نہیں جاتا۔ وہ بھی کئی بار بولنے بولنے رہ گئی۔ خالد بیشہ کالا پروانہ
 ماں کو نظر انداز کر کے کوٹ اتارتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تب ماں
 برداشت نہ ہو سکا۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟ ادھر آؤ۔ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کسے پسند کرانے لگے تھے؟ اب
 جھوٹ نہ بولنا کہ ڈیوٹی پر گئے تھے مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان
 سب کچھ کہہ دو۔“
 خالد نے گھوم کر صوفیہ کی جانب شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماں نے ہنسنے

”تو براں تم سے ملنے آیا تھا۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ صوفی نے دروازہ کھولا۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔“
 ”کلام طلب؟ کیا وہ گھر کے اندر آیا تھا؟“
 ”نہیں، دو انڈے پر کھڑا رہا۔“
 ”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ صوفیہ نے آپ سے سچ کہا ہے۔ وہ یہاں اندر آیا ہو گا۔“
 ”اگر میری بیٹی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تو اس جھوٹ پر تمہیں شرمانا چاہیے،
 لڑکے تم نے ایک لڑکی کے لیے اس گھر کا دروازہ کھولا ہے۔“
 ”خاندانہ غصے سے منہ پھیر کر کہا۔“

”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیہ بے حیائی پر اتر آئے۔ میں اس کا کھانا کھونٹ کر
 اٹل گیا۔“

”کلاس مت کرو۔ اپنے بدن میں اٹک لگتی ہے تو جلن کا احساس ہوتا ہے۔ تمہارے
 ذرا ایسی عقل ہے تو سمجھ واری سے کام لو۔ ابھی اس گھر میں اٹک نہیں لگی ہے۔ مجھے
 نیچے پر اور اعتماد ہے۔ وہ میرے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے اس سے معلوم
 ہے وہ تو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ احسن اس کی تعریف کر رہا تھا۔“

”کیا وہ میری بہن کی تعریف کر رہا تھا۔ میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔“
 ”بے ذوق کیس کے؟ زبان کھینچنے کے بجائے تم اسے یہاں کھینچ کر کیوں نہیں
 لے میری عقل سے کام کرو۔ وہ یہاں ایک بار آئے گا۔ ہمارے یہاں ایک وقت کا کھانا
 کھائے گا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر صوفیہ سے باتیں کرے گا تو شادی کے لیے فوراً
 فی ہوا جائے گا۔“

”کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ یہاں آئے اور میں اپنی بہن سے اسے باتیں کرنے کا موقع
 ملا ہے؟“

”یہ مملکت انڈیشی ہے۔ تم کیا جانو، کتنے ہی گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہوں، ہر جگہ
 ہوا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو سات پردوں میں رکھنے والے والدین بھی حالات سے مجبور
 لاپرواہی کو اپنے ہونے والے واماو سے مل بیٹھنے کا موقع دیتے ہیں۔ گھر کی بات گھر ہی

شکار ہے۔ تمہاری اس حرکت سے اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔“

”یہی سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے اتنی عمر گزر گئی۔ اتنی مدت کے بعد یہ سوچ کوزا
 سی جرات پیدا ہوئی ہے کہ بھوک کے وقت مانگنے سے روٹی نہ ملے تو کسی سے مانگ کر کھا
 جاتی ہے یا چرا کر کھائی جاتی ہے۔ میں نے بہت مجبور ہو کر اس سماج کے دسترخوان سے ایک
 لڑکی کو چرایا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے بہت بڑی چوری نہیں کی ہے۔ چوری کے
 بعد بھی جس طرح ہمیں سوکھی روٹیاں ملتی ہیں اسی طرح ایک روکھی پھینکی لڑکی ملی ہے۔“
 ”میں صوفیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم بات بدل رہے ہو۔“

”صوفیہ ایک نادان لڑکی ہے ای۔ نادان ہے، معصوم ہے اور اس شوکیس میں دھکا
 ہوئی مگر کیا کی طرح بے حس ہے۔ میں نے اسے کبھی مسکراتے اور کبھی رنجوں سے بین
 کرتے نہیں دیکھا۔“

”اچھے گھر کی لڑکی ایسی ہی نادان اور بے حس نظر آتی ہے مگر وہ اندر سے کیا ہے؟
 ماں سے زیادہ نہیں جانتے۔ مگر اب تمہیں سب کچھ جانتا اور سمجھتا پڑے گا۔ تمہیں اس
 کے رشتے کی فکر کرنا ہوگی۔ تمہارا ایک دوست تمہارے ساتھ مل میں کام کرنا ہے اس کا
 نام احسن ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“

”آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”پہلے میری بات کا جواب دو۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“
 ”نہیں۔ وہ بھی میری طرح خواب دیکھتا ہے۔ اس کی تنخواہ مجھ سے پچاس روپے زیادہ
 ہے۔“

”پھر تو اچھا لڑکا ہے۔“ ماں نے جلدی سے کہا۔
 ”مگر وہ سوچتا ہے کہ جب بیوی آئے گی اور بچے پڑھیں گے تو تنخواہ نہیں پڑے گی۔
 چار سو روپے چار سو روپے کے برابر ہو جائیں گے۔“

”تم اسے کسی دن یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ بیوی بچوں کی قدر ہے۔
 بھی آمدنی بڑھتی ہے۔“

”اگر یہ کوئی لطیفہ ہے تو مجھے ہنسا چاہیے۔ اگر اس میں حقیقت ہے تو پھر ہم با
 بیوی بچوں کی فکریاں کھول لینی چاہئیں۔ ویسے آپ یہ بتائیں آپ احسن کو کیسے جانتی

بظاہر جنم کی شریلی ہے۔ کبھی اس نے کسی غیر کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔
خانے سمجھا دیا ہے کہ یہ تمہیں غیر نہ سمجھے۔ تم خالد کے دوست ہو اس لیے میرے
بچے کو بچی کھاتی رہو باتیں کرتی رہو۔ اب ایسا بھی کیا شرمانا؟ دو دن سے تو احسن کی
یار لڑی تھیں۔“

مزے کے ہاتھ سے نوالہ جھوٹ گیا۔ ماں کیسا سفید جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کی
اے طرف کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اس جھوٹ پر وہ شرم سے زمین میں گڑی
انجی۔ ماں اسے گھبراتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔“ کہہ کر
خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی احسن نے بڑی آہستگی سے کہا۔

”تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔ لقمہ چھوٹ جاتا ہے۔ کو تو میں اپنے ہاتھوں سے
کھاؤں؟“

حاکم دم سے سہٹ گئی۔ جیسے وہ حملہ کرنے آیا ہو۔ عمرہ اپنی جگہ سنا بیٹھا ہوا تھا۔
اپنی خانے سے باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں سالن کا ایک بڑا پیالہ تھا۔ اس نے
اُڑکھا۔

”صوفیہ! میں یہ سالن پردن کو دے کر آ رہی ہوں جب تک تم احسن سے باتیں

نہیں کرتے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ صوفیہ نے گھبرا کر آواز دینا چاہی مگر جتنی دیر میں
خانے سے آواز نکالنے کی کوشش کرتی اتنی دیر میں ماں جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا

”تمہاری ماں بہت سمجھ دار ہیں۔“

احسن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ صوفیہ نے ایک
گہرا کراہنے کی کوشش کی تو گڑبڑا گئی۔ کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ وہ بھی پیچھے کی
ماں جاتی مگر احسن نے جلدی سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں قحام لیا۔ اس
اُٹھا نہیں کہنے۔ اس نے تو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا۔
بازوؤں سمجھ نہ سکی کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ گر رہی ہے پھر سمجھ
اُٹا کہ بھٹل رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ صدیوں سے دیکھے جانے والے سپنوں کا شہزادہ

میں رہتی ہے۔ باہر والوں کو پتا نہیں چلتا کہ گھر کی چار دیواری میں تھوڑی دیر کے لیے
کورٹ شپ کی اجازت دی گئی ہے۔“

”مگر ای آپ یہ تو سوچنے کے بجھے کتنی شرم آئے گی۔“

”شرم تو مجھے بھی آئے گی مگر اب میں شرمانے سے زیادہ یہ سوچنے لگی ہوں کہ نہ
برس کی ہو چکی ہے۔ اس کے آگے میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔ اگر نہیں شرم آئے تو
گھر میں نہ رہتا۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاتا۔“

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔
دو دن میں ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل گیا۔ محدود سرمائے کی مطابق فسطوں پر
صوفے آگئے۔ دیواریں ستے ڈسٹمبر سے کلابی گلابی سی ہو گئیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر
لنڈے بازار کے پر دے لٹک گئے۔ ان حالات میں اکثر ہمارے گھروں کو کوفیوں کی طرف
سجایا جاتا ہے۔ تیسری شام احسن کھانے کی دعوت پر آیا تو صوفیہ کو سچا بنا کر بھلا گیا۔
تہذیب اور شرافت کے دائرے میں رہ کر ایسا کیا جائے تو بیٹی اور ہونے والے والوں کے لیے
لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صوفیہ بہت گھبرا رہی تھی۔ احسن بھی اپنی ہونے والی ساس کے سامنے شراباوند
خالد ایک معقول سا بہانہ بنا کر باہر چلا گیا تھا۔

کھانے کی میز پر صوفیہ کی ماں احسن کے سامنے کھانے کی پلیٹیں برحقاتی ہوئی اپنے
خاندان کے گمن گارہی تھیں جو پہلے بہت اونچا تھا اب نیچا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔
”بیٹا تمہاری گھر میں کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ غریبی نے رشتہ داروں سے بلا توڑا
ہے۔ صرف ایک چھوٹی بہن ہے۔ سوچتا ہوں پہلے اس کی شادی کروں پھر اپنی گر
کروں۔“

”اے بیٹا! میرے جیتے جی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری بہن کے ہاتھ پہلے کروں گی۔
کبھی اسے بھی میاں ملاؤ میں ذرا دکھوں گی کہ میری بیٹی کیسی ہے۔“

”میں کل ہی اسے میاں لے آؤں گا۔ مگر آپ کی یہ صاحبزادی خاموش بیٹھی رہے گی
نہیں کھانے سے شراب رہی ہیں یا مجھ سے شرم آ رہی ہے۔“

انٹوش میں لے کر پوچھا۔

”ابو میری جان۔ کیوں رو رہی ہو؟“

”سبک کر کہنے لگی۔ ”میری کالج کی گزرا نوٹ گئی ہے۔ اللہ میں نے کتنی سنبال کر رکھا تھا۔ کبھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی مگر اس بے نہ جانے نے اُسے اُڑا دیا ہے۔“

”اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اسے تو ایک دن ٹوٹنا ہی ہوا ہے۔ اس کے بازوؤں سے نکل کر دباں سے اٹھ گئی۔ پھر اندھیرے میں راستہ ٹوٹتی ہوئی لڑکی طرف جانے لگی۔ احسن نے اسے آواز دی۔

”کون ہو تم؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ مہری تارکی میں گھورتا رہا۔ پھر اچانک ہی بجلی چمکی۔ لام روشن ہو گیا۔ وہ شوکیس کے پاس فوٹی ہوئی گزریا کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ رات کے باقی ٹکڑے شوکیس کے اندر بھرے ہوئے تھے۔ احسن نے اس کے پاس بیٹھتے

نکل

”فہم کرو۔ میں حمیس دوسری گزریا لا کر دے دوں گا۔“

موتنے پانا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر بڑی آہستگی سے بولی۔

”مجھے گزریا نہیں چاہیے۔ مجھے۔۔۔ آپ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے بھی تساری ضرورت ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو نہیں بٹاتے اس وقت تک ایک دوسرے کے نہیں بن سکیں گے۔“

”میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی۔“

”میرا ایک ہی دکھ ہے اور وہ میری دکھی بہن ہے۔ جب بھی میں اپنی شادی کے لیے نہیں نکلتا تو میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے کہ پہلے بہن کی شادی کرو۔“

”بھائی جان بھی میرے لیے پریشان رہتے ہیں۔“ صوفیہ نے کہا۔

”میرا بہن مند بھائی پہلے اپنی بہن کی فکر کرتا ہے۔ یہ فکر کرتے کرتے میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ تو اب ہی رشتہ دیتے ہیں مگر میری بہن کا رشتہ کہیں سے نہیں آتا۔ اب میں

اسے سنبال رہا ہے اور وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔ یہ سب خواب کی سی کیفیت تھی۔ کھل آنکھوں کے سامنے تو کبھی کسی نے ایسی جرات نہیں کی تھی اور نہ ہی خواہش تھی حوصلہ تھا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو گلے لگاتی۔

جب تک وہ خواب کی سی حالت میں رہی وہ میٹھی میٹھی سرگوشیوں میں اسے بلاتا رہا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کی گردن پر، پیشانی پر، آنکھوں پر اور لبوں پر اترتا رہا۔ اس کی پر پہلے کبھی ایسی افتاد نہیں پڑی تھی۔ اجنبی سانسوں کے جھونکے نبھانے اسے کواں لانا لیے جارہے تھے۔ ایک دم سے اس کا سر چکر اٹھا۔ اچانک کوئی حادثہ پیش آجائے تو ہلاک ہوتا ہے۔ احسن اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر ڈاکٹنگ ٹیبل کی طرف سے گھوم کر صوفیہ پر لے آیا۔ پھر اسے نئے صوفے پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اس کے رخساروں کو پیار سے ٹوک چمک کر توازن دینے لگا۔

”صوفیہ میری جان۔ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟“

اس کا سر پکڑا ہوا تھا وہ آنکھیں کھول کر اس پاس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر کچھ سمجھنے سے پہلے ہی ایک بیک تارکی چھا گئی۔ شاید بجلی کا فوڈا ڈگ گیا تھا۔ پھر علاقے کی بجلی چلی گئی تھی۔ اندھیرے نے اس لڑکی کو اور زیادہ بدحواس کر دیا۔ اندھیرے نے اس کی عمر کو بہت پیچھے لے جا کر پھینک دیا۔ عمر کے اس اندھیرے میں وہ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھنے کی حالت سے دوچار ہونے لگی۔ نیند کی تارکی میں خواب اتار نہیں سکتا۔ جتنا کہ جانتی آنکھوں کا اندھیرا آہستہ آہستہ سمجھا رہا ہے۔

وہ بہت دیر تک اس اندھیرے سے الجھتی رہی جو خالم بھی تھا اور صوفیہ بھی تھا۔ وہ بھی لگا تھا اور زخم کو چومتا بھی تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے اڑاتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی شوکیس کے پاس گزری ہوئی۔ ایک چھتا کے سے شیشوں کا انہوں نے سراٹھا کر دیکھا تو مہری تارکی میں دو آنکھیں گھور رہی تھیں۔ وہ بلا غائب ہو گئیں شوکیس پر آکر کودا تھا پھر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کھانے کی میز کی طرف جا رہے۔ احسن نے ہنس کر اسے بھگا دیا تو وہ فوراً ہی بھاگ گیا۔

مگر اس کے بھاگنے سے کیا ہوتا ہے شیشے تو ٹوٹ چکا تھا۔ احسن نے اندھیرے صوفیہ کو ٹوٹ کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے

کل وہ اپنی بہن کو لے کر یہاں آئے گا۔ تم اسے دیکھ لینا۔“
”اگر وہ پسند آئی تو؟“

”یہاں لڑکی پسند کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اپنے اپنے بہنوئی پسند کرنے کی بات ہے وہ اپنی بہن کے لیے ختمیں پسند کر چکا ہے۔ تم اپنی بہن کے لیے اسے پسند کر لو۔ اپنے بھائی سے یہ احقانہ خیال نکال دو کہ تمہاری زندگی میں فلوس جیسی کوئی دولت مند بہرو کی کٹاں گی۔ خواب کچھ ہوتے ہیں زندگی کچھ اور ہوتی ہے۔“

خالد ماں کے پاس سے اٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس رات مزہ اپنی ماں کے کمرے میں سوئی رہی اور جاگتی رہی۔ ماں نے اسے بتا دیا تھا کہ خالد اپنی ٹوٹاں کی بات سن کر خاموش ہو گیا ہے۔ صرف اس کے دماغ میں ایک الجھن ہے وہ یہ کہ لڑکی اسے پسند آئے گی یا نہیں؟ صوفیہ ہر کثرت پر دعا مانگ رہی تھی کہ جس طرح احسن نے اسے پسند کیا ہے اسی طرح خالد بھی اس کی بہن کو پسند کر لے۔

دعا مانگتے مانگتے صبح ہو گئی۔ اس روز خالد ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ شاید وہ احسن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنے سے پہلے اس کی بہن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کتنی دیر لگتی ہے۔ شام کو احسن اپنی بہن کو لے کر ان کے دروازے پر آگیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو صوفیہ اور خالد کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ احسن کے ساتھ اس کی بہن زیدہ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوپٹے کو اپنے چہرے پر کھینچ کر ایک آنکھ کو چھپانے کی تاکلم کو شش کر رہی تھی۔ خالد کے دل میں آیا کہ وہ اسی وقت چیخ چیخ کر کتنا شروع کر دے۔ نہیں میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ میرے خوبصورت فلمی خوابوں کا اس طرح مذاق نہ اڑاؤ۔“

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی اپنی بہن لنگراتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ احسن نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر دلاتے ہوئے کہا۔

”یہ میری بہن زیدہ ہے۔ یہاں اس مکان کے سامنے آکر یہ اک دم سے گھبرا گئی تھی اور اندر آنے سے انکار کر رہی تھی۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ بہن پہلے بھی آپس کی ہے۔ تعجب ہے آپ لوگوں نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟“

بوڑھی ماں نے زیدہ کو یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلے بیٹے کو سوائے نظروں

بجایا۔ اس کے بعد صوفیہ کو دیکھا تو وہ جھجکتی ہوئی ہوئی۔

”گال یہ وہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ یہ بھائی جان کے ساتھ یہاں آئی۔“

”بہن بی احسن نے چونک کر پوچھا۔“

”زیدہ تم خالد کے ساتھ یہاں آئی تھیں؟“ پھر اس نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں آئی تھی؟ تم کب سے میری بہن کو جانتے ہو؟ تم کس رشتے سے اسے یہاں لائے؟“

خالد نے کہا۔ ”حسن تم جارجانہ انداز میں سوالات نہ کرو۔ تمہاری بہن اپنی مرضی کے ساتھ آئی تھی۔“

زیدہ نے چونک کر سر اٹھایا اور شکایت بھری نظروں سے خالد کو دیکھنے لگی۔ وہ زبان بگڑنے لگی کہ مکی مگر اس کی نظرس کہہ رہی تھیں۔ ”خالد مجھ اکیلی کو الزام نہ دو۔ یہاں میں صرف میری مرضی نہیں، ہم دونوں کی مرضی تھی۔ اگر ہم نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہمارے جرم یا گناہ کا گارہ ہیں۔“

احسن نے کہا۔ ”خالد! آئی دونوں باتوں سے بھجتی ہے۔ تم دونوں ہی اس بات کے کہہ رہے ہو۔ زیدہ میری بہن ہے۔ میں اس سے سوال جواب کروں گا مگر تمہاری ماں کا بے کورہ تمہارا محاسبہ کرے۔“

انے دونوں کے درمیان آکر کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔ تم دونوں بات نہ بدھاؤ۔ جو پاس پر مٹی ڈالو۔ میں زیدہ کو اپنی بہن بناؤں گی۔“

زیدہ نے شرابا کر منہ پھیر لیا۔ خالد نے پریشان ہو کر کہا۔

”اب میں اپنی شادی کا فیصلہ آپ کروں گا۔“

”اگر بھلائی فیصلہ کرو۔“ ماں نے کہا۔

”مگر ذرا صبر سے کام لیں۔ پہلے میں احسن سے تہنائی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ احسن نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ باتیں کرنے کے لیے یہ گھر مناسب ہو گا یا ہم باہر؟“

انے سمجھایا۔ ”گھر کی بات گھری میں ہونا چاہیے۔ میں صوفیہ اور زیدہ کو لے کر

ہو بہن کی تو بہن برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اچھل کر خالد کے سینے پر ایک لات نہ مار ڈال کر تانا ہوا پیچھے صوفہ پر جا گرا۔ پھر صوفہ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔ ہلاک لگا کر اس پر آیا اور اسے اپنے نیچے دبوچ کر اس کے منہ پر گھونسا مارتے لگا۔

”بلد خوف تیری بہن بھی ایک کھوٹا سکہ بن گئی ہے۔“

تو جھوٹ بولتا ہے اپنی بہن کی بے حیائی چھپانے کے لیے میری بہن پر کچھ ڈاچھال رہا۔

”یہ کہتی ہی اس نے احسن کو اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر آیا تو خالد اس پر سوار ہوتے ہی تابد توڑ گھونٹے مارنے کے بعد کہا۔

”میں تجھے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں میں تیری بہن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لب زہر جا کر میری بہن کو بدنام کرے گا مگر میں تجھے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں

اس نے جب کہ احسن کی گردن دبوچ لی۔ احسن کے ہاتھوں میں بھی اس کی گردن۔ دونوں زور لگانے لگے۔ دونوں شد و زور تھے کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ کبھی احسن بے آوازے گرا کرتا تھا کبھی وہ احسن کو زیر کر دیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے کے لیے آدھ لافوت رہا تھا اور فیصلہ بازوں کی قوت سے ہو رہا تھا۔ دونوں کے منہ اور ناک سے رتنے لگتا تھا۔ آنکھیں وحشیوں کی طرح ابلی پڑ رہی تھیں اور کپڑے تار تار ہو رہے

ہر منٹ کی لڑائی میں وہ دونوں نڈبال ہو کر لڑکھڑانے لگے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہا ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اب صرف زبان چل رہی تھی احسن نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”تم مجھے ہو کہ گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والی لڑکیاں بد چلن ہو جاتی ہیں۔ میں یہاں کھڑا رہا ہوں باہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں ہمارے قدم پہنچتے ہیں وہاں لڑکیوں کو ہلاک کرنے میں پڑ جاتی ہے۔ تم نے اپنی صوفیہ کو برسوں سے اس گھر کی چار دیواری کے نیچے لٹا کر طرح سنبھال کر رکھا تھا مگر میرے قدم یہاں پہنچ گئے۔ دیکھو وہ شوٹیس

پڑوس کے ہاں آدھ گھنٹے کے لیے چلی جاتی ہوں اتنی دیر میں تم دونوں ٹیکس میں گھٹا کر لو۔ آؤ لڑکیو! میرے ساتھ چلو۔“

وہ صوفیہ اور زیدہ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا مگر چٹنی نہیں چڑھائی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر نکلے ہوئے بولا۔

”احسن! شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ شادی کے بعد مریضہ کے لیے ایک عورت کے ساتھ بندھ جانا ہے لہذا خوب سوچ سمجھ کر کسی کو اپنا بنا چاہیے۔ پتا نہ بتاؤ کہ تم نے صوفیہ کو کس حد تک شریک حیات کے قابل سمجھا ہے۔“

احسن نے جواب دیا۔ ”اگر وہ شریک حیات بننے کے قابل نہ ہو تو آئی مائیں مانگنے نہ آتا۔“

”تم رشتہ مانگتے نہیں۔ سووے بازی کے لیے آئے ہو۔“

”یہ بھی درست ہے لیکن سووے بازی کے لیے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ سواہن آجائے۔ لہذا میں نے پہلے صوفیہ کو پسند کیا ہے۔ اس کے بعد حالات سے مجبور ہو کر بچا کا سودا کر رہا ہوں۔ اب تم بتاؤ۔ کیا زیدہ کو اپنی شریک حیات نہیں بناؤ گے؟“

”میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا جس کا چال چلن اچھا ہو گا۔ تمہاری بہن ہر روز گھر باہر ٹیکسری میں کام کرنے جاتی ہے۔ آج سے چار دن پہلے وہ میرے ساتھ یہاں تھی۔ اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنوں کے ساتھ۔۔۔۔۔“

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی احسن نے اس کے منہ پر ایک لٹا ہاتھ دیکر کہا۔

”بس۔ اس سے آگے میری بہن کو گالی نہ دے۔ ہم مردوں کی یہ پرانی عادت ہے۔ جب کسی لڑکی کو بدنام اور ذلیل کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ خود بھی اس کے منہ ذلت کی پستیدوں میں گر چکے ہیں۔“

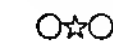
خالد نے جواباً ایک گھونسا اس کے منہ پر جھڑکے ہوئے کہا۔

”مرد ہر حال میں شریف کہلاتا ہے۔ عورت ایک ذرا سی لغزش کے بعد کاش لڑکی ہے۔ ہر شخص ایک گھر اور چمکتا ہوا سکھ جاتا ہے اور تمہاری بہن ایک گھر ہے۔“

نہرے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

مزید درستی ہوئی احسن کے پاس مگنی۔ زبیدہ خالد کے پاس پہنچ کر اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے کے لہو کو پونچھنے لگی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک قہقہوں کے شور میں اپنی ن کھپاتے رہے پھر احسن نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خالد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے نکلا۔

خالد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر ہونٹوں کو سختی سے بھیج لیا۔ احسن نے کہا۔
”اگر تم ڈھنائی سے انکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہم نیر



خالی ہے۔ کانچ کی گڑیا ٹوٹ چکی ہے۔“
خالد نے غصہ سے کہا۔ ”لفافہ نہ کرو۔ اگر تم سچے ہو تو ثبوت پیش کرو۔“
”میں گواہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ گواہ تمہاری ماں ہے۔ وہ صوفی کو میرے پاس بھڑاک
پڑوسن کے ہاں مگنی تو اچانک بجلی ٹپل ہو گئی اور ہم بیس منٹ کے اندر میرے مٹی ایک
دوسرے کے قریب ہو گئے۔“

خالد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر ہونٹوں کو سختی سے بھیج لیا۔ احسن نے کہا۔
”اگر تم ڈھنائی سے انکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہم نیر
شکن نہیں، شیشہ شکن ہیں۔ عزت کے شیشوں کو توڑتے ہیں معاشرے کے ایک گوشے
میں ہم کسی کی بہن کو درغلا کر لے جاتے ہیں تو دوسرے گوشہ میں کوئی ہماری بہن کو لے
جاتا ہے۔ ارے اب تو اس شرمناک سچائی کو تسلیم کر لو۔“

خالد ڈانگلاتے ہوئے قدموں سے شوکیس کے پاس گیا۔ اور لڑکھا کر گرہا اور شوکیس
سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ احسن بھی قریب آکر شوکیس کا سہارا لیتے ہوئے فرش پر دوڑو
ہو گیا اس کے بعد کہنے لگا۔

”تھک کر گر جانے سے بات نہیں بنے گی۔ اگر تم سچائی سے انکار کرو گے تو ہم دونوں
کی بہنیں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ جائیں گی۔ اندھیرا اور بڑے کا برائی اور پٹیل کی
ہم برائی کو ختم نہیں کر سکتے مگر اسے اپنی حد تک روک سکتے ہیں۔ ہم نے جن شیشوں کو توڑا
ہے، انہیں اپنے طور پر جوڑ سکتے ہیں۔ ان کی مٹیابی کر سکتے ہیں۔“

خالد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
”ہاں۔ ایک بار صوفی نے کہا تھا کہ دل ہو یا کانچ کی گڑیا، انہیں توڑنے کے بجائے
سنبھال کر رکھنے کا نام زندگی ہے۔“

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ بوڑھی ماں، صوفیہ اور زبیدہ کمرے میں داخل
ہوتے ہی گھبرا گئیں۔ صوفیہ اٹھنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے دو شوکیس کے پاس تالو اور
احسن کے چہرے اپنے اپنے لہو میں بھیک رہے تھے۔ ان کے لباس تاؤ مار ہو چکے تھے اور وہ
بالکل ہی پاگل نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ہی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ ماں نے
قریب آکر پریشانی سے پوچھا۔

جزیرے کی چاندنی

محبت کی ایک ایسی دردناک کہانی
جسے آپ آنکھوں سے نہیں
زبانوں سے نہیں، صرف دل
کی دھڑکنوں سے پڑھیں گے۔

ہاں سے کھڑا جاتے ہیں۔ وہ پاگل ہے، پاگل کے منہ کون لگتا ہے۔ وہ آپ ہی دوڑتا اور پسی کرتا ہے۔ ریت میں دھنستا جاتا ہے اور اٹھتا جاتا ہے پھر لو کھلا کر ادھر ادھر اپنے بکھڑے سمجھ میں نہیں آتا ہے تو سپیاں اور گھونگھے اٹھا اٹھا کر نئے جزیرے کی تلاش میں نکلتا ہے جیسے رجو اور تراب کو نشانہ بناتا ہو یا چاند پر خاک اڑا رہا ہو کسی کا نہیں مگر ناسو میں تھک ہار کر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔

جزیرے کی چاندنی

ہمارا جزیرہ ساحل سے دور ہے۔ دراصل وہ جزیرہ نہیں ہے سوگز کے رقبے میں ایک ایک چٹان ہے جو سمندر کی نیچلی پر ابھر آئی ہے۔ جب سمندر شانت ہوتا ہے تو ہر سکون رہتی ہیں تو چاندنی راتوں میں پھیرے اپنی کشتیاں سمندر میں ڈال دیتے اپنی مورتوں اور بچوں کے ساتھ وہاں جا کر زندگی کی کچھ خوشیاں چرائیتے ہیں ایک بے کے ساتھ جتنے بولتے ہیں اور سمندر اور انسان کے صدیوں پرانے رشتوں کے بات باتے ہیں۔

ایسا کوئی نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی جوار بھاء کے وقت لہریں غضب ناک ہو جاتی ہیں۔ رات کی بلندی تک اڑتی اور بھرتی ہوئی آتی ہیں اور اس چٹانی جزیرے کو تھوڑی دیر لے لے لے جاتی ہیں۔

لہاں اور پھیرے سمندر کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کب جوار بھانا کی ہاں جزیرے کو لے دو تھی ہے اور کب لہریں شانت ہو کر انہیں خوشیاں منانے کے لیے میں آئے کی اجازت دیتی ہیں۔

اسی رات بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں۔ لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور ہارے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تراب کے شانے سے سر پہنے سمندر غرا رہا ہے تراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی

ہاں رات بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں۔ لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور ہارے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تراب کے شانے سے سر پہنے سمندر غرا رہا ہے تراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی

ہاں رات بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں۔ لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور ہارے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تراب کے شانے سے سر پہنے سمندر غرا رہا ہے تراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی

جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور وہ دھیا چاندنی میں بھگی ہوئی سمندر کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو بستی کے لوگ حیرانی اور عقیدت سے اس نئے جزیرے کی جانب دیکھتے ہیں، جہاں وہ دھبگی ہوئی رو میں آج بھی آکر لٹی ہیں اور بچے والوں کی نگاہوں کے سامنے کبھی نقین کی طرح مستحکم اور کبھی گمان کی طرح نیم ہمارا جھلکتی رہتی ہیں۔

کوئی بانکا جوان نامی گیر ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے کہتا ہے۔
”وہ دیکھو تراب نظر آ رہا ہے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نقین سے کہتا ہوں کہ تراب ہے۔“

کوئی البیلی پھیرے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔
”ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ رجو اس کے شانے سے سر نیچے نیچھی ہوئی ہے اگر کھلی ہوئی نقین ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو محبت سے دیکھ رہے ہیں ہاں چاندنی آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں اتر رہی ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے“ منگو جیتا ہے۔ اس لیے جیتا ہے کہ رجو اس کے ہاتھ سے ایسے لڑ گئی ہے جیسے اناڑی پھیرے کے ہاتھ سے پھلی ترپ کر نکل جاتی ہے۔ سب بات پا کر سمجھتے ہیں اور وہ جیج پاگلوں کی طرح جیتا ہے۔

”تم سب جھوٹے ہو۔ رجو کا نام لے کر مجھے جلاتے ہو۔ ستاتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔“
مرہنگی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس چٹان سے اس نے پھلاگ لگا کر میری آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھی۔ وہ مرہنگی ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ بھاگ دو۔

وہ ساحلی ریت پر لڑکھڑاتے ہوئے دوڑتا ہے۔ انہیں مارنے کے لیے ہاتھ اٹاتا ہے۔

اپل والے کے لیے نکل جاتے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ پھلیوں سے بھری ہوئی کشتیاں لاپٹا لپٹا آتے تو ساحل پر اچھا خاصا میلہ لگ جاتا تھا۔ شہر سے آنے والے پھلیوں کے بیٹے بڑے ٹوکوں میں آتے تھے۔ پھلیوں کا سودا ہونے انہیں تولنے اور ٹوکوں میں لے کے دوکان بڑی گھما گھمی رہتی تھی۔ پان سکرٹ، چائے اور شربت وغیرہ کی عارضی نمائش کیا کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ کمرے دھام دے کر چیمیز خریدتے اور مزدوروں، محنتیوں کو بلاتے کرتے تھے۔ رات کی چچی بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتی تھیں۔ لاکھوں لاکھوں ٹوکوں پر لاوا کرتی تھیں۔

اس کا چاند سو کر اٹھتا اور اپنی جھکی سے باہر آتا تو اس وقت ساحل دیران ہو جاتا۔ رات پر گاڑیوں کے پیروں کے نئے نئے نشانات رہ جاتے تھے۔ دور پھلیوں کے بچے دور کی لہروں سے کھینچے رہتے۔ کسی جگہ راتوں کے اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ریت کے دوڑے بناتی رہتی اور جھکی کے باہر اس کی چچی پھلیوں میں تنک بھر کر انہیں دھوپ میں بیکار کرتی تھی۔ روز کا بھی معمول تھا۔ اس کی چچی محنت کرتی تھی اور پچا بیٹھ کر کھاتا تھا۔

رات کا ایک پچا زانو بھاتی تھا۔ وہ بڑی منتوں اور مردوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کی چچی خیرہ تھا کہ اگر حضرت لال شہباز قلندر اس کی نہ سینے تو بیٹا کبھی پیدا نہ ہوتا چونکہ وہ غلام کا بچہ تھا اس لیے اسے منگو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

رات اس کی کبھی نہ بنتی تھی وہ نفرت سے کہتی تھی۔
”منگو کتنے دانے کو کہتے ہیں تو بیک منگا ہے۔“

اس کی چچی کھینچ کر کہتا۔

”بیک منگو تو ہے جو میرے گھر میں رہتی ہے اور میرے گھر میں کھاتی ہے۔“

وہ بچپن ہی سے بڑی حساس تھی کبھی چچی بھڑکتی اور پچا اسے مارتا تو اسے اپنی بد نصیبی پر غلامی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ منگو ان کا بیٹا تھا اسی لیے اس کی ہر شرارت قابل معافی نہ تھی کی کہ بیٹی نہیں تھی اس لیے سب ہی اس پر اپنا غصہ اتارتے تھے ایسے وقت وہ منہ باغی زب کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی اور اسے اپنا دکھانا سناتے لگتی تھی۔

”جب میں بچی کی طرح بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی مزدوری کروں گی۔ اپنا کھانا خود کھاؤں گی۔ ان کی ہانڈی میں جھانکنے تک نہیں جاؤں گی۔“ اوندہ اُور سا کھلاتے ہیں اور دنیا

والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

گمراہ دونوں خاموش ہیں اور سمندر رول رہا ہے۔ گرج گرج کر رول رہا ہے۔
لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرچے اڑ گئے ہیں۔

لہریں اونچی اور اونچی ہو رہی ہیں اور ان کے سروں پر بکھر رہی ہیں۔ پانی کے چھٹل اور شفاف بوندوں کی جھاروں میں ان کا وجود جھل جھل ہو رہا ہے۔ چاندنی میں جگ رہا ہے اور لہروں میں چھپ رہا ہے۔

لہریں بلند ہو گئی ہیں۔ اتنی بلند ہو گئی ہیں کہ وہ چٹانی جزیرہ کسی اوڈھے کے منہ میں ڈال دیا ہے۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں چند ساعت کے لیے رک گئی ہیں۔

لہریں داپس جاری ہیں اب جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی ہے۔ ہار چمک رہا ہے، چاندنی دیران جزیرے پر بھٹک رہی ہے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ کہاں کہاں؟

چاند کے نیچے چاندنی اور سمندر کی تہ میں محبت ہے۔

دیکھنے والوں کے سر جھک گئے ہیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے واپس جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خواب ہیں اور دلوں میں یقین ہے کہ اگلے ماہ جب چودھویں کا چاند کھلے گا تو تراب اپنی رات کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر پھر اس جزیرے میں آئے گا ضرور آئے گا۔

سمندر اتنا انسانوں کو بہا کر لے جاسکتا ہے لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈر سکتا۔
اگلے ماہ۔۔۔ ہاں اگلے ماہ۔۔۔



بچے عام طور سے پہلے اماں اور ابا بولنا سیکھتے ہیں لیکن رات کی زبان پر پہلے چچا اور چچی کا نام آیا کیونکہ جب اس نے آنکھ کھولی تو اماں باپ مر چکے تھے اور زبان کو بولنے کے لیے صرف چچا اور چچی ہی رہ گئے تھے۔ بہتی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا چچا بھی غریب تھا۔ غریب اس لیے بھی تھا کہ محنت سے جی چراتا تھا۔ رات کو انہوں کی ہتھیلیں رہتا تھا اور صبح دیر تک سوتا رہتا تھا۔ دوسرے پھیرے آؤں رات کو کشتیاں لے کر سمندر

بھری باتیں سناتے ہیں۔“

”تم ایک دہلی پتلی کمزور لڑکی ہو، تم سے مزدوری نہیں ہوگی۔ جب میں اپنے باپ کی طرح بڑا ہو جاؤں گا تو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا پھر وہ مچھلیاں بیچ کر اتنے مارے پیسے لاکر تمہیں دلوں گا۔ تم میرے لیے کھانا پکاؤ گی؟“

”ہاں پکاؤں گی۔“

”میرے گھر میں رہو گی؟“

”ہاں رہو گی۔ تم میرے چچا اور چچی کی طرح مجھے مارو گے تو نہیں؟“

”کبھی نہیں۔ کیا میں نے آج تک تم سے کبھی لڑائی کی ہے؟“

”نہیں۔ تم بہت اچھے ہو۔“

وہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔ دس برس کی رجو یہ نہیں جانتی تھی کہ ان باتوں کے پیچھے پیار کی کتنی مٹھاس ہے۔ وہ محض چچا اور چچی کے ظلم سے اور اپنی جیتی کے دکھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایسے وقت تراب ہی اس کو ایک بہرہ ور اور مہربان نظر آتا تھا۔ تراب کی یہ بہرہ ریزی اور اس سے بڑھتا ہوا میل جول منگو کو برا لگتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے شکایتیں کرتا تھا کہ رجو اس کے ساتھ نہیں کھیلتی اور ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے اس پر سختی ہونے لگی کہ وہ تراب کی جھکی کی طرف نہ بابا اگر تراب کھیلنے کے لیے آئے تو اسے منگو کو بھی اس کھیل میں شریک کرنا چاہیے۔

تراب پندرہ برس کا ہوا تو اپنے باپ کے ساتھ سمندر میں جانے لگا۔ رجو تھوڑی سی مہینہ تھی وہ سری لڑکیوں کی طرح وہ بھی بالکی چھلکی مزدوری کرنے لگی تھی۔ تراب سمندر سے واپس آتا تو وہ اس کی کشتی سے ٹوکری میں مچھلیاں بھر کر ٹرک میں لاؤنے کا کام کرتی۔ اس کے ساتھ مل جل کر جال کو دھوپ میں پھیلاتی، جال کی کوئی ذور کمزور ہو جاتی تو اسے درست کرنے بیٹھ جاتی۔ تراب کا باپ اسے دس روپے سے زیادہ پیسے اور زناں مچھلیاں دیا کرتا تھا آمدنی بڑھنے دیکھ کر چچی اس سے محبت سے پیش آنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں بابا پلٹ گئی اب وہ منگو کو بائیں سنایا کرتی تھی کہ وہ باپ کی طرح ٹکھٹو سے منج مزدوری کرنے کے بجائے ٹرک والوں سے باتیں کرتا ہے اور ان سے سکرےٹ ٹانگ کر بیٹا ہے۔ منگو کو ماہی گیری کے پیشہ سے نفرت تھی۔ سمندر کی غضب ناک لہروں سے کھینا

لہروں کی چو چلاتے رہتا اور مچھلیوں کی بساند میں زندگی گزارتا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ لڑکی بننا چاہتا تھا، وہاں آنے والے شہریوں کی طرح اچھے اچھے کپڑے اور جوتے پہننا پاتا۔ لڑکی بننے دیکھتے دیکھتے ایک روز وہ بستی سے چپ چاپ چلا گیا۔ ماں نے سمجھا کہ بیٹا لڑکی بنی گئی باتیں سن کر کہیں دور نکل گیا ہے۔ شام تک بھوک لگے گی تو آپ ہی واپس نہ لے گا۔ شام ہو گئی رات گزر گئی۔ دوسرے دن بھی بیٹے کی صورت نظر نہ آئی تو اس نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ بستی والے بھی حیران تھے کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟ لڑکی ایک ٹرک ڈرائیور نے اسے بتایا کہ منگو اس کے ساتھ اس دھڑے پر کراچی گیا۔ دوسرے دن پھر اس ٹرک میں واپس آجائے گا مگر کراچی پہنچ کر وہ ٹرک ڈرائیور سے ٹوکنے سے بغیر کہیں چلا گیا اور جاتے جاتے ڈرائیور تک سیٹ کے نیچے سے اس کے جینے پائے پلاس روپے چارہ لے گیا ہے۔ اس کی ماں نے چھاتی پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔

میرے بچے کو کئی ڈھونڈ کر لاؤ، میں ہر ماہ تمہیں دس روپے دے کر تمہارے پیاسے پلو لاکھوں گی۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

ملائی میں اپنے روپے کے لیے خود ہی اسے تلاش ہوں مگر وہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہ جو غور کر رہی ہو، وہاں سے بھی بڑا شہر ہے، سمندر میں چھپی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا آسان نہ کر رہی شہر میں کسی چھپے ہوئے آدمی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے بہت مشکل ہے۔“

روجنے والی دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے وہ ہمیشہ کے لیے کہیں گم ہو جائے اور کبھی نہ آئے جیسے جسے دن مینے اور سال گزرنے لگے اسے یقین آتا تھا کہ اس کی دعا قبول نہیں ہے۔ منگو واپسی کا راستہ بھول گیا تھا یا وہ بڑا آدمی بننے میں مصروف تھا۔ اس عرصے میں لڑکی اپنے بیٹے کا انتظار کرتے کرتے اس دنیا سے چل بسی۔

نئی برس کے دوران رجو بہت استہ چودہویں کے چاند کی طرح مکمل ہو گئی۔ لہذا اپنی چچی کی طرح محنت کرتی تھی۔ بستی کے لوگ برسوں پہلے کی دہلی پتلی سی رجو بن چکے تھے۔ عمر کے اس نئے موڑ پر اس کا روپ رنگ کھرتا جا رہا تھا۔ جب وہ لہلوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر چلتی تو اس کے جسم میں آپ ہی آپ لہروں کا سالوچ اور اچھا محبت ایسی جاذب نظر تھی جیسے وشال سمندر کے خزانے چھپائے پھر رہی ہو۔

کی لگی میں تاش کھیلنے والے نوجوانوں میں سے کوئی نوجوان تڑپ کا پتہ بھیج کر
 بچہ تڑپ ہمارے ہاتھ میں ہے اور جیت تڑاب کی ہو رہی ہے۔ آج رجو اس کے ساتھ
 بچہ تڑپے پر گئی ہے۔ یعنی کچھ بھی کہو۔ وہ برا خوش نصیب ہے ہم رجو پر جان دیتے ہیں
 اور اس پر جان دیتی ہے۔“

کی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بوڑھوں میں سے کوئی چلم کاٹش لگا کر کہتا۔
 بڑے حیاتی ہے۔ ان کا کیا رشتہ ہے کہ وہ اتنی آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں کبھی
 ٹھکیاں کرتے ہیں کبھی ساحل پر گھومتے ہیں اور کبھی چٹانی تڑپے پر جاتے ہیں یہ تو کھلی
 پٹا جاتی ہے انہیں دیکھ کر ہمارے جوان بچے بھی ہنسنے لگیں گے۔

اس کی باتیں سن کر کچھ لوگ تائید میں سر ہلاتے تھے اور کچھ لوگ رجو اور تڑاب کی
 بات کرتے تھے۔ ان کی حمایت کرنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ رجو
 اور تڑاب ایک دوسرے سے محبت کریں مگر شادی نہ کریں شادی سے پہلے شہر و شکر
 دہانے والوں میں اکثر تنخیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک دوسرے سے بے زاری بڑھ جاتی
 ہے۔ رجو اور تڑاب سے بے زار ہو گئی تو کسی دوسرے چاہنے والے کے نصیب جاگ
 جائی گے۔

جب تیار آخر پیاری ہوتا ہے، مچھلی کا پیواری نہیں ہوتا کہ گاہک بدلتے جائیں۔ رجو
 اپنی زندگی کی تمام ساتیں تڑاب سے منسوب کر چکی تھی اسی لیے تڑاب کی کشتی کے سوا
 کسی دوسرے کی کشتی پر مزدوری کے لیے نہیں جاتی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جال ڈالنے
 کے لیے نکل جاتا تو وہ سیدھی لالہ کی دکان پر آتی اور اس کے دو دانے پر دستک دیتی۔ روز
 کو معمولی قناس کی دستک ہتھ لالہ کی پیواری بیڑی ہوتی دو دانہ کوٹھتی۔

اگلی کبھت خیر حرام کر لے جب ساری ہستی سوجاتی ہے جب ہم دکان بند کر دیتے
 ہیں بی بی اسے تمباکو خریدنا یاد آتا ہے۔ اری تڑاب سے کیوں نہیں کشتی وہ دن کو خود ہی
 اڑانے لیے تمباکو خرید لیا کرے گا۔ رجو جواب دیتی۔ نہیں چاہتی باہر خود سے خریدے گا
 زہن زیادہ تمباکو پینے کی عادت ڈالے گا۔ میں تو حساب سے خریدتی ہوں اور حساب سے
 لے بیڑی دیتی ہوں۔ دیکھو تا جب وہ سمندر سے آتا ہے تو کس بری طرح ہانپتا رہتا ہے۔
 ہمارے لوگوں سے جنگ کرتے رہتا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں کہ وہ فولاد ہے

سمندر کے سینے پر جال پھینکنے والے نوجوان پھیرے اب اس پر اپنی نگاہوں کے جال بکے
 لگے۔ شہر سے آنے والے بیوپاری اور ٹرک ڈرائیور گھوم پھر کر تڑاب کی کشتی کی جانب
 آتے تھے اور رجو سے باتیں کرنے یا کچھ دیر تک اپنی آنکھیں سینکنے کا بہانہ تلاش کرتے
 رہتے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کوئی کھل کر اس کے سامنے اپنے دل کا پتہ
 کہہ دیتا کیونکہ اس بے سارا لڑکی پر تڑاب کی نگاہوں کا پھرو تھا اور اس کے دل پر کچھ
 سے اس جیلے کی محبت نقش ہوئی آئی تھی۔

تڑاب نے جوانی میں خوب اونچا اور بھرپور قد نکالا تھا۔ اس کا سینہ چٹان کی طرح تھا
 اور سمندر سے کھیلنے والے بازو فولاد کی طرح مضبوط تھے۔ رجو کی طرح اس کا رنگ مڑ
 نہیں تھا، سانولا تھا۔ جب وہ مچھلیوں سے بھری کشتی کھینچے ہوئے ساحل پر آتا تو پہلے
 اس کا بدن تانبے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ مسلسل چوچلائے کی وجہ سے اس کا سانس ہلکا
 لگتا تھا۔ سینہ دھوئیں کی طرح چلتا رہتا تھا اور جسم سے مچھلیوں کی بسانہ آتی رہتی۔

شہر سے آنے والے ناک، بھوں چڑھا کر رجو کی پسند پر تختہ دیں کرتے رہتے تھے۔
 اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے دل کی دھڑکنوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کوئی ہیرا پسند کرتا ہے اور
 سنگھڑ۔ سنا ہے انہی سنگھڑوں نے مل کر تڑاب کی گود میں محبت کا ایک تاج محل بنایا ہے۔
 رجو پھول تھی اور تڑاب کا تاج پھول کو نہیں پہنتا بلکہ دیکھتے والوں کی آنکھوں
 ٹھکنے لگتا ہے۔ ایک نوجوان پھیرے شاکر نے رجو کے چچا کو اپنی طعنی میں لینے کی کوشش کی۔
 ”چچا! رجو کو مجھے دے دو، میں تمہارے بڑھاپے کا بوجھ اٹھاؤں گا۔“

ایک شاکر ہی نہیں تھا کچھ اور بھی نوجوان اور بوڑھے تھے جو رجو کے چچا کا
 برداشت کرنے اور ہر رات اس کے لیے ایلیون کا کوٹہ مہیا کرنے کے لیے ہر وقت تیار
 مگر چچا رجو کا محتاج تھا اس کی کمائی پر پل رہا تھا لہذا اس کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ
 کر سکتا تھا۔

رجو اور تڑاب کے پیار کا چرچا بہت سی ہر گلی اور ہر گھر میں تھا۔ کوئی بورت
 بوڑھوں میں بیٹھ کر کہتی ”ابھی گھنٹہ بھر پہلے میں نے رجو کو دیکھا ہے وہ تڑاب کے
 اگلی ساحل کے موڑ کی طرف جا رہی تھی۔ ہائے دونوں ایک دوسرے کو لٹکا رہے
 انہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ جاتی ہے۔“

لے بیٹے نہ دیتی۔“

تراب نے پاپ سے ایک کش لیا پھر دھواں چھوڑنے کے بعد کہا۔ وہ واقعی طور پر ڈونٹا ہوا لڑکا تھا۔ وہ جزیرہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت چٹان کی طرح اٹل ہو تو کبھی نہیں ہٹتی۔ وہ واقعی ہی ہے تو حالات کی لہروں میں شرابور ہو کر ٹکڑا آتی ہے پہلے سے زیادہ شفاف لہروں میں جھگکتی ہے۔

لہجہ اکیں ہوتا ہے تراب۔ میری بڑی آرزو ہے کہ کبھی چاندنی رات میں وہاں جاؤں تاکہ مجھے یہ سمجھ سکوں کہ لہجہ کیسے بولتا ہے؟

بہتر کا کرشمہ ہے چاند کی کشش سے لہجہ اس کی جانب بلند ہوتی ہیں لیکن زمین کش زیادہ ہے اس لیے وہ لہجہ پھر نیچے آجاتی ہیں۔ لہجہ کی گھٹلیاں ہیں۔ چاند اور لہجہ کی گھٹلیاں سے کھینچے رہتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں ہمارے پیار کا وہ جزیرہ ڈوب آتا ہے۔ سوچا ہوں کہیں ہماری محبت بھی طوفانی لہروں میں نہ گھر جائے میں کل ہی اسے چاہا کہ پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ ہماری شادی کی تاریخ بتائی کروں۔“

وہ نے فطرت سے اس کے بازو کو تھام لیا۔ اسی وقت ایک بہت اونچی لہر چٹائی ہوئی اور اس نے پیار کے اس جزیرے کو حرف غلط کی طرح نگاہوں سے مٹا دیا۔ وہ اپنے محبوب کے فیصلہ پر خوشی سے مسکرا رہی تھی اور اندر ہی اندر سمجھ رہی تھی کہ یہ جزیرہ اپنی جھگیوں کی طرف داہیں جانے لگے۔ ان کے سروں پر صاف نہ بنگولن آسمان کا سایہ تھا۔ قدموں تلے ٹھنڈی ریت چبھی ہوئی تھی۔ چاند رات کی لہروں کے قریب چھٹکنے سے روک رہا تھا۔ تراب نے رجو کے ہاتھ کو ایسی مضبوطی اور ہمت سے تھام رکھا تھا جیسے ملاح اپنے چوار کو اور ٹھیکہ دار جال کھینچنے کی ڈور کو تھامے۔ رجو کو اس کی جھلی تک پہنچانے جا رہا تھا۔

ان کے سامنے ایک دھلا پتلا سا آبی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور دونوں ہاتھ کر کے لہجہ کی ٹانگ سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھاری دار چٹوان اور پھولدار قیض پہنی ہوئی تھی۔ لہجہ کی کھانسی سے خرید ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ رجو کا کلیجہ دھک سے دھک گیا۔ وہ

پھر بھی اسے زیادہ تمباکو نہیں پینا چاہیے اس لیے میں اسے روک کر روکتی رہتی ہوں۔ وہ ہنسا اچھا ہے چاہیے! میری ہر بات مان لیتا ہے، میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے، تم کو اسے اچھی طرح جانتی ہو تم نے تو اسے گود میں کھلایا ہے۔“

”اف! رجو تو بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے۔ اری میں نے تو تجھے بھی گود میں کھلایا ہے۔ میں تم دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں دونوں ہی پاگل ہو۔ لے لے تمباکو کی پڑا۔ اور دکان بند کرنے سے پہلے ہی یہ بڑا پانڈھ لیتا ہے کہ نہ جانے تو کس وقت آؤ گئے گی۔“

لا لے کی بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ دوسرا پاگل تراب تھا۔ وہ بھی کسی رات اپنے دوست روضہ کے ہاں پہنچ جاتا روضہ کے آگے میں پہلے کے پھول کھلتے تھے اس کی بیوی کی پھولوں کو کبھی گھرے کی صورت میں اور کبھی ہار کی صورت میں گوندھ کر رکھتی تھی دروازے پر دستک سنتے ہی وہ بڑبڑاتی ہوئی آتی۔ آگیا ہماری نیند حرام کرنے، بڑا بار بگیا کہ شام کو آکر پھول لے جایا کر۔ گھر داخل میں تو بوسہ بھرا ہوا ہے۔ تراب جواب دیتا ہے یہ بات کہیں ہے بھائی۔ آج رجو ذرا ناراض ہو گئی تھی، مانتے مانتے یہ وقت ہو گیا اب سے جلدی آیا کروں گا۔

تو جھوٹ کہتا ہے رجو کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ روٹھنے کی عادت مردوں کو ہوتی ہے تاکہ ہم ہاتھ جوڑ کر انہیں مٹائیں اور ان کی خوشامد کریں مگر تجھ سے اب بحث کن کرے؟ یہ لے کھڑا۔ آج اسے رجو کے ہاتھوں میں نہ پسانا۔ اس کے جوڑے میں لگانے کی کہہ سفید کیا اس کے سیاہ بالوں میں خوب کھلیں گی۔

اس کی بھابی نے جپتے ہوئے وہ کھڑا اسے دیا۔ پھر دعائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ تراب رجو کا لایا ہوا تمباکو ایک با ڈھنگے پاپ میں رکھ کر سلا رہا تھا۔ رجو کے جوڑے میں پہلے کی سفید کھلیاں مسک رہی تھیں رات خاموش تھی۔ چاند مسک رہا تھا اور وہ دونوں ساحل پر کھڑے ہوئے دراز کی چٹائی جزیرے کو دیکھ رہے تھے جو لہروں کی دھج میں گھرا ہوا تھا۔

رجو نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا ”کیسی غصہ ناک لہجہ ہیں کتنی بے روزی سے اس جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں، ہم تاروں بھری رات میں وہاں جاتے ہیں جزیرہ ہمارے پیار کا شاہد ہے میرے بس میں ہوتا نہیں اسے طوفانی لہروں سے بچا لیتی۔“

منگو نے دانت پیٹتے ہوئے تراب کو دکھا۔ پھر رجو سے کہا ”اچھا تو تم میرے باپ کا ایون کھلا کر اس کے ساتھ رنگ رلیاں مٹانے جاتی ہو۔ کیا تمہیں ہماری عزت کا اڑاؤ خیال نہیں ہے؟“

تراب نے غصہ سے کہا۔

”غصوں باقیں نہ کرو منگو۔ رجو سے میرا رشتہ طے ہو گیا ہے تمہارے باپ سے منگوری دی ہے کل میں یہاں آکر شادی کی تاریخ مچنی کر دی گئی۔“ اونسہ اُس نے غارت سے کہا۔



”وہ ایونی بوڑھا کون ہوتا ہے منگوری دینے والا۔ میری ماں نے بچپن ہی میں مجھ کو کہہ دیا تھا کہ یہ میری بہو بنے گی۔“

رجو نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

”ارے جا۔ بڑا آیا مجھ سے شادی کرنے والا۔ چور بد معاش، کل صبح وہ ڈرائیور نہ گا اور تیری گردن پکڑے گا جس کے پچاس روپے چرا کر ہٹا گیا تھا۔“ منگو بکتے لگا۔

اس کے روپے میں نے بہت پہلے دے دیئے ہیں۔ تراب جیسے مجھ پرے کی طرف غریب نہیں ہوں۔ ہر ماہ میگزینوں روپے کھاتا ہوں۔ کراچی شہر کا اے ون بس ڈرائیور ہوں اس وقت میری جیب میں دو ہزار روپے ہیں اتنے روپے کبھی تیرے باپ نے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ وہ ہاتھ بچا کر بولی۔

میرے باپ نے نہیں دیکھے ہیں تو تیرے باپ نے کب دیکھے ہیں جا کر پوچھ لے۔

سے۔ اس نے ایون کی گولیوں کے سوا دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تو کس بہت پوچھا۔

باپ کا نام لے رہا ہے؟

تراب نے کہا ”رجو تم اس بے وقوف کے منہ نہ لگو۔ میں جیسے نہیں جانتا کہ کون جگہ میں اس لفظ کے ساتھ رہو۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ وہ رجو کا ہاتھ پکڑ کر منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”فہو“ رجو کا ہاتھ چھوڑ دو۔ دیکھو تراب میں تم سے جگہ نہیں چاہتا۔ ورنہ تم نہیں جانتے میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔“

تراب نے حقارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

”باپ کی اور کیا پڑی کا شور بہ۔ ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو زمین سے اٹھ نہیں سکے گا۔“

نہ تو راستہ روک کر دیکھ لے۔ میں رجو کو اپنے دوست رمنو کے ہاں لے جا رہا ہوں۔

نہ تک یہاں رہے گا رجو وہاں بھابھی کے ساتھ رہا کرے گی۔ یہ کہہ کر وہ رجو کو ساتھ لے لے لگا۔ منگو غصہ سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے پڑی بے بسی سے تراب کے فولادی جسم کو ہٹا کر اس کے ساتھ ٹھکانے کے پیچھے میں شکست اور شرمندگی کے سوا کچھ اٹھ نہ ہو گا۔ اس منگوار کو شہری جھکنڈوں سے مات دی جی ہوگی۔

بہن والوں کے لیے دو سراؤں بہت ہی دلچسپ اور ہنگامہ پرور تھا۔

رجو اور تراب کے دشمن خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ منگو واپس آ گیا ہے۔ تراب کی بہن کرنے والے اور رجو کی بھلائی چاہنے والے منگو کو نفرت سے دیکھ رہے تھے وہ شہری میں ایڈنا اترا تا پھر رہا تھا اور جیب سے بڑے بڑے لوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہہ لگا۔

”غیب ہے اس بہتی میں کسی کے پاس سو روپے کی ریز گاری نہیں ہے اب میں اتنے لوٹ رکھ کر یہاں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں اسی لیے تو میں یہاں نہیں آ رہا تھا مگر کیجنت کا خیال مجھے پہنچ لایا ہے۔ اے موسیٰ! تجھے یاد ہو گا میری ماں رجو سے میری شادی کرنا نہ تھی۔ اے بابا تو ملازمی ہے دو سروں کو بھی نماز پڑھانا ہے تو جج جج کہہ دے میری ماں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میرا رجو کا نکاح تو ہی پڑھائے گا۔“ ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔

کار ملازمی بابا نے اس کی تائید کی۔

نہ بہن میں پھرتا رہا۔ ایمان والوں کو ایمان کا واسطہ دتا رہا۔ ضرورت مندوں کے ہاں میں دو چار روپے رکھنا گیا اور ایک سیاسی لیڈر کی طرح تمام لوگوں کو اپنے حق میں نہانے کے لیے تکانہ کرتا رہا۔ چھوٹی سی بہتی میں کچھ ایسی ہی فضا قائم ہو گئی جیسے کوئی بہت اکتان ہونے والا ہو، صبح شام رجو، تراب اور منگو کے چرچے ہونے لگے۔

لیڈر ایمن، گھنوں میں معاملہ پر مسند پر، بننے والی کشتیوں پر یہی ذکر تھا۔

”رجو تراب کو چاہتی ہے تراب ہی سے شادی ہوگی۔“ رجو منگو سے منسوب تھی منگو نے لڑائی ہوگی۔

اٹا لیا میں کہ قہوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ تراب کے حاجی آپس میں کھسر
لے لگے منگو کے منگو کے حاجی طنز آمیز انداز میں مسکراتے لگے۔ ان کے منگو نے پی
سے بائیں ہال چلی تھی۔ تیرہ برس کا احسان چکا ناچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ایک بوڑھا
لوہے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے ایک بار جو سے شادی کا پیغام بھی بھیجا تھا
وہ نہ سے گالیاں بھی سن چکا تھا۔ وہ منگو کی اس بات پر بڑا خوش ہوا۔ اس نے
ناؤ میں سرھاتے ہوئے کہا "بچوں کی پرورش کی جائے تو ان سے حساب نہیں لیا
لجھڑائی نہیں رہی، وہ حکم کھلا رانی بن گئی ہے لہذا کسی بھی پرانے غصے کو کھٹکھٹا
بھڑاس سے دام وصول کیے جاتے ہیں۔ منگو ٹھیک کہہ رہا ہے جو اس کی ماں کی
باپ تک وہ تیرہ برس کا قرضہ ادا نہیں کرے گی اس وقت تک تراب سے
نہیں کرے گی۔"

اوپر کے قرضہ ادا کرے گی؟" رہنمائی پوچھا "منگو آخر چاہتا کیا ہے؟ وہ صاف
کہا "اگر وہ روپے چاہتا ہے تو تراب ہزار دو ہزار ابھی دے سکتا ہے۔"

نئے جواب دیا "کیا میری ماں نے اتنے برسوں میں صرف دو ہزار روپے کے پیچھے
پہنچا؟ ہزار اعلیٰ کے ناخن لو۔ ماں نے جو روپے جو پر خرچ کیے وہی روپے میرے
اٹل آج میں شرجا کر ایک نئی ٹیکسی شٹلوں پر حاصل کر لیتا۔ ایک ٹیکسی شٹلوں
مارنے کے لیے کم از کم پندرہ ہزار روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم لوگ
ہزار حساب کرو اگر ماں نے ہر ماہ روپے کے لیے سو روپے خرچ کیے ہیں تو اس
نے تیرہ برس میں پندرہ ہزار روپے ہو جاتے ہیں لاؤ نکالو پندرہ ہزار اور جو کولے

لہجہ والے نے کہا "جے رام رام، ہم بھی قرض لینے دیتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں
کا اچھن سے پالنے میں جو رقم خرچ کی گئی ہے اس رقم کو قرض کے طور پر وصول
کریں جو کو پالنے والی اس کی چاچی تھی کیا رشتہ داری میں قرض وصول کرو
لے جواب دیا۔

بڑا داری ہوتی تو میں کبھی یہ بات نہ اٹھاتا۔ جو خود ہی رشتہ توڑی ہے اس لیے
رشتہ جوڑنے سے پہلے اسے قرض ادا کرنا پڑے گا۔ صلہ صفائی کا یہی ایک راستہ

"نہیں ہوگی کبھی نہیں ہوگی۔"

"ضرور ہوگی۔ منگو کے راستے میں آنے والا سر کچل دیا جائے گا۔" دونوں طرف کی
پارٹیاں لائٹیاں اور داؤ لے کر ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک پارٹی
نے کہا۔

"جو تراب کے دست کے ہاں نہیں رہے گی۔ اسے اپنے چچا کی جگہ میں رہا ہوگا۔
دوسری پارٹی نے جواب دیا "جس جگہ میں منگو رہتا ہے وہاں جو نہیں رہے گی جب تک
کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

منگو کے لوگوں نے کہا "اگر وہ منگو کے ساتھ جگہ میں نہیں رہے گی تو پھر تراب کی
کشتی پر بھی مزدوری کے لیے نہیں جائے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"
کے بوڑھے ان کے درمیان آگے "ٹھہرو ٹھہرو۔ آپس میں خون خراب نہ کرو۔ رو کافیل
پہنچات کرے گی۔ ہم بوڑھوں نے دنیا دیکھی ہے ہم جو فیصلہ کریں گے وہ سب کے لیے
قابل قبول ہوگا۔"

"کیسے قابل قبول ہوگا۔" ایک نے کہا "جو تراب کو چاہتی ہے اس لیے فیصلہ
کے حق میں ہوگا۔"

منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔
"تم سب یہ دیکھتے ہو کہ جوانی میں جو نے تراب کو پسند کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ
بچپن سے میری ماں نے اس لڑکی کی پرورش کی ہے اس کے لیے خون بہینہ ایک لکا ہے
تاکہ اسے اپنی بونہا کر سکے۔ تم سب میری مرحوم ماں سے نا انصافی کر رہے ہو۔" تراب
نے آگے بڑھ کر جواب دیا "ہم تمہاری ماں کا احسان مانتے ہیں لیکن لڑکی کو حق پہنچتا ہے کہ
وہ اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرے۔"

منگو نے غصے سے ہاتھ جھٹک کر کہا "تو پھر جاؤ جو کو بیاہ کر لے جاؤ مگر اس سے پہلے
میری ماں کے خون بہینہ کا حساب کرنا ہوگا۔ اگر جو ہماری ہوتی تو میں کبھی فیصلہ کی طرف
حساب نہ مانتا۔ اس نے تین برس میرے باپ کو اپنی کمائی کھلائی ہے مگر میری ماں نے نو
برس تک اسے کھلایا ہے، کپڑے پہنتا ہے جس دکھ بھاری میں اس کے لیے راتیں جاگتا ہے
داؤں کے دام دیئے ہیں ان سب احسانات کی قیمت چکا سکتے ہو تو پھر لے جاؤ جو کہ"

نہ صرف لڑکھانے سے پہلے تراب نے رجو سے شادی کرنے کی کوشش کی تو میرے
 بھائی اور بھول نہیں ہیں یہاں تو گتے فساد ہوں گے لوگ زخمی ہوں گے مارے
 گئے ایک لڑکی کے لیے یہاں جھگیاں جلتی ہوئی نظر آئیں گی۔“
 لڑکی کی عورتیں سہم گئیں۔ انہیں اپنا سناگ لٹا اور جھگیاں جلتی ہوئی نظر آرہی تھی
 لڑکی بچہ رہے تھے اس فساد کو روکنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ منگو کا مطالبہ پورا کر دیا
 گئے ایک بوڑھے نے کہا ”اس بہتی میں کبھی فساد نہیں ہوا۔ ہم ایک لڑکی کے لیے
 بکوں کو برباد، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کر سکتے۔ منگو اپنی ماں کی خرچ کی
 بجائے رقم مانگ رہا ہے مگر بہت زیادہ مانگ رہا ہے، صلح منگانی کے لیے دونوں فریق
 اسے کام لیں۔ منگو اپنی رقم میں کچھ کمی کرے اور تراب اس کی ادائیگی کے لیے
 تیار ہو جائے اس طرح بات بنے گی۔“

نکلے تراب کی جانب دیکھا اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے مطالبہ میں کچھ کمی کرے گا
 تو اس کی مچلی پکڑنے والے کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی جس کے عوض وہ رجو کو
 لے لے اس نے کہا۔

”جی بات ہے۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے ہیں اس لیے میں ایک ہزار کم کیے دیتا ہوں
 ہمارے زندگی میرا یہ احسان رہے گا۔“ رجو نے عورتوں کی بھیڑ سے نکل کر کہا ”میں
 پہلے نئے احسان پر۔ میں چاہتی کے احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ میں ساری زندگی
 تجھ کی عورتوں کی اور ایک ایک بیسہ جوڑ کر ہندہ ہزار تیرے منہ پر ماروں گی۔“

”جی طرح سوچ لے رجو۔“ منگو نے کہا ”جب تک تو قرض ادا نہیں کرے گی اس
 تک تراب سے نہ شادی کر سکے گی نہ مل سکے گی اور نہ اس سے بات کر سکے گی۔ مجھ
 کو تو تو کراس سے رشتہ جوڑنے کے لیے پہلے تجھے چندہ ہزار کی رقم جمع کرنی ہوگی اور
 ایک بیسہ جوڑتے جوڑتے بوڑھی ہو جائے گی۔“ تراب نے کہا ”تو رجو کو تنہا کیوں
 دے دے میں نے اپنی جھگی کی جگہ ایک پکا مکان بنانے کے لیے اب تک تین ہزار روپے
 بچائے یہ روپے میں رجو کو دوں گا۔ اور روز کی آدھی کمائی اس کے لیے بچایا کروں
 جب تک کہ دوست و رفقاء نے کہا ”میرے پاس ایک سو تیس روپے ہیں میں بھی اپنی
 ایک ایک حصہ رجو کے لیے بچایا کروں گا۔ اگلے چار ماہ تک پانچ سو روپے دینے کے

قابل ہو جاؤں گا۔“

لالہ نے آگے بڑھ کر کہا ”میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں نے اور میری چچی نے زلب
 اور رجو کو گود میں کھلایا ہے۔ آج ان بچوں پر چڑا آئی ہے تو میں بھی ان کی سمانا کر لیاں لگائی
 اپنی جمع پونجی سے انہیں دو ہزار روپے دوں گا۔“ نمازی بابا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا
 ”میں بارہ برس سے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنانے کے لیے ہر ایک کے سامنے ہاتھ بٹھایا
 ہوں اور پیسے دو پیسے سبھی سے لیتا رہتا ہوں۔ اب تک میں نے ساڑھے چار سو روپے جمع
 کیے ہیں۔ سچ کہتا ہوں ابھی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں الہام سا نازل ہوا ہے کہ انسان ہر ایک
 ہوئی آفات کو دور کرنے کے لیے چندہ کیا جاتا ہے، خدا کے لیے چندہ جمع کرنے کی ضرورت
 نہیں ہوتی۔ خدا کسی مسجد کا محتاج نہیں۔ رجو بیٹی ایک گھر کی اور ایک گھر والے کی تلاش
 ہے میری مخالفت کرنے والے ہزار باتیں مجھے سنائیں گے مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ رجو
 کے لیے چھت ڈالنے سے پہلے بیٹی کے سر پر آجمل ڈالوں گا۔“

رجو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے سب لوگ لالہ اور نمازی بابا سے متاثر ہو کر
 ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ رجو اور تراب نے محبت کی حمی اور لالہ
 دھرم اور نمازی بابا کا مذہب اس محبت کے ستار پر آکر مل رہے تھے۔ تراب اور رجو
 محتاجی بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دینے کے وعدے کر رہے تھے۔ منگو
 اس کے محتاجی غرا کر انہیں دیکھ رہے تھے ویسے وہ مطمئن تھے کہ اتنی آمد کے باوجود وہ
 تراب کو چندہ ہزار تک پہنچنے کے لیے ابھی کئی برس تک محنت کرنی پڑے گی۔

دوسرے دن سے محنت شروع ہو گئی وہ سب ایک نئی لگن سے اور نئے حوصلوں
 دن رات محنت کرنے لگے۔ دوسری طرف منگو کے آدمی ان کے حوصلے پست کرنے کی
 میں تھے۔ تراب اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ چھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے
 دشمن چوری چھپے کبھی ان کے جال کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتے تھے اور کبھی ٹھیکوں
 نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو ان کی دشمنی کا ثبوت نہ ملے۔

ایک بار تراب اور اس کے ساتھیوں نے آمدنی بڑھانے کے لیے چھلیوں کو
 بڑھائے تو منگو کے ساتھیوں نے وام گرا دیئے ان کے درمیان اچھی خاصی سیالائی ہوئی
 بازیاں چل رہی تھیں۔ دن پر دن گزر رہے تھے رجو بھی زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے لگا

نہیں بلکہ محراب بہت دور تھا اتنی دور کہ شاکر کی کشتی سے ایک نئے کھلونے کی طرح
انٹالاس کی نگاہوں کی گری بھی رجو تک نہیں پہنچتی تھی۔

اسے لو اس دیکھ کر شاکر نے کہا ”میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں مجھے اپنے دل کی بات کہو۔
انٹالاسم تراب تک پہنچاؤں گا کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوگی۔“ ایک ہمدرد کو پا کر
نئے نے دل کی بات کہہ دی کہ تراب سے کہو ایک بار مجھ سے مل لے۔ ایک بار ملنے
کی کیا کیا بڑے گا اگر دشمنوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہو گا۔ وہ ہمیں چھانی پر تو نہیں چڑھا
بلکہ شاکر نے اطمینان دلایا کہ کوئی انہیں نہ دیکھ سکے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ کسی
نہ نہ ہوگی۔ آج رات وہ سب سمندر پر جائیں گے۔ وہ تراب سے کہے گا کہ تھوڑی دیر
لے لے جہاں تیرے پر چلا جائے۔ اس کے جانے کے بعد وہ کشتی لے کر ساحل پر آئے
وہ لو اس میں بھا کر چٹائی پر گریے پر اس کے محبوب کے پاس پہنچا دے گا۔

وہ نے احسان مندی سے اسے دیکھا ”یہ بہت اچھی تدبیر ہے شاکر۔ تم بہت اچھے ہو
جانتے میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔“

اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ میں اس لیے تمہارے کام آ رہا ہوں کہ تمہارا دکھ
ختم نہ کیا نہیں جاتا ہے۔ آج رات تم ساحل کے اس موڑ پر میرا انتظار کرتا۔ جب تمام
یہ سمندر پر چلے جائیں گے تو میں کشتی لے کر وہاں آؤں گا میں اپنی طرف سے پوری
کوشش کروں گا کہ کسی کو اس ملاقات کا علم نہ ہو تم بھی احتیاط برتنا اپنے سائے سے بھی
دارم کہیں جا رہی ہو۔“

وہ نے لے کر گزرا مشکل ہو گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے سورج غروب ہونے کا
دیکھ کر رہی۔ رات آئی تو جھکی سے نکلنے کی تدبیر سوچتی رہی۔ تدبیر اسی وقت کام آئی
جتنی بیکار مشاکی نماز پڑھ کر سو گئے۔ وہ وہ پہاڑوں جھکی سے نکلی۔ اندھیری رات تھی
بات آؤں نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ بلا سے دیکھ لے۔ آج وہ ساری بندشیں توڑ کر
بیکر صرف ایک بار اپنے محبوب سے ملنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ ساحل پر کشتی تیار
پہنچا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

تم نے بہت دیر کر لی۔ تراب تمہارا انتظار کرتے کرتے کیسے مایوس نہ ہو جائے۔
پڑھ دیکھ گئی۔ شاکر کشتی کو لوہوں کے اتار چڑھاؤ پر کھینچ کر لے جانے لگا۔ جب

زیادہ سے زیادہ محنت کر رہی تھی اب اس کا کام ر منو کی کشتی پر ہوا کرتا تھا کیونکہ تراب
سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے پر پابندی لگادی گئی تھی وہ دونوں دوری سے ایک
دوسرے کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے۔ رات کو منگو کا کوئی جاسوس ساحل پر
رہتا تھا کہ وہ چوری چھپے بھی نہ مل سکیں۔

ر منو کی بیوی روز شام کو بیٹے کی کلیاں گوندھ کر رجو کو دیتی اور رجو لالہ کی دنگانے
تربا کو کی پڑیاں لاکر ر منو کو دیتی کہ وہ اسے تراب تک پہنچا دے اور تاکید کر دی کہ زیادہ
تربا کو نہ پئے کلیجہ جل جاتا ہے۔ پیسے جمع کرنے کے لیے اپنے کھانے پینے میں کمی نہ کرے
نہیں تو میں بھی بھوکے رہ کر پیسے جمع کروں گی۔

دونوں ایک دوسرے سے دور تھے اور جتنے دور تھے اتنے ہی اور زیادہ قریب ہونے
جا رہے تھے یعنی جسمانی طور پر دور تھے مگر محبت بھرے پیغامات انہیں تصورات کی دنیا میں
قریب لے آئے تھے۔

پھر منگو نے اعتراض کیا کہ تراب پچھلی رات ر منو کے ہاں رجو سے ملنے گیا تھا۔
میرا سر جھوٹ تھا رجو اور تراب ایک دوسرے کے سائے کو بھی چھو کر نہیں گزرتے تھے
لیکن فیصلہ کرنے والوں کو منگو کی بات پر اس لیے یقین آ گیا کہ ر منو تراب کا گروہ دست فا
اور دوستی کا حق نبھانے کے لیے وہ اپنے دوست کو رجو سے ملنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا
رجو کو نمازی بابا جیسے ایماندار آدمی کی سرپرستی میں دے دیا گیا اور وہ دوسرے دن سے شاکر
کی کشتی پر کام کرنے لگی۔ جس ر منو سے تراب کے پیغامات ملنے تھے اس کا بھی ساتھ
چھوٹ گیا تھا۔

یہ سب کچھ منگو کی جھنجھالی ہوئی کارروائیاں تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صرف
ماہ کے عرصے میں وہ سو ہزار روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ تراب اور رجو نے بھی اپنی کاپیاں
دیکھ کر منگو کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ اب صرف پانچ ہزار کی بات نہ تھی
تراب نے سوچا کہ چند ہزار روپے ہوتے ہی وہ رقم منگو کے منہ پر مارے گا رجو سے ٹکڑی
کرے گا۔ اس کے بعد یہاں منگو کا رونا دھونا کرے گا۔

دیے اب رجو سے جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے تو یہ بات تھی کہ تراب
کوئی نہ کوئی پیغام مل جاتا تھا اور وہ اپنے دل کو سمجھا لیتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ

میں کشتی کو سمندر کی طرف دھکیلے لگیں تو وہ بھی کشتی پر آگیا اور پتوڑ چلا کر اس کا کنارہ چٹانی جزیرے کی طرف موڑنے لگا۔ رجو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تقریباً سات گھنٹے بعد وہ اپنے تراب سے ملنے والی تھی۔ اس نے دور ساحل کی جانب دیکھا اندر میرے بستی اور جنگلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے ہاں طرف سمندر کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ چٹانی جزیرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ چاند کی روشنی میں کتا صاف نظر آتا تھا لیکن وہ چھپ کر جا رہے تھے اس لیے ایک لمبا پتھر کا ٹرے پئے تو آگے گھسنے کے بعد کشتی جزیرے کے کنارے سے لگ گئی۔ دور ایک چتر پر بیٹھا اور تراب ساحل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ رجو کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے پر آئی اور بے اعتدال اپنے چٹان ہوئی دوڑنے لگی۔

”تراب تراب“ قریب پہنچ کر وہ ایک جھکے سے رک گئی۔ وہ منگو تھا۔ اس نے قمر لگا کر کہا ”اچھا تو تم تراب سے ملنے آئی ہو۔ آؤ مجھ سے ملو۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ رجو پلٹ کر کشتی کی طرف بھاگی مگر وہاں شکر راستہ روکے کھڑا تھا۔

دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم دوست سمجھ کر میرے ساتھ آئی ہو۔ آؤ اب دوست بن کر رہیں۔“ وہ دونوں سے کترا کر پیچھے ہٹے لگی ”خبردار۔ میرے قریب نہ آنا جھوٹے منکر فرما لوگ سمجھتے ہو کہ اس تنہائی میں میں تم سے ڈر جاؤں گی؟ میں اپنی جان دے دوں گی کہ تم جس قریب نہیں آئے دوں گی۔“ ہم بھی جان کی بازی لگا کر یہاں آئے ہیں۔ منگو نے تم سمجھتی ہو کہ پندرہ ہزار لے کر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا تراب جیت جائے گا اور ہار جاؤں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پندرہ ہزار پر جسے حاصل کرنے کے بعد مجھے کھانا بڑے اور بستی والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمہیں صرف تمہیں۔ آج تم میری ہو گی یا پھر اس سمندر کی۔ میں جیتے ہو جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہی وہ رجو کی طرف لپکا۔ رجو بھاگنے لگی۔ دوسری طرف سے شکر لے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ آگئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور ہاتھ اٹھا کر بولی ”نصرو رک جاؤ۔ آگے بڑھو“

یہ کہتے ہی وہ رجو کی طرف لپکا۔ رجو بھاگنے لگی۔ دوسری طرف سے شکر لے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ آگئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور ہاتھ اٹھا کر بولی ”نصرو رک جاؤ۔ آگے بڑھو“

میں کشتی کو سمندر کی طرف دھکیلے لگیں تو وہ بھی کشتی پر آگیا اور پتوڑ چلا کر اس کا کنارہ چٹانی جزیرے کی طرف موڑنے لگا۔ رجو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تقریباً سات گھنٹے بعد وہ اپنے تراب سے ملنے والی تھی۔ اس نے دور ساحل کی جانب دیکھا اندر میرے بستی اور جنگلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے ہاں طرف سمندر کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ چٹانی جزیرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ چاند کی روشنی میں کتا صاف نظر آتا تھا لیکن وہ چھپ کر جا رہے تھے اس لیے ایک لمبا پتھر کا ٹرے پئے تو آگے گھسنے کے بعد کشتی جزیرے کے کنارے سے لگ گئی۔ دور ایک چتر پر بیٹھا اور تراب ساحل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ رجو کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے پر آئی اور بے اعتدال اپنے چٹان ہوئی دوڑنے لگی۔

”تراب تراب“ قریب پہنچ کر وہ ایک جھکے سے رک گئی۔ وہ منگو تھا۔ اس نے قمر لگا کر کہا ”اچھا تو تم تراب سے ملنے آئی ہو۔ آؤ مجھ سے ملو۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ رجو پلٹ کر کشتی کی طرف بھاگی مگر وہاں شکر راستہ روکے کھڑا تھا۔

دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم دوست سمجھ کر میرے ساتھ آئی ہو۔ آؤ اب دوست بن کر رہیں۔“ وہ دونوں سے کترا کر پیچھے ہٹے لگی ”خبردار۔ میرے قریب نہ آنا جھوٹے منکر فرما لوگ سمجھتے ہو کہ اس تنہائی میں میں تم سے ڈر جاؤں گی؟ میں اپنی جان دے دوں گی کہ تم جس قریب نہیں آئے دوں گی۔“ ہم بھی جان کی بازی لگا کر یہاں آئے ہیں۔ منگو نے تم سمجھتی ہو کہ پندرہ ہزار لے کر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا تراب جیت جائے گا اور ہار جاؤں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پندرہ ہزار پر جسے حاصل کرنے کے بعد مجھے کھانا بڑے اور بستی والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمہیں صرف تمہیں۔ آج تم میری ہو گی یا پھر اس سمندر کی۔ میں جیتے ہو جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہی وہ رجو کی طرف لپکا۔ رجو بھاگنے لگی۔ دوسری طرف سے شکر لے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ آگئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور ہاتھ اٹھا کر بولی ”نصرو رک جاؤ۔ آگے بڑھو“

ایک رات لالہ دھن بند کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک چمک چمچی گیتا گانا پڑھ کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنا دی۔ وہ دونوں چمک چمک دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دستک کو دو برسوں سے پہچانتے تھے۔ ہزاروں درھم کھائے جائیں تب بھی وہ رجو کی مخصوص دستک کو پہچان لیتے اور پہچان رہے تھے۔

ہو گئے ان کے دروازہ کھولنے چلی گئی۔ لالہ نے اپنی بیوی کی طرف گھوم کر کہا: "ہاں، کیا کوئی نیا کونہ نکلا؟" پہلے یہ تراب کو بلا کر لائے گی پھر اسے اس کے مطلب کی چیز لے جائے گا۔ وہ اس کے بعد آئے ہیں کیا کھائے بنے بیٹا سیٹلے جائیں گے؟ یہ کہہ کر وہ کھانا لے کر اپنے دروازے کی طرف پلٹا۔ وہاں کسی کا وجود نہ تھا۔ دروازے کے اندر تھی اور باہر دروازے تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے وہ چلی

میں نے اس سے کہا ٹھہرو۔ میں تمہارے دوست کو جنگاتی ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ
 لڑنے کے لئے آئے گا۔ جب تک وہ نہیں آئے گی میں پھول نہیں دوں گی۔ یہ کہہ کر میں
 اپنے گھر گئی اور جب روضہ کے ساتھ واپس آئی تو وہ یہاں نہیں تھا۔ کیا پتہ پھول نہ
 بلکہ وہ بڑے ناراض ہو کر چلا گیا ہو، روضہ اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کی جنگلی کی طرف
 بھاگے۔

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی روضہ واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ تراب وہاں نہیں ہے۔
 ”پھول دونوں کہاں چلے گئے؟“ تمام لوگ اپنی اپنی لائٹیں لے کر چاروں طرف پھیل
 نہ لی، میں بہتی کے باہر، اور ساحل پر دو دو تک انہیں تلاش کرتے رہے۔ انہیں
 اس وقت دیکھ کر ہر ایک کے دل میں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنتے رہے پھر
 ان کے بچنے پر ہلکا ہلکا ہار کر اپنی اپنی جگہوں میں آکر سو گئے۔

مکان کی حقائق پر ہنس رہا تھا۔ وہ تراب کے متعلق دھوکے سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ
 وہ بے باک ہے لیکن روضہ کو سمندر کے گہرے پانی میں ڈبوئے ہوئے اس نے اپنی
 لپٹ سے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

دوسرے دن بستی کے لوگ سو کر اٹھے تو انہیں رات کی باتیں خواب نظر آنے
 لگیں۔ تراب کو سمندر پر جاتے سب نے دیکھا تھا۔ مگر اسے اور اس کی کشتی کو واپس آنے
 کی نہیں دیکھا تھا اس کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے ہٹا چکے تھے کہ اب وہ کبھی واپس
 نہیں آئے گا۔ روضہ کی بیوی یہاں ہے جو اس کی واپسی کا قصہ سن رہی ہے۔ اسی طرح لالہ کا
 لڑکا بھی یہاں ہے رات کو نیند کی حالت میں نہ جانے کسے دیکھ کر روضہ کو پکار رہا ہو مگر سے نکل
 نہ سکا۔

لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔ لیکن پھیل
 ان باتوں میں آکر کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کیوں روپوش ہو گئے تھے؟ اس کی وجہ سمجھ میں
 نہ آ رہی تھی اس لیے کچھ لوگ ان کی باتوں کو جھٹلارہے تھے۔ پھر ہر رات ان کا انتظار
 ہوتا تھا۔ جب وہ ایک بار آئے تھے تو دوسری بار بھی آسکتے تھے۔ روضہ اپنے تراب کے لیے
 لڑکا لائے اور تراب اپنی روضہ کے لیے بیلے کی کلیاں مانگنے ضرور آئے۔ لالہ کی بیوی پڑیاں
 لگا کر تیار رکھتی تھی۔ روضہ کی بیوی سرشام ہی بیلے کی کلیاں ہار اور گہرے کی صورت

گئی۔ روضہ جو۔ ”دروازے سے باہر آکر اندھیرے میں وہ اسے آوازیں دینے لگا۔
 اس کی بیوی لائٹیں اٹھا کر تیزی سے چلتی ہوئی آئی ”وہ آج نہیں تو کل زلزلے
 ساتھ یہاں آجائی۔ تم نے تمباکو دینے سے انکار کر دیا اور وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔“ لالہ
 نے اس کے ہاتھ سے لائٹیں لے کر کہا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی میں ابھی اسے ہار لانا
 ہوں۔ وہ لائٹیں ہاتھ میں اٹھائے اسے آوازیں دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ رات کے
 سناٹے میں ”روضہ جو“ کی آواز دور تک لہراتی جا رہی تھی۔ جھگیوں سے لوگ اٹھنے لگے
 سوئی ہوئی بستی جاگنے لگی ”کون؟ روضہ کو پکار رہا ہے؟“

”لالہ کی آواز ہے۔“ مرد باہر نکل آئے، عورتیں دروازوں جھانکنے لگیں۔ دروازوں
 میں یہ خبر پھیل گئی کہ روضہ لالہ کے دروازے پر تمباکو مانگنے آئی تھی۔ پھر کتنی ہی لائٹیں
 جھگیوں سے نکل آئیں۔ کسی نے کہا دور روضہ کے ہاں گئی ہوگی۔ چلو وہاں دیکھ لیتے ہیں۔
 سب کے سب اسی طرف جانے لگے۔ لالہ انہیں تفصیل سے روضہ کے آنے اور
 جانے کا واقعہ سن رہا تھا۔ جب وہ روضہ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اس کا دروازہ کھلا ہوا
 اور اس کی بیوی اندھیرے میں چوڑھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ
 ہوئی بولی ”کیا مل گیا؟ تراب مل گیا؟“

”تراب! نہیں تو۔ ہم تو تراب کو نہیں روضہ کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔ کیا وہ یہاں نہیں
 آئی ہے؟“

”نہیں، یہاں ابھی تراب آیا تھا۔ دروازے پر دستک سننے ہی میں پھیل گئی کہ
 تراب ہے۔ روضہ سنا رہا تھا میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ گھٹنے کے برابر
 سمندر پر جانے والا تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ یہاں چوڑھٹ کے باہر کھڑا
 ہوا تھا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی روضہ کے لیے
 کی کلیاں مانگنے آیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟
 مگر وہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس طرح باہر کیوں کھڑا ہے؟ اندر کیوں نہیں آتا؟ اپنی بیوی
 باتیں کیوں نہیں کرتا؟

مگر وہ خاموش رہا۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ میرے دل میں بات بات لگا
 شاید وہ روضہ کو ڈھونڈ کر لے آیا ہے جیسی بیلے کی کلیاں مانگ رہا ہے۔

ایک بچی ہوئی لہری زو میں آکر الٹ گئی اور دو محبت کرنے والوں کو جھجھوٹی ہوئی
ہالاف ملی گئی لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرچے اڑ گئے۔ رمنو کی بیوی
بالا کر دوسری تھی اور تراب کو پکار رہی تھی۔

مہاراجا قبا میں نے تیری راجو کے لیے ہار اور گجرے گوندھ کر رکھے ہیں۔ ارے
ایک لڑکی کو لارہا ہے۔ "لہرس بلند ہو گئی تھیں۔ ان کے سروں پر بکھر رہی تھیں۔ پانی
نیل اور شفاف بوندوں کی جھاروں میں ان کا وجود جھل جھل ہو رہا تھا، چاندنی
نکھڑا تھا اور لہروں میں چھپ رہا تھا۔ پھر وہ لہرس بلند ہو گئیں۔ اتنی بلند ہو گئیں کہ
نہا کی اڑھس کے منہ میں چلا گیا۔ کچھ عورتیں دور رہی تھیں کچھ اپنی آہوں میں
ہلکے جھپک رہی تھیں۔ رمنو اور اس ساتھی وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے بہت پہلے
نیل کے جزیرے کی طرف جانے کی کوششیں کی تھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ
ایک کی مخالف سمت چلو جانا ناممکن ہے۔ انہوں نے دوستی اور دیوانگی میں ایک
ٹکڑی خمی لہروں نے انہیں اٹھا کر واپس ساحل پر پھینک دیا۔ اور جب انہوں
ہلکے ہو کر جزیرے کی جانب دیکھا تو جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی نظر
پڑا۔



جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور دو دھیا چاندنی میں بھیگی ہوئی سمندر کی لہرس
پڑاؤں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو وہ دونوں اس جزیرے پر آکر ملتے ہیں مگر وہ منگو کو نظر
نہانے، وہ غرت کا اندھا ہے اس لیے محبت کی چاندنی میں اسے نظر نہیں آتا۔ وہ نہیں
جانتے آگھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے وہ دلوں میں دھڑکتی ہے، داغ سے سوچی
نہا اور غنیمت کی آنکھوں سے کبھی لالہ کے دروازے پر کبھی رمنو کی دلہیز پر اور کبھی
نہا کی چاندنی میں دیکھی جاتی ہے۔

دو اور تراب سے محبت کرنے والے ہرماہ کی چودھویں کو انہیں دیکھتے ہیں اور بڑی
بے زبانی کہتے ہیں۔ سمندر انسان کو تو بہا کر لے جاسکتا ہے لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈبو
سکتا۔

جب تمام لوگ سر جھکا کر چلے جاتے ہیں تو لالے کی بیوی اور تراب کی بھابی آہستہ

میں گوندھنے بیٹھ جاتی تھی۔

مگر وہ نہیں آئے۔ لالہ نے افسوس کا اظہار کیا "کاش کہ میں اسی وقت اسے تباہ
دے دیتا۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے، اب میرے دروازے پر کبھی نہیں آئے گی۔" رمنو
کی بیوی کا بھی یہی خیال تھا کہ تراب ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور ان کے خیال پر اب بھی
لوگ بے زاری سے کہتے تھے کہ سب خیال ہی خیال ہے اس رات کوئی نہیں آیا تھا۔ سب
ان کا وہم ہے۔ رفتہ رفتہ اندھیری راتیں گزرنے لگیں۔ چاند ہر رات جوان ہونے لگا اور
چاندنی میں رست کے ذرے چمکنے لگے۔ ایسے ہی وقت رمنو ساحل کی طرف سے دوڑا اور
چلا ہوا ہستی کی طرف آیا "وہ آگئے ہیں۔ میں نے انہیں جزیرے پر دیکھا ہے۔ میں نے
چیخ چیخ کر آوازیں دی ہیں۔ انہیں واپس آنے کے لیے کہا ہے مگر وہ میری نہیں سن رہے
ہیں۔ جلدی چلو۔ کسی طرح انہیں بلاؤ سمندر کی لہرس غضب ناک ہو رہی ہیں۔"

جو لوگ رمنو کی باتوں پر یقین کرتے تھے اور جو تراب اور رمنو سے دلچسپی رکھتے تھے
فورا ہی دوڑتے ہوئے ساحل پر چلے گئے۔ چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا اور چاندنی جزیرے کو
چوم رہی تھی۔ شفاف اور دو دھیا چاندنی میں وہ دونوں نظر آ رہے تھے۔ وہ پوری طرح واضح
نہیں تھے۔ ان کا وجود کچھ ایسا تھا جیسے وہ شیشے کے بنے ہوں جن کے آہار سمندر کی لہرس
دکھائی دے رہی تھیں۔ لگا ہوں کے سامنے جھلکاتی ہوئی چاندنی تھی جو تراب اور رمنو کی
صورت میں مجسم ہو گئی تھی۔

ہستی والے انہیں پہچن سے دیکھتے آئے تھے اس لیے دور سے بھی پہچان رہے تھے اور
چیخ چیخ کر انہیں مخاطب کر رہے تھے "تراب کیا پاگل ہو گئے ہو، رمنو کو لے کر آجا۔" لہرس
رفتہ رفتہ بلند ہو رہی تھیں اور چٹانی جزیرے پر آکر جھل رہی تھیں۔ رمنو تراب کے شانے
سے سر نیچے بیٹھی ہوئی تھی، اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور وہ ایک
دوسرے کو محبت سے دیکھ رہے تھے۔

لالے کی بیوی نے چیخ کر کہا "رجو بیٹی آجا، واپس آجا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راتے
کا پتھر نہیں بنے گا۔" نمازی بابا نے ذرا آگے بڑھ کر آوازیں "تراب تو پہچن سے سمندر کا
مزانگ کو سمجھتا ہے ضد نہ کر، رمنو کو لے کر آجا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔
مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سمندر گرج رہا تھا اس وقت جزیرے کے ساحل پر رمنو کی بیوی

ٹٹاپس نہیں ہوتا جسے وہ بچے کو پناہ موت کے سرد ہاتھوں سے تمام عمر بچاتی رہیں۔
لے کر صرف دعا کہیں ہوتی ہیں۔

”تو دایا میرے بچے کو قیامت کی عمر لگ جائے۔ زندگی اسے کبھی ٹیڑھی نظر سے نہ
لگے اور موت ہمیشہ اسے طرح دے جائے۔ خدا یا۔۔۔“

ابانک ہی جہاز کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے جہاز کا موٹر
ٹھنسی ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ماں باپ کے دل و دماغ کو جھٹکے لگنے لگے۔ انہوں نے
گڑا کر اپنے جانی کو دیکھا۔ بیٹا بہت خوب صورت تھا۔ والدین کی جان سے زیادہ قیمتی تھا
لگتا تھا۔ کسی کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے۔ جہاز کا موٹر تیار ہو چکا تھا۔ اس تیار کو رہ کر
کمانی کے جھٹکے لگ رہے تھے اور جہاز دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ پھر کھڑکی کے شیشے کے پار
کا آئین گردش میں آ گیا۔ پانچ برس کے جانی کے لیے وہ عجیب تماشا تھا کہ جن سفید
پٹوں کو کڑھکا جاتا تھا وہ اوپر تلے ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے۔ کیا موت اسی طرح جھولنا
پڑتی تھی؟

ہاں! وہ عمودی سیاہ چٹان یوں کھڑی تھی جیسے انگلی دکھا رہی ہو ”خبردار! میری طرف
نہ نہ! کون جانتا ہے کہ تم ٹوٹ جاؤ گے یا میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔“ خبردار! آگے نہ
جھا۔

گمراہ عمودی سیاہ چٹان گویا ایک متناطیس تھی۔ جہاز اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا جیسے
پچھلے جانی کی طرف۔ جوانی برہا پے کی طرف اور برہا پا موت کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لیکن
پھر آواز کی بچہ تھا۔ کیا موت بچپن کے حسن کو اور ماں کے دودھ کے چٹکارے کو بھی نہیں
چھوڑتی؟

کبار کی زور کا دھماکہ ہوا۔ ایسا زوردار دھماکہ آسمان کے پھٹنے سے نہیں، ماں کی چھاتی
پٹے سے ہوتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ بعد شوق بچے کی سالگرہ منانے والوں پر کیا گزری؟
ہلائی غمزدہ بلندی پر چند لمحوں کے لیے قیامت برپا ہوئی۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سیاہ
لوہی چٹان کی ”خبردار!“ کہنے والی انگلی ٹوٹ چکی تھی۔



بازو بچکن کے اندر کھلونوں اور کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس کی ماں دکلن

مستاک واپسی

طیارے کی کھڑکی کے باہر صاف و شفاف بادل دھوئیں کی طرح ٹپٹ کھاتے ہوئے گزر
رہے تھے۔ پانچ برس کا جانی کھڑکی کے شیشے کو اپنی منہی انگلیوں سے یوں فوج رہا تھا جیسے
اڑتے ہوئے بادلوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ تو ایک ناسمجھ بچہ تھا ہی مگر
سمجھ دار لوگ بھی ہر اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتی
ہے۔

وہ ایک فلائنگ کلب کا طیارہ تھا۔ اس میں صرف ایک پائلٹ اور تین مسافروں کے
لیے گنجائش تھی۔ ایک مسافر تھا جانی تھا باقی دو مسافر اس کے مٹی اور ڈیڑی تھے۔ بیٹا
آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے جانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی
پانچویں سالگرہ کی خوشی میں اسے ہوائی جہاز کی سیر کرائیں گے۔ سو وعدہ وفا ہو رہا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کی غفلانہ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر قربان ہو رہی تھی۔ مستاک جذبے
مسکراتی ہوئی آنکھیں یوں جھپکی جھپکی سی تھیں جیسے سرخوں کے جام لبریز ہو کر جھٹکے کو بہا
ہوں۔ باپ کی آنکھوں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے تھا دینے والے
انتظار کے بعد وہ پیارا سا بچہ ان کی گود میں آیا تھا۔ سب ہی بچوں کے ذہن میں یہ غرض
ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں یا اپنے والدین کی گود میں کہاں سے آئے ہیں؟ یہ بہت ہی مشکل
سوال ہے۔ دنیا کی کوئی ماں اور کوئی باپ آج تک اپنے بچے کو صحیح جواب نہ دے سکا۔ لی
یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم اللہ میاں کے پاس سے آئے ہو۔

لیکن جانی کے متعلق اس کے والدین خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟
ایسے ہی وقت خدا کی دین کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ بچہ عورت کی گود میں بھی پھول لکھنا
ہے۔ جانی کی مٹی اپنے کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اس نے جانی
کو گرم سوٹ پہنا دیا تھا کہ ہلکی سی سرد ہوا بھی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ ماں کے پاس لپٹا

”مکراتا ہوا دکان کے شوکیس کے پاس آگیا۔ بانو ایک گاہک سے منٹ رہی تھی۔
”اگیا تو اس نے کیپٹن سے پوچھا ”فرمائیے۔“

”میں نے دکان کے باہر بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”میں بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک روپے میں کوئی بھی چیز خریدی جاسکتی ہے۔“ اس
بانو نے چرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا ”کیا کوئی بھی چیز؟“

”کیا نہیں۔ کوئی بھی۔۔۔“ وہ کہتے کہتے چونک گئی۔ کیپٹن اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا پھر
انہی بے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بانو کو بیٹھا بیٹھا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کی اسی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھیں کہ وہ
لال بے فکری اور لچھے دار باتوں سے خود کو بچا کر رکھے۔ ایک بار وہ فریب کھا چکی ہے
اسی فریب کے آئینہ میں اجنبی مردوں کا چہرہ دیکھنا چاہیے۔ لہذا بانو نے اس ایک
بانو کو قبول کرنے کے بجائے ٹھکرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ تو تمہیں خریدنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں سے حسین چیز۔۔۔ اگرچہ یہ انمول ہے، دنیا کے سارے دولت مند اس کی
مال نہیں کر سکتے۔ یہ ایک روپیہ تو میں اس دکان کے اصول کے مطابق دے رہا
ہوں۔“

بانو کو حیرت ہوا دل کہنے لگا ”واقعی یہ مرد لچھے دار باتیں کرتے ہیں۔ ایک بات کے
اپنے مطلب کی دوسری بات کہہ جاتے ہیں۔ آئیے اس کی بے باکی پر مجھے غصے کا اظہار
کریں مگر میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟“

اس نے ایک دم سے گھبرا کر ماں کو آواز دی۔ ”ماں تیزی سے چلتی ہوئی آئی، کیا بات
ہو؟“

بانو نے بولنے سے پہلے کیپٹن نے کہا۔

”میں آپ کی بیٹی کو یہ روپیہ دے رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔“

بانو کی بے باکی پر بول کھلا گئی۔ ”ماں نے محبت سے چپکارتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارا دکان کیوں ہو گئیں؟ آئیے جو رنگ رہے ہیں وہ دے دو۔“

”میں تمہاری بیٹی کے ہاں کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ پوچھ لیں یہ کیا چاہتے

کے باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا رہی تھی۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

”صرف ایک روپے میں آپ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں۔“

لوگ آ رہے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔ ایک بری فوج کا کیپٹن ٹھٹھا
ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فوج کی وردی میں وہ بہت ہی اساتر نظر آ رہا تھا۔ اس نے بانو کی بڑی
ماں سے کہا۔

”ماں جی یہ جنگ کا زمانہ ہے، فوجی گاڑیاں یہاں سے کسی وقت بھی گزر سکتی ہیں اور
آپ نے دکان کا سامان یہاں راستے تک پھیلادیا ہے۔ پلیز! یہ سامان اپنی دکان تک محدود
رکھیں۔“

ایسا کہتے وقت اس کی نظریں بجکتی ہوئی دکان کے اندر گئیں پھر بانو پر غصہ مٹ گئی۔
گلابی رنگ کے لباس میں گلابی گلابی سی لگ رہی تھی۔ آئیے اسے نظریں ملتے ہی وہ گلابی
سے سرخی مائل ہو گئی۔ اجنبی نگاہوں کی دھوپ رنگ حسن کا مزاج بدل دیتی ہے۔ اس کی
ماں آئیے اسے معذرت چاہ رہی تھی اور وعدہ کر رہی تھی کہ وہ جلد ہی تمام سامان راستے سے
ہٹا لے گی۔ آئیے اسے مسکرا کر کہا۔

”ماں جی! کوئی بات نہیں۔ جب فوجی گاڑیوں کے گزرنے کا وقت آئے گا تو میں کب
کو تادوں گا۔ ابھی آپ اطمینان سے دکانداری کریں۔“

”آئیے تم کہنے آتے ہو۔ کہتے مہراں ہو۔ آؤ میری دکان سے کوئی چیز پسند کرو۔“

اس نے دو بار بانو کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بے شک پسند کروں گا لیکن قیمت ادا کروں گا۔ میں رشوت پسند نہیں کرتا کیوں کہ
میں خدا سے ڈرتا ہوں۔“

بورڈی عورت نے حیرانی سے پوچھا۔

”اوہ آئیے اس بات میں مسلمان ہو؟“

”الحمد للہ لیکن آپ کو حیرانی کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ تم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہو۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا ”تو کیا ہوا۔ بھارتی سینا میں مسلمان سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ یہ

دیکھ ہم سب کا ہے۔“

بے گروہ والوں کو ڈنر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آج رات آپ میرے ساتھ ڈنر ہوئی چلیں گی۔“

”نہیں بیٹے۔ یہ تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں فضول خرچی کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”آپ بڑی خوب صورتی سے میری دعوت کو ٹھکرا رہی ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماں اپنے بچوں کا دل کبھی نہیں توڑتی۔ میں اپنے گھر میں نور کا اہتمام کروں گی۔ شام کو چھٹی ہوتے ہی یہاں چلے آنا۔ میرا گھر یہاں سے دور نہیں۔“

گوالی ابو آدرگسٹ! تین برس کے بعد میں ایک گھر میں باقاعدہ سالگرہ مناؤں گا۔ یہ بلی ٹکے آپ ہی کے دم سے مل رہی ہیں۔“

ہارنے زرا سرگما کر اسے دیکھا۔ اتنے بڑے آفسر کے چہرے پر بچوں جیسی خوشیاں لکھائے اختیار مسکرانے لگی۔ کیپٹن نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔

ہارنہا کر بے کام کے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کے دل نے کہا ”وہ مارا۔“

ہارنے کے دل نے کہا ”ہائے میں مر گئی۔ کہیں وہ میری مسکراہٹ کا مطلب غلط نہ سمجھ کر ہرگز ہو گا؟“

”واہس جا رہا تھا۔ ماں نے پوچھا ”بیٹے تم کوئی چیز خریدنے والے تھے خالی ہاتھ کیوں ہو؟“

اس نے پلٹ کر بانو کو دیکھا۔ پھر ماں کو دیکھ کر کہا۔

”میں نے یہاں سے انمول چیز خریدی ہے اور وہ ہے محبت۔“

بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ جیسے محبت کے ایک لفظ نے دھکا مارا ہو۔ جوانی کی شاہراہ لہلہا آتا جانا ہجوم ہو تو کہیں نہ کہیں سے ضرور دھکا لگتا ہے اور دھکا مارنے والے اپنا دل سے گزر جاتے ہیں۔ بانو نے ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

اب کی ماں بظاہر چپ چاپ کھڑی اور جھل ہونے والے سپاہی بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

ماں کی نظریں دائیں طرف ایک آئینے پر بھی تھیں جس میں بانو دکھائی دے رہی ہو۔ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ بیٹی کو انجھے دیکھ کر ماں کے احساسات دھکنے لگے۔

ہیں؟“

وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر دکان کے دور افتادہ حصہ میں چلی گئی پھر خود کو دوسرے کاسٹلنگ لگا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مگر کان اس کی آواز پر لگے رہے وہ کہہ رہا تھا۔

”ماں جی! کیا میں آپ کو امی کہہ سکتا ہوں؟“

ماں کی ہاتھیں کھل گئیں ”ضرور میرے سپاہی بیٹے! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”میرا کوئی نہیں ہے میں اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا۔“

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ شیشہ دل کی طرح ترش گیا۔ ماں کے دل سے آؤنگی۔ بانو کے دل نے کہا ”سچا رہ!“

پہلے پل درو کے رشتے اسی طرح ہمہ رو بہتے ہیں۔ پہلے کسی اجنبی دل کے حکام کو جھانک کر دیکھا جاتا ہے پھر محبت اس دل کے خالی کیسٹ میں اپنی آواز دیکھا دے کرتی ہے۔

ایسا سوچتے ہی بانو چونک گئی۔ ”ہائے! یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کوئی اس دنیا میں فنا ہے توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے تو ہوا کرے۔ میرے دل نے جو غم کھائے ہیں ان کے لیے اب میرے پاس آنسوؤں کا مزمع بھی نہیں ہے۔ میں روتے روتے تھک گئی ہوں۔

اب میں کوئی نیا رنگ نہیں لگاؤں گی۔ اب اس کی باتیں نہیں سنوں گی۔“

وہ نگاہیں چرا سکتی تھی، منہ پھیر سکتی تھی مگر اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”امی! آپ کی صورت ہو ہو میری امی جیسی ہے۔ بالکل ایسا ہی متا کا نور ہے آپ کو دیکھتے ہی بے اختیار امی کہنے کو جی چاہنے لگا۔“

ماں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا ”آج سے میں تمہاری امی ہوں۔ دکان کے اندر آؤ میں تمہیں دودھ پتی کی چائے پلاؤں گی۔“

وہ دکان کے اندر تو کیا، دل کے اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بانو کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں، شام کو فرصت ملے گی۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آج میں پیدا انش کا دل ہے۔ میں ماں سے تھا کہ تنہا اس طرح سالگرہ مناؤں لیکن اب آپ کی بڑائی تنہائی کا دکھ سمیٹ لیا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کی صاحب زاوی کہہ میرا مطلب ہے

لگا رہا تھا۔ سپاہی جانتا ہے کہ مورچہ کہاں بنانا چاہیے۔ اس نے بانو کو شرعاً تہ گھبراتے لگا کر کہا۔

”تمہاری سہمی ہوئی، جھجکی ہوئی اور شرابی ہوئی ادا میں بتا رہی ہیں کہ تم کنواری اور اپنی ہو اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا ہے۔“

بانو کو یوں لگا جیسے سپاہی اپنی بندوق کی گولی سے اس کے سینے کو داغ رہا ہے۔ وہ جلدی سے ہلے۔

”میں نے آپ کے انتظار میں دکان ابھی تک بند نہیں کی۔ آپ کو فوراً وہاں جانا چاہیے۔“

”میں جان بوجھ کر دکان کی طرف نہیں گیا۔ میں نے سوچا دعوت کے سلسلے میں کچھ کالنے کے لیے تمہاری اسی گھر جائیں گی تو دکان میں آکر تم سے دل کی بات کہوں گا مگر وہ بھی میں وہ گئیں اور تم شاید گھر جا رہی ہو چلو یوں بھی کام بن رہا ہے تم ناراض تو نہیں ہو۔“

وہ ناراض کیوں ہوتی؟ اسے تو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا وہ راستے کے کنارے اپنا نظارہ کر رہا تھا جیسے اپنی تقدیر کا راستہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے اپنی وردی پر اسے تمدن کی طرح ہلکا ہاتھ۔ ایسے میں کوئی لڑکی ناراض نہیں ہوتی۔ صرف رونا اعتراض کرتی ہے۔

”آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

میں نے آج تک کسی لڑکی سے دل کی بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے کہتا ہے؟ کس طرح ابتدا کرنی چاہیے۔ عام سا طریقہ یہ ہے کہ اجنبیت دور کرنے کے لیے ملانہ خداف کرایا جاتا ہے تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ایران میں کنواری لڑکیوں کا ذکر کرنا محظوب کیا جاتا ہے۔“

مگر وہی کنواریوں کی بات اس نے کہہ دی۔ بانو نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے تاکہ اسے آگے نکل جائے۔

”بھئی اتنی تیزی سے نہ چلو۔ کیا مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حق نہیں دو گی؟ کم از کم میرا ہونچہ بوجھ بھی کام آئے گا۔“

”اے آپ کا نام پوچھنا بھول گئی تھیں۔ آپ انہیں بتا دیں۔“

جوانی کی ایسی کڑی دھوپ میں لڑکیاں محبت کی چھاؤں تلاش کرتی ہیں اور بانو محبت کی چھاؤں میں جل گئی تھی۔ اس فکر مند ہو گئی کہ اب کیا ہو گا۔ بیٹی پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزرا رہی گی؟ کیا ہمیشہ شادی کے خیال سے سہم جایا کرے گی؟“

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکی۔ آتے جاتے ہوئے گاؤں نے اس کا دھیان بٹھکی کی طرف سے ہٹا دیا۔ شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکانیں جلد بند ہو جاتی تھیں اس لیے اس بیٹی بھی دکان بڑھانے لگیں۔ اس نے کہا۔

وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں بھی عجیب ہوں۔ اسے بیٹا بنایا مگر اس کا نام پوچھنا بھول گئی۔ تم نے پوچھا تھا بانو؟“

”اے! نہیں تو میں بھلا کیوں کسی کا نام پوچھوں؟“

”ایسا نہ کو بیٹی۔ سب ہی مرد آصف کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ لڑکا اچھا ہے پھر بالکل اکیلا ہے۔ اسے ہماری محبت ملے گی تو یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔“

”اسی ہم دکاندار ہیں۔ یہاں گاؤں کے لیے آتے ہیں اور وہ آکر جا چکا ہے۔ اب آپ دکان پر چوائیں۔“

”نہیں بانو! میں کچھ دیر اس کا انتظار کروں گی۔ تم گھر جا کر سالن اور بریانی تیار کرو۔ میں برتنہ ڈالے ٹیک لے آؤں گی۔“

وہ دل ہی دل میں بیڑ بڑاتی ہوئی دکان سے باہر نکل آئی۔ باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا ”اسی کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے بھی رعایتی شرط پر کسی کے ساتھ چلا کر دیتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے دو گھنٹی کی جان بچان میں دعوت کا انتظام کر رہی ہیں اس کی ساگرہ منانے والی ہیں۔“

اس پچھلے دو برس سے کسی بھی خبر اور کماؤ پر ت شریف زادے کو ایسی نظروں سے دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی بانو کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان لڑکے کہاں رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا سب کے سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ بانو جوان ہوگی تو اس کا کیا بنے گا؟ اسی لیے جب کوئی مسلمان لڑکا بھولے سے نظر آجاتا تو اس پر واری صدمے ہونے لگتی تھی۔

بانو راستے کے کنارے ٹھنک گئی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس چند قدم کے فاصلے پر کڑا

”تب باتیں کرتے کرتے کتنی دور آگئے ہیں“ آپ کو امی کے پاس جانا چاہیے۔“
 ”اباؤں کا اور امیں اپنا نام بھی بتا دوں گا کہ میرا نام سرتاج حسین ہے مگر تم جاہلو
 باتیں کرتے ہو۔“

”سرتاج۔ یہ لفظ تو بڑا ہی محبت پرور اور پائیدار ہوتا ہے۔ عورت کا محافظ ہوتا ہے،
 ناکل و توبہ اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ پان کی پیک کی طرح بانو کے
 ہونٹوں اور دل کے لہو میں کھل گیا۔ اسے آصف یاد آیا جو سرتاج بن کر آیا تھا اور سرکی
 پہنچ کر لے گیا تھا۔ وہ کیپٹن سرتاج حسین سے دور بھاگتی چلی گئی۔ اچھا ہوا کہ گھر
 نے اٹھا تھا وہ مکان میں مٹھے ہی دروازہ بند کر کے دیکھنے والے کی نظروں سے چھپ

سرتاج حسین دور کھڑا تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھا رہا اور یہ سوچ کر مسکراتا
 بائیں نے اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر سرتاج والی بات خوب کہی۔ شادی اور سرتاج کے
 نام کو کوئی نہیں شراقتی۔ اسی لیے وہ شرا کر بھاگ گئی۔ انسان کبھی کبھی خوش فہمی
 سے بہت بڑا کرتا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا دکان کی طرف واپس چلا گیا۔

بانو دروازے کے پیچھے کھڑی ایسے مرد کے خیال سے کانپتی رہی جو شوہر بن کر آتا ہے
 رات کے نام پر سب کچھ لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کاٹ رہے تھے، سر چکرا
 اٹا، کوئی اور دقت ہونا تو وہ چولے کے پاس کبھی نہ جاتی، بہتر جا کر گر پڑتی اور خوب
 نہ پھٹ کر روتا شروع کر دیتی لیکن ماں نے آج رات پھر ایک مہمان کے لیے دستر
 بانی بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شرافت کے دائرے میں۔۔۔ جولان بیٹیوں کو اسی طرح نگاہوں
 نہانے بچایا جاتا ہے۔ ماں کے سر سے اپنا بوجھ ہٹا کر کرنے کے لیے باورچی خانے میں
 بیٹے لگی جیسے خود کو چولے میں جھونکنے جا رہی ہو۔



گنہہ غیارے کے پائلٹ سے رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا۔ کنٹرول ٹاور کے ریڈیو
 پر زخری بار سے کال کیا پھر ایس ہو کر اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ٹریفک
 کنٹرول کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

”میں انہیں بتاؤں گا۔ پھر وہ تمہیں بتائیں گی۔ پھر تم اپنے دل کو بتاؤ گی پھر تمہارا دل
 اپنی دھڑکنوں کو بتائے گا۔ کسی کا نام تھانے پکری میں بھی اتنا نہیں گھومنا جتنا تمہارا ہاتھ
 ہو۔“

بانو کو بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اپنے ہنسنے کھکھکانے
 لبوں کو ہتھیلی کی آڑ میں چھپا کر بولی۔
 ”آپ بہت زیادہ بولتے ہیں۔“

”ابتدائی مرحلے پر لڑکیاں شرابی ہیں۔ اس لیے خود بولنا چاہیے۔ اس کے بعد
 بولنے کا موقع نہیں دیتیں۔“
 ”آپ کو لڑکیوں کی دوستی کا خاصا تجربہ ہے۔“

”ہاں میں نے دوبار قسمت آزمائی کی مگر قسمت میرے صبر کو آزما کر رہی۔ پہلی بار میں
 نے محبت کی گمروہ میری ہم مزاج نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار
 لڑکی میرے معیار کے مطابق تھی مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔“ اس نے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا
 ”پتہ نہیں تیسری بار کیا ہو گا۔“

بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ”بار بار دھوکہ کھانے سے بہتر ہے کہ کسی سے
 خالص محبت کی توقع نہ کی جائے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ کیپٹن نے کہا ”ہم ٹریفک کے جھوم سے گزرتے ہیں یہ جاننے
 ہوئے بھی کہ کبھی نہ کبھی حادثہ پیش آئے گا ہم راستوں پر چلنا چھوڑ تو نہیں دیتے۔ ہم
 جانتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محبت کا فریب دیتا ہے پھر بھی ہم کسی نہ کسی سے
 محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ نہ ہو تو دنیا میں گولے بارود اور فوجی وردی کے سوا کچھ
 رہے۔“

بانو کے دل نے تائید کی ”ہاں محبت کے بغیر ہر خوشی کھوکھلی سی لگتی ہے۔ کسی کو بار
 سے کچھ دیئے اور کچھ لیے بغیر رہنا نہیں جاتا۔ اسی لیے محبت ہماری زندگی میں موت کی طرا
 ائل ہے، ضرور آتی ہے اور بڑی خوب صورتی سے راتی رہتی ہے۔“

وہ محبت کے مارے اندر ہی اندر مرنے لگی۔ اس کے دل نے کہا ”یہ آنسو بکھیر
 بولے۔ کم از کم اپنا نام ہی بتا دے۔ نام نہیں بتائے گا تو پھر کس نام سے خیالوں میں آئے

لہلہ کے درمیان انسانی جسم گڈے گڑیوں کی طرح اونٹ سے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ ایک مروٹھا، ایک عورت تھی اور مرد کے قدموں کے پاس ایک بچہ نظر آ رہا تھا۔ بالائے سر کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی؟ وہ جو بھی نہیں اسے دیر تک نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اتنا بڑا اس کا اپنا بچہ بھی تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہی اس نے بڑبڑا لگا تھا۔ اس نے مرہی آواز میں کہا ”سب کے سب مر چکے ہیں۔“

اس نے فون کا ریسور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ پھر کسی سے کہنے لگا۔

”ہمت ہی انسانک حادثہ ہوا ہے۔ ایسے حادثہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ اب ان ٹیلی کوم کے لانے کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ معمولی چٹان بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔“ وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا اور سار جٹ محدب شیشہ کے آر پار ان تصویروں کو دیکھ رہا۔ ایک بار کی وہ چونک کر اچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔

”سر! اسے دیکھیے۔ یہ اس تصویر کو دیکھیے بچہ زندہ ہے۔“

کیپٹن کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے بھی جواباً حیرت سے چیخ کر پوچھا ”بالائی بچہ زندہ ہے؟“



چوہے کی آنچ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف سالن پک رہا تھا۔ دوسری طرف بانو پک رہی تھی۔ اس کے دماغ کے چوہے پر آصف کی یادیں ابل رہی تھیں۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ایک ماں جاتا ہے تو دوسرا اس خالی دل کے آئینے میں آ جاتا ہے۔ آج سرتاج حسین آ رہا۔ کچھ اسی طرح آصف بھی آیا تھا بلکہ وہ عشق و محبت کے مراحل سے گزر کر نہیں بلکہ بے سارے انداز میں دلہان کی اس کے گھونگھٹ تک پہنچ گیا تھا۔

بہرنے گھونگھٹ کے پیچھے سے پہلے بار اسے دیکھا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ کوئی بچی۔ محض صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کا خیر ہو اور پرانی نظروں سے بچا کر رکھ سکتا ہو۔ وہ جیسا بھی ہو آخر مجازی خدا ہوتا ہے۔“

ماں نے آصف کو بیٹی کے لیے پسند کیا تھا اس لیے شادی سے پہلے صفائی پیش کر دی تھی۔ آصف بہت زیادہ خوب صورت نہیں ہے اور بد صورت بھی نہیں ہے۔ وہاں ہر

”ہیلو“ میں کنٹرول ٹاور سے ریڈیو آپریٹروں رہا ہوں۔ فلائنگ کلب سے ایک چارٹرڈ کیے ہوئے طیارے ایف سی ون ٹوا ٹو کا پائلٹ خاموش ہے، بار بار کال کرنے کے باوجود جواب نہیں مل رہا ہے۔ اس طیارے کو فوراً تلاش کیا جائے۔“

دوسری طرف سے کنٹرول سینٹر کے کیپٹن نے پوچھا۔

”اس طیارے سے آخری بار کب رابطہ ہوا تھا؟“

”صبح ساڑھے نو بجے۔ اس وقت وہ شمال کی طرف یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی ایک پارٹی اسے تلاش کرنے کے لیے روانہ کی جائے گی۔“

اس گفتگو کے بیس منٹ بعد ایک طیارہ شمال کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ وہاں سے ہوا زیادہ نہ تھا۔ جلد ہی اس پر سرچ پڑوں کے پائلٹ نے اس سیاہ معمولی چٹان کی ٹوٹی ہوئی انگی دیکھ لی۔ پھر طیارے میں بیٹھنے والے سار جٹ کو اطلاع دی۔

”ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیمرے تیار رکھے جائیں۔ میں عموں چٹان کے اطراف دو چکر لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے دو راونڈ کافی ہوں گے۔“

سار جٹ کا جواب ملتے ہی پائلٹ ایک دائرہ کی صورت میں طیارے کو موڑنے لگا۔ کیپٹن آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھنے لگا۔ چٹان کی وسیع آغوش میں ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہوا طیارہ نظر آ رہا تھا۔ کیپٹن نے دوربین سے نظریں ہٹا کر دوسری کھڑکی کی جانب دیکھا۔ سار جٹ کیمرے پر جھکا ہوا تصویریں اتارنے میں مصروف تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آئی طیارے کے پرچے اڑ گئے ہیں۔ کیا انسانی جسم سلامت ہوں گے؟“

اس کا جواب تصویروں سے مل سکتا تھا۔ پینتالیس منٹ کی پرواز کے بعد جب کنٹرول سینٹر میں واپس آئے تو سار جٹ فوراً ہی تصویروں کو ڈیولپ اور اطلاع کرنے ڈارک روم میں چلا گیا۔ کیپٹن بے چینی سے ادھر ادھر شہلے لگا۔ بے چینی اس قدر تھی کہ بار بار سکرٹ کے لمبے لمبے کس لگا رہا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں تم ہو جاتی ہیں لہذا وہ گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ سار جٹ ڈارک روم سے باہر آیا پھر اس نے کیا تصویریں سامنے میز پر پھیلا دیں۔

کیپٹن محدب شیشہ اٹھا کر باری باری ان تصویروں کو دیکھنے لگا جہاز کے ٹکڑے ہوئے

تپ مڑیں۔ آپ کو اپنی محنت مزدوری سے میرے اخراجات پورے کرنے بابائے شرم کی بات نہیں ہے کہ آپ ای کی دکان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔“

تم نے شرم نہ دلاؤ۔ شرم نہیں آتی چاہیے۔ بتاؤ میرے لیے جیز میں کیا لائی ہو؟
نہ کی مبالغہ نہیں کیا۔ اب بات نکلی ہے تو بولنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں بوڑھی ہو چکی
نہ انا بلکہ اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔ پھر ان کی دکان تمہاری ہوگی اور تمہاری ہر چیز
اپنی ہے۔“

ہالانی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جیسا
نہ کی سوچا نہ تھا ویسا اس کا شوہر تھا۔ دکان کو اپنی بیوی کا جیز سمجھ رہا تھا اور اس کی
نہ نے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ صرف تین وقت کھانا اور اس کے ساتھ سونا جانتا تھا۔
جلا کم اسے نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔

تپ میری ای کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کو موت آجائے۔
نہ ملو ہو تاکہ آپ ایسے ناکارہ کام چور اور مطلب پرست ہیں تو میں کبھی شادی نہ
کر دوں گا جیسے میری نظروں سے۔“

ہر جوبھ کیے بغیر اطمینان سے منگلتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بانو کے سر
ٹپ کر گیا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر اپنے سناگ سے کچھ تو لگاؤ پیدا ہو جاتا
نہ کی پھار پھار ہی کیوں نہ ہو، سر کو ڈھانپ تو دیتا ہے۔ دنیا والے اسے سر سے نکلی تو
کر سکتے تھے میں وہ بھول گئی تھی کہ مجازی خدا خواہ کیسا ہی ہو اس کی شان میں
نہ نہیں کرتی چاہیے۔ اب وہ چلا گیا تو غصہ دھیم پڑ گیا اور غلطی کا احساس ستانے لگا۔
نہ کو کان بند کر کے آئی تو اس نے تسلی دی۔

جی گہرا نہیں وہ آجائے گا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ محنت سے چار
انگ ہے۔ یہاں مفت کی روٹیاں ملتی ہیں اس لیے وہ ضرور آئے گا۔“

نہ رات کو نہیں آیا۔ صبح بانو، دکان کھولنے جایا کرتی تھی اس روز نہ جاسکی۔ اس
کر ہاتھ کا وہ ضرور آئے گا۔ ماں اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر خود ہی دکان داری کے
بابائی۔ دیر کو جب وہ روٹیاں پکا رہی تھی تو وہ بھوکا چاسا اگر بادرچی خانے میں بیٹھ
اے دیکھ کر بانو کیوں لگا جیسے وہ اپنا کوئی نہیں ہے مگر گھر کا ایک سامان ہے جو گم

وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں کب ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں اور ہندو
غٹنے بانو کو اٹھا کر لے جائیں۔ ماں چھاتی جیتی رو جائے گی کوئی عزت بچانے والا نہ ہوگا۔
اگر اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک مرد آجائے گا۔ اس بات کا اطمینان رہے گا کہ
غٹنے بے باکی سے حملہ نہیں کریں گے۔

حالات ایسے تھے کہ بانو کسی آئیڈیل کا تصور نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خواہوں کے
شہزادے کا انتظار کرنے کے لیے سال دو سال جوانی کی ویلنڈر بیٹھی رہ سکتی تھی۔ آئے دن بے
خبریں سننے میں آتی تھیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے خون سے
ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ان کے شہروں میں آگ اور خون کا یہ کھیل کسی بھی وقت کب
جاسکتا تھا۔ اسی گھبراہٹ اور افزائش میں وہ دلہن بن کر آصف کی پناہ میں آئی۔

آصف ایک دلا پتلا سانو جوان تھا۔ صورت اچھی تھی نہ بری، کوئی بھی جوان لڑکی
اسے محبوب کے روپ میں نہیں، صرف شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی تھی۔ بانو نے ہی
اسے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ گھر میں پڑا رہا۔ تین وقت کھانا تھا ہر
ڈکاریں لیتا ہوا باہر تفریح کے لیے نکل جاتا اور رات کو واپس آکر محبت کے فرائض ادا کرتا
تھا۔ ایک دن بانو کی ماں نے نوک دیا۔

”بیٹا! مرد محنت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔“
”ماں؟ اس دلیس میں مسلمانوں کو کام کہاں ملتا ہے۔ یہاں کی بھوکے محتاج ہم
جیسوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”ایسا نہ کو بیٹا! یہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح
سے زندگی گزار رہے ہیں۔“

”پتا نہیں کس طرح گزار رہے ہیں، مجھے کوئی راستہ بھائی نہیں دیا۔ اس لیے آپ کا
داماد بن کر یہاں آ گیا۔ آپ کی دکان اچھی چل رہی ہے۔ اللہ دے رہا ہے تو مجھ جیسے ایک
بندے کو بٹھا کر کھلانے میں کیا نقصان ہے؟“

اس کی باتیں سن کر بانو کو بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں اپنے داماد سے یہ نہیں کہہ سکتی
تھی کہ وہ ان پر بوجھ بنا ہوا ہے مگر ایک بیوی اپنے شوہر سے لڑ سکتی تھی۔ ماں کے جانے کے
بعد اس نے کہا۔

ہونے کے بعد مل گیا ہے۔ اسے خوشی ہوئی لیکن غصہ دکھانا بھی ضروری تھا۔ اس نے غصے سے روٹیوں کا چھابہ اس کے آگے بٹھادیا۔ ہانڈی سے سالن نکال کر دیا۔ اس طرح غصہ لگی دکھایا اور اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ پھر طنز بھی کیا۔

”جس کے ساتھ رات گزار کر آئے ہو کیا اس نے روٹی نہیں کھلائی۔“
اس نے ایک لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

”میں نے رات اسٹیشن کی سرائے میں گزار دی ہے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا۔ بھوک پیاس کا دل بھر آیا۔ پیچھا کل سے بھوکا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو بھوک پیاس کے وقت مجھے یاد کرتا ہے، کسی نہ کسی طرح میرا محتاج ہے۔ پیچھا دودھ کھالیا کرے گا تو کون سا بوجھ بن جائے گا۔ کم از کم نام تو ہو گا کہ اس گھر میں ایک مولیٰ رہتا ہے۔“

یہ سوچ کر وہ محبت سے سمجھانے لگی ”آپ کیسے ملازمت کے لیے پریشان نہ ہوں گے میں صبح سے دوپہر تک دکان میں بیٹھتی ہوں، میری جگہ آپ دکان سنبھالا کریں۔ اپنی خوش ہو جائیں گی کہ آپ کو مزد داری کا احساس ہو گیا ہے۔“

آصف راضی ہو گیا۔ بانو تین دن تک اس کے ساتھ دکان پر جاتی رہی۔ اسے تم چیزوں کی قیمت اور گاہکوں سے منہنے کے کر سکتا تھی رہی۔ جتنا اس نے سکھایا۔ آصف نے اس سے کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا۔ آئے دن موقع پا کر گلے سے روپے چرانے لگا۔ بانو ان گلے کا وزن خوب سمجھتی تھی، اس نے سمجھ لیا کہ دکان کی آمدنی میں کچھ میرا بھی حصہ ہے مگر ساس اور داماد کے رشتہ کی لاج بھی رکھنی تھی اس لیے اس نے روزانہ دو چار روپے کی چوری برداشت کر لی۔ بانو کو بھی سمجھا دیا کہ آصف کو شرمندہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ وہ گے میں سے اپنا حجب خرچ نکال لیا کرتا ہے۔

ماں بیٹی بڑی مصلحت سے کام لے رہی تھیں مگر چور کا حوصلہ بڑھنے لگا۔ روز روز ہر چلا کہ وہ نشہ کیا کرتا تھا۔ کنگال ہونے کے بعد نشہ چھوٹ گیا۔ اب پھر حجب میں خاصی رقم رہنے لگی تو اس نے دارو پینا شروع کر دی۔ اس پر ماں بیٹی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک رات بانو نے اسے خوب سنائیں۔

”میں شرم نہیں آتی۔ شراب پی کر گھر آتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شرابی بن گئے اور بے غیرت ہو۔ تمہاری بیوی بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ میں بیوہ بن جاؤں۔ اگر تمہیں موت نہیں آتی ہے تو کیسے جا کر ڈوب مرو۔ مرنے کا حوصلہ نہیں بنانے سے پہلے اس گھر سے چل جاؤ۔“

بانو کو اپنی حالت میں بیوی کی کھری کھری باتیں سننے سننے سو گیا۔ آدمی رات کے ڈنک اپنی بد فہمی کا دکھنا روٹے روٹے سو گئی۔ صبح ماں کے چیخنے چلانے سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”امف کہاں ہے؟“

بانو اس کا بستر خالی نظر آیا۔ ماں نے کہا۔

”میں معلوم ہے کہ میں نے دکان کا نیا اسٹاک خریدنے کے لیے پانچ ہزار روپے لئے دو روپے نہیں ہیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو دیکھو۔“

بانو الماری کے پاس گئی تو وہ کھلی ہوئی تھی جس دراز میں اس کے زیورات رکھے تھے اب وہاں ایک تہ کیا ہوا کانڈ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کھول کر پڑھا کھٹا تھا۔

بانو یکدم اب تم میری بیوی نہیں ہو۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے کی بیوی بننے کے لیے تیار کر دینا چاہتی ہو۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے بہ ہوش و حواس دکان سے کرجا رہا ہوں۔ میری تلاش فضول ہے۔ فقط آصف۔“

بانو نے بڑے بڑے ہی بانو پکرا کر گرنے لگی۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھال کر لایا مگر وہاں سے بھاگی بھاگی محلے کی لڑکی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ نہیں

لڑکی پر کسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پچھلی رات تک وہ سناگن تھی اور اب اس کا

ماں لگ گیا ہے۔ اجاڑنے والا گھر سے نقدی اور زیورات بھی سمیٹ کر لے گیا ہے۔

ڈاکٹر ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پچھلے دو دنوں سے بانو علیل تھی، آج بستر سے اٹھ کر گر پڑی۔

بانو ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی پھر اسے ادھر ادھر ٹٹول کر مسکراتے ہوئے کہا۔
”خیر کی بات نہیں ہے ماں جی! تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے۔“
ماں چند لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبریں کراسے

بڑھائے ہوئے کہا۔

”ہاں تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیں۔“

کچن صوبہ شیشہ ہاتھ میں لے کر توجہ سے دیکھنے لگا۔ سارجنٹ کی آواز اس کے اٹل تھری تھی۔

مرا ہارے طیارے نے عمودی چٹان کے دو پکر لگائے تھے۔ یہ تصویر پہلے راؤنڈ اٹی گئی تھی۔ اس تصویر میں بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں اناری مٹی تھی، اس میں بچے کے ہاتھ پاؤں ذرا اٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ وہ ہاتھ نکل رہا ہے۔“

بچے کے منہ ہاتھ میں تصویر تھی، وہ ہاتھ کانپنے لگا۔ بچہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا یعنی دیکھنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ کیپٹن کا دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ اس کا پتا بچہ بارہ ہزار پندرہ کی پکڑ کر ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے سٹکل دے رہا ہے۔ ”چپا آؤ مجھے بچاؤ۔“

بچہ صرف کیپٹن کو نہیں، ابھی ساری انسانیت کو تڑپانے والا تھا۔ اس نے فون کا انٹارک نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

صن کیپٹن ہری رام بول رہا ہوں۔ طیارے کو جہاں حادثہ پیش آیا ہے وہاں ایک بچہ ہے، فون فوراً امدادی پارٹی روانہ کرو۔ مجھے جلد تاخیر یہ رپورٹ ملنی چاہیے کہ بچے کا کیا ہے۔“

صن کیپٹن کے بعد کیپٹن نے فلائنگ کلب سے رابطہ قائم کیا۔

صن کیپٹن ہری رام کنٹرول سینٹر سے بول رہا ہوں۔ آپ فوراً تفصیلی رپورٹ پیش کر کہ فلیس نے طیارہ انیف ی دن ٹواؤ نو چارٹر کیا تھا؟ طیارے میں کتنے افراد تھے؟

ایک بچہ بھی تھا، اس کا تعلق کس سے ہے؟“

اس کے بعد وہ کسی تیسری جگہ نمبر ڈائل کرنے لگا مگر اب وہ تیار نشان نہیں تھا۔

لولوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹیلی فون کی گھنٹیاں جج رہی

ہر فون کی جج و پکار کے پیچھے جو لوگ تھے ان کے داغوں کی اسکرین پر صرف ایک

بچہ تھا جو دو لاشوں کے پاس پڑا ہوا زندگی کو پکار رہا تھا۔

○☆☆○

خوش ہونا چاہیے یا اپنا سر پٹینا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ بیٹی ماں بننے والی تھی افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ ایک چور کی اولاد کو جنم دے گی۔

بانو کو ہوش آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اسے بھی خوش خبری سنا کر چلی گئی۔ دو ملاٹن کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ خزاں میں پھول نہیں کھلتے اگر کھلتے بھی ہوں تو خوشبو سے مالا ہوتے ہوں گے۔ بانو بھی ایسے وقت ماں کی متاسے اور بچے کی خوشبو سے خالی رہی۔ بعد کی بات۔ دگی کہ کبھی مستاجوش میں آئے گی ابھی تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوئی مٹی پر نہیں بلکہ بھاگنے والے چور کے نقش قدم ہیں۔

اس روز ماں بیٹی نے دکان نہیں کھولی مگر میں تمام دن چپ چپ سی رہی۔ بانو عورت بن کر اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ یہ خیال اسے مار رہا تھا کہ پاس پاس کی سائیکس اب اسے اپنے پاس نہیں بٹھائیں گی کیونکہ وہ سناگ کی دلیز کے یا ہر پیک کی گئی تھی۔ اب اس کی سائی حیثیت قابل فخر نہیں تھی۔ ایسا سوچتے وقت وہ خود کو ایک خوب صورت بچے کے تصور سے ملامت لے کر شش کرتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اپنے جگر کا گلزار ہی اپنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچے کے سارے زندگی گزار دے گی۔

دوسری طرف ماں سوچ رہی تھی کہ بانو اپنی پہاڑی جوانی کیسے گزارے گی؟ مرز بڑھایا ایسا ہے جو اولاد کے سارے گزرتا ہے ورنہ جوانی کسی جوانی کا ہاتھ تھا۔ بغیر آنے نہ بڑھے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ لہذا اس بچے کو پیدا نہیں ہونا چاہیے اگر پڑا ہو جائے تو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ ایک تو یہاں مسلمان لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے اگر لڑکے کے حسن سے متاثر ہو کر آئے گا تو اسے بچے والی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بانو تو آنکھیں

ماں بن سکتی ہے لیکن گود میں ایک بچہ رکھ کر سناگن نہیں بن سکتی۔

ماں نے دل پر جبر کرتے ہوئے اور دونوں مٹھیاں سختی سے بٹھپتے ہوئے فیصلہ کیا۔

”وہ بچہ زندہ نہیں رہے گا۔“

○☆☆○

”ہاں وہ بچہ زندہ ہے۔“

میز پر گیلی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ سارجنٹ نے دو عدد تصویریں اٹھا کر کیپٹن کی

لگتے ہیں۔ لیکن وقت بڑا سنگدل ہوتا ہے وہ ایک ہی جھٹکے میں ماں کو بھی سنگدل بنا دیتا ہے۔ ایک رات بانو دروازہ سے تڑپ رہی تھی اور باہر قیامت کا شور مچا تھا۔ بہت سے "ہریر مادیو" کی آوازیں آ رہی تھیں اور محلے والے جواباً "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے تھے۔

اُسے محلے میں دی ایک گھرا ہوا تھا جہاں کوئی مرد نہیں تھا، کوئی محافظ نہ تھا۔ ماں نے کالم میں کبھی بانو کے پاس بیٹھ جاتی تھی، کبھی بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں جا کر ٹال کھاتی تھی۔ باہر جو انسان تھے وہ دروازے پر نہ آتے تھے۔ نہ عورتوں کی عزت اور نافرمانی زندگی کی کوئی قیمت تھی۔ پانی کی طرح لو بہا دیا جا رہا تھا۔

ماں کو دایاں کٹے میں دیر ہوئی تو وہ درد سے تڑپتی اور کراہتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ باہر والے کر دیوار تک پہنچ گئی پھر اپنے کمرے کی کڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا تو اسے ہچکچاہٹ لگی۔ ایک وحشی درندہ ایک نوزائیدہ بچے کو فضا میں اچھال کر نیزے کی اتنی بلکہ اچھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ایک دم سے چکر اکر فرش پر گر پڑی۔ اسی اپنی بیٹی کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو اب بانو غما نہیں تھی اس کے پاس کالم پر فرش پر ایک نوزائیدہ بچہ خون میں لتھڑا ہوا پھینچ رہا تھا۔ باہر درد سے لوہا لگنے لگی تھیں رہے تھے اندر ایک ماں اپنے لہو کے چھینٹوں سے ایک نئے انسان کو لپٹے ہوئی تھی۔ وہ مارے دہشت کے یہ بھول گئی تھی کہ درد وہ کیا ہوتا ہے اور وہ نہ کہ کرب سے کیسے گزر گئی۔ اسے ایک ہی منظر یاد تھا کہ بچہ نیزے پر اچھالا جا رہا تھا۔ حتمی حالت میں چیختی لگی۔

اُٹھ پھیلے، میرے بچے کو بچائیے۔ وہ ظالم اسے چھین کر لے جا رہے ہیں۔ وہ بچے کو مار ڈالیں گے۔

اس کی ماں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگایا۔ پھر روتے ہوئے بولی۔
 "میں اب تو خدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس دن کے لیے سمجھاؤ تھی کہ اسے جنم بہ مذہب درندوں کی اس دنیا میں ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے پھر اس بچے کو کہاں لے جائیں گے؟"

باہر ایک مکان دھڑا دھڑا چل رہا تھا اس کے دہکتے ہوئے شعلوں کا عکس کڑکی کے

آٹھ ماہ سے وہ بچہ بانو کے وجود میں چھپ کر کونٹیں بدل رہا تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہتی تھی۔

"میرا بچہ کیسا ہو گا؟ اپنے باپ کی طرح یا میری طرح؟"
 ماں نے بار بار سمجھایا "وہ جیسا بھی ہو" اسے اپنے دل سے نوحہ کر پھینک دیا۔ نہیں سمجھاتے سمجھاتے آٹھ ماہ گزر گئے۔ اگر تم پہلے ہی ماں جانتیں تو وہ بچہ آسانی سے منایا ہو جاتا۔ اب بھی وقت ہے بانو اپنے آپ پر رحم کرو۔"
 "اے کیا آپ ہوش و حواس میں نہیں ہیں؟ کیا آپ میرے بچے کی قاتل بننا چاہتی ہیں؟"

"نہیں بیٹی! میں تم دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ تم پہلے جیسی بن جاؤ۔ ہم یہ دکان فروخت کر کے کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔ کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ کبھی تم ساگن بنی تھیں اور ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی فلاحی ادارے میں پرورش پائے۔"

"نہیں اے! میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں اس معصوم سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتی۔"
 "تم کبھی آصف سے بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب اس کے لیے ممبر کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کے لیے بھی ممبر آجائے گا۔"

"آپ ضد کیوں کر رہی ہیں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی، بس دیکھ لی مرہ کی ذات ایک نے مجھے داغ لگایا ہے، دوسرا کوئی آئے گا تو مجھے داغدار کہہ کر طعن دے گا۔ آپ کیا باتیں نہ کریں درندہ میں گھر سے چلی جاؤں گی۔"

ماں ڈر کر خاموش ہو گئی کہ کہیں بیٹی سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ وہ مست کو سمجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی سنوارنے کے لیے دن رات پریشان رہتی تھی اسی طرح بیٹی اپنی مست سے مجبور تھی اور خیال ہی خیال میں بچے کو سینے سے لگا کر جوتی رہتی تھی۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ ایک بچے کی وجہ سے اس کی جوانی غارت ہو جائے گی۔

جب وہ بانو کو سمجھا کر تھک گئی تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وقت کی کوئی ٹھوکر ہی اسے سمجھائے گی۔ یہ آج کل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں، بزرگوں کے تجربات کو بکھر

تھوڑی آنکھیں میچ لیں۔ پھر ایک طویل سانس اس طرح چھوڑی جیسے اندر سے نکال دینا چاہتی ہو۔ خالی تودہ ہو گئی تھی، اب لٹنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب پھر اُٹھ کر اُٹھ کر اس کے دروازے پر نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ ایک مفلس کی طرح آرام کوئی تھی۔

وہی میچ اس کی آنکھ کھلی تو اس پاس کا ماحول ایسا خالی، ایسا نکلا نظر آیا جیسے اتنی بڑی کائنات سے آخری کپڑا بھی اتار لیا گیا ہو۔ اس سامنے کھڑی تھی، اس کی جھکی جھکی لڑکی کہ وہی تھیں کہ اس نے ایک معصوم بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے۔ بانو لہلوں میں پھر آنسو آگئے اس نے پوچھا۔

میرا دل کہاں ہے؟ میرے بیٹا ہوا تھا؟

”اب ایک آشرم میں۔“

”ایک آشرم؟“ بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ”آپ میرے بچے کو ہندوؤں کے ہاں کیوں چھوڑ آئی ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے اسی؟“

میں بھڑکتی تھی بانو! مسلمانوں کی ہستی ویران ہو رہی ہے۔ یتیم خانے میں مٹی تودہ خالی رہنے کے لیے گئے، باقی بھاگ گئے۔ یتیم خانہ کے کرائے دھرتا بھی نہیں تھے۔ میرے بیٹے آئی کہ انسان، انسان کا دشمن ہوتا ہے، گھڑ بھڑ بھڑ کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہم فرقت اور دشمنی نہیں سکھاتے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جس دھرم کے چند لوگ اپنے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں وہ بچہ فی الحال اسی دھرم کی پناہ میں محفوظ رہ سکتا ہے۔

انہوں نے تک ماں کو دیکھتی رہی پھر روتے ہوئے بولی۔

”اپنے بچے سے صرف اس کی ماں کو نہیں اس کے ایمان کو بھی چھین لیا۔ کیا ایسا بچہ آپ کے دل سے بھی ایمان نکل گیا تھا؟“

لٹنے لٹنے۔ وہ میں نے حالات سے مجبور ہو کر خدا کے بھروسے پر ایسا کیا ہے۔ خدا کے پاس تو وہ آشرم میں بھی صاحب ایمان رہے گا۔

”جی رہے گا۔ آپ مجھے بھلا رہی ہیں۔“

اسے بھلا دیکھ کر صبر کر لو اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ ہم اس شہر میں نہیں آئے۔

راتے بانو کے چہرے پر پڑ رہا تھا جیسے خود اس کا چہرہ جل رہا ہو، اس کا دل سنگ رہا ہو۔ تھر تھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

”اے کہیں بھی چھپا دیجئے۔ اسے لے کر ماں سے بھاگ جائیے۔ میں صرف اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

”نہیں بانو! تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو اور میں تمہاری سلامتی کے لیے زنا ہوں۔ اب بھی وقت ہے، میری بات مان لو۔ میں اس بچے کو ایسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں اس پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

”کہاں؟“ بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”کہیں بھی یہ نہ پوچھو۔ اپنے دل پر بھروسہ کر لو۔ تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی مگر بردہ سلامت رہے گا۔“

”تم۔۔۔ نہیں میں اپنے بچے۔۔۔۔۔“

اس کا انکار اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک کشت تلواریں رکھی دی۔ پھر شعلوں کی روشنی میں ایک سکھ کا خون چروا نظر آیا۔ اس کا نڈا اس لوہے سے بجا ہوا تھا۔ وہ ”سمت سری اکال“ کہتا ہوا کھڑکی کے راتے سے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کے حلق سے بچ نکل گئی۔ کسی نے اس کی پشت پر خنجر گھونپ دیا تھا۔ وہ کھڑکی پر الٹ کر ہار کر پڑا۔ اس نے دوڑ کر کھڑکی کو اندر سے بند کر دیا اور روتے ہوئے بولی۔

”بانو! تم خود غرض ہو۔ یہ تمہا نہیں بچے سے دشمنی ہے۔“

وہ بھاری انداز میں چیختی لگی۔

”میں خود غرض نہیں ہوں، میں اپنے بچے کی دشمن نہیں ہوں۔ اسے لے جائیے“ ابھی لے جائیے۔ میں اس کی جدائی برداشت کر لوں گی مگر یہ الزام نہیں اٹھاؤں گی کہ ماں کی محبت ہی بچے کو مار ڈالتی ہے۔“

ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ اب بچے کی تلواریں بانو کے کان میں نہ پڑے۔ تلواریں دیر میں صبح ہونے والی تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ باہر ہنگامہ سرد پڑے ہی وہ بچے کو یتیم خانے میں چھوڑ آئے گی۔

بانو کمرے کے فرش پر تھپڑی ہوئی تھی۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے

بہاؤم میں کیوں چھوڑے گی۔“

بہاؤم نے اس کا کوئی باپ نہ ہو اس کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ وہ بچہ اس بوڑھی کا نہیں بلکہ اس کی کسی جوان بہن یا بیٹی کا ہوگا۔“

بوڑھی ملازمہ کی یہ بات میرا کہ دل کو لگ گئی کہ جس کا باپ نہ ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ واقعی دنیا کا ہر مذہب مرد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ محمد احمد رام ایٹور اور ان کے بیٹے ہنس والے کسی باپ کے جائز بچے کا مذہب سمجھ نہیں آ جاتا ہے۔ یہ مرد کے بیٹے فخر کی بات ہے اور یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کے ناجائز بچے کا مذہب بھی نہیں آتا۔ جب کہ وہ اپنی سوسائٹی میں بیٹا روزے نماز کی باتیں کر رہا ہو گا یا لڑکی کی مورتنی کے سامنے زینت کر رہا ہو گا یا سچ کے بت کے سامنے سینہ پر صلیب کا نشانہ بنا ہو گا۔ کیا مذہب یا دھرم کا تقدس اسی طرح قائم رہ سکتا ہے؟

میرا بچہ ”جو بچہ تمہارے دروازے پر پڑا ہوا تھا کیا اسے آشرم میں رکھ لیا گیا؟“

”ہاں یہ آشرم ایسے ہی بچوں کے لیے ہے۔“

”مگر آشرم کے کھاتے میں بچے کے باپ کا نام اور دھرم کیا لکھا جائے گا؟“

”یہاں بچوں کے ماں باپ کے نام نہیں لکھے جاتے کیونکہ یہاں آنے کے بعد بچوں کے نام کے تمام رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بچے ہمارے دھرم کے ہو کر رہ جاتے۔“

”ہاں جب کوئی ناطہ نہ رہے تو بچے کسی بھی دھرم کی گود میں جاسکتے ہیں۔ ماں باپ کو پہلے اسے اعتراض کرنے کا حق نہیں رہتا۔“

میرا بچہ تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر میری برسی کی ایک حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بدن پر کالاس تھا اور اس کے آس پاس دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک لڑکی اپنے نظر آ رہا تھا۔

میرا بچہ اس قیدی حسینہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھارتی قلموں کی سب سے مشہور

اتاتھ بالک آشرم کے ایک کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک حسین عورت چلی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں تک ترشے ہوئے تھے۔ سیاہ رنگ کے ماتھی بلاؤں اور اسکرٹ میں اس کے حسن کی چاندنی کھل رہی تھی۔ اس کا نام میرا تھا۔

میرا روزنامہ سندیس کے صفحہ اول کی رپورٹر تھی۔ اخبارات کے حلقے میں دوسری تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔ لیڈروں اور سیاستدانوں کے راز ازا کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بنا دیتی تھی۔ بڑے بڑے لوگ اس سے خوف زدہ بھی رہتے تھے اور غار بھی کھاتے تھے۔ لیکن اس روز میرا تیز و طرار نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی بالک آشرم سے کسی بچے اور اس کی ماں کا کوئی راز چر کر اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

وہ خود ایک رازنی کر اس آشرم میں پہنچی تھی اور بار بار اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے پنڈت جی کسی سے باتیں کرنے میں معروف تھے۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنے ہی آرام سے بیٹھو پر انتظار کاٹنے کی طرح جھمتا ہے۔ اس لیے وہ کمرے پر لو بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آشرم کی بوڑھی ملازمہ اس کے پاس آئی وہ بلاؤں سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ نے کہا۔

”بیٹھو بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی ذرا دیر ہے پنڈت جی خود ہی ہمیں بلائیں گے۔“

وہ بیٹھ گئی۔ ملازمہ نے سامنے ایک کھڑکی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیسا کجنگ ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ آج میرے آشرم کا دروازہ کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ایک نئے بچے کے ہمارے دروازے پر رکھ کر جاری ہے۔ میں نے اسے پکارا تو وہ بھاگتی چلی گئی۔ مجھے نہ کی تیار ہی ہے نہیں تو میں دوڑ کسا سے پکڑ لیتی۔“

میرا نے وقت گزارنے کے لیے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا تھا؟“

”اچھی طرح تو نہیں مگر ہاں دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے میں سیندر نہیں تھا تو وہ“

(یہ وہ ہوگی یا پھر مسلمان۔“

”اے یہ وقت جب کہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ ایک مسلمان عورت اپنے“

”مجھے پنڈت گردھاری لال کہتے ہیں۔ بیٹی ہم جان بوجھ کر کسی دوسرے دھرم کے بچے
 اپنی نہیں رکھتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ اب یہی دیکھو کہ آج
 بے سوچے کوئی بوڑھی عورت ہمارے دروازے پر ایک بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی
 نہیں ہم بچے کو کہیں پھینک نہیں سکتے۔ بھگوان کسی کو اتنا کھور نہ بنائے۔“
 میرا نے قدرے مایوس ہو کر پوچھا۔

”اُپا آپ میرے بچے کو نہیں رکھیں گے؟ میں میں ایک عیسائی ہوں۔“
 ”بیٹی! تم اپنے دھرم کے انوسارا اپنی عیسائی مشنری میں بچے کو رکھ سکتی تھیں۔ میں یہ
 باتوں کا کہہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روزنامہ سندیس کے ایڈیٹر سودیش مکرجی نے
 اگلے ہی پرارتنہ کی تھی کہ ہم تم سے کچھ نہ پوچھیں تمہارے بچے کو ہندو سمجھ کر
 لیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے کے لیے بلایا گیا ہوں کہ بچے کا دھرم بدل جائے تو
 انکار تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ ہر مذہب میں تھوڑے بہت شیطان ہوتے
 ہیں۔ بچے اگر کسی بھی مذہب کی پناہ میں آکر انسان بن سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔
 انکار نہیں ہے۔“

”میں میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے من میں یہ بات کھٹکتی نہیں رہے گی کہ
 نے کسی کے بچے کو اپنی اچھا سے اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ اب تم جاسکتی ہو۔“
 ”میرا جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکی۔ وہ چٹکچاتی ہوئی بولی۔
 ”مجھے بول لگ رہا ہے جیسے میں اپنی آؤمی جان یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“
 اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

”تم بڑی دھرم والی ہو۔ اتنی خاموشی سے آنسو بہا رہی ہو۔ دوسری مائیں تو یہاں گود
 لے کر دقت دھارتیں مار مار کر روتی ہیں۔ ابھی تم نے ایک ماری کو اسی طرح چیتھے
 نے اور روتے دکھا ہوگا۔“

”بابا! میں سر ہلا کر بولی۔
 ”اُپا! بیٹی رانی کی آنکھ اور میرا دل دونوں ساتھ ساتھ رو رہے تھے۔ میں میں یہاں
 جانے سے پہلے آئے۔ آخری بار اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آشرم میں یہ میرا

اداکارہ بیٹو رانی تھی۔ دلش کے تمام فلمی رسالے اور نوجوانوں کے تمام بیوروں میں اس کی
 تصویروں کی بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ قیدی کے لباس میں اور آشرم کے پہلی سطر
 میں ایسی تصویر بنی ہوئی تھی جسے وہ خود اپنی زندگی کے کسی بھی خوب صورت کمرے میں لگا
 پسند نہ کرتی۔ ایسی تصویریں تو صرف تقدیر کے بس کیسے ہی لاتارتے ہیں۔
 اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”تم رک کیوں گئیں آگے بڑھو۔“
 بیٹو رانی چونک کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بوجھل قدموں سے پتا چل رہا تھا کہ ک
 قیامت سے گزر رہی ہے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کا اہم سرمایہ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ وہ بچے
 چلتے رک گئی۔ جنونی انداز میں اپنی سرکونڈا میں ہلانے لگی۔
 ”نہیں نہیں۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میرا لعل، میرا بچہ مجھے داہیں
 کر دے۔“

وہ پلٹ کر واپس کرے کی طرف بھاگنا چاہتی تھی مگر سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ پھر انہیں
 کے حکم پر اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگے۔ میرا کا کلیجہ کانپنے لگا۔ ایک ماں کو اس کے بچے
 سے جدا کیا جا رہا تھا۔ ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کو کان
 یا نوچ کر اس سے الگ کر دیا جائے۔ پھر وہ قانون کے محاذ اس جنم جلی کو زبردستی کہاں لے
 جا رہے تھے۔ اگر بیٹو رانی نے پاپ کیا تھا تب بھی دنیا کی کسی قانونی کتاب میں یہ نہیں لکھا
 ہے کہ بچے کو اس کی پاپن ماں سے جدا کر دیا جائے۔ پھر یہ قصہ کیا ہے۔ دوسروں کے
 رازوں کو کنٹرول کرنا کیا بنانے والی میرا نے سوچا۔ اس المناک منظر کے پیچھے ایک اور
 اس کے بچے کی دردناک داستان ہے اس داستان کو کریدنا چاہیے۔

بعض اوقات زندگی اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانک کر دکھا
 جاسکے۔ میرا کا دھیان بٹ گیا۔ پنڈت جی نے دروازہ کھول کر کہا۔
 ”بیٹی میرا اندر آ جاؤ۔“

میرا سر جھکا کر دروازے کے پاس آئی۔ پھر پنڈت جی کے سامنے سے گزرتی ہوئی
 کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈت جی نے دروازے کو بند کرنے کے بعد بڑے
 دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کڑوا سینڑی عمارت کے باہر اخبارات کے رپورٹوں اور فونو گرافوں کی بھیڑ لگی تھی۔ کپٹن ہری رام اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا اسکرٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میز کے ٹارگٹ فلائنگ کلب کا لائسنس آفیسر رپورٹ پیش کر رہا تھا۔
 ”مرا آج پندرہ ستمبر ہے۔ دو دن پہلے آج کے لیے طیارہ چارز کرایا گیا تھا۔ چارز نے اے کا نام ہمیش چند پٹری تھا۔ وہ ہمیش اسٹیل ملز کے مالک تھے۔“

کپٹن رام نے پوچھا۔
 ”ہمیش چند آج فلائنگ کلب میں کب آئے تھے؟“
 ”نچوٹے نوبجے۔“

”ان کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟“

”ان کے ساتھ ان کی دھرم پتی اور پانچ سال کا ایک لڑکا تھا۔“

”تب کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا پانچ برس کا تھا؟“

”ہمیش چند اس لڑکے کو گود میں اٹھا کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے اسے پیار ہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج وہ اپنے بیٹے کی پانچویں سالگرہ منا رہے ہیں۔“
 ”ہن کا پتا کیا ہے؟“

”وہ کلکتہ سے آئے تھے۔ دارجلنگ میں ان کا ایک کالج ہے، تن سنگ روڈ پر۔“

”میں میں سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔“

”میری بلی کا پڑاؤ پس آگیا ہے۔ اس عمو دی چٹان کے آس پاس بہت سی چٹانیں ابھری ہیں اس لیے وہاں بلی کا پڑ لینڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ بچہ حرکت کر رہا۔ بلی کا پڑنے سے قبل اور کھانے پینے کی چیزیں چھینکی گئی ہیں۔۔۔۔۔“

اس کی بات اور عمو دی رہ گئی کھلے ہوئے دروازے سے تمام رپورٹیں اور فونو گرافز دفتر میں آئے تھے اور انہوں نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیئے تھے۔ کپٹن نے جواب دی۔

”طیارہ فلائنگ کلب سے چارز کیا گیا تھا۔“

”اسٹیل مل کے مالک کو رپٹ ہمیش چند پٹری گریاں گزارنے کے لیے دارجلنگ لے گئے۔ ان کے ساتھ ان کی دھرم پتی اور ان کا بیٹا تھا۔ حادثے میں ہمیش چند اور ان کی

آخری دن اور آخری خواہش ہے پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“

”بیٹی! خواہش کبھی آخری نہیں ہوتی جب تک سانس چلتی رہتی ہے ایک کے بعد دوسری خواہش چلتی رہتی ہے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا مگر تمہارے ایڈیٹر سونڈی مگر جب بچے کو اسپتال سے لے کر یہاں آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ تم نے بچی صورت نہیں دیکھی ہے۔“

”ہاں! مگر جی کا خیال تھا کہ بچے کی صورت دیکھ کر میری متاثر نہ ہونے لگے گی۔ پھر میں اسے چھوڑنے کا ارادہ بدل دوں گی مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے دور سے ایک نظر دیکھ کر چلی جاؤں گی۔“

”مگر بیٹی! تم اپنے بچے کو کس طرح پہچانو گی۔ صبح سے اب تک یہاں چار بچے آچکے ہیں ان میں سے ایک لڑکی ہے باقی تین لڑکے ہیں تم اپنے بیٹے کو کیسے پہچانو گی؟“
 ”آں؟ میرا سوچتے لگی۔ میں کیسے پہچانو گی؟ کیا میرا بچہ مجھے دیکھتے ہی پکارے گا؟
 کیسا احمقانہ خیال ہے؟“

پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے، تینوں لڑکے ہم رنگ اور ہم عمر تینوں کا نام دیں پندرہ ستمبر ہے۔“



میتنی ہلاک ہو چکے ہیں۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف ان کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج پندرہ ستمبر ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سالگرہ کا دن گزار رہا ہے۔



”پانچ اپنی ماؤں کو اماں یا ائی کہتے ہی ہیں لیکن تمہارا کوئی بچہ تھا اور نہ ہے۔ میں نے پتہ سمجھایا ہے کہ دو برس پہلے کی بانو کو مار ڈالو۔ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ اگر شادی کی جی ٹی تو تم پہلی بار دوسری بنو گی۔ سرتاج تمام راستے تمہاری باتیں کرتا آیا ہے۔ جاؤ وہ گھر باہر ہو گا۔“

”ہنہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا غم ماضی ستا رہا تھا اور مستقبل کی سرقتیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ماں بار بار بتاتی تھی کہ جو بچے دیکھ کر چلے ہیں وہ آگے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ بچہ جسے ماں کی بد نصیبی نے دنیا میں لایا وہ اپنی پہلی تخلیق کو نہیں آئے گا۔ اگر وہ پھر سے سماں بنے گی تو پھر اس کے آگے بچے اپنی بچے ہوں گے۔“

اسے خوشگوار زندگی گزارنے کا سبق پڑھاتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ پچھلا فیروز یاد رہتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے پہلے فن پارے کو کبھی نہیں بھولتا۔ دس سال کی بچی کے بعد بھی بانو اپنی پہلی تخلیق کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

جب وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس بدل کر آئینے کے سامنے آئی تو کچھ دیر تک وہ آپ کو دیکھتی رہ گئی۔ آئینے میں جو بانو تھی وہ بالکل کورے کانڈ کی طرح تھی۔ جیسے ایک اس پر کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا اور نہ ہی اس کانڈ پر کبھی کسی بچے کی تصویر لگائی تھی۔ اسی لیے تو سرتاج بے اختیار اس کی طرف کھینچا چلا آیا تھا۔ بانو کو اس کی بات یاد تھی۔

”تم کہا تو مجھے سرتاج کہہ سکتی ہو۔“

”آئینے کے سامنے شریا گئی۔ اس نام کے سائے میں شادی کا پیغام تھا۔ سرتاج کا پیار بڑھ کر رہا تھا کہ تمام مرد آصف کی طرح سنگدل اور بے حس نہیں ہوتے۔ وہ بھول کو ہر کی طرح اٹھاتے ہیں اور آخری سانس تک زندگی کے خوب صورت گلدان میں سجا کر بچے ہیں۔ وہ سوچنے لگی ”ہائے ایسی محبت اور مسرت اب تک کہاں تھی۔ اتنی دیر سے یہاں تک ہے؟“

تہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف ان کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج پندرہ ستمبر ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سالگرہ کا دن گزار رہا ہے۔

سائن کے چلنے کی بو آئی تو بانو چونک گئی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ باورچی خانے میں چولے کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور تھوڑی دیر بعد کپٹن سرتاج حسین اپنی سالگرہ منانے اس کے گھر آئے والا ہے۔

سوچ کی رفتار، آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ سوچنے سوچنے چپک چپکتے ہی سال بچے آصف کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کی بیوی بن گئی تھی۔ پھر ایک بچے کو جنم دے کر واپس باورچی خانہ میں آگئی تھی تاکہ سرتاج حسین کے لیے بریانی اور سالن تیار کر سکے۔

تعمانی میں ماضی کی طرف دیکھتے ہی بچے کا خیال دل میں کچھ کے لگائے لگتا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے تھے ”وہ کہاں ہو گا۔ اب پورے دو برس کا ہو گیا ہو گا۔ دو برس کے بچے ”اماں اماں“ کہنے لگتے ہیں۔

اسی وقت اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔

”بانو کیا سوچ رہی ہو؟ کھانا تیار ہو گیا؟“

”اے! جی ہاں سائن ذرا جل گیا ہے مگر کھانے کے قابل ہے۔“

”اچھا میں دیکھ لیتی ہوں تم منہ ہاتھ دھو کر لباس بدل لو۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں وہ ذرا تنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”کون؟“ بانو نے بے خیالی میں سوال کیا۔ حالانکہ وہ سمجھ گئی تھی۔

”یہ تو کیا تم اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی فوجی افسر جانتی ہو اس نے مجھے اپنا نام کہا

بتایا ہے! اس کا نام سرتاج حسین ہے۔ جلدی جاؤ بیچارہ برسوں سے تمہاری زندگی گزار رہا ہے۔

اسے احساسِ ولادت کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔“

وہ وہاں سے جانے لگی پھر یک بیک پلٹ کر بولی۔

”اسی آپ کو تو معلوم ہو گا دو برس کے بچے اماں کہنے لگتے ہیں۔“

انہی کل کر سامنے آجائے تو کیا ہوگا؟ کیا دوسری بار طلاق ہوگی؟ یہی سوچ کر اس کا دل
بہا ہوا۔

اسا مین بن کر مسرتوں کے ہجوم میں خوف زدہ تھی۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ہی
نے وہ گمانے والی خوشیاں ملتی ہیں۔ ایسی خوشیاں خدا نہیں دیتا بلکہ انسان خود خریدتا
ہے۔ ایک دوسرے سے لین دین کے موقع پر اگر ایک اپنا سب کچھ دے کر بھی کچھ چھاپتی
ہے۔ پانچ سو روپے حاصل کرنے کے باوجود سس سس کر زندگی گزارتی ہے۔

سوچے سوچے انتظار کی گھنٹاں ختم ہو گئیں۔ گھونگھٹ کے پیچھے سے کچھ دکھائی نہیں
دیا تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی کہ۔۔۔ سرتاج حسین ساگ کے کمرے میں آ گیا ہے۔ اسے
نئے کلاؤ تجربہ حواس کے مطابق اور زیادہ مٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے تمام
انف کی طرح ایک ہی انداز میں ریکارڈ کی مانند بولتے ہیں اور گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنا
نہرہ مٹا کر لے لگتے ہیں۔ لیکن جب سرتاج نے اس کے قریب بیٹھ کر اور اس کے ہاتھ
اپا ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا تو بانو کا تجربہ غلط ہو گیا کہ تمام دلہا اپنی خواہشات کو اہمیت
پہنچیں۔ اس کے برعکس وہ سہمی ہوئی دلہن کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اسے دائمی محبت اور
آئی غنہ کا یقین دلاتے ہیں۔

سرتاج حسین کا انداز ایسا تھا کہ بانو کا دل خود بخود اس کی طرف کھینچا چلا گیا۔ اس کے
اوردان میں جو خوف سایا ہوا تھا وہ آپ ہی آپ دور ہو گیا۔ بعض مرد ساحر ہوتے ہیں،
یہ لے تو وہ حرزہ ہو گئی تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کیسے اپنے سرتاج کی
انف میں چلی گئی۔ تب سرتاج نے کہا۔

”تو جے تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں۔ ان حسین لمحات کے بعد ہمارے
دہان کوئی پردہ نہیں رہے گا۔ میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم سے پہلے میری زندگی
بمبھ لڑکیاں آپہنچی ہیں۔ اگر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آیا ہو تو مجھ سے نہ
بہا۔۔۔“

بانو کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں۔ جو خوف مٹ گیا تھا وہ یکبارگی اس
کا اندر ڈھلنے کے سے جھٹکے پہنچانے لگا۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود کانپنے لگی۔ وہ اپنی
انف میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن بعض باتوں کا رد عمل بے اختیار

سوچ کی نگری میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ آئینے کے سامنے بھی
دیر سے سوچ میں کھڑی ہے۔ سرتاج ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ہوگا۔ وہ تیزی سے چلی
ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ کر اس کی تیز رفتاری
برقرار نہ رہی۔ شرم دھانے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ دروازے کے ایک ہٹ کو تمام کر
دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈرائنگ
روم میں نہیں بلکہ سرتاج کے دل کے کسی گوشے میں قدم رکھنے والی ہے۔
اسی وقت پتا چلا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں ہے۔ اسے امی کی آواز سنائی دے رہی
تھی۔

”بیٹا بانو بڑی شرمیلی ہے۔ وہ اس طرح نہیں آئے گی میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔“
”نہیں امی! آپ نہ جانیں۔ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر وہ لگتا ہے
کہ آپ ناراض ہو جائیں گی۔“

”بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو۔ جب تمہیں بیٹا کہا ہے تو تمہاری کسی بات پر ناراض کیے
ہو سکتی ہوں۔ تم بلا بھجک کہو۔“

”امی بات یہ ہے کہ میری شرافت کی گواہی دینے کے لیے میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار
نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے شریف اور ایماندار سمجھتی ہیں تو بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے
دیں۔ میں اسے اپنی عزت بنا کر پیش اس کی عزت کروں گا۔“

اچانک ہی بانو کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔
لگا ہوں کے سامنے آتش بازیوں جھوٹے لگیں۔

ایک ماہتابی تیزی سے سرسراہتی آسمان کی بلندی کی طرف جانے لگی۔
اس کے ساتھ ہی وقت کا پچھلی تیزی سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اڑا چلا گیا۔

ایک ماہ گزر گیا۔

وہ دلہن کا سر جو اپنے گھونگھٹ نکالے ساگ کی جج پر بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے
سائے میں ہر کنواری کا دل گھبراتا ہے کہ پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ تو کنواری
نہیں تھی۔ کلی سے پھول یا لڑکی سے عورت بننے کے بعد کنوارے گھونگھٹ میں بھی
بیٹھی تھی۔ کیا پردہ اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنے سرتاج سے چھپی رہ سکے گی؟ اگر چھپ نہ سکے

نہ کی طرف تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان بڑی پرسرا سراسری خاموشی رہی۔
ایک سگڑ کا ایک کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد ہنسنے لگا۔

وہ کسی پرہیز رہا تھا۔ بانو پر یا اپنے آپ پر؟ ہنسنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے
نہ پاگل ہنسنے ہیں۔

میں بھی کیسا نادان ہوں کہ اپنے سامنے کے ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ
منا کپائی سے میرے سامنے آئے۔ یہ سراسر حماقت ہے ہر انسان کا اپنا ایک ماضی
چھوڑا اور اپنا غور ہوتا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ذاتی معاملات کی
انتہائی کرے۔

اس نے پھر سگڑ کا ایک کش لگایا۔ اندھیرے میں سگڑ کی آگ دیکھنے لگی۔ بانو
ایک لمحے وہ اس کے سنگٹے ہوئے دل کو چھوٹ رہا ہو۔ آخر اس نے کہا۔

”بانو! میں یہ نہیں سمجھتا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے۔ اگر چھپایا ہے تو پھر ہمیشہ
ہائے رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری انا کو نہیں نہ پہنچے۔ تم میری عزت ہو اور تمہاری
بند کھنا میرا فرض ہے۔“

بانو اس کی محبت اور شرافت کا یہ انداز دیکھ کر تڑپ مچی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ
یہ اگر اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور اپنے ماضی کی ایک ایک بات اسے بتائے۔
وہ کون سی بات؟

وہ تو سوچ رہا ہو گا کہ اس کی دلہن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی آچکا ہے۔ وہ زیادہ سے
بہانے کنواری نہیں سمجھ رہا ہو گا لیکن اتنی دور تک نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایک بچے کی
ماں بن چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت سرناج جیسے شوہر پر اپنی جان بھی قربان
نہی ہے مگر عورت کی جوانا ہوتی ہے اسے نہیں نہیں پہنچاتی۔ اپنے دل کی بات خود کبھی
نہی کہہ سکتی تھی۔ بانو کے ساتھ بھی یہی عورت کی مجبوری تھی جسے وہ خود سمجھ
نہی تھی۔ اپنے ضمیر کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ قیامت کی رات کسی طرح گزری گئی۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر ماں موجود تھی اور
ناشتہ ناشتہ سے بیٹی اور داماد کے چروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرناج اپنی عادت
میں اپنی بیٹی بول رہا تھا بانو کچھ چپ چپ ہی تھی لیکن سرناج کی کسی کسی بات پر شرما

ہو تا ہے۔ اس پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ سرناج چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ
کچھ بولے گی پھر وہ خودی بولا۔

”تم لرز رہی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ میں پہلا شخص ہوں جو تمہاری زندگی میں آیا ہوں۔ بہ
تمہارے بدن کی کنواری کپکپاہٹ ہے۔ میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔“

بانو کو یوں لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے مگر وہ تو پیار کر رہا تھا اس کی سانسوں کے رائے دل
میں اتر رہا تھا۔ جس بات کا جواب وہ نہ دے سکی تھی، سرناج اس بات کو اس کی اداسی میں
ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ سرناج سرخسما بن گیا ہو۔ بانو کے دل کا چر رہا
سوچ رہا تھا۔ حالانکہ سب ہی شوہر اپنے حقوق کے مطابق ایسے وقت سرخسما بن کر بار
سے تفتیش کرتے ہیں۔

کرے میں گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔
اس لمحے کچھ احساسات تھے کہ وہ آپریشن ٹیبل کے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔ اسے جھوٹ کا
سرطان ہو گیا ہے اور سچائی کے نشتر سے اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے۔ کیا واقعی دنیا میں کوئی
ایسا اسپتال ہے جہاں سے جھوٹ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کی جاسکتی ہو؟

”نہیں“ بانو نے بڑے حوصلے سے سوچا ”کوئی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکتا۔ اس
کے باوجود میں نے فیصلہ کیا تھا کہ محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو اس سے کچھ نہیں چھپاؤں
گی مگر ای نے مجھے اس بچے کی قسم دی ہے (جو نہیں ہے اور ہے) انہوں نے انتہائی ہے کہ
اب میں کسی پر اعتماد نہ کروں۔ سرناج خواہ کتنا ہی شریف، ایماندار اور محبت کرنے والا
شوہر ہو وہ ایک باس دلہن کو کبھی بدواشت نہیں کرے گا۔“

وہ بڑی قیامت کی رات تھی۔ گزرتا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اندیشے تھے کہ دل میں مگر
کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف کی تاریکی اسے دلا سے دے رہی تھی کہ اسے
پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ رات کی تاریکی میں اور ماں کے پیٹ میں ہر بات چھپ جاتی
ہے۔

رات کے پچھلے پھر سرناج اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر اس کے ہٹ کھولنے کے بعد
ایک سگڑ سگٹنے لگا۔ بانو نے سمجھتے ہوئے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ کوئی
کے باہر نادرول بھرے آسمان کے پس منظر میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی

الے وقت شوہر سے وفا کرتے کرتے ایک نہی دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ اگر بچہ لہلہ کے سامنے ہو تو اسے چھوڑ کر شوہر کے سینے سے لگا جاسکتا ہے مگر نگاہوں سے دل ہواؤ اذواجی محبت کے درمیان وہ عورت کو بیوی کے بدلے صرف ماں بنا کر رکھ دیتا ہے بڑی مٹاؤی مٹکی پر مڑی تھی۔

ایک برس اور گزر گیا۔ پندرہ ستمبر کی صبح بانو کی آنکھ کھلی تو اسے سب سے پہلے یاد آیا لڑیے سے گھڑے ہوئے پورے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ اگر وہ آج موجود ہوتا تو صبح ہی عاں کی پانچویں سالگرہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ محلے کے بچوں کو مدعو کیا جاتا گانے بٹے کا پروگرام ہوتا۔ میرا بیٹا تمام بچوں کے درمیان شہزادہ نظر آتا۔ کیسا ہنگامہ ہوتا۔ یہ نونہیں سے بھر جاتا۔

اس کی نظر گھڑی پر مچی، نونچ گئے تھے۔ وہ ہڑبدا کر اٹھ بیٹھی اب اسے سرتاج کا خیال بڑا کڑوا ہوتا تھا کہ وہ صبح دیر تک سوئی رہتی تھی اور سرتاج ناشتہ کیے بغیر ڈیوٹی پر چلا آتا۔ وہ سترے اٹھ کر اپنی کوٹاؤں کا احساس کرتی ہوئی مکان سے باہر لان میں آئی، بال سے کہ شاید وہ ابھی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہو مگر وہ نہیں تھا۔ ٹھیک نونچ کر باٹ پر اسے ایک طیارے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

نہیں جانتی تھی کہ وہ چھوٹا سا طیارہ زندگی کے ایئر پورٹ سے پرواز کرتا آیا ہے اور نئے دن دسے پر لینڈ کرنے والا ہے۔

اس کے دل نے دھڑک دھڑک کر یہ نہیں بتایا کہ اس طیارے میں ایک پانچ برس کا سا لڑائی پانچویں سالگرہ مناتا ہے۔

وہ نئے پانچ برس کا ایک ایک لڑائی کا نئے کی طرح ہبستار رہا تھا۔ اس کے خون ابلی نہیں آیا کہ اس کے خون کا ایک چھینٹا اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرواز کرتا تھا ہے۔

بلکہ ایک ہی اس کے دل میں درد سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ درد کون سے جگہ سے آیا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔



خبر عموما اخبارات سے پہلے ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہیں۔ دیس کے تمام ریڈیو اسٹیشن

کر مسکرا دیتی تھی۔ ماں کو اعتماد ہو گیا کہ بات بن گئی ہے۔ جب داماد خوش ہے تو بانو قسمت بھی خوش ہے۔ بانو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چپ چپ سی رہتی ہے۔

پھر دن، ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ سرتاج نے پھر کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جو بانو کے دل پر بوجھ بن جاتی۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اس کا دیوانہ بن گیا تھا اور اس کی دوا کی بدستور قائم تھی۔ مشکل یہ ہے کہ انسان کو کسی کموٹ قرار نہیں ملتا۔ بانو کے دل سے خوف اور اندیشے دور ہوئے تو وہ سرتاج کی دیوانہ وار محبت سے گھبرانے لگی۔ وہ اپنے غلوں اور محبت سے غفلت حاصل کر رہا تھا اور وہ تھی کہ آپ اپنی ہی نظروں سے گرنی جا رہی تھی۔

ایک سال بعد سرتاج نے اس کے لیے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا چھوٹا مکان بنایا اور اس کے ہاتھ میں مکان کی چابی دے کر کہا۔
”یہ تمہارا گھر ہے“ اس کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولا اور اپنی محبت سے اس کو کہہ کر جنت بنا دیا۔

اپنے مکان کا پہلا دروازہ کھولتے وقت بانو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایک وہ آصف تھا جو گھر لوٹ کر چلا گیا تھا ایک یہ سرتاج تھا جس نے اپنی محنت کے کاڑھے بیجے سے جن کا وہ چھوٹا سا تاج محل بنایا تھا۔ کیا وہ اس گھر کو اس کے لیے جنت بنا سکتی تھی؟ مگر کیسے بنا سکتی تھی؟ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں بی بی آکا کو اکرنا بچے آصف کا نہ ہوتا، سرتاج کا ہوتا تو وہ اسے ہاتھوں میں لے کر اس نے مکان میں قدم رکھتی۔ پھر اس کے اور سرتاج کے درمیان کوئی جھوٹ اور بے اعتمادی نہ ہوتی۔

جب دو برس گزر گئے تو سرتاج نے ایک رات اسے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔
”کیا بات ہے کیا ہمارے اس چھوٹے گھر میں ایک ٹھکانا پھول نہیں کھلے گی؟“
بانو اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

”میں کیا کہوں۔ یہ تو خدا کی دین ہے وہ جب چاہے گود میں پھول کھلا دے۔“
ایسا کہتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار سے لگے ہوئے کیلنڈر پر گئیں۔ کیلنڈر پندرہ ستمبر کی تاریخ بنا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے حلق میں آکر دھڑکنے لگا ”وہ خدا یا! اب تو میرا لہلہ چار برس کا ہو گیا ہو گا۔ وہ ابھی کیا کر رہا ہو گا؟“

ایک پہاڑی کے دامن میں تھا۔ جب داس دیو کاٹنے کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو
نے ادا کا دروازہ کھولا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سوچ گئی تھیں۔
ہائے اس سے پوچھا۔

”تمہارا کام کرتے ہو؟“

”ہاں صاحب! میں یہاں کمالی ہوں مگر آج یہاں کی پھلوری اجڑ گئی ہے۔“

”داؤلہ کیادل کو لگنے والی بات کئی ہے۔ ٹھہرو میں اسے لکھ لیتا ہوں۔“

اس نے نوٹ بک میں لکھنے کے بعد کہا۔

”میں اس کہنے سے نیک لگا کر آسمان کی طرف یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھو جیسے
مٹی پانی کے جہاز کے بغیر نگا ہو گیا ہو۔ ہم تمہاری یہ تصویر اخبار میں چھاپیں گے۔“

پراس نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ تصویر اتارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسی
بیمال کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بلا شک لڑکا بلاؤ ز اور اسکرٹ
اپنے شانے سے ایک کمرہ لٹکا کر کھڑی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”سزا داس دیو۔ ایک مالی کو ادا کار بنانے سے تمہارے اخبار کی مانگ نہیں بڑھے گی۔

نہ کے پیسے کو مذاق نہ بناؤ۔“

داس دیو نے بات ٹالنے کے لیے مسکرا کر کہا۔

”چھاتو تم پہنچ گئیں۔ مگر کیا بات ہے؟ آج تم کچھ کھوٹی کھوٹی سی لگ رہی ہو۔ بھی
بے کڑی تہنیتی ماؤں کو ادا کر سکتی ہے اور تم تو ابھی کنواری ہو۔“

بیمال کے دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کنواری مریم ہے۔ کوئی اس کی مٹکا کو نہیں سمجھ
بہت اس پہنچ سالہ جانی کی خبر سنی تھی اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے

کا حساب لگا چکی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جانی وہی بچہ ہے۔ وہ سوچ بھی
لگتی تھی کہ ایک کروڑ پتی سیٹھ کا بچہ اس کے اپنے خون کا پردہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو

ایک بچے کا درد اپنے دل میں لے کر وہاں آئی تھی اور اپنے روزنامہ کے لیے صحیح
بامثل کرنا چاہتی تھی۔

ہلکی جواب دیئے بغیر کاٹنے کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ داس دیو اس سے
بہت سے چلتا ہوا کال ٹیل تک پہنچ گیا پھر اس کاٹن دبانے کے بعد بولا۔

پانچ سالہ جانی کے متعلق خبریں سن رہے تھے۔ طیاروں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔
حادثات میں مرنے والوں پر افسوس بھی کیا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نین

حادثات کو بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خبر سن کر ہر ماں باپ کا دل دھل گیا کہ ایک پانچ برس کا
بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہے۔ یہ خبر سن کر کوئی ماں ایسی نہیں تھی

جس نے اپنے بچے کو فوراً ہی کھینچ کر سینے سے نہ لگالیا ہو۔
ڈیلی ایوننگ ٹیلی گرام کے ایڈیٹر نے ریڈیو سوچ کو آف کرتے ہوئے اپنے رپورٹریس

دیو سے کہا۔
”داس دیو! اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ فوراً دار بلینگ پہنچو۔ وہاں پہنچ کر جانی کا ٹکڑا

تصویر لو۔ کاٹنے کے اندر پہنچ کر اس بچے کے خالی بستر کی بھی ایک تصویر اتار دو۔ وہاں جو لوگ
ہوں ان کے بیانات لے کر ایک معصوم بچے کے متعلق ایسی لڑو خیز کہانی بناؤ کہ پڑنے

والوں کے دل دھل جائیں۔ یہ سنہری موقع ہے ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔“

”میں سمجھتا ہوں باس! جب تک دھماکہ خیز خبریں شائع نہ ہوں اخبار پاقوں کو
نہیں بکنا۔“

ایڈیٹر نے کہا ”صرف دھماکہ خیز ہی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ان خبروں میں ٹک
مرج اور دو مرتبے مسالے لگانے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہم جانی کے خالی بستر کی ایک تصویر شائع

کریں گے اور اس کے نیچے لکھیں گے کہ اس آرام دہ بستر پر ماں کی لوریاں سننے والا جانی بارہ
ہزار فٹ کی بلندی پر پتھر کی چٹانوں کی گود میں پڑا ہے۔ ہمارے دیس کی کوئی ماں اپنی لور کی

آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتی۔ کہو یہ کیسا نڈر اسٹنٹ ہو گا؟“

”غضب ہو جائے گا باس! ایسی باتیں بڑھ کر تمام مائیں چیختے لگیں گی۔“

”میں تو پوائنٹ ہے۔ جب عورتیں چیخیں گی اور ضد کریں گی تو ان کے بچے یا پاپا دادا
اخبار خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بس اب جلدی سے جاؤ! ایسا نہ ہو کہ روزنامہ

سندیس کی میرا تم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ کوشش کرو کہ وہ شیطان کی خالہ تم سے پہلے
کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکے۔“

”ایسا ہی ہو گا باس! وہ کتنی ہی چالاک ہو مجھ سے بازی نہیں لے جائے گی۔“

ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے داس دیو اپنے فوٹو گرافر کو لے کر دار بلینگ پہنچ گیا۔ جانی

”بی بی! تم بہت اچھی ہو۔ عورت ہی عورت کے دکھ درد کو سمجھتی ہے۔ آؤ اندر“

داس دیو اس سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

”ہاں جی! آپ کانچے کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔“

”میں اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ مگر ایک ماں کی طرح دن رات جانی کو گود میں کھلایا۔ میں اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ جانی کو ہوائی جہاز کی سیر کرانے کے بعد آتے ہی ہوں۔ اس دلت میں نے ریڈیو لگایا تو یہ منہوس خبر سنائی دی۔ اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہ آیا ہے۔ بی بی یہ خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی؟“

”نہیں ماں جی!“ میرا نے کہا ”یہ خبر جھوٹی ہوئی تو ہم یہاں نہ آتے۔ آپ کیا کر کے ایک ایک تصویر ہمیں دے دیں۔ کیا آج جانی کی سالگرہ منائی جا رہی تھی۔“

”ہاں یہ دیکھو کل رات ہی یہ بڑا برتھ ڈے ایک منگوا یا گیا تھا۔“

ملازمہ نے آگے بڑھ کر ایک میز پر سے کپڑے کو ہٹایا۔ وہاں ایک بڑا سا برتھ ڈے رکھا ہوا تھا۔ فوٹو گرافر اس کی تصویر اتارنے لگا۔ خوب صورت سے ایک پرواضح فلم ”چندرہ سمبر“ لکھا ہوا تھا۔ میرا سالگرہ والی بات جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ان کی تاریخ ہے لیکن ایک پر ”چندرہ سمبر“ کی تحریر دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس دن کی کوکھ میں اس کا بچہ چل چل کر پوچھنے لگا۔

”بی بی! آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟ دیکھیے نا؟ میرا برتھ ڈے ایک تیار ہے یا نہ کیا آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟“

ایک پندرہری اندر اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب کچھ ہونے ہے اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ کیا ہو سکتا ہے؟ پانچ برس پہلے تو وہ اندر سے مریچکی مارنے کے بعد اور کون سا الیہ اسے رلا سکتا ہے؟

انسان جو سوچ بھی نہیں سکتا وہی اس کے آگے آتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑی ایک پر ہائی تاریخ کو گننے جا رہی تھی۔

”میں بارہ سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ پانچ برس پہلے میں سینٹھ اور سیٹھانی کے فوٹو جانی کو لانے گئی تھی۔“

”میرا! یہاں کوئی تیسرا اخبار رپورٹر نہیں ہے آؤ ہم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں یہاں سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ معلومات ہم آپس میں بانٹ لیں گے کتنی معلومات کا جو حصہ میں شائع کروں گا وہ تم نہیں کرو گی اور جو حصہ تم شائع کرو گی وہ میں نہیں کروں گا۔“

میرا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

”مجھے منظور ہے لیڈز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے میں کہتی ہوں کہ جانی کی تصویر میرے اخبار میں شائع ہوگی۔ سمجھوتے کے مطابق تم اس کی تصویر شائع نہیں کرو گے۔“

داس دیو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جانی تو اہم موضوع ہے۔ اس کی تصویر تمام اخبارات شائع کریں گے۔“

میرا نے کہا ”اس طرح جانی کے متعلق جتنی خبریں ہوں گی وہ سب ہی اہم ہوں گی لہذا فضول سمجھوتے بازی سے پرہیز کرو۔“

اتنے میں دردناک کھل گیا۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے ساڑھی کے آٹھلے سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کون لوگ ہیں؟“

داس دیو نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ آنسو پونچھتی ہوئی اس عورت کی فوراً تصویر اتاری جائے۔ فوٹو گرافر نے کمرے کی آنکھ سے دیکھا۔ اسی وقت میرا اس بوڑھی عورت کے بالکل قریب آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے کا بٹن دبنے کے بعد فوٹو گرافر کو پتا چلا کہ میرا بھی تصویر میں چلی آئی ہے۔

داس دیو نے جھٹلا کر کہا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟ کیا ابھی آنسو پونچھنا ضروری تھا؟“

”ہاں! داس دیو! ہم پہلے انسان ہیں بعد میں رپورٹر ہیں۔ ایک دم کی عورت کے آنسو پونچھ کر اسے تسلی دینے کے بعد ہم اپنا کام کر سکتے ہیں۔“

بوڑھی ملازمہ نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

”لانی مگنی تھیں؟“ داس دیو نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”یعنی آپ اسپتال یا میسٹرنی ہوم سے اسے لانی مگنی تھیں؟“

”آں؟“ ملازمہ نے ایک ذرا ہچکچانے لگی اور اپنے دونوں بازوؤں کو گود لینے کے انداز

میں یوں نکتے لگی جیسے بچے کو اٹھائے بہت دور سے لاری ہو۔ پھر وہ حسب عادت بڑبڑانے لگی۔

”اس کے پالنے والے تو سورگ باشی ہو گئے اب یہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ اسپتال سے لایا گیا تھا یا آشرم سے۔۔۔۔۔“

یہ بات میرا کے سینے میں گولی کی طرح لگی۔ وہ ایک دم سے لاکھڑا کر صوفہ پر گر پڑی۔ اس سے بے خبر داس دیو نے چٹکی بجا کر کہا۔

”وہ مارا۔ یہ خبر بڑی دھماکہ خیز ہوگی کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔ اگرچہ حادثے میں اس کا باپ اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کے بعد بھی اسے جنم دینے والی ماں کہیں زندہ ہوگی۔“

افس اس خبر سے کیسی سنسنی پھیل جائے گی۔

مستکیسی سنسنی اور کیسے کرب سے مگر زری تھی یہ میرا کا چہرہ بتا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں ”میرا بچہ۔۔۔ میرا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی۔ ساری بلندیوں کو گرا کر اسے سینے سے لگا لوں گی۔“

وہ غر غراتی ہوئی الجھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت داس دیو نے کہا۔

”میرا! میں تم سے زیادہ فاسٹ ہوں۔ دیکھ لیتا یہ خبر سب سے پہلے میرے اخبار میں آئے گی۔“ پھر اس نے ملازمہ سے پوچھا ”جانی کو کس آشرم سے لایا گیا تھا؟“

”جلپانی گڑی کے بالک آشرم سے۔۔۔۔۔“

ملازمہ کی بات سن کر میرا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ بچہ اسی کا ہے۔ اس نے داس دیو کا بازو تھام کر کہا۔

”نہرو۔ داس دیو! میری ایک بات مان لو۔ ہم میں سے کسی کو یہ خبر شائع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔“

”کیوں؟“ داس دیو نے ہنسنی سیڑ کر پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ بچہ ایک کروڑ پتی سیٹھ میس چند کے نام سے بچانا جاتا ہے۔ اگر نہ

برائے کر گئے تو اس معصوم بچے سے ایک باپ کا نام چھن جائے گا۔ آئندہ کے لیے اس اقدام کی ہر جگہ ہوجائے گا۔“

”میرا! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم یہ خبر میرے پاس روک کر خود پناہ میں شائع کرو گی۔ اپنی یہ چالاکی اپنے ہی پاس رکھو۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ میرا نے اسے آواز دی۔ داس دیو نے دروازے

تک جا کر میرا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فونو گرافر سے کہا کہ وہ اس گھر سے جانی کی بد تصویر حاصل کرے پھر اس نے بوڑھی ملازمہ سے پوچھا۔

”ماں جی! مجھے یقین ہے کہ آپ جانی کی اصلی ماں کو جانتی ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کا پتا لگا سکتی ہیں۔“

میرا نے جلدی سے کہا۔

”ماں جی! کچھ نہیں جانتیں۔۔۔ یہ کچھ نہیں بتائیں گی۔“

بوڑھی عورت نے تاکید کی ”یہ سچ ہے بیٹا! آشرم والوں نے جانی کے ماں باپ کا پتا اسنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”میں ابھی طرح سمجھتا ہوں میرا! ماں جی کو تھرا اشارہ مل گیا ہے لیکن میں نے سبکی لیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں آشرم سے معلومات حاصل کروں گا۔“

یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سے بغیر کانچ سے باہر آگیا۔ ڈاک خانہ وہاں سے زیادہ دور

نہ تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر ٹنک کال کے ذریعے اپنے ایڈیٹر سے باتیں

لے لگا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ میرا کے مقابلے میں کتنی تیز رفتاری اور ذہانت سے

ہم کر رہا ہے۔ فونو گرافر شام تک اہم تصویریں لے کر دفتر پہنچ جائے گا۔ اس نے وہ دھماکہ

خبر بھی سنائی کہ جانی لے پالک لڑکا ہے اور اب وہ آشرم کی طرف جارہا ہے تاکہ جانی

کامل ماں کا سراغ لگا سکے۔

یہ تفصیلی رپورٹ دینے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن آیا۔ وہاں سے نیو گج کے ذریعہ

لاہور پہنچا۔ سلی گڑی سے براؤ گج کے ذریعہ جلپانی گڑی پہنچ کر اس نے آشرم کا پتا

مطم کیا۔ چندرہ منٹ کے بعد جب وہ سائیکل رکشا میں بیٹھ کر آشرم میں آیا تو دفتر میں قدم

دکھائی نہ ہو سکا۔ اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ میرا اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر

لے کر اتر تھانے کی ہوگی۔ اسی لیے آپ مجھے اس بچے کی ماں کا نام اور پتا نہیں بتائیں گے
ہاں بارہا منے والا آدمی نہیں ہوں۔ جب یہ خبر میرے اخبار میں چھپے گی کہ پانڈی چوٹی
وہ ہے وہ پندرہ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اور ہلپائی گوری کے بالک آشرم سے میٹھ چنڈ اور
لکھنؤ کی گود میں پہنچا تھا تو جانتے ہیں کیا ہو گا؟ وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔ اس بچے کی
لہاں جہاں بھی ہوگی۔ وہ اخبار پڑھتے ہی سات پردوں سے نکل کر اپنے بچے کی طرف
لے گی۔ اور نہ میرا نام داس دیو ہے داس دیو۔“

”وہ بچہ گھمنڈ سے پاؤں پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میرا نام یو سی سے کہا۔
”یہ نہیں مانے گا۔ اس کی نادانی سے ان دو ماؤں تک یہ خبر پہنچ جائے گی۔ یہ میں جانتی
ہوں ان کے دلوں پر کیا کرے گی۔ میرے اندر تو ایسی ترب اور بے چینی ہے کہ میں کچھ
بہانہ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہتی ہوں۔“

”دھرج رکھو بیٹی! بھگوان سے بچے کے لیے پراعتھا کرو۔ یہ تم تین عورتوں کی لالچ بھی
لے گا۔ پانڈی نہیں وہ دو عورتیں کہاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بچے کو آشرم کے
اوپر پھونڈ دیا تھا یعنی اپنے آپ کو چھپا لیا تھا مگر اب بچے کی پتاس نہ کرو وہ چھپی نہ رہ
سکتی۔“

”دوسری کو میں پہچانتی ہوں۔ اس کا نام یو ثورانی ہے۔“



یو ثورانی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی خلا میں ایک تک دیکھ رہی تھی۔ یہ
ان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلا میں
رہنے لگتا ہے۔ اسی طرح یو ثورانی خلا میں گھورتی ہوئی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر
ہر اس دور میں پہنچ گئی جب کہ ان کو ناری کینا کلاتی تھی۔

انہوں نے اس کا نام یو ثور دھار رکھا تھا۔ بھگوان کرشن کہنا کو جنم دینے والی ناری کا نام
یو ثور تھا۔ اس ناطے سے یو ثورانی کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پوتر اور بھگوان بنانے
لے اس کا نام یو ثور دھار رکھا۔ جب وہ پچھت پرائی بھرنے کے لیے جانے لگی تو ایک دن
ہر ایک شریر نوجوان نے غلیل چلا کر پانی سے بھری ہوئی اس کی گالگر توڑ دی۔ یو ثور دھار
غمر سے کہا۔

پنڈت گردھاری لال سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے داس دیو کو دیکھتے ہی کہا۔
”داس دیو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کا کیریر پتہ نہ کرو
کسی ماں پر کچھ زندہ اچھا لو۔ کیا تمہاری کوئی ماں نہیں ہے؟“
”مفتول باتیں نہ کرو میرا! میری ماں ایک آورش ناری ہے۔“
”تو پھر اس آورش ناری سے جا کر پوچھو کہ وہ تمہارے جیسے سپوت کو کسی عورت
ذات کی توہین کرنے کی اجازت دے سکتی ہے یا نہیں؟ اپنا نام کرنے اور اپنا اخبار بیچنے کے
لیے آدمی کو اتنا نہیں گرتا چاہیے۔“
داس دیو نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے پنڈت جی کو مخاطب کیا۔

”شریمان! آپ دھرم کی بات کریں۔ ایک لے پالک بچہ جو اپنے ماں باپ سے محروم
ہو چکا ہے اس بچے کو اس کی اصلی ماں تک پہنچانا کیا ہمارا کرتو (فرض) نہیں ہے؟“
”ہاں بیٹے!“ پنڈت جی نے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ تمہارے جیسے نوجوان اپنے کرتو کو
سمجھتے ہیں لیکن تم اس آشرم کے دستور کو نہیں جانتے۔ یہاں جو بچے آتے ہیں ان کی ماؤں
کے نام کسی کماتے میں لکھ کر نہیں رکھے جاتے کیونکہ ایسی ماؤں سے اولاد کا رشتہ بیشک
لیے ٹوٹ جاتا ہے اور جو چیز ٹوٹ جاتی ہے اسے مصلحتاً کر نہیں رکھا جاتا۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ داس دیو نے کہا ”ہم آپ جب دفتر کھول کر بیٹھے ہیں تو چھوٹی
سے چھوٹی چیز کا حساب رکھتے ہیں پھر یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ ماں اور بچے کا حسب
یہاں نہیں رکھا جاتا ہے۔“

”میرے بیٹے ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ایک عمر چاہیے اس دنیا میں چھوٹی سے چھوٹی
اور بڑی سے بڑی چیزوں کی گنتی ہو جاتی ہے مگر آدمی اپنے لہو کی بوند کا حساب نہیں رکھتا۔
ایسے ہی لہو کے چھیننے اس آشرم میں آتے ہیں۔ اگر مرد اپنے باپ (گناہ) سے انکار نہ
کرے تو کوئی عورت اپنے بچے کو میاں نہ لائے۔ اب اگر میں بولتا جاؤں تو بات بہت دور
تک جائے گی۔“

”آپ مجھے ٹانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔“

”بیٹے جو صحیح تھا وہ میں نے کہہ دیا۔“

”میں شریمان! میں بچہ نہیں ہوں کہ بھل جاؤں۔ میرا نے عورت ذات کی لالچ

”تو نے گاگر توڑ دی“ پانی گراوا۔ ساڑھی بھگوا دی۔ مجھے ستا کے تجھے کیا ملا؟“
 نوجوان نے مسکرا کر کہا ”کرشن کشیا بھی اپنی راوہا کو اسی طرح ستایا کرتے تھے۔“
 ”مگر میں راوہا نہیں ہوں۔ میرا نام یثودھا ہے۔“
 ”کسی ماں کا نام یثودھا ہو تو اچھا لگتا ہے۔ تیری جیسی جوان چنچل اور ایللی ناز مرف
 راوہا کے روپ میں اچھی لگتی ہے۔“

یہ بات یثودھا کے من میں بیٹھ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ دنیا کی جوان آنکھوں
 میں سامنے کے لیے جوان ہو گئی ہے۔ اس رات وہ دیر تک بستر پر کدوئیں بدلتی رہی۔ اس
 نوجوان کی نگاہوں کی گری کبھی اس کا یہ پلو اور کبھی وہ پلو جلاتی رہی۔ دوسرے دن
 پگھٹ پر نوجوان نے کہا۔

”میرا نام مری دھر ہے۔ آج رات جب چاند ڈوب جائے گا تو میں تیرے مکان کے
 پچھواڑے کھلیان میں انتظار کروں گا۔“
 اس کی ہر بات انگارے کی طرح چور جہڑیوں کو جھولتی تھی۔ رات آئی تو وہ اپنے
 جذبات سے لڑنے لگی کہ کھلیان میں نہیں جائے گی۔ یہ بری بات ہے۔ واقعی یہ بات ہی
 ہوتی ہیں۔ کوئی بھی سیدی سادی شرمیلی سی لڑکی خود کبھی بے شرمی کی طرف نہیں جاتی۔
 جوانی کا مقناطیس جبراً اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اس کنواری نے سوچا۔

راوہا بھی شیاں سانورے سے لٹنے جاتی تھی۔ اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو بھگوان
 خود کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کی مرلی کی تان سمجھاتی ہے کہ پریم بھاؤ تاسے کوئی نہیں بچ سکتا۔
 پریم ایسی فشتی ہے جو راوہا کرشن کے روپ میں پونجی جاتی ہے۔“

جب چاند ڈوب گیا تو کھلیان میں یثودھا کا حسن ظہور ہو گیا۔ دنیا کے تمام ماں باپ
 اپنی جوان بیٹیوں کے آگے کھنکھناتے ہیں کہ بیٹیاں اس حیا اور حفاظت کی لکیر سے
 باہر قدم نہ نکالیں لیکن پریم فشتی اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس سے یثودھا نے یہ نہیں
 سوچا کہ پریم اور باپ کے بیچ ناخن برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ بھاؤ تاس میں ڈوب کر یہ فاصلہ کیسے ختم
 ہو جاتا ہے یہ پتا نہیں چلتا۔ پھر بھی وہ بڑی سہمی ہوئی تھی۔ مری دھرنے فاصلے کو پانا پڑا

کتر گئی۔
 ”میں مرلی! اگر تم بیاہ سے پہلے مجھے ہاتھ بھی لگاؤ گے تو میں اپنی نظروں سے مگر جاؤں

میرے من میں سامنے ہو اس لیے چلی آئی۔ میرے اس طرح آنے کی لاج رکھ
 مری دھرنے سمجھ لیا کہ دال نہیں گلے گی۔ اس نے پوچھا۔
 ”ہم کس طرح ایک ہوں گے۔ تیرا باپ اونچی ذات کا برہمن ہے اور میں ذات کا
 لڑکی ہوں۔ ہماری شادی نہیں ہو سکے گی کیا میں سارا جیون تجھے دکھتا اور ترستار ہوں
 اس نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے
 آنکھوں میں وہ انگارے کر سکی ہوئے ہوئے کانپنے لگی۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ کوئی
 بڑے تو عورت ساری کی ساری پکڑ میں آجاتی ہے۔ مری دھرنے اس کے نازک سے
 لپکے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔
 ”جون دو کہ مجھ سے شادی کر دو گی۔ ہم مندر میں جا کر بھگوان کے سامنے ایک
 اہن گے۔ پھر ہمارے بیچ ذات پات کی کوئی دیوار نہ ہو گی۔“
 ”میں سوچ کر ہٹاؤں گی۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔
 وہ دونوں شش و پنج میں مبتلا رہی۔ بوڑھے ماما پتا کی بدنامی سے ڈرتی رہی لیکن
 ن کے ترازو میں بوجھنے کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ جوانی کا پلڑا ہیوشہ بھاری پڑتا ہے۔
 بے دان وہ پوجا کے لیے مندر گئی وہاں لگن منڈپ نہیں تھا۔ اس نے ہونے والے پتی
 ماتھ سات پھیرے نہیں لگائے صرف بھگوان کو شاکستمان کر مری دھر کو اپنا پتی مان
 اس کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ مری دھر کے ساتھ کتنی مضبوط زنجیر میں بندھ گئی ہے۔
 اسے پتی سمجھ کر اس کی آنکھیں کپکپا کرنا اس کا دھرم ہو گیا تھا۔ ایک رات مری دھرنے
 ہم کب تک چوری چوری کھلیان میں لٹتے رہیں گے۔ میری بات مانو یہاں سے بسینی
 بلہ میں پورا بھینجی گھوم آیا ہوں۔ تم اتنی سندر ہو کہ فلم کمپنی میں تمہیں کام مل جائے
 یہاں ہنسی کی حوا میں تم نے راوہا کا جو سوانگ رچایا تھا اسے دیکھ کر میں دعوے سے
 کہہ دوں کہ تم کامیاب ہیروئن بن جاؤ گی۔ پھر ہمارے پاس اتنی دولت ہو گی کہ تم اس

کا صاحب نہیں کر سکو گی۔“

وہ ہر رات اسے سنانے پہنے دکھانے لگا۔ کچھ سہنوں کی رنگینیاں تھیں اور کچھ اپنے پتی کا حکم تھا کہ بہن چلے۔ یہاں رہے گی تو ماں باپ زبردستی دوسری جگہ شادی کر دیں گے لہذا وہ ملی دھر کے ساتھ بہن پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے حد حسین تھی۔ چہرے کے نقوش ایسے حنیفے اور ایسے جاذب نظر تھے کہ نظریں جذب ہو کر رہ جاتی تھیں۔ پر بھات پر ڈو کشنز کے مالک پنالال نے اسے دیکھا تو منہ سے رال نکھ گئی۔ وہ ملی دھر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر ملی دھر نے واپس آکر خوش خبری سنائی۔

یہودھا! تم بہت لکھی ہو سیٹھ پنالال تمہیں اپنی فلم میں ہیروئن کا رول دے رہے ہیں۔ اب تم ایک بہت خوب صورت کوشی میں رہو گی۔ تمہارے پاس کار ہو گی، نوکر ہوں گے پنالال کی پانچ فلموں میں کام کرنے تک تمہیں براہ میں ہزار روپے ملیں گے۔“

یہودھا حیرانی سے سختی رہی کہ سنے کس طرح جج ہو رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر ملی دھر کے ساتھ اپنی کوشی میں آئی۔ اس کوشی کا ایک کمرہ فلم کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی بے پنالال بھی صبح سے رات گئے تک وہاں رہتا تھا اور یہودھا سے فلمی رول کی سیرسل کراتا تھا۔ سیرسل کے دوران ملی دھر باہر چلا جاتا تھا کیونکہ پنالال کا اعتراض تھا کہ وہ اپنے پتی کے سامنے بے محنتی اور شرابی ہے۔

پنالال اسے سمجھانے لگا کہ اگر وہ تنہائی میں شرابے گی تو کیرے کے سامنے کام نہیں کر سکے گی۔ مگر شرم تو ایک فطری جذبہ ہے وہ بعض اوقات جھلا کر سوچتی کہ ایسا کام نہیں کرے گی لیکن پانچ سال کا ایگر منٹ ہو چکا تھا۔ ملی دھر نے کہا۔

”تم کام چھوڑ دو گی تو پنالال کا لاکھوں روپے کا نقصان ہو گا وہ تمہیں جیل تک پہنچا دے گا۔ ذرا عقل سے کام لو۔ جیل میں جانے کے بدلے عزت اور شہرت حاصل کر لو۔“

پانچ سال کے ایگر منٹ نے اسے مجبور کر دیا تھا اور مجبوری کے وقت عقل سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے وہ ملی دھر کی عقل کے مطابق کام کرنے لگی۔ ایک ماہ بعد فلم کے ایک ایسے سین کا سیرسل تھا جس میں دین ہیروئن کو دھوکے سے شراب پڑا کر اس کی

ناوٹ لیتا ہے۔ پنالال نے اسے سمجھایا کہ اب اسے ایک گلاس میں شربت پلایا جائے اور وہ پینے کے بعد ایسی ایکٹنگ کرے گی جیسے جج شراب پی لی ہو۔ یہودھا نے

”ہم ایک شرابی عورت کی ایکٹنگ کیسے کروں گی۔ میں کیا جانوں کہ شراب پی کر کیسا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ پنالال نے کہا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ تم سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔ پتہ تو معلوم ہی چیز ہے تم زہری کر بھی مرنے کی کامیاب اداکاری دکھا سکو گی۔ چلو اب اگلاس کی شراب کو ایک سانس میں پی جاؤ۔“

یہودھا نے گلاس کو اٹھایا۔ مگر چند ٹھونٹ پینے کے بعد اسے ابکائی سی آنے لگی۔ مطلق پنالال نے ذرا جلدی سے کہا۔

”شہرت کو میں نے جان بوجھ کر ذرا کڑوا رکھا ہے تاکہ تم خود کو جج شراب پیتی ہوئی نہ کہو۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ایک سانس میں پی جاؤ۔“

شراب ہوا زہر، پہلی بار پیتے وقت ایک سانس کی مدت بھی بہت ہوتی ہے۔ دوسری بار میں گلاس خالی ہو گیا مگر سر میں آندھیاں سا گئیں۔ ساری دنیا اس کے چاروں طرف اٹنے لگی۔ اس وقت جو کچھ اس پر گزر رہی تھی اسے وہ فلم کا سین سمجھ رہی تھی کیونکہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فلموں میں دہرایا جاتا ہے اور فلموں کے ذریعہ جو کچھ سکھایا جاتا ہے اس میں اس کی سچی سیرسل ہوتی ہے۔

بے ہوش آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ شام ملی دھر آیا تو وہ ہاتھوں سے لپٹ کر روتے ہوئے صاف صاف کہنے لگی۔

”اب میں آپ کے قابل نہیں رہی۔ جس پنالال کو تم دیوتا کہتے تھے اس نے دیوی بن گئی۔ میں اس سے آپ سے مارے شرم کے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔“

ملی دھر نے اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

”میری جان! اتنی ذرا سی بات پر رو رہی ہو۔ پہلے ہی چانس میں پانچ فلموں کی ہیروئن بننے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے۔“

عجب میں محنت کرتی ہوں، میں کماتی ہوں، میں اپنی پرورش آپ کرتی ہوں، سب کچھ کرنا کرتی ہوں تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ میں ایک کتے کو پال سکتی ہوں، تمہیں نہیں پال سکتی۔ سیٹھ پنالال اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہوں تو اس بے غیرت کو ابھی یہاں سے لے دو۔“

یثودھا کے اس حکم کے بعد مرلی دھردودھ کی مکھی بن گیا۔ پنالال کے آدمیوں نے بچل سے بچل کر کوٹھی کے باہر پیچنگ دیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد فلم کی پبلیٹی شروع ہوئی۔ پنالال نے کہا۔

”یثودھا جیسا نام بہت پرانا ہے تمہارا کوئی ماڈرن قسم کا نام ہونا چاہیے۔“

یثودھا نے کہا۔
 ”ہاں یثودھا بہت ہی پوتر (مقدس) نام ہے۔ میرے ماما پتا اس نام کے سائے میں لڑا بک شریف لڑکی بنانا چاہتے تھے۔ آہ میرے بھانجے (نسیب) میں یہ دن لکھے تھے، چلو لڑکی بد معاش قسم کا نام رکھ دو۔“

پنالال نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”جب تم زہریلی باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ اب تمہاری اداکاری میں گمراہ رنگ آئے گا۔ پنالال بے تمہارا نام رانی ہونا چاہیے۔ تم فلم دیکھنے والوں کے دلوں پر راج کر دگی۔“
 ”صرف رانی نہیں، میرے اپنے نام کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اپنے آپ کو یاد رکھ سکوں۔ یثورانی کیسا نام ہو گا۔“

”بہت خوب صورت، بس توجہ سے تمہارا نام یہی ہے۔“
 یثورانی اپنے نام کے ساتھ ساتھ بدل گئی۔ دو ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ آٹھ ماہ بعد فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوئی تو دس کے کوٹے کوٹے میں یثورانی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ فلم کوڑی پتی فلم ساز اس کے دروازے پر آنے لگے لیکن وہ پانچ سال تک پنالال کی فریادیں سن رہا تھا۔ اب اسے ہر ماہ ایک لاکھ روپے دے رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ دوسری فلم بنائے گی اس سے شادی کر لے گا۔ اگرچہ اب پنالال سے بھی زیادہ دولت مند لوگ شادی کی تمنا کرتے تھے لیکن یثورانی نے سوچا کہ جو اس کی عزت تک پہنچ چکا ہے ایک سوئی ہو کر رہے تو بہتر ہے اس لیے وہ دوسری فلم کے ریلیز ہونے تک پھر ایک

یثودھا نے چونک کر سر اٹھایا پھر حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مرلی دھریہ بات سنتے ہی غیرت کے جوش میں پنالال کو قتل کر دے گا یا پھر اپنی دھرم پتی کا ہاتھ تمام کر ساری دولت اور جموٹی عزت و شہرت کو ٹھوکریں مار کر اسے گاؤں واپس لے جائے گا لیکن اپنے پتی کی بے غیرتی دیکھ کر جیسے ایک جھٹکے سے اسے عقل آگئی کہ وہ اس کا پتی کب تھا؟ لیکن کہاں ہوا تھا؟ اس بھگو ان کے سامنے جو پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اگر اس پتھر کے سینے میں دل ہوتا تو وہ اسے ٹھوکریں کھانے سے پہلے ہی بچا لیا۔ مگر یہ بے غیرتی اوپر سے نیچے تک ہے۔ بھگو ان نے بڑی خاموشی سے اسے مرلی دھریہ کی بے غیرت جموٹی میں ڈالا۔ مرلی دھریہ نے اسی طرح پنالال کی گود میں اسے ڈال دیا۔ ایسے وقت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ بھگو ان اور انسان دونوں کا عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟

اس روز وہ مرلی دھریہ سے کچھ نہ بولی۔ من ہی من میں کڑھتی رہی۔ دوسرے دن پنالال آیا تو وہ بولی۔

”سیٹھ صاحب! ایک منٹ کس سے ہوا ہے؟“

”تم سے۔۔۔۔۔“

”آپ ہر ماہ بیس ہزار روپے کس کے ہاتھ میں رکھیں گے؟“

”تمہارے ہاتھ میں۔۔۔۔۔“

”یہ کوٹھی اور کار کس کی ہے؟“

”تمہاری ہے میری جان!“

”جب میں تمہاری جان ہوں تو یہ دلال اس کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟ اسے دیکھ کر نکال دو۔“

یثودھا نے نفرت سے مرلی دھریہ کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”یثودھا یہ کیا ہو اس کر رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو کہ تم نے اپنے پتی کا اپنا (توہین) کیا ہے؟“

”میں ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ تم میرے پتی کب تھے؟ اور تم کیا جانو کہ پتی کا کر ڈیا ہوتا ہے؟ ارے بے شرم! مردودہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑتا ہے اور دوسرا اٹھا کر اس کے لیے ساری دنیا سے لٹاتا ہے۔ مگر تم دلال ہو دلال! انکل جاؤ میرے گھر

”بابا مطلب؟“ شیکھر نے چونک کر پوچھا۔

”کیا تم اسے اس جرم کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی
ابرنیڑی کی گیند بن ہے۔“
”شیکھر! میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا آخری فیصلہ سناؤ۔ میری دو شرطیں
کرتے ہو یا نہیں؟“

”میں یثورانی سے سچی محبت کرتا ہوں۔ اس سے ہر حال میں شادی کروں گا۔“
”بڑے عزم سے یثورانی کے پاس چلا گیا۔ پنلال اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔
انبال تھا کہ ڈوبنے والے کو نکلنے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ یثورانی کو بھی فوری طور پر
بچے کے لیے ایک باپ کی ضرورت ہے لہذا وہ شیکھر کو قبول کر لے گی لیکن رات کے
بے ملازم نے آکر اطلاع دی کہ یثورانی ملنے آئی ہے۔
پنلال نے کہا۔

”ہاں کہہ دو سیٹھ صاحب گھر میں نہیں ہیں کل انک ملاقات کرے۔“
”لازم چلا گیا۔ پنلال ڈر گیا تھا کہ وہ ہنگامہ کرنے آئی تھی اور آسانی سے اس کا پیچھا
پوڑے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے بھیجی چھوڑ دے گا۔ جب وہ بار
رہنکمر سے شادی کر لے گی تو پھر واپس آجائے گا۔ ملازم نے واپس آکر بتایا کہ یثورانی
ابن ملتی گئی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

”ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے گیا تو وہ بلا وہاں موجود تھی۔ پنا
نکبرا کر پوچھا۔
”تم کہاں گئیے آگئیں۔“

”اب اس بیڈ روم میں میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔“
”ٹیک ہے، ٹھیک ہے آرام سے بیٹھو۔“
”میں بیٹھے نہیں، ہمارے تمہارے پچھلے گناہوں کا حساب کرنے آئی ہوں۔ ہوس
اٹا کیا تم اس دن کے لیے مجھے محبت کا فریب دے رہے تھے۔ تم لوگ اتنی بے شری
دہی مویہ کیے کلاتے ہو؟ مری دھرنے مجھے تمہارے حوالے کیا اور اب تم مجھے شیکھر
بلے کر رہے ہو۔ کیا اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہو۔“

ازدواجی اور گھریلو زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔

دوسری فلم ریلیز ہوئی مگر کاس آف پر کامیاب نہ ہوئی۔ ایسے ہی وقت یثورانی کو ہا
چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے فون پر پنلال کو اطلاع دی کہ فوراً ہی شادی کروورن
ہمارا بچہ ناجائز کھلائے گا۔ پنلال فلم کی ناکامی کے باعث سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اس نے
جھلا کر جواب دیا۔

”میرے ایک کروڑ روپے ڈوب رہے ہیں اور تمہیں شادی اور رنگ ریلوں کی سوج
رہی ہے، ابھی میرے ساتھ بکواس نہ کرو۔“
یثورانی نے غصہ سے کہا۔

”تم بکواس نہ کرو۔ جب میں ڈوب رہی ہوں تو تمہارے ڈوبنے کی پروا نہیں کروں
گی۔ ہمارے ہونے والے بچے کو بدنامی سے بچاؤ۔ نہیں تو میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں
گی۔“

پنلال نرم پڑ گیا۔ کیونکہ یثورانی اب پہلے جیسی کمزور اور بے سارا عورت نہیں
تھی۔ کتنے ہی دولت مند ہاتھ اسے سہارا دینے کے لیے تیار تھے۔ ایک مشہور فلمی ہیرو
چندر شیکھر اس سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ پنلال نے شیکھر سے ملاقات کی اور اس سے
پوچھا۔

”میں یثورانی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے اپناؤ گے؟“
شیکھر نے ایک دم سے خوش ہو کر کہا۔

”میں دل و جان سے اسے اپناؤں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی حسین عورت کو
میری خاطر چھوڑ دو گے۔“

”یقین کرو۔ میری دو شرطیں مان کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ
تمہیں کل ہی یثورانی سے بیاہ کرنا ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم میری اگلی فلم میں کام
کرنے کا معاوضہ نہیں لو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”تو پھر جاؤ اور یثورانی کو یہ خوش خبری خود ہی سناؤ کہ تم اس سے بیاہ کر اس کے ہونے
والے بچے کے باپ بن جاؤ گے۔“

اتنی احتیاط کے باوجود سری صبح پولیس اس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ قانون کے اہل
اسے حوالات میں لے گئے۔ پھر حوالات سے کبھری اور کبھری سے جیل میں لے گئے
مقدمہ چلنے کے دوران بڑے بڑے فلم ساز اسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتے رہے
تیکمر اکثر اس سے ملنے آتا تھا اور اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ پٹالال کے ملازم کی گواہی۔

بہن سے مکر گیا ہے۔“

”ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے مگر کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”جتنی بات یہ ہے کہ بانوکہ ایک پانچ برس کا بچہ زندہ بچ گیا ہے اور بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھپا ہوا ہے۔“

بانوکہ دل دھک سے رہ گیا۔ پانچ برس کی گنتی کے ساتھ ہی اپنے بچے کی جدائی تریانے لیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو دیکھا۔ پہلے صفحہ پر جانی کی تصویر تھی بڑی ہی بے مروتی دل میں اتر جانے والی تصویر تھی۔ بانو نے سوچا ”میرا بچہ بھی اتنا ہی بڑا ہو گا اور ایسا مصوم اور خوب صورت ہو گا۔“

سرتاج حسین نے کہا ”ذرا اگر مگر مچ جائے پلاوہ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ پہاڑی کے پاس میں میری ڈیوٹی ہے۔ میرا خیال ہے بچے کو اتنی بلندی سے نیچے لانے تک ساری رات گزار جائے گی۔ ساری رات جاگنا ہو گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ریڈیو کا سوچ آن کر دیا۔ موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا وہ چائے پینے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ اگر وہ اپنے ساتھ اخبار لے جاتی تو چائے تیار ہونے کے دوران وہ دھماکہ خیز معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن اخبار کی صرف ایک تصویر نے اسے ذرا مٹی میں پھنسا دیا تھا۔

جب وہ ایک ٹرے پر چائے سے بھری ہوئی دو پیالیاں رکھ کر اپنے سرتاج کے پاس بنے لگی تو موسیقی کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی پھر اچانک ہی وہ آواز ٹھم گئی اور لمبی مرولی آواز سنائی دینے لگی۔

”یہ آواز ایسا ریڈیو کی آواز نہیں ہے۔ چند منٹ کے لئے موسیقی کا پروگرام روک کر بلی کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔ سامعین! وہ بد نصیب جانی جو اپنے بواں باپ کے قریب زندہ ہے، دراصل ایک لے پالک بچہ ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی تصدیق پیدائش۔۔۔۔۔“

بانو ایک دم سے ٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پندرہ ستمبر کی تاریخ سن کر اس کے ہاتھوں میں ہائے کی ٹرے کانپ رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز نے کہا۔

پندرہ ستمبر کی صبح طیارے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ریڈیو کے ذریعے یہ خبر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ایک مظلوم اور دہشت زدہ بچے کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ کوئی دل ایسا نہیں تھا جو بچے کی سلامتی کے لئے دعا نہیں نہ مانگ رہا ہو۔ ملک کے کونے کونے سے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کو فون کر کے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس بچے کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر شری جائے لہذا ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعہ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بچے کے سلسلے میں جیسے جیسے خبریں موصول ہوتی رہیں گی، انہیں عوام تک پہنچایا جاتا رہے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ مر چکا ہو گا، کچھ لوگ یہ سوچ کر کانپ جاتے تھے کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ناسمجھ بچہ دوپہر کی دھوپ اور رات کی سردی کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ وہ حادثہ سے بچنے کے بعد رات کی تاریکی میں دہشت سے مر جائے گا۔ وہ ہر کو ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ جیلی کا پڑے جانی کے لئے کھانے کا سامان اور کبل وغیرہ پیکنگ جا رہے ہیں۔

آدھ گھنٹے کے بعد پھر یہ خبر سنائی گئی کہ پولیس اسٹاکاؤٹ اور فوجی فوجوں اس پہاڑی کے واسن میں کیمپ لگا رہے ہیں۔ ریڈیو، محکمہ اطلاعات اور اخبارات کے رپورٹروں کو ڈو گرافٹری وہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوری طور پر بجلی پھینکی جا رہی ہے تاکہ رات کے وقت دور تک اس پہاڑی کو روشن رکھا جاسکے۔ اس کے باوجود وہ بجلی کی روشنی جانی کی بلندی تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ساری خلقت نے حادثے کی یہ خبر سن لی تھی۔ صرف ایک بانو اس خبر سے بے خبر تھی۔ وہ صبح سے کچھ نہ معلوم سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ریڈیو آن کر کے کوئی گیلن بھرا پروگرام سننے کو دل نہیں چاہا۔ اس لئے گھر کا ریڈیو خاموش پڑا رہا۔ شام کو پانچ بجے سرتاج حسین فوجی جیب میں بیٹھ کر آیا تو اس کے ہاتھوں میں شام کا اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”آج ریڈیو سنا تھا؟“

”نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”آج کی خبریں سن کر تمام انسانوں کے دل میں درد اٹھ رہا ہے۔ ایک طیارہ پہاڑی

اور اسی قریب کو برداشت نہ کرے اور اسے طلاق دے دے۔

اب اسے پرکھنی تھی۔ ایک طرف سرتاج کی رفاقت تھی، عزت آبرو اور خوشگوار زندگی تھی۔ دوسری طرف پانچ برس سے بچھڑے ہوئے لاپتہ بچے کا پیار اپنا پتا رہا۔ اب وہ اپنے دامن میں طلاق نامہ اور بدنامیاں لے کر اپنی مستکی تسکین کر سکتی تھی۔ اپنے ذرا سی دیر میں فیصلہ کر لیا کہ سرتاج کو سیکڑوں بیویاں مل سکتی ہیں مگر ایک ماں نے اپنی خود بچہ پھر نہ مل سکے گا۔

سرتاج سمجھ رہا تھا کہ بانو کو کسی قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس نے تسلی دینے کے لیے بچے سے لگایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی پھر رو رو کر کہنے لگی۔
”آپ مجھے سینے سے نہ لگائیں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا۔“
”کیا دھوکا؟“

”میں تم کی بیوی بننے سے پہلے۔ اے۔ ایک مطلقہ عورت تھی۔ یہ حقیقت میں ہے چھپاتی رہی، اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں۔“
”ہوئے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید طنز یہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ شاید انوکھ حیات کی بے حیائی پر ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”میں سپاہی ہوں اور سپاہی کسی علاقہ کو فتح کرنے سے پہلے اس کے جنرل یا فائ حالات پر واقف ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں اپنی منکوحہ بنانے سے پہلے معلومات حاصل کی تھیں۔ پتا چلا کہ تم ماں بنی پہلے۔ بلیانی کوڑی میں رہتی تھیں۔ وہاں جا کر مسلمانوں کے محلے پر چلا کہ آصف نام کے کسی شرابی جواری سے تمہاری شادی ہوئی تھی، وہ تمہارا گھر نہ کر اور تمہیں طلاق دے کر چلا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ اب بتاؤ وہ بچہ پیدا کنس سے پہلے ضائع کر دیا گیا یا۔“

”نہیں، نہیں وہ زندہ ہے۔“ وہ قدموں سے لپٹ کر روتی چیختی ہوئی بولی ”آپ مجھے مار لیں گے میرے بچے کو پہاڑ کی اس خطرناک بلندی سے زندہ سلامت اتار کر لے آئیں۔“
سرتاج نے حیران ہو کر قدموں سے لپٹی ہوئی بانو کو دیکھا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہو گیا کہ بچہ پہاڑ کی بلندی پر ہے، اس کی ماں قدموں کی پستی پر بلک بلک کر رو رہی ہے اور

”اب ایک مقامی اخبار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سورگ باسی ہمیش چند پٹری اور ان کی دھرم چٹی نے اس بچے کو بلیانی کوڑی کے بانک آشرم سے حاصل کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اصل ماں۔“
ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ حالانکہ چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔ سرتاج ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
”کیا ہوا بانو؟“

کیا ہوا؟ بانو کیسے بتائے کہ کیا نہیں ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ اس کے سینے پر لٹا نہیں رہا تھا۔ ”ای، ای، ائی! بلیانی جان نے مجھے بلیانی کوڑی کے بانک آشرم میں چھوڑا تھا۔“
وہ بچہ بانو کے دل کو اپنی ننھی ننھیوں میں مسل رہا تھا ”ای، ای، ای! آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھیے تقدیر نے بھی مجھے کہاں لے جا کر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ایسی بلندی نہیں چاہئے، مجھے اپنی گود میں اتار لیں ای۔“

بانو نے متنا سے بے قابو ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے کے اطراف یوں بھینچ لئے جیسے بچے کو نامعلوم بلندی سے اتار کر سینے سے لگا رہی ہو۔ ایسے وقت وہ بھول گئی تھی کہ اس کا سرتاج اس کے سامنے موجود ہے۔ یوں تو اس پاس کی اور بھی بہت ساری دنیا آباد تھی مگر اسے اپنے بچے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس بچے کو اس نے جنم دیا تھا اور جس کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی، اب اس بچے کے تصور کو جانی کی تصویر سے قائم کر رہی تھی۔

پھر وہ چونک گئی۔ سرتاج اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا ”بانو کچھ تو کہو یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ وہ صرف ایک بچے والی نہیں، ایک شوہر والی بھی ہے اور اپنے شوہر سے اس گناہ بچے کا وجود چھپاتی آئی ہے۔ اب وہ کس طرح چھپا سکتی ہے؟ اگر اب بھی اپنی زبان بند رکھے گی تو بچے کے پاس کبھی نہیں پہنچ سکے گی اور اگر زبان کھولے گی تو سرتاج کے دل کو نہیں پہنچے گی۔ وہ اب تک اسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ اپنی محبوب بیوی کا جھوٹ اور قریب سامنے آئے گا تو جنون کی حد تک محبت کرنے والے شوہر کا رد عمل کیا ہو گا؟ ہو سکتا

میرا جب پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو وہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہزاروں آنکھیں پہاڑی کی بلندی کی طرف اس عمودی چٹان پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ بچہ نظر نہیں آسکتا تھا مگر ہزاروں دلوں میں ایک ہی مشترکہ حسرت تھی کہ وہ بچی بہت نظر آجائے۔ اتنے بڑے ہجوم کو روکنے کے لئے دور تک موٹے موٹے رے بانڈھ کر حد بندی کر دی گئی تھی۔ حد بندی کے اندر فوجی نو جوان کہہ پاؤں کی مدد کر رہے تھے۔ پہاڑ چڑھنے

”دک کیوں گئے؟ کیا فونی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکہ کر دیا ہے؟“
 داس دیو آنکھیں سکیڑ کر دوڑ جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔
 ”نجب ہے۔ یہ تو حملے سے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی

ہو رہی ہے؟ مگر نہیں جب تک یہ راز رہے بہتر ہے۔“
 اس ماں کے داغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہئے
 اگر وہ زندہ سلامت واپس آئے گا تو وہ کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں
 کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی۔
 اس کے سوچنے کے دوران داس دیو نے اچانک کہا۔
 ”آگئی جس کا انتظار تھا، وہ آگئی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں
 ہے۔“

میرا نے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی رے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا شلوار
 کرنا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانہ سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا۔ چہرے
 سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جھننی انداز میں چمکی ہوئی
 تھیں جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دلیز پر اکر پکار رہی ہوں ”میرے فعل رات
 ہو چکی ہے واپس آ جاؤ، میں دروازہ بند کر دوں گی۔“
 داس دیو نے کہا ”اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ یہ بچے کی ماں ہے۔ میں
 ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرنا ہوں۔ کل کا اخبار بھی ہاتھوں ہاتھ لے گا۔“
 بانو رے کے پاس آئی اور ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔ ایک
 پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

”شریستی جی! اندر آنا منع ہے۔ آپ باہر چلی جائیں۔“
 بانو نے ہانپتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ، میں کیپٹن سرناج
 حسین کی بیوی ہوں۔“
 آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ داس دیو بھی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میرا
 نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”دک کیوں گئے؟ کیا فونی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکہ کر دیا ہے؟“
 داس دیو آنکھیں سکیڑ کر دوڑ جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔
 ”نجب ہے۔ یہ تو حملے سے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی
 ہو رہی ہے؟ مگر نہیں جب تک یہ راز رہے بہتر ہے۔“
 اس ماں کے داغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہئے
 اگر وہ زندہ سلامت واپس آئے گا تو وہ کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں
 کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی۔
 اس کے سوچنے کے دوران داس دیو نے اچانک کہا۔
 ”آگئی جس کا انتظار تھا، وہ آگئی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں
 ہے۔“
 میرا نے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی رے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا شلوار
 کرنا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانہ سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا۔ چہرے
 سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جھننی انداز میں چمکی ہوئی
 تھیں جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دلیز پر اکر پکار رہی ہوں ”میرے فعل رات
 ہو چکی ہے واپس آ جاؤ، میں دروازہ بند کر دوں گی۔“
 داس دیو نے کہا ”اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ یہ بچے کی ماں ہے۔ میں
 ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرنا ہوں۔ کل کا اخبار بھی ہاتھوں ہاتھ لے گا۔“
 بانو رے کے پاس آئی اور ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔ ایک
 پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔
 ”شریستی جی! اندر آنا منع ہے۔ آپ باہر چلی جائیں۔“
 بانو نے ہانپتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ، میں کیپٹن سرناج
 حسین کی بیوی ہوں۔“
 آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ داس دیو بھی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میرا
 نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

انگی رکھ دی تھی مگر وہ بھی باز آنے والی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دو بیالی چائے کے پیسے لگا کر تے ہوئے بولی۔

”یہ میری اور میرے اس بیٹے کی چائے کے پیسے ہیں۔“

پھر وہ اس دیو کی طرف پلٹ کر بولی۔

”میں کسی اخبار میں شائع نہیں کروں گی کہ تم میرے ناجائز بیٹے ہو۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہوٹل کے باہر چلی گئی۔ اس دیو چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ پھر اس نے غصہ سے میرا کی جانب دیکھا لیکن غصہ نہ دکھاسکا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بڑی سی دیکھن کار ہوٹل کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک بہت مشہور بیرو ٹیکسٹر باہر آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے سے اس مجمع کی تیسری عورت باہر آ رہی تھی۔

وہ سیاہ بارڈر کی سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ بلاؤز سے ابلے بدن کی چھائی پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے پر چند نلکا کاٹھا۔ ریشمی جوڑے کے پس منظر میں اس کا حسین چہرہ بچھا بچھا سا تھا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں پہاڑ کی تاریک چوٹی سے جا لگی تھیں۔ وہ آنکھیں اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہی تھیں۔

”میرے کرشن، میرے نند لال، میرے ماگھن چور تیری یثودھا مایا آگئی ہے۔ ایک عیاش نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں ماں بیٹے کے رشتے میں پرو کر وہ سماج کو اور دھرم کو کتنی بڑی گالی دے رہا ہے۔ یہ تو صرف ماں کا خوصہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی گالی کو بڑے پیار سے دودھ پلاتی ہے۔ نیچے اتر آ میرے لال! میری گود خالی ہے۔“

اس دیو نے اسے دیکھتے ہی میرا کے قریب آ کر کہا۔

”ارے یہ تو مشہور فلم اسٹار یثودانی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ کسی قتل کے کیس میں سزا کاٹ رہی تھی۔ اتنی مصروف اداکارہ ایک بچے کو دیکھنے میں آئی ہے یقین نہیں آتا کہ یہ بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا یثودانی کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”میڈم! میں ایوننگ نیوز کا رپورٹر ہوں۔ آپ نے آج شام کے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ وہ بچہ لے پانگ ہے یعنی اس کی اصل ماں اب بھی کیس زندہ ہوگی۔ مجھے یقین

ہو گا کہ وہ یہاں آئے گی۔ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔“

یثودانی چند لمحوں تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

”آپ اس کی ماں کو تلاش کر کے کیا کریت گئے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میڈم! میں اس عورت کی تصویر اور اس کا بیان شائع کر دوں گا۔“

”کسی عورت اور ایک معصوم بچے پر کچھ اور اچھا کر تم کتنے پیسے کماؤ گے؟“

”آلہ! ام میں تو سچائی۔“

وہ بات کاٹ کر بولی ”سچائی کی بات نہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایسی بہادر بڑی کس طرح ہوتی ہے۔“ پھر اس نے ٹیکسٹر سے کہا۔

”ٹیکسٹر اس رپورٹر سے پوچھو کہ اس کے اخباری دفتر اور پریس کی قیمت کیا ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ اتنے نوٹ اس کے منہ میں فونٹس کرمنٹ بند کر دو۔“

وہ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی رے کی طرف جانے لگی۔ میرا تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہانکے ساتھ ہو گئی پھر اس سے بولی۔

”یثودانی! میرا نام میرا ہے پہلے بھی ہمارا سامنا ہو چکا ہے شاید تم نے مجھے پہچانا نہ تھا۔“

وہ رک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔

”میرے اتنے پرستار ہیں کہ میں ہر ایک کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتی۔“

”میں تمہاری پرستار بن کر تمہارے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج سے پانچ برس پہلے وہ تجربہ کی صبح ہم دونوں آشرم میں موجود تھیں اور ہم دونوں ایک ہی ارادے سے وہاں آئی تھیں۔“

یثودانی نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”ابھی میں سمجھ گئی۔ میں پنڈت گردھاری لال سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بچے کے تین دعویدار ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دوسری تم نظر آ رہی ہو۔ کیا یہاں

نہیں ابھی موجود ہے۔“

”ہاں یہاں ایک عورت اور ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تیری دعویدار

ہوگی۔ بہتر ہے کہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔“
”نہیں، پہلے میں اپنے بچے کی خبروں کی۔“

میرا نے تصحیح کی ”پناچہ نہیں ہمارا بچہ۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ وہ کس کا ہے اس وقت تک وہ ہم تینوں کا ہوگا۔“

یثورانی کو اس کی بات بری لگی۔ کیونکہ مستاء خود غرض ہوتی ہے اپنی گود کے بچے کو دوسری گود سے منسوب نہیں کر سکتی لیکن مستاء دوسری ماؤں کا درد بھی سمجھتی ہے۔ یثورانی کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الحال وہ تینوں کا مشترکہ بچہ ہے۔

میرا نے کہا ”صبح سے پہلے بچے کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔ کوہ پناجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے جب تک کوئی نئی اطلاع ملے ہم کہیں ترائی میں چڑھ کر باتیں کریں گے۔“

یثورانی اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔
”اس بات کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟“

”یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اس وقت میں غم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ میرے ایک ہمدرد کمٹی نے مجھے اس بچے کی صورت نہیں دکھائی کہ کہیں میری متا چل نہ جائے۔ انہوں نے اسے آشرم میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس کی صورت دیکھ بھی لیتی تو کیا پناچ برس کے بعد وہ صورت سے پہچانا جاسکتا ہے؟“

”نہیں“ یثورانی نے کہا۔ میں نے اسے جنم دینے کے بعد دیکھا تھا۔ آج اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی اب وہ پہچانا نہیں جاتا پناچ برس میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔“
”کیا اس کے جسم پر کوئی واضح شناختی نشان تھا؟“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”اس بات کا میں نے خیال نہ رکھا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی یاد رکھنی چاہئے تھی مگر میں قتل کے مقدمے اور بچے کے چھڑنے کے خیال سے اس طرح دماغی پریشانی میں مبتلا رہی کہ بچے کے کسی شناختی نشان کی طرف دھیان نہ دے سکی۔“

وہ بولتے بولتے سوچنے لگی ”کاش کہ میں بچے کو آشرم میں نہ دیتی مگر وہ لوگ مجھے جین والا چکے تھے کہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ان دنوں ٹیکسٹر بھی دیس سے باہر شنگ میں

معموف تھا ورنہ میں بچے کو اس کے حوالے کر دیتی۔ اور جب وہ واپس آیا تو میری تقدیر نے مجھے میرا ساتھ دیا۔ عدالت نے یہ کہہ کر مجھے بری کر دیا کہ پنالال کے ملازم نے مجھے پنالال کے ملاقات کے بغیر واپس جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس نے مجھے اس کو نجی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی جائے واردات پر میری موجودگی کا کوئی ثبوت پایا گیا، محض شبہ کی بنا پر مجھے سزا نہیں دی جاسکتی۔

جینی سے رہا ہوتے ہی میں ٹیکسٹر کے ساتھ آشرم میں پہنچی تو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس آشرم میں کسی کے بچے کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں وہ تحریری کارروائی نہیں کرتے ہیں البتہ میرے یاد دلانے پر پنڈت جی کو یاد آگیا کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے۔“

میرا نے پوچھا ”یثورانی کیا سوچ رہی ہو؟“

”ہاں؟“ وہ چونک کر بولی ”اپنے بچے کے لئے سوچ رہی ہوں۔ جو اب ہمارا ہو گیا ہے۔“

اسی وقت ان دونوں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ باہر تاریکی میں ایک عورت سائے کی طرف نظر آ رہی تھی۔ میرا نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

”تم کیپٹن سرناج حسین کی شریک حیات ہو۔ اندر آ جاؤ۔“
بانو نے گاڑی کے اندر آ کر دروازے کو بند کیا۔ پھر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میرا نام بانو ہے۔ شاید میں اپنے بچے کی دو ماؤں سے مل رہی ہوں۔“
میرا نے اس سے بھی کہا کہ وہ اپنا بچہ نہیں ہمارا بچہ کہے۔ بانو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جو بچہ ازل سے میری کوکھ میں لکھ دیا گیا ہے، میں اسے آخری سانس تک اپنا کہوں گی۔ تم دونوں بھی اسے اپنا کہو گی تو میں اعتراض نہیں کر سکو گی۔ سیدھی سی بات ہے وہ اپنا نہ ہونا اور اپنا نہ ہونا تو ہم تینوں یہاں نہ آتیں۔“

یثورانی نے کہا ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے اپنا کہتے وقت اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنا ہی ہے مگر اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا پیدا ہو گا۔“

لے لیا۔ اپنی کتاب زندگی کھولی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ رہی تھی۔ ایک عام سی غلطی کر چکی تھی۔ اس کی داستان عام سی تھی مگر متاثرہ اپنی ذات میں اس وجہ رکھتی ہے۔ وہ بحالت مجبوری بچے کو جدا تو کر سکتی ہے لیکن اس کی محبت کو دل سے نکال کر نہیں بھیج سکتی۔ اس نے داستان کے آخر میں کہا۔

”میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ دنیا والے میرے بچے کو ناجائز کہیں اور میں اپنا کیریر بچہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے بچے کو آشرم میں چھوڑ دیا۔“

بیٹورانی نے اپنی داستان کے آخر میں کہا۔

”للم کی بیرونی کوئی اتنی نیک نام بھی نہیں ہوتی۔ میں بدنامیاں اٹھا کر بچے کو ضرور بچا کر چھائی پانے کے خیال سے میں اپنے بچے کو آشرم جیسی محفوظ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔“

بانو نے اپنی داستان حیات سننے کے بعد کہا۔

”میں مجھے بدنامی کا ڈر تھا اور نہ ہی کوئی میرے بچے پر انگلی اٹھا سکتا تھا۔ میں آخر وقت لاپرواہی سے لڑتی اور ضد کرتی رہی کہ بچہ میری گود میں پرورش پائے گا۔ لیکن مذہب اور علم کی آڑ لے کر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں نے میرے دل میں دہشت بکھاری۔ بچہ کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچا یا گیا تو ظالم اسے نیزوں پر اچھالیں گے۔“

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے گاڑی کے اندر سناٹا چھا گیا۔ بانو ان تین عورتوں کے اندر بھی تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے کے بعد بانو کسی کی گود سے بچے کو نہیں چھین سکتی تھی۔ کیونکہ پرانی گود کا ردواب اپنا ہی درد

میں بھری تھی۔ وہ تینوں آنسو پوچھتی ہوئی گاڑی سے باہر آ گئیں۔ بانو انہیں حد تک لائے اس پار لے گئی اور اپنے سر تاج سے بچے کی باقی دواؤں کا تعارف کرائے۔ سر تاج حسین نے مسکرا کر کہا۔

”میں تم تینوں کو یہ خوش خبری سناؤں کہ اجیت سنگھ سے ٹرانسیر پر گفتگو ہو چکی ہے۔ بچے کو بحفاظت لے کر آ رہا ہے۔“

مارے خوشی کے ان تینوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بانو نے سر تاج کے بازو

”ہاں سمجھوتے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”بچہ متا کے بازار میں تین ماؤں کے درمیان غلام بھی نہیں ہو سکتا۔“

”اس کے لئے لائری کی پرچی بھی نہیں اٹھائی جاسکتی۔“

”حضرت سلیمان کے دربار میں دو عورتوں نے ایک بچے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہاں اصل ماں کے ساتھ انصاف ہو گیا تھا مگر ہم تین ماؤں کا فیصلہ کسی دربار میں نہیں ہو سکتا۔“

میرا نے کہا ”خود غرضی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کے بل پر اسے حاصل کریں۔ میرے پاس قلم کی طاقت ہے، میں اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لئے دیس کے سارے اخبارات کو جھنجھوڑا دوں گی۔“

بیٹورانی نے کہا ”میں ایک قلم میں کام کرنے کا معاوضہ چالیس لاکھ روپے لیتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا بینک بیلنس اور دو کروڑ کا جائیداد ہے میں اپنے بچے کے لئے اٹھ کروڑ روپے واؤ پر لگا دوں گی اور سب جانتے ہیں کہ روپے سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔“

بانو نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر تین مستحکم سے کہا۔

”میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے اور وہ ہے خدا۔۔۔۔۔“



رات پہاڑیں مٹی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ پانچ نہیں دوپہر بانو ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کے پالنے میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ زندہ تھا یا مر رہا تھا۔ اسی تشویش میں ماؤں کی نیند مر گئی تھی۔

میرا نے ہنستے ہوئے کہا ”ہم سب پڑھی لکھی سمجھدار عورتیں ہیں۔ ہمیں جاہلوں کے انداز میں ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم سہولت سے پرسکون ہو کر سوچیں تو شاید کوئی حل نکل آئے۔“

بانو نے کہا ”میرے خیال سے ہم تینوں اپنی اپنی داستان سنائیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جب ہمارا درد مشترک ہو گا تو ہم مشترک محبت کے جذبہ سے کوئی دانش مندانہ فیصلہ کر سکیں گے۔“

وہ راضی ہو گئیں۔ پھر رات گزارنے کے لئے باری باری اپنی داستان سناتے لگیں۔

بچے کی بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے۔ کیا تم تینوں نے بچے کو بدنامی سے بچانے کے لئے انہرم میں نہیں چھوڑا تھا؟

یثورانی اور میرا نے تائید کی۔ بانو نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ بچہ میرے پاس عزت سے رہ سکتا تھا اور اب بھی اسے وہی عزت ملے گی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں اپنے بچے کو نیزے کی انی پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی لاش کے لئے اسے چھوڑ دیا تھا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو اب میں میرا اور یثورانی سے پرارتنا کرتا ہوں کہ وہ بچے کو ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ ناجائز نہ کہلائے۔ بانو کا بچہ جائز تھا بلکہ ہے۔ اس لئے اسے بانو کے ہاں رہنے دو۔ تم بھی کبھی بانو کے ہاں جا کر ایک ماں کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم بانو نے میرے اس فیصلے سے انکار کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بچے کی عزت تمہیں پاری نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر پنڈت جی باہر چلے گئے میرا اور یثورانی تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جب بانو ان کے قریب گئی تو وہ دونوں بانو کے سینے سے لگ کر رونے لگیں ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک معصوم بچے کی بدنامی کو بیشہ کے لئے دھورہ ہے تھے۔

باہر اس دبو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کہا۔

”پنڈت جی! میں سب سمجھتا ہوں کہ اس گاڑی کے اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ سچی خبر ہے اخبار میں اگر رہی رہے گی۔“

”پنڈت گردھاری لال نے قریب آکر آہستگی سے کہا۔

”میرے سچے صحافی بیٹے! ایک مسلمان عورت نے ہندو خنڈوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے آشرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ سچی خبر تم ہمارے دیکھ کے کسی اخبار میں لکھ کر سکو گے؟“

داس دیو کا لٹکا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ ایسی سچی خبریں کو اخباری زبان میں پروہ پیگنڈا کہتے

سے لگ کر کہا ”میرا بچہ!“

میرا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”میرا بچہ!“

یثورانی پہاڑ کی بندری کو لگا ہوں سے چھو کر بولی ”میرا بچہ!“

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے ”میرا اور تیرا“ کا جھگڑا چل رہا ہے مگر وہ تینوں ماں اپنے اندر لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ آپس کے جھگڑے میں بچہ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جائے گا۔

وہ سوچتی رہیں اور بچے کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ حد بندی کے باہر ہزاروں افراد بھی پہاڑ کی جانب تک رہے تھے۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد وجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ بچے کو اپنی پٹری پر باندھ کر صحیح سلامت نیچے آگیا۔ وہ تینوں بے اختیار اس کی طرف دوڑنے لگیں۔ اب بچے کو کھیل میں لپیٹ کر اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا۔ تینوں ماں اس پر جھک گئیں وہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایسا معصوم اور جاذب نظر تھا کہ ماؤں کے دل اس کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔

فنی ڈاکٹر نے کہا ”آپ سب بچے کے پاس سے ہٹ جائیں“ اسے فوری طبی امداد کے لئے اسپتال پہنچانا ہو گا پلینز۔“

وہ تینوں ایک طرف ہو گئیں۔ حد بندی کے باہر کھڑے ہوئے داس دیو نے اپنی کھوپڑی کو سلاتے ہوئے سوچا ”یہ تین کا ہندسہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کچھلی رات سے یہ تینوں ایک ساتھ نظر آ رہی ہیں۔ اب اس میں شبہ نہیں رہا کہ ان میں سے کوئی ایک اس بچے کی ماں ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان تینوں نے مل کر اس ایک بچے کو جنم دیا ہو۔“

یثورانی، میرا اور بانو کسی حتمی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے پھر اسی گاڑی کی طرف جانے لگیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر پنڈت گردھاری لال بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے وہ اصل ماں کی نشاندہی کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا۔

”اگر دروازہ بند کر لو اور مجھے بتاؤ کہ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ میرا نے کہا۔

”ہم میں سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں۔“

”بیٹی! صرف اپنی ممتا کے لئے سوچو گی تو کبھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ تم تینوں کو صرف

کلی کا کفن

لو کو!

تم اشتہامی جذلوں کو لبو کا کفن
اور پھول کے رشتوں کو خزاں کا کفن
پہناتے ہو

اب آؤ

اور اس کلی کو ہوس کا کفن پہنا دو
تمہاری تہذیب مکمل ہو جائے گی۔

لیا اس دھوکے میں رہا کہ وہ کسی دن میری بہن کا رشتہ بن گئے آئے گا مگر انہی دنوں بنگلہ دیش
 ے مہاجرین کے قافلے آئے گئے۔ ان کی مصیبتوں میں کام آنے کے لیے صاحب
 ثبت لوگ روپے پیسے کی امداد کے علاوہ لئے ہوئے خاندان کے افراد کو کہیں کام دھندے
 ے لگانے لگے اور کہیں ان کا گھر بسنے لگے۔ فیم احمد بھی ایک مہاجر لڑکی کو اپنی بہن
 بننے کے لیے برات لے کر ان کی بہن میں پہنچ گئے۔

کلی کا کفن

ہم سب کو مہاجرین سے بہت دوری ہے لہذا میں فیم احمد سے یہ نہ پوچھ سکا کہ بندہ پرورد
 نب میری بہن کی تعزیتیں کیا کرتے تھے پھر ایک خانماں برباد لڑکی کی خانہ آبادی کیوں
 کر ہے ہیں؟ ایسا پوچھتے وقت میں خود غرض کھاتا اس لیے چپ چاپ شریف احمد کو دہما
 بار اسے اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر اس لڑکی کے دروازے پر لے آیا جو میری بہن کی جگہ دہمن
 نی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم ٹیکسی والے یوں تو اپنی مرضی کی سواری بٹھاتے ہیں لیکن پولیس والوں کے سامنے
 اور اپنے محلے والوں کے سامنے اپنی من مانی نہیں کرتے کیونکہ محلے میں ہمیں رہنا ہوتا ہے
 اور خواتین میں ہم رہنا نہیں چاہتے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں شریف احمد کی برات
 کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا لیکن میں ٹیکسی ڈرائیور رجبی تھا اور محلے کا براتی بھی۔ اس
 لیے مجھے نکاح میں بھی شریک ہونا پڑا۔ مزید ستم یہ کہ نکاح پڑھانے والے قاضی صاحب
 نے مجھے قاضی بنا کر دو کیلوں کے ساتھ لڑکی کے پاس ایجاب و قبول کی گواہی کے لیے بھیج
 دیا۔

مجھے یہ اعزاز اس لیے حاصل ہوا کہ میں میٹرک پاس ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ انگریزی
 ابھی طرح سمجھ لیتا ہوں اور اردو فصاحت و بلاغت سے بولتا ہوں۔ محلے والوں پر میرا دور
 بری بہن کا رعب طاری رہتا ہے کیونکہ وہ بھی ان دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔
 جب میں نکاح قبول کرانے عورتوں میں گیا تو وہ ساولی سلونی بنگالی دوشیزہ مگو ٹھٹھٹ
 کالے بٹنی تھی۔ بنگال کے حسن کا سلطان بن مشہور ہے۔ میں اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا مگر
 ڈال ہاتھوں کی نزاکت اور لامتناہی تیار تھی کہ بڑا نمکین حسن ہے۔ میں ابھی تک کنوارا
 ہوں مگر ٹیکسی کے ایک ایک پرزے کی طرح عورت کے کل پرزوں کو سمجھتا ہوں میری
 داستان حیات بتائے گی کہ ایک تجربہ کار ٹیکسی ڈرائیور بننے کے لیے عورت کو سمجھنا کتنا

کبھی کبھی میری ٹیکسی دہمن کی طرح سنورتی ہے اور اس دہمن کی آغوش میں دہما سرا
 باندھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آگے آگے بیٹھنا بچے والے فکری دہمن سناتے جاتے ہیں اور آگے
 پیچھے براتی اور دہما کے رشتے دار پانچ پیسے اور دس پیسے لٹاتے رہتے ہیں۔ ایسے وقت یوں
 لگتا ہے جیسے میں اپنی جینکس برس کی کنواری شمشاد کے لیے اس دنیا کے منگے بازار سے
 ایک دہما خرید کر لے جا رہا ہوں۔

برات ہمارے محلے شریف آباد سے چلی تھی اور دہمنی ساڑھے گیارہ نمبر پہنچ کر رہی
 تھی جہاں مصیبت کے مارے لوگ بنگلہ دیش سے آکر نہالے رہے تھے۔ برات کے دہما کا
 نام شریف احمد ہے۔ شریف احمد واقعی اسم باسی ہے۔ ہمارے محلے میں اس نے شرافت
 کی مثال قائم کی ہے۔ وہ کبھی نظرس اٹھا کر جوان لڑکیوں کو نہیں دیکھتا۔ میرے کچے مکان
 کے ٹھیک سامنے اس کا پکا مکان ہے۔ خود میری بہن شمشاد نے اس کی تعریف کی ہے کہ
 شریف احمد بیٹھ اس کے سامنے سے سر جھکا کر گزر جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی حد سے زیادہ شرافت مجھے منگنی پڑی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ
 وہ دو سروں کی نظرس بچا کر میری بہن کو دیکھے، مجھ سے چھپ کر میری بہن کی محبت میں
 گرفتار ہو جائے۔ آپ مجھے بے غیرت کہیں گے اور زیادہ کہیں گے تو مجھے بہن کا دلال کہہ
 کر بکاریں گے مگر ایسا کہنے سے پہلے آپ کو میری غریبی اور میرے کچے مکان کو دیکھنا ہوگا۔
 میری بہن کی بڑھتی ہوئی عمر کا حساب کرنا ہوگا۔ ان حالات میں لڑکی والے یہی چاہتے ہیں
 کہ کوئی لڑکا ان کی لڑکی کی خوب صورتی اور خوب سیرتی دیکھ کر پھنس جائے۔ اگر چنانچہ
 کے اس عمل کا نام دہلائی ہے تو ہم سب اس سوسائٹی کے مہذب دلال ہیں۔

شریف احمد کا باپ فیم احمد بھی بہت زیادہ شریف اور غریب پرورد ہے۔ وہ اپنے بیٹے
 کے لیے کسی غریب لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتا تھا اور اکثر میری شمشاد کی تعزیتیں کیا کرتا تھا۔

بانداری سے نہ سہی بے ایمانی سے ہی کہیں پہنچاؤے کسی کی دلمن بناوے اس دنیا میں
بکچھ ہوتا ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔

میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میں ایماندار تھا۔ میٹر کے مطابق پیسے لیا کرتا تھا۔ میں
بتاتا تھا کہ ایمانداروں سے ٹیکسی چلا کر رئیس اعظم بن جاؤں گا۔ پھر میری سمجھ میں آگیا کہ
دنیا میں ایک کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دو وقت کی روٹی
ماننے کے لیے کسی نہ کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا پڑتا ہے اگر میں کسی سواری سے کموں
میٹر سے چلتے ہیں میرا نقصان ہے ایک روپیہ زیادہ دو تو وہ سیدھی طرح کبھی نہیں دے
۔ اسے میرے نقصان کی پروا نہیں ہوگی کیونکہ لوگ صرف اپنے فائدے پر نظر رکھتے
ہے۔ پھر میں کیوں نہ اپنا فائدہ دیکھتا؟

اس لیے میں نے میٹر تیز کر دیا۔ ایمان کا میٹر بہت سست ہے کیونکہ ایمان کا حساب
ات کے دن ہوگا۔ ابھی جس قیامت کا سامنا ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری
ہے۔ کھانے پکڑے، مکان کا کرایہ اور تعلیم کے اخراجات کے لیے ہر شخص بے ایمانی کا
تجزیہ چاہ رہا ہے۔ یہ جتنی تیزی سے چلاتا ہے اتنی ہی تیزی سے ننگائی بھی بڑھتی جاتی ہے
رہن کی کنواری آہیں بھی دل کو چھلی کرتی جاتی ہیں۔ اس لیے اب میں مسافروں کو
دل میں لگا کر یا راستہ خراب ہونے کا بہانہ کر کے لمبے راستے سے لے جاتا ہوں۔ وہ
پب کھا کر مجھے خوشی سے زیادہ پیسے دیتے ہیں اور اپنی نادانی سے سمجھاتے ہیں کہ یہ دنیا
پب کھا کر ہی خوش رہتی ہے۔

اس طرح میں نے پانچ برس میں بہن کی شادی کے لیے نئے کپڑے، سونے کے
ہرات اور جینز کا تھوڑا سا سامان جوڑ لیا ہے۔ لیکن اتنی بے ایمانوں کے باوجود یہ سمجھ
نہیں آتا کہ اپنی بہن کے لیے کس طرح بے ایمانی سے ایک دلہا خرید کر لے آؤں؟ اگر
بک دلہا کو بچانے کے سلسلے میں ذرا بھی بھول چوک ہوئی تو میں غیر مذہب دلال کہلاؤں
۔

دارو کی آگ حلق سے اتارتے وقت میں ایسی بہت سی گہری باتیں سوچتا ہوں جو ظلال
بہرے کے اواروں اور سماج کے مصلحین کو سوچنا چاہیے۔ پہلے میں نے ایک ادھاپا۔
بانشہ اپنی انٹھان تک نہیں پہنچا تو میں نے ایک پوا اور حلق میں اتارا۔ پھر سرور میں آکر

ضروری ہے۔

جب تک میں اپنی بہن کو دلمن بنا کر رخصت نہ کرتا اس وقت تک اپنے لیے دلمن
نہیں لاسکتا تھا۔ فی الحال ایک رات کی دلمنوں کے ساتھ نہایت شرافت سے زندگی گزار رہا
تھا۔

اس وقت بھی اس سانوفی سلونی لڑکی کو دلمن بنے دیکھ کر ٹیکسی کے میٹر کی طرح میرے
دل کا بے ایمان میٹر بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اس
سے نکاح قبول کر لیا تھا۔ نکاح پڑھانے کے دوران صرف اتنا یاد ہے کہ اس دلمن کا نام
زیب النساء عرف بیلا رانی تھا۔ مجھے صرف بیلا رانی یاد رہ گئی۔

رخصتی کے وقت جب بیلا رانی کو خیلے کی لڑیوں میں چھپا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر
بٹھادیا گیا تو میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا تاکہ تمام راستے اس کے
سبک سے ٹھیک بن جائیں۔ اگر اس وقت شریف احمد میری بہن کو دلمن بنا کر
لے جا رہا ہوتا تو میں آئینے کی پوزیشن نہ بدلتا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے وقت انسان کو
کبھی غیرت مند بنا دیتا ہے اور کبھی بے غیرت۔ ویسے بھی مجھ جیسا تجربہ کار کنوارا ہر عورت
کو اپنی بہن تو نہیں بنا سکتا؟

میں نے بیلا رانی کو اس کے سہاگ کی پہلی منزل تک پہنچا دیا۔ شریف احمد اور اس کی
بہن دلمن کو سہارا دے کر اپنے گھر میں لے گئے۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر تھا۔ شمشاد
کھڑکی سے لگی ایک لڑکی کو دلمن بن کر اپنی منزل تک پہنچتے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ
اس وقت اس کی نگاہوں میں کتنی حسرتیں ہوں گی اور دل میں کتنے طوفان اٹھ رہے ہوں
گے۔ ایسے وقت میں اپنی بہن کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اس لیے ٹیکسی اشارت کر کے وارو
پہنچے چلا گیا۔

زندگی جب بہت زیادہ ٹھوکریں مارتی ہے تو شراب بھی پانی ہو جاتی ہے، مسالا نشہ ہی
نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو بہن کا اداس چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ غم غلط نہیں
ہوتا، صحیح ہو کر دل غم میں اور سکھ جھالیتا ہے۔ اس کی عرومیاں کتنی ہیں۔

”میرے ٹیکسی ڈرائیور بھائی! تو ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے پھر بہن کو
راستے میں کیوں چھوڑ دیتا ہے؟ کتنے ہی مسافروں کو تو میٹر تیز کر کے پہنچاتا ہے، مجھے بھی

”شیدے! تو جانتا ہے اب میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ پہلے گاہک میرے پیچھے آتے اور مجھے منہ مانگی رقم دیتے تھے اب میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں اور اوپر سے اجڑ گئی اس لیے دن کی روشنی میں نہیں نکلتی ہوں۔ رات کو برقعہ پہن لیتی ہوں تاکہ یہ چٹکے نہ لگال اور سوکھا ہوا جسم اچھی طرح نظر نہ آئے کچھ تو کمرے میں اب سے چہرے پر نئی تعبائی ہے اور کچھ گاہک غسل کے اندر سے ہوتے ہیں۔ رات کو عموماً شراب کے نشے رہتے ہیں۔ ایسے وقت انہیں گدھی بھی حور پری نظر آئے اس طرح مجھے میرے جسمے رزق ملتا رہتا ہے۔“

یہ کہہ کر میرے قریب کھٹک آئی پھر میرے گھٹنے پکڑ کر بولی۔
”رزق ملتا ہے پھر بھی ایک دلو کے فائدے ہوتے ہیں۔ رات کے مہمان اتنی رقم نہیں بٹے کہ میں اس میں سے پولیس والوں کو بھی دے سکوں اور عیسائی ڈرائیوروں کا بل ادا رکوں اور منگانی کے بڑے ہوئے ہاتھوں کو کاٹ سکوں۔ آج میں تجھے بیس روپے نہیں دے سکوں گی شیدے۔“

وہ میرے بالکل قریب آئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ نشے کی حالت میں سوکھا ہوا اب بھی پر شباب نظر آتا ہے۔ وہ مجھے دنیا کی سب سے حسین عورت نظر آ رہی تھی۔
اب ہائی کر گندی ہالوں میں گرنے کے بجائے کسی سوکھی عورت کی پناہ میں گرنا بہتر ہوتا ہے میں نے اس سے کہا۔

”میری عیسیٰ میں رہ جا۔ میں تجھے بیس روپے دوں گا۔“
وہ خوش ہو کر بولی ”تمہاری بڑی مہمانی ہو گی تو اپنا ہی آدمی ہے۔ مجھے جلدی چھوڑ دے گا۔ ہر کوئی طرح پریشان نہیں کرے گا۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے، میرا بچہ بہت بیمار ہے۔“

بچے کا ذکر آتے ہی میرا مڑ خراب ہو گیا کیونکہ دس دس کے نوٹ پھینکتے وقت مرد لڑکھاری اور اچھوتی عورت کا قصور کرتا ہے۔ میں نے بکڑ کر کہا۔

”تم سالی ٹیکسیا بن کر بچے کیوں پیدا کرتی ہو، میری عیسیٰ نے تو کبھی بچہ نہیں دیا۔
اپنی کو صرف پیسے پیدا کرنے چاہئیں بچے نہیں۔ چل جا یہاں سے میں بیس پیسے بھی نہیں لیا۔“

بے سری تو اس فلمی گیت گاتا ہوا عیسیٰ میں آکر بیٹھ گیا۔
تھوڑی دور تک ڈرائیو کرنے کے بعد ایک برقعہ پوش عورت نے ہاتھ اٹھا کر عیسیٰ روکنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فٹ پاتھ کی عیسیٰ ہے اور گاہک کی تلاش میں نکلی ہے۔ ایسی برقعہ پوش ٹیکسیاں میری آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں اس لیے میں نے گاڑی روک دی اور فوراً میٹر کو آن کر دیا تاکہ معاملہ طے ہونے تک میٹر تیزی سے مل بٹاتا رہا۔ اس نے نقاب الٹ کر گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر بولی۔
”رے شیدے تو ہے؟“

ہاں میں شیدا عیسیٰ ڈرائیور ہوں۔ اس شہر کی تمام وہ عورتیں جو اپنی جوانی کا میٹر آن کر کے سواری کی تلاش میں نکلتی ہیں وہ مجھے پہچانتی ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں اور ہم سب کو پولیس والے پہچانتے ہیں اور پولیس والوں کو حرام کی آمدنی پہچانتی ہے۔ اس طرح نہایت ایماندار سے ہم عورت کی کمائی کو انصاف سے بانٹ کر منگانی کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

جب اس نے نقاب الٹا تو اس وقت نشے کے باعث میری کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر جھومتے ہوئے پوچھا۔
”کون زینہ؟ اری اتنی رات کو نکلی ہے۔ اگر کسی ایماندار پولیس والے نے پکڑ لیا تو سیدھی حوالات میں پہنچ جائے گی۔“

وہ عیسیٰ کا اگا دو راہ کھول کر میرے پاس بیٹھنے ہوئی بولی۔
”جو پولیس والے ایماندار ہوتے ہیں ان کی معلومات بھی محدود ہوتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے کہ میں پیشہ کرتی ہوں۔ ایسوں کے سامنے تو مجھے اپنی گھروالی بنالینا۔ میں تجھے کیا سمجھاؤں؟ تو نے تو گھٹا گھٹا کاپانی پیا ہے۔ اس وقت کوئی بہانہ نہ کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ چل گاڑی آگے بڑھا راستے میں کوئی نہ کوئی گاہک پھنس ہی جائے گا۔“

میں نے عیسیٰ کے میٹر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ایک روپیہ دس پیسے بنے تھے۔ میں اتنی جلدی آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”اگر جلدی چلتا ہے تو پھر میں میٹر سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے ٹھیل پاؤں تک جانے آئے کے میں روپے لوں گا۔“

لنگ کر کھڑی ہو گئی اور پلٹ کر بولی۔

”وہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ ابھی میں روپے کی قیمت چکانی ہے۔“

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی ٹارٹ کی گھیرید لیا اور ایک جھنگے سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور چلا گیا۔ عورت جب ایک روپے میں آتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ میں بیڑا تار ہوا اور اسے گالیاں دیتا اپنے گھر کے دروازے پر آکر رک گیا۔

جب میں دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہوا تو اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ شاد آگن میں چارپائی بچھائے اس پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی شریف احمد کے مکان دیکھے جا رہی تھی۔ ہمارے آگن سے شریف احمد کے مکان کی اوپری منزل کا ایک کمرہ بالکونی نظر آتی ہے اور اس کی بالکونی سے ہمارا پورا آگن نظر آتا ہے۔ جب چاندنی ات میں شمشاد چارپائی بچھا کر لیٹ جاتی تھی تو میں سوچا کرتا تھا کہ شریف احمد اپنی بالکونی سے اسے دیکھ رہا ہو گا۔ پہلے پہل مجھے یہ بات ناگوار گزری تھی پھر حالات نے مجھے سمجھا دیا کہ میرے ہاتھوں میں جانے والی ہر چیز کو شوکیس میں رکھ کر اس کی اہمیت بڑھائی جاتی ہے اس حد تک اگر وہ میری بہن کو دیکھ لے اور میری بہن اسے دیکھ لے اور دنیا والوں کو لگی خبر نہ ہو تو یہ بے شری نہیں ہے۔

مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ شریف احمد بیلا رانی کو بیاہ کر لے آیا تھا۔ اب شمشاد کے بوسہ کی تھی؟ اور ایسے دیکھ رہی تھی جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ اسے بھائی کی موجودگی کا خاص بھی نہیں تھا۔ ہر بات اپنے وقت پر سمجھ میں آتی ہے اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ شریف احمد کو نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ عالمی اسکرین پر بیلا رانی کو بالک کے مرحلوں سے گزرتے دیکھ رہی ہے۔

میں چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ دوسری صبح شریف احمد کے باپ نعیم نے مجھے بلایا۔ دستور کے مطابق بیلا رانی کو اس کے میکے بھیجا جا رہا تھا۔ صبح سویرے بلاناہڑی کون برباد کرتا ہے۔ میں ٹیکسی لے کر نکلا تو اس وقت اچھے میسے دینے والی امراں مل جاتیں۔ مکے والوں سے میسے کم ملتے ہیں۔ پھر بھی میں نے بیلا رانی کے لیے اس کے میکے جانا منظور کر لیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹیکسی کی غیم تارک دنیا میں چند لمحوں کے لیے سب کچھ گم ہو گیا، صرف آنسوؤں کی جھلماہٹ رہ گئی۔ یہ جو شراب ہے مایہ ہمیں بہت کمزور بناتی ہے۔ پرانے آنسوؤں کی تہ میں اتار کر اپنے زخم کے حوالے سے بہت کچھ سمجھا جتی ہے۔ وہ بڑے کرب سے کہہ رہی تھی۔

”دونوں ہو گئے۔ میری چھاتی سے دودھ نہیں اترتا۔ بچے کو اوپری دودھ پلایا تو دوبارہ ہو گیا۔ مجھے روٹی کے لیے پیسے نہیں چاہئیں۔ نئے کپڑے خریدنے کے لیے میں پراپر فٹ اوڈھ کر نہیں نکلی ہوں اور نہ ہی اپنے جسم کو مکھڑ رہنا کر شیش محل میں رہنے کا خواب لے کر آئی ہوں۔ میں صرف بچے کی دوا کے لیے پیسے حاصل کرنے آئی ہوں۔“

میں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پتھر بننے کی کوشش کی اور سخت لہجے میں کہا۔

”تم سب عیاشی کے لیے نکلتی ہو۔ بھانت بھانت کے مردوں کے بغیر تم لوگوں کو نیند نہیں آتی مگر مردوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اپنی عمو میوں کے افسانے گزرتی ہو اور اس افسانے کو کلا ٹکس پر پہنچانے کے لیے ایک نوزائیدہ دودھ پیتے بچے کو پیش کرتی ہو۔ یہ سب محض ڈرامہ ہے اور کچھ نہیں۔“

اچانک ہی وہ میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھینٹوڑنے لگی اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔

”یہ ڈرامہ نہیں ہے، وہ بچہ دودھ اور دوا کے لیے بلک رہا ہے۔ وہ بچہ کس کا ہے؟ کسی حاجی کریم الدین کا ہے، کسی صنعت کار سیٹھ کا ہے یا کسی رئیس زادے کا ہے یا تیرے جیسے ٹیکسی ڈرائیور کا ہے۔ بے غیرت، بے مروت، تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ تم سب کے مشترکہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے اپنے جسم کا کاروبار کر رہی ہوں۔ تم سب میرے وجود سے بھانگی ہوئی ٹریفک کی طرح گزر جاتے ہو اور اس بچے کو چھوڑ جاتے ہو۔ کیا اس کے لیے دودھ کی ایک بوتل خرید کر میں دے سکتے؟“

میں نے جلدی سے میں روپے نکال کر دے دیئے۔ ایک فاحشہ کی زبان پر سنسری قہقہہ چلانے کے لیے میں روپے کافی ہیں۔ جو حقیقت ناقابل پروا شت ہوتی ہے اسے دولت کی قہقہہ سے کٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے دس دس کے نوٹ لے کر اپنے سینے سے لگا کر سمجھنے لیے اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اپنے بچے کی طرف جانے کے لیے نکلی۔

ہسپتال کی تمام ایمرولینس کیمائز کی طرف مئی ہوئی تھیں۔ میں محلے کا عیسائی ڈرائیور ہوں
اے اس کی لاش میری عیسائی میں لائی گئی۔ عیسائی کی پچھلی سیٹ پر ایک ہفتہ پہلے اس کی
برادرین بنا کر لے گیا تھا اب اس عیسائی کو جنازہ بنا کر لے جا رہا تھا۔

محلے والے شریف احمد اور اس کے باپ فہیم احمد سے افسوس اور ہمدردی کا اظہار
کر رہے تھے۔ ان پر ایک ساتھ کتنے ہی غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ بیلا رانی سماگ کی
دو بی بی اپنے بچے کی مٹی چمچ لٹ کر اپنے شوہر کے پاس نہیں آئی تھی۔ ہونے پہلے ہی
لوگوں کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ موت نے ہشتے ہشتے گھر کو اور بھی اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ فہیم
اور دو دو محلے والوں کو بتا رہا تھا کہ ہوسکتی تک چڑھی تھی۔ اس کی بیوی بڑے اربانوں
نے اسے ہوسکتا کر لائی تھی۔ وہ پہلی ہی رات شریف احمد سے کہہ رہی تھی کہ وہ ماں باپ
نے الگ ہو جائے۔

کسی نے کہا ”میں مہاجرین نے پہلے مشرقی پاکستان کو الگ کیا۔ اب یہ لڑکی یہاں آکر
یہ گوالدین سے الگ کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے ہمدردی کرنا فضول ہے۔“
فہیم احمد نے کہا ”ہم تو نیکی کرتے ہیں اور دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے تو جہاں تھا کہ
اب خاندان برباد ہو کر یہاں آکر سکھ بچن کی زندگی گزارے گی مگر واقعی یہ مہاجر اپنی فطرت
سے مجبور ہیں۔ اپنی الگ حیثیت بنانے کے لیے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ ہمارا کیا
چاہیے دن وہ بری طرح بچھڑائے گی۔“

میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں فہیم احمد کو روٹے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی
تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس نے میری بہن کی خوشیوں کو برباد کیا تھا اور خود بری
لو برباد ہو گیا تھا۔ ظلم کرنے والے کو آنکھوں کے سامنے سزا مل جائے تو مظلوم کے دل
پر سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے۔ شریف احمد نے بیلا رانی کو طلاق دے کر اس کے مہر کی
پانچ سو روپے ادا کر دی۔ میرے لیے پھر امید بندھ گئی۔ راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اب
اگر سے کسی دن بھی میری بہن کا رشتہ آسکتا تھا۔ شمشاد معمول کے مطابق روزانہ کالج
پر لائی تھی اور میں نے معمول سے زیادہ بے ایمانی شروع کر دی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ
کامیابی ہو رہے اور بہن کا رشتہ آئے تو محدود آمدنی رکاوٹ نہ بنے۔

جب وہ میری عیسائی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو پچھلی رات کی طرح گھونگٹ میں
نہیں تھی۔ میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ہائے میں بیان نہیں
کر سکتا کہ اس سانپ لڑکی کا چہرہ کتنا دلکش تھا۔ آئینے سے گزر کر سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔
میں چند لمحوں تک دم بخود ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ دستور کے مطابق شریف احمد کو بھی اس
کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن صرف اس کی ماں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ راتے میں
میں نے محسوس کیا کہ شریف احمد کی ماں بہت خاموش اور بہت ادا ہے۔ اس کی وجہ یہ
ہوسکتی ہے کہ ہوسکتی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو ساس پہلے ہی دن سے اسے ہانپ کر لئی
ہے اور کبھی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔ بیلا رانی کے میکے پہنچ کر شریف احمد کی ماں نے مجھے
انتظار کرنے کے لیے کہا اور ہوسکو لے کر مکان کے اندر چلی گئی۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے اندر سے لڑنے
جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن بات سمجھ میں
نہیں آئی کہ کس لیے جھگڑا ہو رہا ہے؟ ایک گھنٹے کے بعد شریف احمد کی ماں تیار ہوئی
عیسائی میں بیٹھ گئی۔ میں نے عیسائی اسٹارٹ کی اور اپنے محلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے
عقب نما آئینے میں دیکھا وہ اپنے دوپٹے کے آہٹل سے آنسو پونچھ رہی تھی اور سیٹ کی
پشت سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ مجھے برسوں کی بیمار نظر آئی۔ میں
نے پوچھا۔

”ماں جی! کیا بات ہے کیا پہلے ہی دن ہوسو سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“
میرے سوال پر وہ چونک پڑی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ عیسائی میں تھیں
ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں کوئی اپنے گھر کے راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔ وہ میرے سوال کو
ٹال گئی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ادھڑلے عمو کی خاتون ہر لمحہ مرنے جا رہی ہے۔



کبھی کبھی میری عیسائی جنازہ بن جاتی ہے۔ کیمائز میں ایک کشتی ڈوب گئی تھی۔ کتے
ہی ڈوب کر مر گئے تھے اور کتے ہی ایسے تھے جنہیں جاں کنی کی حالت میں ایمرولینس کے
ذریعے ہسپتال لایا جا رہا تھا۔ شریف احمد کی ماں پچھلے کئی دنوں تک ہسپتال میں بیمار رہنے
کے بعد مر گئی تھی۔ اس کی لاش گھر لانے کے لیے ایمرولینس نہیں مل رہی تھی کیونکہ

بولتا ہوں۔ اپنی بہن کے بیچیس برس کے چہرے کو نہیں بڑھ سکا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میرے آنگن کے درخت میں جو پھل پک رہا ہے وہ چٹتے چٹتے کچی دیوار کے باہر گرے گا۔

میں گہری سوچ میں ڈوبا اپنی بدنامی کے خیال سے کانپ رہا تھا اور ہر شریف آدمی کی لڑائی بہن کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو مٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں یوں چونک پڑا جیسے بدنامی دستک دے رہی ہو۔ جب رات فطریے میں پڑی ہو تو ہر دستک اور ہر آہٹ پر دل کانپتا ہے۔ میں نے دانت پیستے اپنے شمشاد سے کہا۔

”خبردار اس کمرے سے باہر نہ لکھنا میں ابھی آتا ہوں۔“ میں اسے غصے سے دیکھتا ہوا بل کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا اور باہر کے دروازے کو کھول دیا۔ دروازے پر نعیم احمد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اوجیز عمر کے قد اور ایک صحت مند آدمی تھے۔ ٹلی چیشیا کا ایک دانہ بتا رہا تھا کہ وہ پانچوں وقت کے نمازی ہیں۔ اس وقت میں کسی انڈیا فرشتے سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن انہوں نے بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے لہا۔

”بیٹے میں تمہاری مشکل آسان کرنے آیا ہوں۔“ ان کی باتیں سن کر مجھے یاد آیا کہ میں شمشاد کو ان کی ہونا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ انڈیا فرشتہ بن کر آئے تھے۔ میں نے فوراً ہی انہیں کمرے میں لا کر بٹھایا۔ انہوں نے بیٹھتے ہی بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کیا جوان لڑکیوں کو مارنے پینے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟“ میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ میں نے تو بڑی خاموشی سے شمشاد کی پٹائی کی تھی، یہی آواز میرے مکان کے دروازے تک بھی نہیں پہنچی تھی پھر انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ لڑکیوں کو مار رہا تھا۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”بیٹے، میرا مکان بہت اونچا ہے اور بالکونی سے تمہارا آنگن نظر آتا ہے۔ میں نے غلطی کرتے کرتا دیکھا تو پہلے ہی سمجھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن تم غصے کی

ایک صبح وہ کالج نہیں گئی۔ میں کمرے سے نکل کر آنگن میں آیا تو وہ آنگن میں نکل کے پاس بیٹھیں گے کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے شمشاد تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“

میری آواز سننے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اک دم سے گہرا گئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اس کے قریب آیا تو وہ اپنی منگی میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو پشت کی طرف لے جا کر چھپانے لگی۔

”کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام سی کوشش کی لیکن میں نے جبراً اس کی منگی کھول دی۔ منگی کھلتے ہی ام کے اچار کا ایک گڑا زمین پر گر پڑا۔

میں اک دم سے سناٹے میں آ گیا۔ اب میں ایسا نادان بھی نہیں تھا کہ بات کی تک نہ پہنچ سکتا۔ میں نے ایک زوردار لمحہ غماز پسید کرتے ہوئے پوچھا۔

”بول یہ سب کیا ہے؟ بے حیا، بے غیرت۔ کیا میں اس لیے تجھے کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجتا ہوں؟“

اس کی خاموشی اور اس کے آنسوؤں نے میرے شبے کی تصدیق کر دی۔ میں بے تحاشہ اسے مارنے پینے لگا۔ ان حالات میں بھائی ہو یا باپ، بہت مجبور ہوتا ہے۔ ادنیٰ توازن میں گالیاں نہیں دے سکتا اور گالیاں دے کر بیٹی یا بہن کو خود اپنی زبان سے بدنام نہیں کر سکتا اس لیے میں خاموشی سے اسے مارتا رہا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی، میں اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔ وہاں لا کر میں نے اس سے پوچھا۔

”بتاؤ کہینہ کون ہے؟ میں ابھی اس کے پلے تجھے باندھ دوں گا۔ نہیں بتائے گی تو گا گھونٹ کر بیشہ کے لیے تجھے ختم کر دوں گا۔“

اس نے روتے روتے بتایا کہ وہ کالج کا ایک پروفیسر تھا۔ شاعری کی کتاب پڑھاتے پڑھاتے اسے خوابوں کی دنیا سے گزار کر اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ مگر اب وہ اس شہر میں نہیں ہے، ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں جو عیسائی ڈرائیور ہوں اور سڑک پر چلنے والی ہر عورت کا چہرہ

شادی کے ایک ماہ بعد شمشاد کا حمل ضائع ہو گیا مگر وہ خوش تھی۔ اس کا شوہر اور اس اسر نعیم احمد بھی بہت خوش تھے اور شمشاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک سال بعد پھر شمشاد کے پاؤں بھاری ہوئے۔ کچھ عرصے بعد اس نے ماں دین کر مجھے ماموں جان بنا دیا۔



کبھی کبھی میری ٹیکسی ساج کی کچرا گاڑی بن جاتی ہے اور شہر کی جتنی غلیظ خواہشات بنی ہیں انہیں ایک جگہ سے سمیٹ کر دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ تقریباً دو سال کے بعد لے نے زب۔ اتسا اسٹریٹ پر بیلا رانی کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ گرمیوں کی منگی منگی شام تھی۔ وہ لے آٹھنی رنگ کی ساری میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ اس کے ساری باندھنے کا راز اتنا خوب صورت تھا کہ بدن کے نشیب و فراز بناؤت کے انداز میں ابھر آئے تھے۔ لے کے جوڑے میں پھولوں کی دہلی مک رہی تھی اور سانولی پیشانی پر سنہری بندیا جگمگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی دونوں پچھلی سیٹ پر اتر پڑے۔ میں نے فوراً ہی عجب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ آئینے پر ایک لڑکال کر مسکراتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولی۔

”کہاں چلنا ہے؟“

اس کے ساتھی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سوسائٹی۔ طارق روڈ۔“

میں نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ جب ٹیکسی کچھ دور نکل گئی تو میں نے نئے نوٹوں کی فراخوائی آواز سنی۔ ہم ٹیکسی ڈرائیوروں کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو آنکھیں سامنے اس کی طرف دیکھتی ہے اور باقی کی دو آئینے کے پیچھے کے مناظر دکھاتی ہیں۔ وہ سوسو کے نوٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ بیلا رانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں

”نہیں پورے پانچ سو۔“

اس نے سو کا ایک نوٹ اور بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”میں کوئی فٹ ہاتھ کی ٹیکسی نہیں ہوں، مجھ سے اس طرح سووے بازی نہ کرو۔“

حالت میں اسے مارنے لگے تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔“

ان کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھے لگا۔ انہوں نے مجھے گھبراتے دیکھ کر کہا۔

”میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ بلکہ میں تمہاری بدنامی پر پردہ ڈالنے آیا ہوں۔ میں تمہاری شمشاد کو اپنی بوہنا چاہتا ہوں۔“

مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دنیا میں ایسے فرشتے بھی موجود ہیں جو پرانے گناہ کا بوجھ اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”میں تمہارا بزرگ ہوں۔ میں تم سے مذاق کرنے یا جھوٹ بولنے نہیں آیا۔ سارا معاملہ جانتا ہے جو بات میری زبان سے نکل جاتی ہے وہ پتھر کی ٹیکری بن جاتی ہے۔ آج شام کو میں چند شریف آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا اور شریف احمد کا کلاچ شمشاد سے پڑھا کر اور اسے اپنے گھر کی عزت ہمارے ماں سے لے جاؤں گا۔“

میں فرط عقیدت سے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں سے لٹ کر رونے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں زندگی میں کبھی نہیں رویا۔ اس وقت بھی آنکھیں پونچھنے کے لیے میں نے ہاتھ اٹھایا تو پتہ چلا کہ میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں میں صرف خوشی سے رونے کے انداز میں گڑگڑا رہا ہوں۔ میں بہت سنگدل ہوں۔ انسان کا کوئی جذبہ یا کوئی مصیبت مجھے کبھی نہیں رلا سکتی۔

پھر وہ آدمی کیسے رو سکتا ہے جس پر مصیبت آتے ہی اس مصیبت کا خوب صورت حل پیش کر دیا گیا ہو۔ میری مصیبت بڑی آسانی سے ٹل گئی۔ شمشاد دنیا والوں کی نظروں میں عزت آبد سے دلن بن کر اسی رات شریف احمد کے ہاں چلی گئی۔ میں نے جو زیورات کپڑے اور جتنی نقدی بے ایمانی سے جمع کی تھی۔ وہ بے ایمانی سے بنائی دلہن کے جیز میں دے دی۔

اس کے بعد میں آزاد ہو گیا۔ اب اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کسی دے داری کو پورا کرنے کے لیے مجھے دن رات ٹیکسی چلانا ہے۔ میں اپنی مرضی کے مطابق شہنشاہ دین کر ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ دل چاہتا تو اپنی پسند کی سواری اٹھا لیتا ورنہ کسی ٹیکسی اڑے پر بیٹھ کر چرس کے سگریٹ پیتا رہتا۔

لال مہر کرنا چاہیے۔ فٹ پاتھ پر جو عورتیں آتی ہیں، پہلے ان کا ریٹ بہت اونچا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ نیچر ہوتی جاتی ہیں اور ان کا ہجڑا کرنے لگتا ہے۔ دو چار سال تک انتظار کرنے کے بعد وہ مجھے پچاس روپے میں مل سکتی تھی۔ اس وقت واقعی میں نے مہر کر لیا لیکن غیر شعوری طور پر وہ میرے دماغ میں کلبلائی رہی۔ جب ٹریفک کے ہنگاموں سے دور ات کی تنہائی اور خاموشی میں، میں نے سونے کی کوشش کی تو اس کا حنائی ہاتھ میری گالوں کے سامنے چلا آیا۔ میں نے اس خیالی ہاتھ کو تھام کر پوچھا۔

”جی بی زیب انسا عرف بیلا رانی۔ تمہیں شدیدے ٹیکسی ڈرائیور کے نکاح میں بغوض چاہو روپے دین مہنی شب کے حساب سے دیا جا رہا ہے۔ کیا تمہیں یہ غیر شرعی نکاح قبول ہے؟“

اس کی سریلی آواز سنائی دی ”قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔“

پھر وہ دلن بنی میرے پٹلوں میں آئی۔ میں اپنی یادداشت کے سارے اس کے چہرے کے نقوش کو دیکھنے اور چھونے لگا۔ اسے چھوتے وقت میرا سر گھوم رہا تھا، درود یوار گھوم رہے تھے۔ نیلے کے پھولوں کے ساتھ اس بنگالی دیشیزہ کے بدن سے جو پینہ منک رہا تھا اس میں پھلیوں کی بسانہ تھی۔ مجھے ابکائی آنے لگی۔ میرے پلٹ کرتے ہی سارے زاب پکنا چور ہو گئے۔ دراصل میں نے بہت زیادہ پینے کے بعد فرائی کی ہوئی پاپیٹ مچھلی کھا لی تھی۔ اس مچھلی کی مناسبت سے بنگالی دیشیزہ یاد آ رہی تھی۔

بس اسی طرح وہ کسی نہ کسی بہانے یاد آتی رہی۔ دراصل عورت خود کو دور رکھ کر اپنی بہت بہت زیادہ بوجھا دیتی ہے۔ اس کے متعلق نہ سوچنے کے باوجود عموماً اس کا احساس دینے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے ایک لومڑی کی طرح سوچنا چاہیے تھا اور گور لے کہ میں گمراہ سر سے پاؤں تک ٹھنسی اور درس بھری تھی۔ میں اسے کھنٹی کہہ کر دل کو جھوٹی نلیاں نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تھوڑے تھوڑے پیسے بچاؤں گا۔ پانچ روپے جمع کرنے کے بعد اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔

اس دن سے میں نے پیسے بچانے شروع کر دیئے۔ لیکن جو لوگ محدود آمدنی میں پیسے پاتے ہیں وہی میرے حالات کو سمجھ سکتے ہیں کہ بچانے ہوئے پیسے اکثر ناگہانی ضرورتوں کی ضرورت پڑ جاتے ہیں۔ چھ ماہ کے بعد جب میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو گئے تو میں

اس نے پانچ سو روپے پورے کر دیئے۔ بیلا رانی نے پانچوں نوٹوں کو یہ کر کے پرس میں رکھ لیا۔ راستے میں اس نوجوان نے ٹیکسی رکوا کر وہسکی کی ایک بوتل خریدی پھر ملحق دروازے کی ایک عمارت کے پاس پہنچ کر وہ دونوں اتر گئے۔

میری ٹیکسی خالی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سینہ دل سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ شروع ہی سے میرے دل میں دھڑک رہی تھی۔ جب میں نے شریف احمد سے اس کا نکاح پڑھا یا تھا اس وقت سے اس کا حنائی ہاتھ میرے دل پر رکھا ہوا تھا۔ آج دوسری بار اس نیکین ہاتھ کو ایک دوسرا شخص پکڑ کر میرے سامنے سے لے گیا تھا۔ ٹیکسی خالی ہونے کے بعد بیلا مسکتی رہی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا جیسے وہ واپس آگئی ہو۔ وہ نہیں تھی پچھلی سیٹ پر بیلا کے پھولوں کی بنی ہوئی دینی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا پھر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اسے سو گھنٹے لگا۔ عجیب سی خوشبو تھی۔ میرا خیال ہے نیلے کے ساتھ بیلا کے بدن کا پینہ بھی سک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اور کئی ٹاؤن کے سنے علاقے سے زرب انسا اسٹریٹ کے منگے علاقے تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ کیسے حالات نئے جنموں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ بہت اونچی قیمت پر ہر رات پانچ سو روپے دین مہر کے عوض بک سکتی ہے۔ یہ دین مہر پہلی بار شریف احمد نے مقرر کیا تھا۔ وہاں ایک رات وہ کرا سمجھ گئی تھی کہ یہی اس کی قیمت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میرا دل دھڑکنے لگا کہ کیا میں اس کی قیمت چکا سکتا ہوں؟ وہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آگئی تھی تو اگلی سیٹ پر بھی آسکتی تھی۔ لیکن میں اس کے لیے ایک مہینے میں بھی پانچ سو روپے جمع نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسی کی قطبیں ادا کرنے میں اور آئے دن اس کی حرمت کرانے میں میری آمدنی کا تین چوتھائی خرچ ہو جاتا تھا۔ باقی حصے میں سے کچھ ٹریفک پولیس والے لے جاتے تھے اور کچھ نشے کی ضرورتیں لے جاتی تھیں۔ باقی پیسے کی آگ بجھانے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بیلا رانی میرے لیے بہت مہنگی تھی۔ بہت اونچی تھی۔ میں ہاتھ اٹھا کر اسے جھون نہیں سکتا تھا۔

جسے ہم چھو نہیں سکتے۔ اس کے لیے دل زیادہ مچھلنے لگتا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ

بچے کئی ماہ سے میں نے پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ میں ساڑھے نو سو روپے تک جمع کر چکا تھا لیکن اچانک ہی بیماری نے مجھے توڑ دیا۔ اب میں دو سو روپے قرض وار بن گیا ہوں اس لیے اب میں تھیں خیالوں کی دنیا میں حاصل کرتا ہوں اور تب خیال کا ظلم ٹوٹتا ہے تو میں بڑی ذہنی لذتوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا تم مجھے ان وقتوں سے کسی طرح نجات دلا سکتی ہو؟

اس نے جواب دیا ”پہلے تم اپنا قرض ادا کرو پھر پانچ سو روپے جمع کرو۔ میں اتنے بڑے ٹر کے کسی بھی فٹ پاتھ پر مل جاؤں گی۔ ابھی مجھے پری ٹی کلب جانا ہے گاڑی آگے بھاؤ۔“

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے اس کی صاف گونگی پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن برنس آفر برنس ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی میری ٹیکسی رکوا کر یہ کہے کہ وہ بیمار ہے اس کے پاس بے ٹیس ہیں اور میں اسے اسپتال پہنچا دوں تو میں کبھی اسے لفٹ نہیں دوں گا کیونکہ ٹیکسی لفٹ دینے کے لیے نہیں کاروبار کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ بھی لفٹ دینے کے لیے نہیں کاروبار کرنے کے لیے نکلی تھی۔ ایک کاروباری کی حیثیت سے مجھے اس کی بات کا برا نہیں ملنا چاہیے تھا مگر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاوے کہ مرد اپنی ناکامی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں نے تہہ کر لیا کہ بہت جلد پانچ سو روپے اس کے منہ پر باروں گا۔ اس کے لیے میں دن رات ٹیکسی چلانے لگا۔ وقت گزر گیا میسے جمع ہوتے گئے اور ضرورتوں کے چور وازوں سے نکلے گئے۔ ہم سے اور آپ سے اگر پوچھا جائے کہ اتنی آمدنی کہاں جاتی ہے زہم و زحمت کا صحیح حساب نہیں بتا سکیں گے کیونکہ بہت سی ضرورتیں چوری چھپے آتی ہیں اور غیب کا کمال چلی جاتی ہیں۔

سال کے بعد سال گزر گیا۔ وہ مجھ سے ملتی رہی اور چھڑتی رہی۔ تین سال کے بعد میرے پاس تین سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئی کہ اس کا ہوا اک دم سے گر کر دو سو روپے پر آ گیا تھا۔ میں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ جسوں کی نظر میں بھلاؤ ہمیشہ گرتا ہے کسی بھی حالت میں اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

وہ بچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مرجھا گئی تھی۔ اس کے

اچانک ہی بیمار پڑ گیا۔ دکھ بیماری کے آگے کون رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے وہ تو کسی وقت بھی آسکتی ہیں۔ میں چھ دن تک بیمار رہا۔ چھ دن تک ٹیکسی میرے دروازے پر کھڑی رہی۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے کہ آمدنی رک جاتی ہے مگر ضرورتیں نہیں رکتیں۔ ٹیکسی کا مہاجن اگر ہفتہ واری قسط لے گیا۔ کچھ دواؤں اور ایکسٹنشن میں پیسے نکل گئے۔ بیماری سے اٹھ کر بہن کے گھر گیا تو بھانجی کی سالگرہ تھی اسے کھلونوں کا تحفہ دے کر واپس آیا تو ٹیکسی کا کیر بکس بیٹھ گیا تھا۔ جب اس کی مرمت کرانے کے بعد کمائی کے لیے نکلا تو اس وقت تک بچائے ہوئے ساڑھے تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے اور میں دو سو روپے کا قرض وار بن چکا تھا۔ میں نے جھلا کر اپنی نقدیر کو پوری ایک درجن گالیاں دیں اور دل کو سمجھایا کہ اللہ میاں نے پیلا رانی کو میرے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ لیکن سمجھانے سے کیا ہوتا ہے جب میں ٹیکسی کے اوڑے پر آیا تو جو سب سے پہلی سواری لی وہ پیلا رانی تھی۔

وہ دستور کے مطابق بچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بار میں نے آئینے کا رخ نہیں بدلا۔ اس لیے کہ جو چیز حاصل نہ ہو اس سے کھڑائی کی کوشش کرنا دانش مندی ہے۔ پیلا رانی نے اگلی سیٹ کی طرف جھٹکتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”آج تم نے آئینے کا رخ نہیں بدلا؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”مردوت بظاہر خاموش رہتی ہے مگر وہ اپنے آپ اس سے گزرنے والوں کی ایک ایک حرکت کو سمجھتی ہے۔ جب میں شادی کی دوسری صبح اپنے میکے جا رہی تھی اسی وقت میں نے تمہاری شرات کو بھانپ لیا تھا“ تم آئینے میں مجھے بار بار دیکھ رہے تھے۔ اس روز بھی زیب النسا اسٹریٹ پر جب میں بچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آئی تو تم نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”تم درست کہہ رہی ہو۔ جب پہلی بار تم دلہن بنی بیٹھی تھیں اور جب میں پہلی بار ایجاب و قبول کے لیے تمہارے پاس آیا تھا تو اسی وقت سے تمہارے حنائی ہاتھوں نے میرے خیالات پر کاد دینے تھے کہ تم ان ہاتھوں سے آگے بھی بہت دور تک حسین ہو۔ جب بات کھل ہی گئی ہے تو میں صاف طور سے کہہ دوں کہ میں تھیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

لئے وہاں گاکہ دیکھو تمہیں شرافت کی زندگی راس نہیں آئی۔ جس شریف احمد کو تم ٹھکرا کر
ہلٹی تھیں آج میری بہن اسی شریف آدمی کی بیوی بن کر عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔
نہی سمجھتا تھا کہ میری یہ باتیں اس کے دل میں نشتر کی طرح اتریں گی۔

دو گھنٹے بعد جب میں اسی فٹ پاتھ پر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میں عکسی روک کر
سامنے والے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ وہ میری عکسی کو اچھی طرح پہچانتی تھی جب
میں وہاں آتی عکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ چائے پی کر میں ہوٹل سے باہر آیا تو عکسی
دستور خالی تھی۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا کہ پتہ نہیں کہاں مرگئی ہے۔ میں وہاں سے
چس کا ایک سگریٹ خریدنے کے لیے تھوڑی دور چلا گیا۔

جب میں سگریٹ کے کش لگاتا ہوا واپس آیا تو عکسی خالی تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔
میں نے چاروں طرف دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ مزید ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا مگر
وہ نہیں آئی۔ میں جھنجھلا کر گھر واپس آیا۔ چس کا نشہ گھر کی تنہائی میں مجھے تڑپاتا رہا اور
میں تڑپ تڑپ کر اسے گالیاں دیتا رہا۔ دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب دوپہر کو
عکسی لے کر سڑک پر آیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ میری عکسی میں بیٹھنا بھی چاہے
کی تو نہیں بٹھاؤں گا۔ اسے دور ہی سے دھتکار دوں گا۔

رات کے نو بجے میں نے عکسی کا میٹر پانچواں دروازہ اور اسے دروازے کے سامنے کھڑی
کر کے پینے کے لیے چلا گیا۔ رات کے ایک بجے واپس آیا تو گھر کا دروازہ کھولتے وقت
عکسی کا پچھلا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ نیم تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے کے
پہلو دروازے پہچان لیا۔ میں جو اسے دھتکارنا چاہتا تھا اسے دیکھتے ہی سہم کر آگے بڑھا اور
اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے ہوئے گھر کے اندر لا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری
بہن کے سرال والے اسے دیکھ لیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے غصے سے پوچھا۔
”کل تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا تھا؟“

”تمہارے جانے کے بعد مجھے تین سو والی ایک آسامی مل گئی تھی۔“
”تم اس طرح سرجھکا کر کہہ رہی ہو جیسے بہت مظلوم ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم کتنی
نکار اور چال باز ہو۔ آج سے پانچ برس پہلے جب میں نے تمہاری آرزو کی تھی تو تم نے
ناقص کاروباری انداز میں مجھے ٹھکرایا تھا۔“

باوجود بای پھول کی اڑی اڑی سی رنگت ابھی باقی تھی۔ اس پر میک اپ کا سلیقہ ایسا تھا کہ وہ
کانڈی پھول کی طرح کھل گئی تھی اور کسی بدلیسی سینٹ کی نمک نے اس میں اچھی خاصی
کشش پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ میرے پاس ایک سو روپے ہیں۔
حالانکہ جیب میں تین سو روپے تھے۔ بھادوگر تارہ تو اور گراٹا چاہیے۔ مجھے اس کا وہ غور
اب تک یاد تھا جب اس نے مجھے طنزیہ انداز میں پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ
سرجھکا کر بولی۔

”مجھے دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے میرا چالان ہو گیا ہے اگر صبح تک میں نے
ڈیڑھ سو روپے نہ مانے میں نہیں پہنچائے تو وہ مجھے حالات میں ڈال دیں گے۔“
”اچھا تو پھر ڈیڑھ سو لے لو۔“

”مجھے مزید پچاس کی سخت ضرورت ہے میری لڑکی دوسری جماعت میں ہے۔ اس کے
لیے نئی کتابیں خریدنی ہیں۔“

میں نے کہا ”اچھی بات ہے رات کے بارہ بجے اسی جگہ آکر ملنا۔ میں دو سو روپے لے
کر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

اس نے کہا ”ابھی دس بجے ہیں۔ اس وقت بھی رات ہے یہ دو گھنٹے کا انتظار میرے
لیے عذاب بن جائے گا۔“

میں نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔
”میں پیسوں سے مجبور نہیں ہوں، مکملے والوں سے مجبور ہوں۔ وہاں بارہ بجے کے بعد
سناٹا چھا جاتا ہے۔ میں اسی وقت تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ تم کبھی اس مکملے کی عزت
بن کر مگنی تھیں۔ بہت سے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی مگر تم اس مکملے میں رہتے ہو تمہیں ڈرنا چاہیے۔ اچھی بات
ہے میں دو گھنٹے تک انتظار کر لوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ عکسی سے اتر گئی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا
تھا کہ جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی تھی اب وہاں میری بہن رہتی ہے۔ چونکہ بہن کی سرال گھر
کے بالکل سامنے ہے اسی لیے میں اسے چھپا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا وہ
گھنٹے بعد جب وہ میرے گھر آئے گی تو میں دو سو روپے اس کے منہ پر پھینک کر اسے بھی

میں نے خفارت سے کہا۔

”کلک آج کل تم جنت میں زندگی گزار رہی ہو؟ خبردار اس مکان کو جنم نہ کھنا کیونکہ وہ بنی بن کی جنت ہے۔ جہاں تم شرافت سے نہیں رہ سکیں وہاں میری بن عزت و آبرو زندگی گزار رہی ہے۔“

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر دھپ سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے

”کیا تم نے اپنی بن کو وہاں بیاہ دیا؟ یہ کب کی بات ہے؟“

”جب تمہیں طلاق دی گئی تھی، اس کے چھ ماہ بعد میری بن اس گھر کی عزت بن بنی۔ اس کی شادی کو ساڑھے چھ برس گزر گئے ہیں۔“

”تجربہ ہے“ اس نے حیرانی سے کہا ”اب تک تمہاری بن کو بھی میری طرح فٹ

نہر آجاتا چاہیے تھا۔“

”جو اس مت کر۔ ذلیل کمینہ۔“

میں چیختے چیختے سنہیل گیا۔ رات کے سناٹے میں میری آواز بن کے سسرال تک پہنچ

گئی۔ وہ تنہی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”تم سمجھ دار ہو۔ اچھا ہوا خود ہی غصے کو ضبط کر لیا۔ مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے

ادری بن کے متعلق ایسی بات کہہ دی۔ میں کیا کروں؟ میں بھی زخم کھائی ناگن کی طرح

بنی ہوں اور جو بھی سامنے آجائے اسے ڈس لینا چاہتی ہوں۔ پہلے میں ایسی نہیں تھی۔

میں سمجھتی تھی کہ عورت کو صرف محبت ملتی ہے۔ نفرت بھی ملے تو وہ اسے محبت میں

بدلتی ہے۔ بہت پہلے جب میں سولہ برس کی تھی تو میری زندگی میں ایک نوجوان آیا۔ وہ

میں خوب صورت تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی عبادت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں اپنی خوش

نہی پر اک دم سے پاگل ہو گئی۔ اس کی خوبصورتی اور اس کی شخصیت کے سامنے اپنی ذات کو

ام کر لیا۔ محبت میں ایسا ہوتا ہے کہ عورت اپنے آپ کو مار کر صرف اپنے محبوب کی

عزت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بننے کی تمنا نہیں کرتی۔ مگر بہت

پر محبت کا یہ پیمانہ ٹوٹ گیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا۔ سات سمندر پار جانے

کے بعد وہ کہاں گم ہو گیا، میں نہیں جانتی۔ لیکن اس وقت تک میری مصو میت میرا

وہ بولی ”کاروبار آخر کار دوبار ہوتا ہے۔ اس میں مکاری بھی ہوتی ہے اور چال بازی بھی۔ تم نے محبت سے تو میری تمنا نہیں کی تھی۔ تم عورت کو مشین بنا کر یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ اس کے سینے میں جلی دل دھڑکتا ہو گا۔ کبھی میرے سینے میں دل دھڑکتا تھا، کبھی میں تمنا کرتی تھی کہ کوئی مجھے محبت سے اپنائے، کوئی مجھے ناگن خیل کے مطابق لے والا لکھا نہ سمجھے۔ لیکن تم جیسے مرد نگاہوں کے انکسار سے صرف عورت کے لباس کے اندر جھانکتے ہو۔ اس کے سینے میں کتنا خوب صورت دل ہے یہ کبھی نہیں سمجھتے۔ جب مجھے فٹ پاتھ پر لے آئے ہو تو پھر میرے کاروباری لمبے کار کیوں سامنے ہو؟ یہ دیکھو میں کاروبار میں اتنی دیانت دار ہوں۔ کل مجبور ہو گئی تھی، آج اس کی تلافی کے لیے آئی ہوں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہو کر اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں، میں نے کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اگر انکار کرو گے تو واپس چلی جاؤں گی۔“

اس کی باتیں سن کر میں نرم پڑ گیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کاروبار میں انکار و اقرار کی تکرار ہوتی ہی رہتی ہے۔ مجھے برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ روپے لے کر اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ یہ وہی پرس تھا جسے میں نے پہلی بار زینب انسا اسٹریٹ پر دیکھا تھا۔ شاید اس سے دو سال پہلے بھی یہ پرس اس کے ساتھ رہا ہو گا۔ جب سے وہ اس راستے پر آئی تھی وہ پرس بھی اس کے ساتھ لیا تھا اور اب اس کی طرح رفتہ رفتہ پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں جو رنگ برنگے ٹکڑے ہوئے تھے وہ جگہ جگہ سے اکٹڑ گئے تھے۔ آدی کی جیب ہو یا پرس وہ اپنی آمدنی کے مطابق لپکا ہوتا اور مرجھاتا جاتا ہے۔

میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ طنز کا موقع آئے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”یہ پرس شاید اس وقت بھی تمہارے ساتھ رہا ہو گا۔ جب تم پہلی بار دلہن بن کر اس سامنے والے مکان میں آئی تھیں؟“

اس نے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن چشم تصور میں وہ مکان نظر آیا جہاں وہ دلہن بن کر گئی تھی۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکود کر کہا۔

”اس مکان کی بات نہ کرو وہ جگہ جنم سے بدتر ہے۔“

ہے۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں درندے دیکھے تھے جو اورت کی مرضی کے خلاف اسے چھین لیتے ہیں مگر اس نے بڑی محبت سے میرے وجود کے لئے زورے کو حاصل کر لیا۔“

”پھر تم نے ایسی محبت بھری زندگی کو کیوں چھوڑ دیا؟“

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بتاتی ہوں، تم سچ میں نہ بولو۔ صبح چار بجے تک میں اس کی آغوش میں رہی پھر وہ لپٹ کر کے نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری ساس میرے پاس آئی اس نے اپنی محبت سے میرا ہاتھ قلم کر دی لجاجت سے کہا۔

”بیلا رانی، اب تم اس گھر کی عزت ہو اس لیے تمہیں بھی اس گھر کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔ میرا بیٹا شریف احمد شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے وہ جوان ہوا تھا ہم اس کے لیے فکر مند تھے کہ گھر میں ہو کیسے آئے گی۔ نہیں آئے گی تو لوگ میرے بیٹے کا مذاق اڑائیں گے کہ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ میں کسی طرح اس کی شادی کرنا چاہتی تھی ہاں سمجھو کہ میں اس کی مراد اگلی کا بھرم رکھنا چاہتی تھی لیکن وہ تیس برس کا ہو گیا اور مسلسل شادی سے انکار کرتا رہا تو میرے خاندان نے ایک تجویز پیش کی۔ وہ تجویز ایسی تھی کہ برے بیٹے کی لاج رہ جاتی لیکن میں ایک عورت ہو کر اس تجویز کو کبھی پسند نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے میرے خاندان نے مجھے بہت سمجھایا پھر مجھے اور میرے بیٹے کو مارنے بیٹھے لگا۔ میں اپنے اوپر قلم برداشت کر سکتی تھی لیکن آئے دن اپنے بیٹے کو لواتے جوتے کھاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ایک دن اسی طرح میرے بیٹے کو مار ڈالے گا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی اور یہ شادی ہو گئی۔ ابھی تمہارے ساتھ جو رات گزار کر نماز پڑھنے کے لیے گیا ہے۔ وہ میرا خاندان فقیر احمد تھا۔“

میں لڑکھڑا کر یک بیک یوں پیچھے چلا گیا جیسے بیلا رانی نے مجھے زور کا طمانچہ مارا ہو اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب کے نشے میں تو گھومتا ہی ہے لیکن حالات کے حرای نشے نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ غائب یہ ہم سب کیسے حرای زندگی گزار رہے ہیں۔ فٹ پاتھ سے لے کر شریف گھرانوں کے آئینوں تک ہم کیسی دغلی حرکتیں کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی نورانی پیشانی پر

کنوارا پس سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف محبت کی تلخ اور شیریں یادیں رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہی یادوں کے سہارے زندگی گزار دوں گی لیکن والدین میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جوان لڑکی یا بیوی نہ جائے تو وہ سوسائٹی میں سراٹھا کر نہیں چل سکتے۔ وہ میری شادی کی فکر کرنے لگے۔ انہی دنوں مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں نہیں چاہتی کہ کون بنگالی اور کون بھاری ہے۔ اس ہنگامے میں جو لوگ میرے باپ کو قتل کر کے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے ان کا تعلق انسان کی کسی قوم سے یا کسی ذات سے نہیں تھا۔ میرے والدین بھاری ہیں لیکن میں پیدائشی طور پر بنگالی ہوں کیونکہ بنگال میں میرا جنم ہوا ہے۔ اس ہنگامے میں ایک بار بنگالیوں کا پلہ بھاری ہوا۔ دوسری بار بھاریوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ جب مجھے بنگالی اٹھا کر لے گئے تو انہوں نے مجھے بھاری لڑکی سمجھ کر میری عزت کو کھلونا بنایا کیونکہ وہ میرے بھاری والدین کی مناسبت سے مجھے جاننے تھے۔ جب بھاریوں نے میری عزت لوٹی تو میں ان کی نظروں میں بنگالی تھی کیونکہ میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ میں بنگالی زبان روانی سے بولتی ہوں اردو اچھی طرح بول نہیں سکتی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لیے چپ ہوئی پھر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

”میں کسے الزام دوں؟ کوئی پاکستانی ہوتا تو میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر اسے شرم دلاتی۔ وہاں سے یہاں تک میں نے یہی دیکھا کہ سب بنگالی، بھاری، پنجابی، سندھی اور سرحدی ہیں اور فٹ پاتھ کی دنیا میں یہ قومیں بھی نہیں ہیں، صرف دلال اور کاہک ہیں۔ پاکستانی کیسے سو رہے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے فٹ پاتھ پر کون لایا ہے؟“

میں نے کہا ”کوئی بھی لایا ہو لیکن جب تمہیں شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع ملا تو تم نے لہسن بننے کے بعد بھی اس زندگی کو ٹھکرا دیا۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

”ہاں میں دلہن بنی تھی اس لیے کہ ہر عورت کے دل میں دلہن بننے اور پھر ہاں بننے کا ارمان ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خیالی جنت کا خواب ہوتا ہے، میں اپنی آنکھوں میں ایک خواب سما کر اس سامنے والے گھر میں سماگ کی بیچ پر آئی تھی۔ اس رات میرے خواب پورے ہو گئے۔ میں نے دیکھا میرا شوہرا دھڑ عمر کا آدمی ہے مگر بہت محبت کرنے والا

جی تھا۔ بیلا رانی میرے قریب تھی۔ اس نے کہا۔

”میرے پاس اسپرہ کی دو نکلیاں ہیں انہیں کھاؤ۔“

پتہ نہیں اس نے وہ دو گولیاں مجھے کیسے کھلائیں۔ اس وقت مجھے بیلا رانی جیسی اورتوں کے پرس یاد آرہے تھے جن میں لی سی ٹیبلٹ ہوتی ہیں، جن میں اسپرہ کی نکلیاں دتی ہیں، جن میں خواب آور گولیاں ہوتی ہیں، جن میں ان کے ہر زخم کا علاج ہوتا ہے۔ فتن کہ میری بہن کے پرس میں بھی کوئی ایسی نکیہ ہوتی جسے ٹھک کر وہ پیش کی غیند سوجاتی ٹھک میرے سوچنے سے میری بہن نہیں مر سکتی تھی اور میری دنیا کی بے حیائی نہیں مر سکتی تھی۔ اسے مارنے کے لیے مجھ جیسے لوگوں کو مرنے پڑے گا لیکن میں کیسے مر سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کے عزیز نہیں ہوتی اگر مجھ جیسے لوگ اتنی جلدی، اتنی آسانی سے مر جاتے تو بیلا رانی بے پناہ پیار کے گلہ ان میں سب کے بجائے علاج کے اگلہ ان میں نہ چلا جاتا۔

صبح تک میں بخار میں پھنک رہا۔ بیلا رانی میرے پاس رہی حالانکہ اسے چلا جانا چاہیے تھا۔ جب اس کا خریدنے والا بیمار تھا اور اسے اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا تھا تو ایسی صورت میں ہمارے درمیان کوئی جھوٹا رشتہ بھی نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ میرے گھر سے جاسکتی تھی لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ وہ صبح تک رہ کر اور میری تنہا داری کے فرائض انجام دے کر دو سو روپے وصول کرنا چاہتی ہے۔ دو سو روپے کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے وہ صبح تک میرے پاس رہ کر کہہ سکتی تھی۔

”سو روپے کے مطابق میں نے تمہارے ساتھ رات گزار دی ہے اب اگر تم مجھے ہاتھ نہ لگائے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

لیکن صبح ساڑھے چار بجے جب اذان کی آواز آنے لگی تو اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دو سو روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارا سودا اکل نہ ہو سکا۔ تم نے مجھ سے میری قیمت وصول نہیں کی اس لیے میں یہ دیکھ نہیں لے سکتی۔“

یہ کہہ کر اس نے سو سو کے دو نوٹ میرے سرہانے رکھ دیے اور پرس بند کر کے اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

”ابھی اندر جا رہے، مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر نعیم احمد نے دیکھ لیا تو میرا کچھ

سجدوں کا داغ بنائے نماز پڑھنے بھی جاتے ہیں۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے بیلا رانی نہیں، شمشاد سہاگ کی بیچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بچے کو گود میں کھلا رہی تھی۔

وہ کس کا بچہ ہے؟ چاروں طرف سے ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ وہ بچہ کس کا ہے؟ وہ بچہ کسے اپنا باپ کے گا؟ جو دادا ہے؟ اسے باپ کے گا جو باپ ہے اسے سوتا بیلا جی کے گا۔ جو بہو ہے وہ بیوی ہے جو بیوی ہے وہ سوتلی ماں بن گئی ہے۔ آغ تھو۔ ہم اس دنیا میں کیسے کیسے رشتوں کی کھجوریاں پکا کر کھاتے ہیں، ہضم کرتے ہیں اور ڈکار لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔

میں چکر اکر گر پڑا۔ مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ بیلا رانی مجھے سہارا دے کر چار پائی پر لے آئی تھی۔ میں غصے، نفرت اور توہین کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ میری نس نس میں شرارے سلگ رہے تھے۔ میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی خود اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہ ہو بلکہ کسی اور کے پیروں پر کھڑا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کو ایک مذہب چیلنے میں بھیجا تھا اور اپنے ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کے گاہک کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا کیونکہ اس میں میری بہن کی بدنامی تھی، وہ اپنے بچے کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جاتی۔

میں سڑکوں پر چلتی چلانے والا اور فٹ پاتھ کی زندہ ٹیکسیوں کو اپنے منافع کی انگلیوں پر نچانے والا عداری اپنی بہن کو اس سطح پر نہاچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب اپنی انگلی گنتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دو سڑکوں کا گلا کیسے کتنا ہے۔ اس وقت میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آنکھ سے آنسو نکل جائیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر دوا شروع کر دوں مگر نہ جانے آنسو میرے پتھر لیے وجود کے اندر کہاں چھپے ہوئے تھے۔ یہ کب جاگیں گے اور کب میری پکلیوں کی دلیز تک آئیں گے۔ میں زندگی کے ہر درد و کرب سے گزرتا ہوں مگر آنسو میری بے حیا آنکھوں میں نہیں آتے۔

جب آنسو نہیں نکلے تو اندر کا سارا غبار بخار کی صورت میں ابھر آیا۔ بیلا رانی نے مجھے چھو کر کہا۔

”تمہیں تو بخار چڑھ رہا ہے۔ کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے میرے جوتے اتار دیے اور دوسرے کمرے سے لٹاف لاکر مجھ پر ڈال دیا۔ لمحہ بہ لمحہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا اور میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ مجھے ہوش

”بس۔ مرو کی مروا گئی ہمیں تک ہوتی ہے۔ تم لوگ عورت کے سامنے صرف تھائی کے مرد میدان ہو۔ تھائی سے باہر ای عورت سے سامنا ہو جائے تو خدا یاد آجاتا ہے۔ نہارا دولا بنوئی اللہ میاں کے پاس پناہ لینے گیا ہے۔“

وہ ہنستی ہوئی اور پرس جھلائی ہوئی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں اتنی دیر بیٹھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا، میڈیٹل ہو کر بستر پر گر پڑا۔ ایک رات کے بخار نے مجھے بہت کمزور بنا دیا۔ نا۔ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں اس دنیا کی زہریلی سچائی نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

مجھے بیٹارانی کی زیر بلی ہنسی پر غصہ نہیں آیا۔ میں فہم احمد کو دیکھ کر جھلا گیا تھا۔ مہرے جی میں کیا تھا کہ میں دوڑتا ہوا باہر جاؤں اور اس کا گلا دباؤں۔ لیکن میرے ہاتھ بت کمزور ہو گئے تھے کیونکہ میں نے مارا ننگی میں ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کو اس کے ٹرٹ کدے میں سمجھا تھا۔ مجھے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب وہ ایسی شرمناک زندگی نہ گزارے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے میں بہن کے دروازے تک نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اب ہر اٹھ کر بیٹھنے وقت اب میرا سر جکرانے لگتا تھا۔

میں بہت دیر تک اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور خیال ہی خیال میں فہم احمد کو قتل کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد فہم احمد زیر لب مقدس آیتیں پڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی اور میرے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”تمہارے دیکھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ بیٹارانی تمہیں سب کچھ بتا چکی ہے۔“

میں نے غصے کی حالت میں حوک اڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ مجھے بتا چکی ہے کہ تم کتنے بڑے شیطان ہو۔ مجھے بیماری سے اٹھنے دو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا ہی ہوا کہ تم بیمار ہو۔ نہ زیادہ جیج سکتے ہو نہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ اس طرح میں سکون سے کچھ باتیں کر سکوں گا۔ ابھی بیٹارانی کو تمہارے گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ٹیکسی ایک ایسا چور رہا ہے جہاں سے شرکار آدمی

نہیں بگاڑے گا اس کا سر میرے سامنے شرم سے جھکے گا بشرطیکہ اسے شرم آجائے لیکن تم اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے کیونکہ وہ تمہارا اصلی بہنوئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے فہم احمد کا ڈر نہیں تھا۔ میں صرف محلے والوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اس خیال سے میں نے اپنے بستر کے سرہانے کی طرف سے ذرا سا اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا، میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت گلی دیران تھی صرف ایک کتا چل تندی کر رہا تھا۔ لیکن جس وقت بیٹارانی میرے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چند قدم آگے بڑھی اسی وقت سامنے میری بہن کے مکان کا دروازہ کھلا۔ فہم احمد سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی طرف جانے والا تھا۔ ہم دونوں کے مکان کے درمیان تقریباً پارک کا فاصلہ تھا، اسنے قریب سے وہ بیٹارانی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بیٹارانی بھی رک کر اسے دیکھنے لگی۔

پہلے تو فہم احمد نے میرے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ شاید میں نظر آؤں گا۔ پھر اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا میں تاریکی میں پردے کے پیچھے تھا اسے نظرنہ آسکا پھر اس نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی طرف سے بدنامی نہ چھینٹا اڑ کر اس کے اجلے دامن تک نہیں آسکے گا تو وہ بیٹارانی سے نظریں ملا کر اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ بھیرتے ہوئے سنی خیز انداز میں مسکرائے لگا۔ بیٹارانی کی پشت میری کھڑکی کی جانب تھی اس لیے میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہ نفرت کا اظہار کرے گی اور اس کینٹ پر حوک کر چلی جائے گی لیکن وہ اپنی کرسی پر ہاتھ رکھے ایک ادائے ناز سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ساڑھی کا آچل اٹھکا دیا پھر سینہ تان کر ایک ہاتھ سے پرس کو جھلاتی ہوئی نکلتی اور بل کھاتی ہوئی فہم احمد کی طرف بڑھنے لگی۔

اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر فہم احمد ایک دم سے بوکھلا گیا اور بدک کر مسجد کی طرف حیزت قدموں سے جانے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بیٹارانی وہاں سے پلٹ گئی پھر کھڑکی کے پاس آکر آہستگی سے ہوئی۔

نہارے گھر پہنچا دیوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی باتیں میرے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھیں۔ میں جو کچھ کرتا رہا اب وہی میرے سامنے آیا۔ کیا اتنے شرمناک واقعے کے بعد مجھے عبرت حاصل ہو سکتی تھی؟

ہاں عبرت حاصل ہوئی لیکن میں کس طرح شرافت سے زندگی گزار سکتا تھا اور دوسروں کو گمراہی سے بچا سکتا تھا؟ کیا بیلا رانی جیسی عورتیں میری ٹیکسی میں آکر بیٹھیں تو میں انہیں مستحسن شروع کر دیتا؟ نیک ہدایت دینے والے اس دنیا میں بہت ہیں لیکن نیکی بڑھی کیس نہیں ہے۔ بیلا رانی کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاؤں گا تو اس کے لیے ہزاروں بلیکبیلوں کے دواؤں سے کھلے ہیں، بیلا رانی تو بے کر کے شریفوں کی دنیا میں آئے گی تو پھر کوئی شریف آدمی غیر شرعی دین مراد کر کے ایک عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں آپ کو بھی سمجھاتا ہوں اور میں اس دنیا کے ہادی اور معلمین کو بھی سمجھاتا ہوں کہ تم اب تک غلطی سے چوروں، دغاخوؤں اور غلط کاروں کو سمجھاتے آئے ہو۔ دراصل تمہیں شریف آدمیوں کو سمجھانا چاہیے کیونکہ اس دنیا کی زیادہ سے زیادہ غلامتیں شریف گھرانوں کی دہلیز سے نکل کر فٹ پاتھ پر آتی ہیں۔

نعیم احمد جلد ہی شمشاد کو لے کر میرے پاس آگیا۔ شمشاد اپنے چار برس کے لڑکے کو اٹائے دوڑاؤں پر آکر کھڑی ہو گئی مگر میرے کمرے کے اندر نہیں آئی۔ اس کا جھکا ہوا سر ہار تھا کہ اسے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔

”شمشاد! تم اندر آؤ اور اس خبیث کو باہر جانے دو اگر میں بستر سے اٹھنے کے قابل نہ ہوں تو اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔“

شمشاد اندر نہیں آئی۔ نعیم احمد باہر نہیں گیا۔ اس نے کہا۔

”شیدے“ تو احمق ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیلا رانی میری زندگی سے نکل کر کہاں پہنچا جاتا ہے؟ اس معاشرے میں نبی کون سی عزت ہے کہ تو اس عزت کا تھوڑا سا حصہ، بہن کو دے سکے گا؟ اگر حقیقت کی طرف سے دیکھے گا تو یہ شمشاد، بیلا رانی کی سطح پر زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے وقت عقل کی

ایک بار ضرور گزرتا ہے۔ ٹیکسی میں شریف عورتیں بھی سفر کرتی ہیں اور بازاری بھی۔ مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ بیلا رانی بازاری بن چکی ہے مگر تمہیں اپنی ٹیکسی میں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔“

”میں کسی کو بلائے نہیں جاتا سواریاں خود ہی ہاتھ اٹھا کر مجھے بلاتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ آگئی اور اس نے تمہارے شیطانی چہرے کو نکال دیا۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی میری بہن کو یہاں لے آؤ۔“

”تمہاری بہن جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے یا مجھے بدنام کرنا چاہو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی بدنام ہوگی۔ شریف احمد ایک اگلی پرہ ہے جس کے پیچھے تمہاری شریف بہن عزت سے زندگی گزار رہی ہے۔“

میں نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“

”شیدے! غصہ کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ شادی سے پہلے تمہاری بہن ماں بننے والی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ہوں جس نے تمہیں بدنامی سے بچایا ہے۔ اگر میں اس منکاہ کی تہنوی کو اپنے گھر نہ لانا تو کیا اس وقت بھی تم اسی طرح چیخ کر کہہ سکتے تھے کہ تمہاری بہن بدکار ہے۔ نہیں ایک بھالی اپنی زبان سے اپنی بہن کے لیے ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا اور آج بھی تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ وہ آج بھی بدکار ہے مگر وہی بھلائی پر چڑھے ہوئے چاندی کے ورق کی طرح وہ پتیلی اور عزت دار زندگی گزار رہی ہے۔ اس عزت کی چمک کے پیچھے وہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ وہ کیسی ہے؟ میں کیا ہوں؟ یہ نہ دیکھو۔ تم کہیں اور کیسے کاشت لے کر فکرو گے تو یہ ساری دنیا تمہیں بڑی گھٹاؤنی نظر آئے گی۔“

”میں تمہاری ان فضول باتوں کو سمجھتا نہیں چاہتا۔ تم ابھی جاؤ اور میری بہن کو یہاں پہنچاؤ۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

”میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم ٹیکسی چلاؤ وقت دوسروں کی بہنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہو۔ انہیں ان کے گھر بھی واپس لے آتے ہو۔ میں بھی تمہاری بہن کو

باری اٹھا کر آگے بڑھا تو لسیلہ کے چوراہے پر چاروں طرف سے پولیس کی گاڑیوں نے میری ٹیکسی کو گھیر لیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے ٹیکسی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑ لیے گئے۔ میری ٹیکسی کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان ایک بڑا سا نمبر رکھا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے جب مجھے بھی ہتھکڑی پڑائی تو پتہ چلا کہ اس قہیلے میں جس بھری ہوئی تھی۔ میں نے تھانے کی طرف جانے کے دوران بڑی بڑی قسمیں کھا کر جنی دلائے کی کوشش کی کہ میں مجرم نہیں ہوں، ان لوگوں کو میں نے پہلے نہیں دیکھا جو جس کا تھیلہ لے کر کیس جا رہے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور کب ایماندار اور شریف سمجھتے جاتے ہیں؟ کسی نے میری سچائی کا یقین نہیں کیا۔ تھانے کا انچارج اتنا ایماندار تھا کہ ان تین مجرموں کی بڑی سے بڑی رشوت بھی کام نہ آسکی، اس نے ہم سب کے باری باری بیانات لیے۔ جب میرے بیان دینے کے بارے آئی تو میں نے ٹیکسی کے ڈیش بورڈ سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ نکال کر بتایا کہ میں نے ایک برس پہلے فرسٹ ڈیویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ حالات مجھے ٹیکسی ڈرائیور بنا کر ایک ایسی جگہ لے آئے ہیں جہاں صرف چور بد معاش آتے ہیں۔ تھانے کا انچارج واقعی شریف آدمی تھا۔ وہ میری تعلیمی صلاحیتوں اور میری باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ مسافروں کو ٹیکسی میں بٹھانے سے پہلے ان کا سامان چیک کرنے کا دستور نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی میں بیٹھنے والے غیر قانونی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہیں پھر بھی اکثر ٹیکسی ڈرائیور بدست مجرموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی ٹیکسیوں کو جرائم کا اڈہ بناتے ہیں۔ اگر کوئی شریف آدمی تمہاری شرافت کی ضمانت دے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس وقت تک تمہیں حالات میں رہنا پڑے گا۔ کوئی ایسا آدمی ہو تو مجھے اس کا نام اور پتہ بتاؤ، میں اسے یہاں لایوں گا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کس شریف آدمی کا نام اور پتہ بتاؤں۔ اس دنیا میں شریف آدمی نادر ملتے ہوں گے لیکن میں زندگی کے جس ٹریفک سے گزرتا آیا ہوں وہاں کوئی شریف آدمی کبھی نظر نہیں آیا۔ اب میں تھانے کے انچارج سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جواباً

ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اپنی آنکھوں میں کوئی عیب ہو تو تاریک شیشوں کی عینک لگا کر اسے چھپایا جاتا ہے۔ اس طرح سیاہ چشمے سے گورے چہرے کا حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہر برائی کو چھپانے کے لیے ایک خوب صورت نقاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس محلے میں جو میری شہرت جو میری عزت ہے اس سے زیادہ خوب صورت نقاب تیری بہن کو نہیں مل سکتا۔ اچھی طرح سوچ لے تو شمشاد کو مجھ سے چھین کر اس کی زندگی برباد کر دے گا۔“

وہ جھوٹی عزت کا مجرم قائم رکھنے کے لیے بڑی عمدہ تجویز پیش کر رہا تھا۔ یہ بات انہی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھی اگر میں خاموش رہتا تو یہ راز ہمیں دفن ہو جاتا اور ہم سب ساج کے عزت دار افراد کی طرح پھر سے زندگی گزارنے لگتے۔ میں نے شمشاد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ پہلی بار بولی۔

”مجھے اس راہ پر لانے والا ایک معلم ایک پروفیسر تھا۔ جب تعلیم دینے والے ایسی راہوں پر لگا دیں تو ایک کے بعد دوسری راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ مجھے دوسری راہ کا یہ رہبر ملا۔ یہ میرا مجازی خدا نہیں ہے۔ مجازی کا مطلب جھوٹا اور فرضی ہے تو پھر میرے جسم و جان کا جھوٹا خدا ہے۔ اس کے بعد میں کسی تیسرے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہتی۔ میں جہاں ہوں مجھے وہیں پڑا رہنے دو۔ یوں بھی اب میں صرف تمہاری بہن ہی نہیں ہوں، اپنے اس بچے کی ماں بھی ہوں۔ یہ دنیا والوں کے لیے ناجائز سہی لیکن بچہ کبھی ماں کے لیے ناجائز نہیں ہوتا۔ میں اس بچے کی زنجیر سے فیم احمد کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ ہو سکے تو یہ گھر اور یہ محلہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ اب ہماری نگاہیں ٹپکس۔ کم از کم بھائی بہن کی آنکھوں میں اتنی توجہ ہو کہ وہ بدکار زندگی کے آئینے میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ حیا کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ جب سے وہ دروازے پر آئی تھی اس نے ایک بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی تھی اور تب یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جنہیں ہم گناہ کار کہتے ہیں وہ ہمارے تمہارے سامنے لباس تو ضرور کھوتی ہیں لیکن حیا سے آنکھ نہیں کھولتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں شرم اگر کیس ہے تو صرف عورت کی آنکھ میں ہے۔



کبھی کبھی میری ٹیکسی جرائم کا اڈہ بن جاتی ہے۔ رات کے وقت میں گرومنڈر سے

تھانے کے انچارج نے پوچھا ”تم کہاں رہتے ہو؟“

”اورنگی ایک نمبر میں۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”رہزے پر پھل بچتا ہوں۔“

اتنے میں ایک سپاہی نے تھانے کے انچارج سے کہا۔

”سر! آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں۔ یہ بیلارانی اس تھانے میں کئی بار آچکی ہے۔ یہ پیشہ کرنے والی عورت ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اس نوجوان سے شادی کر چکی ہے۔“

تھانے کے انچارج نے گھور کر بیلارانی اور مصلح الدین کو دیکھا۔ بیلارانی نے جلدی سے کہا۔

”حضور! پہلے میں بری عورت تھی مگر خدا کی قسم میں چھ ماہ سے ایک وفادار بیوی بن کر مصلح الدین کے ساتھ شرافت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اگر میں پہلے کی طرح ہوتی تو اتنی بری سے یہاں نہیں آتی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہاں کے تمام سپاہی مجھے جانتے ہیں۔ اہ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ چونکہ میں جھوٹی نہیں ہوں اسی لیے اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوں۔“

تھانے کے انچارج نے کہا۔

”یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم شرافت کی زندگی گزار رہی ہو لیکن ہم نہیں جانتے کہ تم بے تک مستقل مزاجی سے عزت سے زندگی گزارو گی۔ ابھی تم آزمائشی دور سے گزر رہی۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تمہاری کوئی ضمانت یا کسی طرح کی یقین دہانی قابل قبول نہ لی۔ تم دونوں اگر شیدے کے کام آتا چاہتے ہو تو کسی ایسے شخص کو لاؤ جو اس معاشرے کا بچنے والے کا معزز اور شریف انسان ہو۔“

میں نے سلاخوں کے پیچھے سے بیلارانی کو دیکھا۔ وہ مایوس ہو کر کبھی میری طرف اور مصلح الدین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مصلح الدین کی نگاہوں کی بے بسی بتا رہی تھی کہ ہم نے بھی اس معاشرے میں کوئی معزز اور شریف انسان نہیں دیکھا ہے۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ کانٹوں کی زندگی میں پھول کا حسن ہوتا ہے۔ سامنے کی زندگی میں سورج کی اجلی

یہی کتا کہ آوی خود شریف ہو تو اسے شریفوں کی صحبت مل جاتی ہے۔ میں نے کہا۔

”جناب! میں اس دنیا میں نما ہوں۔ میرے دن رات کا زیادہ حصہ ٹھیکسی میں بیٹھ کر با سو کر گزرتا ہے۔ کراچی شہر میں کوئی شریف آوی نما یا اپنی فیملی کے ساتھ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ ایک ہی کرائے کے مکان میں نہیں رہ سکتا۔ مالک مکان ہزار ہانوں سے اسے مکان خالی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مکان خالی کرانے کے لیے کبھی وہ اپنے مکان کو فروخت کرنے کا بہانہ کرتا ہے، کبھی بیرونی ملک سے اس کے رشتے دار آنے والے ہوتے ہیں، کبھی اس کی بیٹی کی شادی کے لیے مکان خالی کرنا پڑتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہم ایک مکان اور ایک محلے میں رہ کر وہاں کے شریف لوگوں سے تعلقات پیدا کریں اس وقت تک ہم مکان بدر اور محلہ بدر کر دیئے جاتے ہیں یا پھر وہ شریف لوگ محلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو ہماری شرافت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں ضمانت کے لیے کسے طلب کر سکتا ہوں؟ مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔“

مجھے رات بھر سوچنے کے لیے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ میرے لیے بڑی شرم کی بات تھی کہ میں اتنی طویل زندگی میں ایک بھی شریف آوی سے دوستی نہیں کر سکا تھا اگر دوستی اور تعلقات پیدا بھی کیے تو اس نے اپنی شرافت کے پیچھے چھپی ہوئی ذلالت دکھادی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے ایمان اور کون سی تہذیب کی کسوٹی پر شریف آوی پچھانے جاتے ہیں؟

میں حوالات کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا کہ اتنے میں بیلارانی آگئی۔ اس کے ساتھ ایک اچھا قبول صورت نوجوان تھا۔ اس نوجوان نے تھانے کے انچارج کو سلام کرنے کے بعد بیلارانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جناب یہ میری بیوی ہے۔ میرا نام مصلح الدین ہے ابھی میں لیبیل چوک سے گزر رہا تھا تو شیدے ٹھیکسی ڈرائیور کو آپ گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ شیدے بہت اچھا انسان ہے، اس نے ایک بار میری بیوی کو غنڈوں سے بچایا تھا۔ ہم اس خیال سے یہاں آئے ہیں کہ شاید ہم کسی طرح شیدے کے احسان کا بدلہ چکا سکیں۔ ہم غریب آوی ہیں، روپے پیسے سے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے لیکن جس طرح بھی ممکن ہو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ یہ شریف آوی چرس کا دھند انہیں کرتا ہے۔“

ایک مگلی کو آج بھی مگلی فہم احمد کہا جاتا ہے۔ غرض کہ اس دنیا میں نیک کام کر کے وہ مرنے کے بعد جنت میں جانے کے تمام اہم سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا ہے۔
اتنے اہم سرٹیفکیٹ دیکھ کر تھانے کا انچارج اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پوچھا۔

”آپ شیدے کو کیسے جانتے ہیں؟“

فہم احمد نے جواب دیا ”شیدے کی مگلی بہن میرے بیٹے کی شریک حیات ہے۔ حالات نے اسے عکسی ذرا سیور بنا دیا ہے ورنہ یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے اسی لیے میں نے اس کی بہن کو بڑی عزت آمود کے ساتھ اپنی ہوسنا یا ہے۔“
تھانے کے انچارج نے مطمئن ہو کر کہا۔

”یہ بات شیدے کو پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کہ وہ آپ جیسی معزز ہستی کا رشتے دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ اتنے خوددار ہوتے ہیں کہ بہن اور بیٹی کے سسرال والوں کو تھانے پکڑی میں بلا کر زحمت نہیں دیتے ہیں بہر حال آپ شیدے کو ساتھ لے جائیں مگر اس کیس میں جب بھی شیدے کی طلبی ہو، اسے عدالت میں حاضر کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔“

فہم احمد نے ذمہ داری لے لی اور میں رہا کر دیا گیا۔ حوالات کے آئینی دروازے سے نکلنے وقت یہ عقدہ حل ہو گیا کہ اس معاشرے کے شریف آدمی صرف کیریئر سرٹیفکیٹ میں پائے جاتے ہیں۔

میں نے فہم احمد سے بات نہیں کی۔ تقریباً دو برس سے میں نے اس کی اور اپنی بہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وہ عہد ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے زیادہ کمینہ آدمی مجھ سے زیادہ شریف بن کر میری ضمانت کے لیے آجائے گا۔ مجھے اس کا احسان نہیں لینا چاہیے تھا، اسی طرح حوالات میں رہنا چاہیے تھا مگر اس کجمنت نے تھانے میں آکر بھی بڑی معصومیت سے کہہ دیا تھا کہ میری بہن اس کے گھر میں ہے۔ ایسی صورت میں میں اس کی رشتہ داری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تھانیدار کے سامنے میرے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

میں فہم احمد کی ساتھ تھانے سے باہر اپنی عکسی کے پاس آیا۔ وہاں بیلا رانی بچھلی

اور شفاف کر نہیں ہوتی ہیں۔ پھر ہم جیسے ذلیل انسانوں کی زندگی میں کوئی اچلے بے داغ وامن والا شریف آدمی نظر کیوں نہیں آتا۔ آخر یہ شریف آدمی کہاں پائے جاتے ہیں۔
بیلا رانی اور مصلح الدین وہاں سے اٹھ کر کسی معزز آدمی کی تلاش میں چلے گئے میں بیلا رانی کے حلق سوچنے لگا۔ میں نے اسے کبھی غنڈوں سے نہیں بچایا تھا، وہ خواہ مخواہ میرے ناکرہ احسان کا بوجھ اٹھانے آئی تھی۔ میں سمجھ گیا اس نے صرف تھانیدار کو متاثر کرنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی کہ وہ مصلح الدین سے شادی کر چکی ہے۔

ایک محضہ بعد میں نے سلاخوں کے چپچپے سے فہم احمد کو دیکھا۔ وہ ایک بغل میں قائل دیائے اور دوسرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے کی ایک چھری پکڑے ہوئے تھا۔ بدن پر کفن کی طرح سفید لباس تھا جو اس کی شخصیت اور کردار کو اجلا اور بے داغ بنا رہا تھا۔ اس کی پیشانی کا داغ اور خضاب رسیدہ مختصر سی داڑھی اس کے شریف اور ایماندار ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہی تھیں۔ وہ حسب معمول زیر لب مقدس آیتیں پڑھ رہا تھا۔ میں چیخ کر مٹا چاہتا تھا اس کی زبان سے ان مقدس آیتوں کو چھین لو، کلام پاک کو فغان نہ بناؤ۔ کیا یہ ہدایات دینے والی کتاب ایسے ہی بے ایمان نمازیوں کے لیے اتاری گئی ہے؟

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ میری زبان کھلتے ہی اس کے ساتھ میری بہن بھی بدنام ہو جاتی۔ ویسے بھی کیا ہم سب اپنے جھوٹ کو کچ ثابت کرنے کے لیے اور اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے خدا کی قسم اور کلام پاک کی قسم نہیں کھاتے ہیں؟ وہ بھی مقدس آیتوں کو کھارہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر تھانے کے انچارج کو سلام کرتے ہوئے معافہ کیا اس کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ کر قائل کو کھولنے ہوئے کہا۔

”بندے کو شیخ فہم احمد کہتے ہیں۔ خاکسار اب سے بارہ برس پہلے اپنے محلے کالہ ڈی ممبر اور اس کے بعد جیرمین رہ چکا ہے۔ یہ دیکھیے یہ ہیں کانڈاٹ۔۔۔۔۔“

وہ فائل سے ایک ایک کانڈ نکال کر دکھانے لگا۔ وہ کانڈاٹ بتا رہے تھے کہ وہ اپنے محلے کا سب سے عزت دار اور مخلص انسان ہے۔ اس نے جیرمین بننے کے بعد محلے میں پانی کے ٹکے لگوائے ہیں، پرائمری اسکول کھولا ہے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ محلے کی

میرے منہ پر پھر ایک طمانچہ پڑا۔ بیلا رانی کے ساتھ میری۔۔۔ بہن کا نام آرہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی روک دی۔ پھر اپنا سر اینٹریگ پر ٹیک دیا کیونکہ میرا سر چکر رہا تھا۔ جو بھی اگلے سیدھے رشتے قائم ہو چکے تھے میں انہیں کہاں تک جھٹلا سکتا تھا۔ میں ایک عزت دار بد معاش کا سالا کھلانے سے انکار کر سکتا تھا لیکن بیلا رانی اس سچائی سے انکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور میری بہن کا بیٹا آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں اور ایک ہی نعیم احمد کی اولاد ہیں۔

نعیم احمد نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجائی۔

”خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں یہاں سے رکشے میں چلا جاؤں گا۔ تم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے ذلیل انسان ہوں۔ جو گناہ کر رہا ہوں اس سے توبہ نہیں کر سکتا۔ توبہ کروں گا تو شمشاد اور اپنے بیٹے سے رشتہ توڑنا ہو گا۔ رشتہ ٹوٹنے کے بعد شمشاد میرے گھر سے نکلے گی تو میں دنیا والوں کو کیا کہوں گا کہ میری بہو کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ کس کا بچہ لے کر جا رہی ہے؟ خدا کے لیے تم دونوں میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے بے غیرت بن کر نیک نام رہنے دو۔“

میں نے دروازے کی طرف اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”جا بھاگ یہاں سے۔ ذلیل کیٹنے! نہ میری کوئی بہن ہے نہ تجھ سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ تو صرف بیلا رانی کی دھمکی سے گھبرا کر میری ضمانت کے لیے آیا تھا۔ جا اب یہ تجھے دھمکی نہیں دے گی۔“

وہ دروازہ کھول کر جانے لگا تو بیلا رانی نے کہا۔

”دھمکی کیسے نہیں دوں گی؟ شیدے جب بھی عدالت میں تیری پیشی ہوگی۔ یہ الوداع چھاتیرے ضامن کی حیثیت سے ضرور آئے گا۔ نہیں آئے گا تو اس کی شرافت کی ایسی تیسی کر کے رکھ دوں گی۔“

”میں آؤں گا تو جب بھی بلائے گی میں چلا آؤں گا۔“ اس نے گڑگڑا کر کہا ”مگر تو میرے محلے میں نہ آنا خدا کے لیے میری عزت رکھ لینا۔“

وہ عزت کی بھیک ان سے مانگنا رہا جو بے عزت تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی اشارت کی اور اسے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بیلا رانی نے کہا۔

سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نعیم احمد میرے ساتھ سامنے والی سیٹ پر آگیا۔ میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”بیلا! تم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری ہمدردی میں اب تک یہاں موجود رہیں۔“

بیلا رانی نے خوشی سے لہک کر کہا۔

”ارے واہ! میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوئی اس شریف مرغے کو میں ہی تو پکڑ کر لائی ہوں؟“

میں نے حیرانی سے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا نعیم احمد کو تم بلا کر لائی ہو؟“

”ارے شیدے! تو نے بھی گھاس کھائی ہے۔ مجھ جیسی ٹیکسی کے بلانے سے بھلا کوئی شریف آدمی گھر سے نکل کر آ سکتا ہے؟ میں نے مصلح الدین کو قاصد بنا کر اس کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ تیرا سالا شیدے حوالات میں ہے۔“

میں نے غصے سے کہا ”تو اس مت کر میں اس بد معاش کا سالا نہیں ہوں۔“

وہ بولی ”تیرے انکار کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی تو گرم کیوں ہوتا ہے چل تجھے سالا نہیں کہوں گی پہلے میری بات تو سن لے۔ تیرا یہ ہونکی، نہیں۔۔۔ پھر مجھ سے بھول ہو گئی اسے تیرا ہونکی کہوں گی تو پھر سالا بن جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حرامی رشتوں کو دنیا والوں کے سامنے کن رشتوں سے پکارا جائے؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ سالا نعیم تیری ضمانت کے لیے یہاں آنے سے انکار کر رہا تھا۔“

نعیم احمد نے عاجزی سے کہا۔

”دیکھ بیلا رانی! میں عزت دار آدمی ہوں، مجھے گالی نہ دے کیا تو سیدھی طرح بات نہیں کر سکتی؟“

”کیا تو سیدھی طرح تھانے آگیا تھا؟ میں نے مصلح الدین کے ذریعے دھمکی دی تھی کہ شیدے کی ضمانت نہیں لے گا تو میں تیری پار سائی کا پول کھول دوں گی۔ محلے والوں سے کہوں گی کہ وہ تیرے جوان بیٹے کا معائنہ کر ا میں اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ بیلا رانی اور شمشاد کی گود میں ایک ایک بچہ کہاں سے آیا ہے؟“

”شیدے! اتنی زندگی گزارنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے زندگی گزاریں؟“
 کس سے محبت کریں اور کس سے نرت کریں؟ کس کی عزت کریں اور کس کی بے عزتی کریں؟ میں نے جھٹلا کر فہم احمد کی جو بے عزتی کی ہے اس میں کھوکھلا پن ہے کیونکہ میں بالواسطہ اس کی عزت کرتی ہوں یعنی اس کی دی ہوئی بیٹی جو میرے پاس ہے میں اس بیٹی سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے شریف خون کو بازار میں نہیں لاسکتی۔ وہ میری بھی بیٹی ہے، میں اسے عزت و آبرو سے دلن بنا کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔ سوچا جائے تو میں اس شیطان کی عزت کا بھرم رکھ رہی ہوں۔ سوچا جائے تو تو بھی سر بازار اسے بہن کی خاطر گالیاں نہیں دے سکتا، دنیا والوں کے سامنے اس کی عزت کرنے پر مجبور ہے۔ ہم لوگ جو عزت والے نہیں ہیں، اسی طرح دوسروں کو عزت دے رہے ہیں۔“
 عزت کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ اب وہ بھی عزت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بیچ بچ تو نے مصلح الدین سے شادی کر لی ہے؟“
 ”ہاں شادی تو ہو گئی ہے مگر بیچ بچ تو ہو گئی ہے یا نہیں؟ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“

”اس بات کا مطلب کیا ہوا؟“

”مطلب یہ ہوا کہ مصلح الدین کے ماں باپ مجھے بھونانے کے لیے راضی نہیں تھے۔ اس کا باپ بہت دولت مند ہے، پھلوں کا ٹھوک بیوپاری ہے۔ مصلح الدین مجھ پر جان دیتا ہے۔ جب اس نے ماں باپ کی بات نہیں مانی تو اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ وہ میرے عشق میں ثابت قدم نکلا۔ اس نے بہت نہیں ہاری۔ اس میں یہ حوصلہ اس لیے بھی پیدا ہوا کہ میں نے پرانے دھندے سے توبہ کر لی تھی۔ میں اپنی لڑکی مونا کے ساتھ ایک دو وقت کے فالتے سرگئی تھی مگر جاگ کی تلاش میں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اگر ایک عورت اپنے مرد کے اعتماد کے مطابق پچھلے گناہوں سے توبہ کر لے اور آئندہ بار بار سا اور فقاواریں کر رہے تو مرد پورے غلوں، لگن اور تہدی سے اپنے گھر کی جنت آباد کر لیتا ہے۔ مصلح الدین اپنے گھر سے کچھ پیسے لے کر نکلا تھا۔ اس نے ان پیسوں سے پرانا ہڑو خریدا ہے اور فٹ پاتھ پر پھیل بچا کرتا ہے۔ ہم نے اور گئی میں ایک کمرے کا مکان کرائے پر لیا ہے اس گھر میں

میری بیٹی مونا کی معصوم باتیں ہیں اور میرے تحت کرنے والے مرد کا پیار ہے۔ ہائے شیدے! میں بیان نہیں کر سکتی کہ جب وہ دن بھر کی محنت کی کمائی لا کر میری ہتھیلی پر رکھتا ہے تو میں اپنی ہی نظر میں کتنی عزت واری ہو جاتی ہوں۔“

”میں نے تجھ سے یہی پوچھا کہ تو اس کی بیوی بن چکی ہے یا نہیں؟“

”ہاں ایمانداری سے بن چکی ہوں مگر کسی ایمان والے قاضی نے میرا نکاح نہیں پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ پہلے اپنے ماں باپ کو یا کسی بزرگ کو ساتھ لاؤ مگر اس کے بزرگ فٹ پاتھ کی عورت کو اپنی بوسنیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قاضی اور مولوی کے پاس گئے لیکن سب یہی سمجھتے تھے کہ مصلح الدین مجھے کہیں سے بھگا کر لایا ہے اور چوری چھپے نکاح پڑھانا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے کورٹ سے اجازت حاصل کریں۔ جب اجازت مل جائے گی تو شرعی طور سے نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ کورٹ میں جانے کے لیے وکیل کی ضرورت تھی اور وکیل کے لیے فیس کی ضرورت تھی ابھی مصلح الدین نے پھل بیچنے کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تھا۔ اتنے پیسے فاضل نہیں تھے کہ ہم وکیل اور عدالت کے چکر میں پڑتے۔ جب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ہم تھک ہار کر گھر میں آ بیٹھے۔ میں نے باپوسی سے کہا۔

”مسلے! کیا یہ دنیا نہیں چاہتی ہے کہ میں شریف عورت بنوں؟“

وہ محبت سے بولا ”نہیں بیلا! اللہ تعالیٰ جب اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے تو انہیں ایسی ہی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔“

”میں تو بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گزر جاؤں گی۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے تیری فکر ہے تو یہاں ایک ہی کمرے میں مجھ سے ذرا دور سوتا ہے۔ نہیں سوتا نہیں ہے رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے مگر نکاح سے پہلے میرے ساتھ سونا گناہ سمجھتا ہے۔ ایسے تو راتیں جاگ جاگ کر بیدار پڑ جائے گا۔ آوی کو اتنا بھی شریف نہیں ہونا چاہیے کہ کھانے کی پلیٹ سامنے رکھ کر بھوکے پیٹے کروٹیں بدلتا رہے۔“

”مگر بیلا! کیا کھانا حرام ہوتا ہے۔“

”تو کسی طرح مجھے حلال کر دے۔“

وہ مجھے گہری لگن سے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے حاصل کرنے کی

”اول ہونہ میں شادی کی پہلی ہی رات عورت کے پیے اپنے ذمے رکھنا نہیں چاہتا۔ شرم محمدی کے مطابق انسان کی حیثیت دیکھ کر مہر کی رقم مقرر کی جاتی ہے۔ اس وقت میری حیثیت فقہ رقم کی صورت میں نہیں بلکہ مال کی صورت میں یہ پھل وغیرہ ہیں ان میں سے کچھ پھل میں تیرے مہر کے لیے مخصوص کر دوں گا پھر تیرے حصے کے پھل جیسے جیسے فروخت ہوتے رہیں گے میں ان کے پیسے لا کر تجھے دیتا رہوں گا۔“

میں نے یہ بات منظور کر لی۔ پھر اس نے نکاح پڑھاتے ہوئے کہا۔

”بی بی زینب! التاء عرف بیلارانی! کیا تم مصلح الدین ولد معین الدین کو اپنے نکاح میں بوجھ ایک درجن مالے، ایک میر سیب اور دو درجن کیلے بطور مہر مہل قبول کرتی ہو؟ کو میں نے قبول کیا۔۔۔۔۔“

میں نے تین بار قبول کیا۔ اس نے میرا ہاتھ تمام کر مجھے وہاں سے اٹھایا اور اپنے بستر پر لا کر بٹھایا۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے اسٹین لیس انگلی کی انگوٹھی نکال کر میری انگلی میں پہنائی۔ اس کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا۔ مجھے پار کیا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اتنی لمبی عمر گزارنے کے بعد پہلی بار ایک سچے مرنے والے مجھے زندگی کی سچی سرسبزی دیں۔ خدا کی قسم یہ دنیا ایسی لیے خوب صورت ہے کہ ابھی یہاں مصلح الدین جیسے اصلاح کرنے والے اور ذلت کی ماری ہوئی عورتوں کو عزت دینے والے موجود ہیں۔

”شیدے! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دنیا والوں کی نظروں میں ہمارا نکاح ہو چکا ہے یا نہیں مگر میں مطمئن ہوں کہ اس نکاح کے بعد میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک شریف آدمی کی پناہ میں آؤں گی۔“

میں بیلارانی کی باتوں سے اور مصلح الدین جیسے اصلاحی جذبہ رکھنے والے نوجوان سے بے حد متاثر ہوتا رہا۔ میں نے کہا۔

”بیلا! تو نے یہ اچھا کیا کہ مصلح الدین سے شادی کر لی۔ اس طرح تجھ سے زیادہ تیری بیٹی مونا کو تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ جب وہ جوان ہوگی تو مصلح الدین کی سرپرستی میں کوئی اسے غلط نظروں سے دیکھ نہیں سکے گا۔“

”میری مونا بہت اچھی ہے بہت خوب صورت ہے۔ ابھی چھ برس کی گزیا ہے، مجھے اسی کی فکر کھائے جاری تھی، اب تمام فکروں سے آزاد ہوں۔ میں مرنے کی تب بھی

شدید خواہش تھی اس نے اپنی خواہش سے مجبور ہو کر کہا۔

”تجھے حلال کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ میں خود ہی دلہا اور خود ہی قاضی بن جاؤں۔ خداوند کریم ہمارے نکاح کا گواہ ہو گا۔ شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے نیک نیتی سے جو کام کرو وہ خدا کو منظور ہوتا ہے۔ بول اس طرح نکاح قبول کرے گی؟“

”ہاں ہزار بار قبول کر دوں گی۔“

”ہزار بار نہیں، صرف تین بار“ قبول“ کہتا ہو گا۔ چل اب اٹھ کے وضو کر لے۔“

ہم دونوں نے وضو کیا۔ ہمارے کمرے کی ایک دیوار پر کعبہ کی سمت اللہ اور محمد کی طہرے لگے ہوئے ہیں۔ ہم ادھر منہ کر کے بیٹھ گئے۔ مصلح الدین زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے مگر اسے سورہ فاتحہ اور چاروں قل اچھی طرح یاد ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔

”بی بی زینب! التاء عرف بیلارانی! میں مصلح الدین ولد معین الدین تمہیں اپنے نکاح میں بوجھ دین مہر۔ ارے ہاں میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ مہر کی رقم کتنی ہوگی؟ اس وقت میرے پاس صرف بارہ روپے ہیں۔“

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا ”میرا رب بارہ روپے نہیں ہے۔“

وہ ایک دم سے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی فوراً ہی عقل آگئی کہ نکاح کے وقت ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ میں نے ندامت سے کہا۔

”بیلا! مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں یہ بات میری زبان پر کیسے آگئی۔ مجھے مہر کی رقم بارہ روپے منظور ہے۔“

اس نے کہا ”لیکن میں نے یہ بارہ روپے کل صبح راشن لانے کے لیے رکھے ہیں۔“

”میں مہر کی رقم سے راشن لے آؤں گی۔“

”نہیں بیلا! نہ میں عورت کی کمائی کھاتا ہوں اور نہ ہی میں تجھے دی ہوئی مہر کی رقم راشن کے لیے واپس لوں گا۔ شادی سے پہلے وال راشن کی فکر ضروری ہے۔ یہ پیسے راشن کے لیے رہیں گے۔“

”اگر فقہ رقم نہیں ہے تو مہر مہل کی کیا ضرورت ہے جو فوراً ادا کیا جاتا ہے، ابھی مہر مہل ہونا چاہیے یعنی جب میں مطالبہ کروں گی تو مجھے وہ رقم ادا کر دینا۔“

ہوتی ہے، کل سے میں روز صبح یہاں آیا کروں گا اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسکول پہنچایا کروں گا۔ یہ اسکول کے نئے کپڑے پہنے گی اس کے نئے بیٹے میں نئی کتابیں ہوں گی اور ہم تینوں مل کر اسے ایک نئی اور صاف ستھری زندگی کا درس دیا کریں گے۔“

بیلا رانی کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسوؤں کی جھللاہٹ میں اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھ رہی تھی اور اس کے مستقبل تک جو راستہ گیا تھا اس راستے کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔



کبھی کبھی میری عیسی سیاست کا اکھاڑہ بن جاتی ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامے ہو رہے تھے، جلسے جلسوں کی ہنگامہ آرائیاں کا دوبار زندگی کو متعل کر رہی تھیں۔ شاہراہوں اور گلی کوچوں کے نقشے بدل گئے تھے۔ جہاں زندگی کی رونق تھی وہاں اسی زندگی کو ختم کرنے کے لیے گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ تیس برسوں میں کتنی ہی بار انقلاب لانے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کا فریب دیا گیا۔ ہر فریب کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلائی گئیں۔ اب پھر نئے انقلاب کے لیے چراغ روشن کیے جا رہے تھے اور یہ چراغ غریبوں کے گھر سے روشن ہو رہے تھے کیونکہ سڑکوں پر دی مارے جا رہے تھے اور کرفو کے واقعات میں آمدنی اور راشن کے بغیر دی بھوکے مر رہے تھے۔ جنہیں کھانے کے لیے کچھ مل جاتا تھا وہ اپنے گھروں میں تاش کی بازیاں جتا رہے تھے جنہیں کچھ نہیں مل رہا تھا وہ چوریاں کر رہے تھے۔ جنہیں چوریوں سے دولت حاصل ہو رہی تھی وہ کرفو کے سنہری مواقع کو اور طول دینے کے لیے سڑکوں پر ہنگامے کر رہے تھے۔ دیانت داری سے انقلاب لانے والے کم تھے اور کرپشن پڑھانے والے زیادہ تھے۔ یہ بات لوگوں کے سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ انقلاب لانے سے پہلے عوام کے ذہنوں میں قیمری انقلاب لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک غریب اور جہالت رہے گی اس وقت تک کوئی بھی نظام سچائی سے قائم نہیں ہو سکتا۔

میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی عیسی کا میٹر خراب کر دیا تھا کیونکہ ان دنوں لوگ حواس باختہ تھے، ہنگامے کے دوران ادھر سے ادھر بھاگتے تھے اور مجھے منہ مانگا گرایہ دیتے تھے۔ میری عیسی میں دونوں طرف کے سیاسی کارکن دفن دفن آکر بیٹھے تھے اور ایک

مصلح الدین باپ بن کر کسی شریف گھرانے میں اسے بیاہے گا۔ میری آخری تمنائی یہ ہے کہ میری گڑیا رانی کو ایک اچھا گھر اور ایک اچھا شوہر ملے۔ تم اسے دیکھو گے تو اس پر بڑا پیار آئے گا۔ کیا تم میری گڑیا رانی کو دیکھو گے؟“

”ہاں میں اس معصوم کلی کو ضرور دیکھوں گا جس کی حفاظت کے لیے تم نے منہ کار زندگی سے توبہ کرنی ہے اور اس بچی کے اطراف شرافت کی مضبوط دیواریں کھڑی کر دینی ہو۔ اسی لیے تو میں اور بچی کی طرف جا رہا ہوں۔“

بیلا رانی نے حیرت سے کہا۔

”اے ہاں! مجھے تو باتوں میں یاد ہی نہ رہا کہ تم میرے ہی گھر کی طرف جا رہے ہو۔ میں نے مصلح سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر میں رہے کیونکہ موٹا وہاں اکیلی ہے۔ یہ سوچ کر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میری بیٹی کی حفاظت کے لیے اس کا ایک باپ موجود ہے۔“

وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتانے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے اس کے گھر کے سامنے عیسی روک دی۔ مصلح الدین نے باہر نکل کر ہمیں دیکھا۔ اس نے میری رہائی پر مبارکباد دیتے ہوئے مصافحہ کیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے اور چھوٹے سے آنگن کا گھر تھا۔ اس گھر میں چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزیں تھیں اور جو سب سے بڑی چیز تھی وہ موٹا کا پیار تھا۔

وہ معصوم بچی ایک چار ہونٹ پر سو رہی تھی۔ وہ صرف چھ برس کی تھی مگر قدمیں ہاں کے کانڈھے کے برابر ہوتی جا رہی تھی۔ بچے یوں بھی معصوم ہوتے ہیں مگر نیند میں اور بھی معصوم نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب ان کے خوابوں میں صرف پریاں اور شہزادے آتے ہیں اس زندگی کا کوئی البیہ ان معصوم خوابوں کو مجروح نہیں کرتا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے زندگی کی تمام غلاخٹوں سے نکل کر ایک ایسی خوب صورت دنیا میں آگیا جہاں صرف نئی نسل کے ننھے منوں کی معصومیت ہوتی ہے۔

میں وہاں بہت دیر تک بیٹھ کر باقیں کرتا رہا۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر چائے پینے کے بعد میں نے جیب سے دس روپے نکال کر خوابیدہ موٹا کی مٹھی میں رکھ دیئے اور بیلا رانی سے کہا۔

”یہ صرف تم دونوں کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے مجھے بتاؤ کہ یہ کس اسکول میں پڑھنے

بھی بھی تھی میری تھی، مگر اب میری نہیں رہی تھی۔ میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا وہ باہر سے اور اندر سے اس قدر جل گئی تھی کہ اب وہ مرمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے مرمت کرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے نئے سرے سے ایک نئی ٹیکسی بنانی پڑتی۔ یعنی اسے دوبارہ سڑک پر لانے کے لیے کم از کم اس پندرہ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے سر جھکا کر ایک کباڑیہ کے پاس پہنچا۔ کباڑیہ سے اس کا سودا کرتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔

کباڑیہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس آہنی ڈھانچے کی قیمت اتنی گرا دی کہ میں نے اسے پچنا مناسب نہیں سمجھا دو گھنٹے کے بعد جب میں اس ٹیکسی کی طرف واپس آیا تو اتنی دیر میں وہ آدمی رہ گئی تھی۔ جو کل پرزے کام کے رہ گئے تھے۔ لوگ انہیں کھول کر لے گئے تھے اب وہ ایک بوڑھی عورت ان کی طرح اتنی کھوکھلی ہو گئی تھی کہ کوئی اس پر نظر ڈالنا ان کی گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فروخت کرنا تو دور کی بات تھی، میں نے جھنجھلا کر اسے ایک لائٹ ماری اور اسے سڑک پر پھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میں بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ کیا کروں؟ میں شریسنندوں سے پوچھتا چاہتا تھا کہ وہ میری ٹیکسی کو جلا کر اور میرے خد سے دو روٹیاں چھین کر کون سا انقلاب لانا چاہتے۔ یہ وقت اور یہ ہنگامے گزر جائیں گے تو کوئی نہ کوئی پارٹی اقتدار سنبھال لے گی مگر امن و امان کے بعد کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ غریب اور غریب ہو گئے ہیں اور بدکاری بے حیائی اور کرپشن اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

میں بھٹکتا ہوا ایٹارانی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ان دنوں ہر گھر کے دروازے پر سناٹا پڑا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی موت کی سی خاموشی تھی۔ اب سے پہلے میری گاڑی کی ٹائز اس کر مونا ڈرتی ہوئی دروازے پر آجاتی تھی، کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے جاتی تھی کبھی اسکول کی کتابیں اٹھائے میرے پاس ٹیکسی میں آکر بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے وہ بھی بری ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تھی تب سے میں نے فٹ پاتھ کی ٹیکسیوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ دو برس سے میں نے کسی بدکار عورت کا چرو نہیں دیکھا تھا صرف اس معصوم

جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور تمام راستے میں تقریر کرنے کے انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ پھر آپس میں بحث کرنے کے دوران مجھ سے بھی پوچھتے تھے کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں۔ میں ایک ناخدا ہوں جو سوار یوں کو ٹریفک کے سمندر سے گزار کر ساحل پر پہنچاتا ہے۔ میں کرائے کے سلسلے میں تھوڑی سی بے ایمانی کرتا ہوں مگر انہیں منجرباد میں کبھی ڈبو تا نہیں۔ میں اپنے ہی جیسی ہی کسی پارٹی کے ساتھ تھا جو میری طرح تھوڑی سی بے ایمان ہو لیکن اتنی ایماندار ہو کہ عوام کے جان و مال کے ساتھ انہیں بخیریت ساحل پر پہنچا دیا کرے۔

اگر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والوں سے یہ بات کہتا تو وہ میری پشت میں چھرا گھونپ دیتے۔ وہ صرف یہ سننا چاہتے تھے ان کے سامنے آنے والا ہر شخص ان کی پارٹی کا ساتھ دینے والا ہے۔ اپنی ٹیکسی کو سلامت رکھنے کے لیے اور اپنے جسم کو توڑ پھوڑ سے بچانے کے لیے جو پارٹی سوالی بن کر میرے سامنے آتی تھی میں اسی کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے کامیاب لیڈروں کے وعدوں کی طرح میرے وعدے بھی بدلتے جاتے تھے۔ اتنی سیاست کے باوجود مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دن میری ٹیکسی ان ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ دو سیاہ پارٹیوں کے ٹکراؤ کے درمیان میری ٹیکسی آگنی تھی۔ میں نے وہاں سے ٹیکسی نکال کر لے جانے کی بہت کوشش کی مگر میں خود چھراؤ کی زد میں آ گیا۔ مجھے مجبوراً ٹیکسی سے نکل کر بھاگنا پڑا۔ اسٹے میں پولیس کی طرف سے لائٹھی چارج شروع ہو گیا۔ لوگوں کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر بھی کیے گئے۔ فائرنگ کی وجہ سے ہنگامہ ڈھنگ لگی تھوڑی دیر بعد جب میدان صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جلتی ہوئی دکان کے سامنے میری ٹیکسی بھی جل رہی تھی۔

ہم ان ہنگاموں میں کس طرح لٹ جاتے ہیں یہ میرے لئے کامنظروں کے سمجھ میں آسکتا ہے کہ میں نے دس برس پہلے وہ ٹیکسی قسطوں پر لی تھی۔ پورے آٹھ برس تک میں اس کی قسطیں بھرتا رہا تھا۔ قسطیں ادا کرتے کرتے وہ نئی ٹیکسی کھنڈ بن گئی تھی۔ وہ تیار پڑتی تھی، میں اس کا علاج کرتا تھا۔ وہ مہلکی ہو جاتی تھی، میں اسے مٹاتا تھا۔ وہ روٹھ جاتی تھی، میں کارخانے میں لے جا کر اسے مٹاتا تھا جو کمانا تھا اس پر خرچ کرتا تھا۔ ایک غریبی بیوی کی طرح وہ روٹھنے کی ادائیں دکھا دکھا کر میری جیب سے پیسے نکال لیا کرتی تھی۔ وہ

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس گھر کے باہر والی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس لیے وہ تفصیل سے مجھے کچھ بتا نہیں سکی۔ میں نے پوچھا۔
”تم نے کیا کھایا ہے؟“

”چاچا جی کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، ابو ددو مینے سے پیار ہیں۔ کبھی کھانے کے لیے ملتا ہے کبھی ہم بھوکے رہتے ہیں۔ صبح اسی کہہ گئی تھیں کہ وہ آپ کے پاس جاری ہیں۔ آپ سے کچھ پیسے لے کر آئیں گی۔ آپ تو آگے مگر وہ ابھی تک نہیں آئیں۔“

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”فکر نہ کرو بیٹے میں ابھی تمہارے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔ تم انہیں روشن کرو اندھیرا ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے دودھ لانے کے لیے برتن لیا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد، بابا، روئیاں اور دودھ لے کر واپس آنے لگا تو یلارانی نظر آئی۔ وہ آگے آگے جاری تھی اور میں پیچھے تھا۔ اسے آواز نہ تھا جانتا تھا کہ اسی وقت وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ مونا سے کہہ رہی تھی۔

”مٹی تمہارے چاچا جی ملے تھے انہوں نے مجھے ڈیڑھ سارے پیسے دیئے ہیں۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنی چیز لے کر آئی ہوں۔“

اس کی باتیں سنتے ہی میں دروازے کے باہر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہو چکی ہے اور جو پیسے اس کے پاس تھے وہ میں نے نہیں دیئے تھے۔
”ابو کہاں سے لائی تھی؟ مونا کی آواز سنائی دی۔“

”اسی کتنی ساری چیزیں ہیں۔ چاچا جی بھی میرے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لینے گئے ہیں۔“

”آہں“ اس کی گھبراہٹ ہوئی سی آواز سنائی دی ”کیا شیدے یہاں آیا ہے؟“
میں کمرے کے اندر آ گیا۔ یلارانی ایک دم سے گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی مصلح الدین کو دیکھنے لگی۔ مصلح الدین کی زبان بند تھی مگر کان کھلے تھے وہ سب کچھ سن چکا تھا اور بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس کے سائت جسم میں اچانک لچل سی جھجک تھی۔ وہ چپ لٹھے لٹھے لیے

بچی کا چہرہ اگلی سیٹ پر دیکھتا رہا جو میری مصلح الدین اور یلارانی کی بیٹی تھی۔ ہم تینوں اس معصوم بچی کی حفاظت کر رہے تھے اور وہ بچی ہم میں ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا کر رہی تھی۔

اس روز مونا دروازے پر نہیں آئی کیونکہ اس نے دروازے پر گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ٹیکسی روزی کا ذریعہ نہ سہی ایک معصوم بچی کو اپنی طرف بلانے کا چلا بھرتا کھلوتا تھی۔ مجھ سے مجھ سے ٹیکسی اور مونا سے اس کا کھلوتا چھن گیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا، کمرے میں مدھ مدھ مسمی تاریکی پھیل رہی تھی۔ ایک چارپائی پر مصلح الدین لیٹا ہوا تھا، اسی چارپائی کے سرے پر مونا سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی اور دوڑتی ہوئی آکر مجھ سے پلٹ گئی۔ پھر رونے کے درمیان سسکیاں لے کر کہنے لگی۔

”چاچا جی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے“ اسی صبح سے گئی ہیں ابھی تک نہیں آئیں۔ ابو چپ چاپ پڑے ہیں کچھ بولتے نہیں ہیں۔ پڑوس کی ماسی کہہ رہی تھی کہ شر میں بہت سے لوگ مر رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ مجھے بھی مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ چاچا جی آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، اسی بہت خراب ہیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔“

اب وہ اونچائی میں میرے کانہے تک پہنچ گئی تھی مگر ہمارے لاڈلے بچے نے اسے دنیا والوں سے بہت دور ایک معصوم اور بھولی بھالی گریبا بکر رکھا تھا۔ وہ یاد تو گھر کی چار دیواری میں رہتی تھی یا میری ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول آتی جاتی تھی۔ اس کے آگے جو دنیا ہے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں بڑے پیار سے اس کے سر کو سللاتا ہوا اور پیچھے کو جھٹکاتا ہوا تسلیاں دیتا رہا۔ پھر میں مصلح الدین کے قریب آیا، وہ اپنے بستر پر ایک لاش کی طرح جڑا ہوا تھا۔ اس نے صرف دیدے گھما کر مجھے دیکھا، اس کے ہونٹوں پر پینک سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے خیریت پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ مونا نے کہا۔

”ابو بہت بیمار ہیں باتیں نہیں کر سکتے ہیں۔“

”کب سے بیمار ہیں؟“

”جب سے ریزہ لوٹ لیا گیا ہے۔ باہر لوگ لوٹنے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں۔“

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی بول۔

”میں بھی اس کے سامنے رہوں گی تو مجھے دیکھ کر اسے اور تکلیف پہنچے گی۔“

”بیلا! میں پچھلے دو ماہ سے یہاں نہیں آ سکا۔ میں بھی شریکوں کی پیٹ میں آ گیا تھا اور جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ برسوں رہا ہو کر آیا تو سوچا کہ کچھ کمائی کر لوں پھر مونا کے لیے کچھ چیزیں خرید کر لے جاؤں گا مگر آج میری ٹیکسی جلادی گئی ہے۔ آمدنی کا جو واحد ذریعہ تھا وہ بیکار کے لیے ختم ہو گیا ہے۔“

”شیدے! ان سیاسی ہنگاموں نے ہمیں برباد کر دیا ہے۔ مصلح الدین کا رزہ لوٹ لیا گیا پھر اسے توڑ کر اس کی ٹکڑیوں کو لوگوں نے مار پیٹ کے لیے ہتھیار بنائے۔ اس نے اپنی آخری پونجی کو بچانے کی انتہائی کوششیں کیں۔ اسی دوران قانون کے محافظ آگئے۔ کسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہے کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ قانون کے محافظ بھی کو ایک لاشی سے ہانکنے لگے۔ انہوں نے رانقل کے کندے سے مصلح الدین کے سینے پر کئی ضربیں لگائیں۔ تب سے وہ خون کی تہ کر رہا ہے۔ دواؤں سے افادہ ہوتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر خون تھوکنے لگتا ہے۔ اس کے دل کے پاس کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔ اگر توجہ سے علاج نہ ہو سکا تو وہ خون تھوکتے تھوکتے مرجائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اپنے آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

”وہ بہت خوددار ہے شیدے۔ کتا ہے بھوکا مر جاؤ۔ مجھے دواؤں کے بغیر مار ڈالو مگر فٹ پاتھ پر نہ جاؤ۔ حرام کا ایک پیسہ بھی لاؤ گی تو میں مر جاؤں گا۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کام کہاں ملتا ہے۔ کارخانے بند پڑے ہیں۔ دوچار دنوں کے لیے کھلتے ہیں تو وہاں نئی کام دہائیوں کے لیے محتاج نہیں نکلتی۔ کسی گھر میں ہانڈی برتن دھونے کا کام بھی نہ مل سکا۔ پچھلے دنوں میں نے پانی پی کر اور مونا کو ایک وقت کھلا کر دن کاٹے ہیں۔ میں بھوکا رہ سکتی ہوں اور مصلح الدین کی خودداری کو قائم رکھنے کے لیے مر بھی سکتی ہوں مگر ایک معصوم بچی کو مر جھانے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ اپنے مجازی خدا کو دواؤں کے بغیر کس طرح مرنے کو دیکھ سکتی ہوں۔ دوائیں بند ہو جاتی ہیں تو خون جاری ہو جاتا ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی شیدے میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ اس لیے پھر فٹ پاتھ پر چلی گئی۔ پچھلے دو دن سے میں نے یہ بات سسلے سے چپا رکھی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں دھوکہ دے کر ایک

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بیماری اور ثقاہت کے باوجود اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابھری نظر آ رہی تھیں پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر جھکا کر خون کی تہ کر دی۔ بلارانی چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”میں سسلے آتم مجھے غلط نہ سمجھو، میں حرام کے پیسے نہیں لاتی ہوں۔ میں نے یہ پیسے شیدے سے ادھار مانگے ہیں۔ شیدے تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟“

”مصلح الدین کے پاس سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھے جھنجھوڑتی ہوئی کہنے لگی۔“

”شیدے خاموش نہ رہو۔ اسے بتاؤ کہ یہ پیسے تم نے دیے ہیں۔ تم نہیں بولو گے تو میری دنیا لٹ جائے گی۔ یہ کتنی بار خون کی تہ کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا مکمل علاج نہیں ہو گا تو یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“

وہ میرے پاس سے دوڑتی ہوئی پھر مصلح الدین کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنی دوائیں لے کر آئی ہوں۔ میں نے مزدوری کی ہے سسلے۔ میری مزدوری کی لاچ رکھ لو۔ میری مونا کے لیے اچھے ہو جاؤ۔“

ساری باتیں میری سمجھ میں آگئی تھیں۔ میں مصلح الدین کے قریب جا کر اسے سمجھانے لگا کہ بلارانی ج کہہ رہی ہے۔ اس کی دوائیں میرے پیسوں سے آئی ہیں۔ مونا اپنے باپ کے چہرے گردن اور تنکے پر گرے ہوئے لو کو پونچھ رہی تھی مگر حیرانگی سے نکل چکا تھا۔ میرا جھوٹ اس کے آگے ج نہ بن سکا۔ اس نے پھر تہ کر دی بلارانی تڑپ کر اٹھ گئی۔ پھر جھجھک کر بولا۔

”شیدے! جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ دیکھو خالوں نے میرے سسلے کا کیا حال بنا دیا ہے؟“

میں جلدی سے پاٹ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے بلارانی بھی آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم مصلح الدین کو چھوڑ کر نہ آؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“

میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر پیسے نکالے۔ میرے پاس اٹھائیس روپے تھے میں نے وہ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

”مونا یہاں اکیلی گھبرائے گی، میں یہاں رہتا ہوں تم یہ روپے لے کر جاؤ اگر دو انیس واپس نہ ہو سکیں تو تین دو انیس خرید کر لے آنا۔“

وہ روپے لے کر چلی گئی۔ میں نے مونا کے پاس آکر اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

”چلو بیٹے تم کھانا کھاؤ۔ تمہاری امی دو انیس لینے گئی ہیں۔ اب تمہارے ابو اچھے ہو جائیں گے۔“

وہ باپ کے پاس سے اٹھ کر چٹائی پر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھ دیں پھر اس کے پاس بیٹھ کر مہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے لقمے اٹھا کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ میں لائین کی روشنی میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شادی نہیں کی، میری کوئی اولاد نہیں ہے مگر وہ مجھے اپنے ہی جگر کا ٹکڑا نظر آ رہی تھی۔ بچے کھاتے وقت بھی کتنے معصوم اور ہر فکر سے سکتے آزاد نظر آتے ہیں۔ اس کی بے فکری نے مجھے دنیا جہان کی فکر میں مبتلا کر دیا۔ ٹیکسی نہیں تھی، ریزہ نہیں تھا مصلح الدین بیمار تھا اور میں بیکار تھا مگر زندگی کی ضرورتیں جیج رہی تھیں۔ ابھی مزید دو اوٹن اور انجنیئروں کے لیے، روٹی اور کپڑے کے لیے، مونا کی تعلیم کے لیے اور اس کی معصوم ہنسی کو دائم اور قائم رکھنے کے لیے، صبح و شام پیسوں کی ضرورت تھی۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اس گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے فروخت کر کے کچھ دنوں کے لیے زندگی کو بھلایا جاسکتا تھا۔ میں ٹیکسی سے چھوٹ کر پیدل ہو گیا تھا اور ہم سب پیدل کتنی دیر تک چل سکتے تھے؟

مصلح الدین اچانک کھانسنے لگا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے سینے کو سہلانے لگا۔ کھانسی کے دوران پھر اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے اٹل رہی تھیں۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اس اندھیری دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس اندھیرے میں وہ بیلا رانی کو تلاش کر رہا تھا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے رات کی رانی کو اندھیرے میں بھٹکنے سے روک رہا تھا۔ اس کے سر بٹننے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خود وار ہے، بے حیائی کا ایک پیسہ قبول نہیں

شریف آدمی کو زندہ رکھ سکتی ہوں تو اس کی شرافت کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے ذلت براتر آنا چاہئے۔ ہاں میں ذلیل ہوں۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا تو میں اپنے آپ پر تھوکوں کی ٹکر ابھی اسے خون تھوکتے نہیں دیکھ سکتی۔“

وہ کتنے کتنے اس طرح ہانپنے لگی جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔ پھر وہ زار دم لے کر بولی۔

”میں مصلے کے اعتبار کو قائم رکھنے کے لیے رات کو گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اس لیے دن کو فٹ ہاتھ پر آتی۔ میں نے سوچا ہنگاموں میں لوٹ مار کے دوران کوئی مجھے بھی لوٹ کر لے جائے گا تو کم از کم میں پچیس روپے میری ہتھیلی پر رکھ دے گا مگر لوٹ مار کے وقت جہاں نئے کپڑوں کے تھان، ریڈیو اور ٹی وی سیٹ ہاتھ آ رہے ہیں وہاں پرانی مشین کو اٹھا کر کھن لے جاتا ہے؟“

اس کی باتیں سن کر میں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ واقعی کھنڈر نظر آئی۔ وہ بالکل میری اس ٹیکسی کی طرح تھی جس کے اندر سے لوگ اپنے کام کے کل پرزے نکال کر لے جا چکے تھے اور بچکے ہوئے دھماگے کو چھوڑ دیا تھا۔

جس ڈاکٹر سے وہ مصلح الدین کا علاج کر رہی تھی وہ نہیں ملا۔ ہم دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ اس نے مصلح الدین کو دیکھتے ہی کہا۔

”اس کی حالت بہت نازک ہے اسے دونوں وقت انجکشن لگانے ہوں گے۔ میں جو دو انیس لکھ کروے رہا ہوں انہیں فوراً لے کر آؤ۔“

بیلا نے اپنی لائی ہوئی دو انیس اسے دکھائیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے علاج اور اس کی تجویز کردہ دواؤں سے متفق نہیں ہوتا۔ اس نے ڈھیر ساری دواؤں میں سے صرف ایک دوا کو کارآمد بتایا۔ باقی دواؤں کا نسخہ خود لکھ کر دیا۔ اپنی فیس اور انجکشن کے پندرہ روپے لیے اور تسلیاں دے کر چلا گیا۔

مصلح الدین آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ بیلا رانی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

”میں جو پیسے لائی تھی وہ دواؤں میں ختم ہو گئے اگر وہ دکاندار یہ دو انیس واپس لے کر نئی دواؤں دے دے گا تو میرا خیال ہے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اوسے پونے ذرا دیر کے مصلح الدین کے لیے کفن خرید سکتا تھا۔

اب میری جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں رکشے میں بیٹھ کر وہاں تک جاسکوں۔ مجبوراً بس میں بیٹھ کر جانا پڑا لیکن وہاں پہنچا تو ٹیکسی کا ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں آٹھ بجے کر فون گھننے والا تھا اور اب آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ تمام کانیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا لوگ جرجھاگے جا رہے تھے وہ نہیں بتا سکتے تھے کہ میری مرہ ٹیکسی کہاں لے جا کر دفن کر دی گئی ہے۔

میں بار بجپتا کر واپس آیا۔ اس وقت تک بیلا رانی کو ہوش آ گیا تھا کہ مصلح الدین کو مرنے کے بعد بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ جب تک پیسے نہیں ہوں گے تجبیڑ و ٹھنڈی کی رکسوں اور انہیں ہو کیس گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی بساط بھر کر شش کر چکا ہوں کہیں سے پھونٹی کر ڈی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر تین گھنٹے کے اندر ہم کفن وغیرہ خرید نہ لاسکے تو اس کے بعد کر نوگو جائے گا۔ کر فون کے اوقات میں بھی مروے کو دفن کرنے کے لیے شہر سے اپنا نہ مل جاتی ہے لیکن پہلے سے کفن وغیرہ خرید لینا ضروری ہے۔

”اب کون ہو گا؟“ بیلا رانی پریشان ہو کر مصلح الدین کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ زندگی کے تمام مسائل سے نجات حاصل کر چکا تھا مگر بیلا رانی کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ محلے پر دوسرا آدمی سے مدد مانگنے چلی گئی۔ میں بھی باہر نکل کر کچھ کرنا چاہتا تھا مگر موت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چاچا! مجھے ڈر لگتا ہے مجھے چھوڑ کر مت جائیے۔“

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک لاش کے ساتھ تھا کمرے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی اپنے سگوں کی لاش کے قریب تنہا بیٹھنے ہوئے ڈرتی ہیں اور موت کی ابھی عمری کیا تھی وہ تو بچی تھی۔ زندگی کا تجربہ بس اتنا ہی تھا کہ اس نے پہلی بار اپنے گھر میں ایک انسان کو خون تھوک کر مرنے دیکھا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر نہ جاسکا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب ان ناناں ہاتھ دالہ پر بیٹھ گئی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔

”سب اپنی اپنی پریشانیوں کا دردناک دور ہے ہیں۔ سب ہی یہ کہتے ہیں کہ یہ ہنگامے ختم نہیں ہوں گے اسی لیے ہر ایک کو کل کی فکر ہے۔ ایسے میں کون دو چار روپے کی مدد کرنا

کرے گا۔

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے کھائے کھانتے پھر خون کی قے کی اور ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی نبض دیکھی۔ کان رکھ کر اس کے دل کی دھڑکتوں کو سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ بیلا رانی کے لیے دھڑکنے والا دل بیشک کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں موتا نے میرے چہرے کو کیسے پڑھ لیا، وہ کھانا چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی۔

”چاچا جی! کیا ہو گیا ابو کو؟ ابو پھر خاموش ہو گئے؟“

وہ باپ کے بتے ہوئے لہو کو پونچھنے لگی اور اسے آوازیں دینے لگی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ اس کی آوازوں سے بہت دور چلا گیا ہے تو وہ باپ کے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر دھڑکیں مار مار کر رونے لگی۔ اسی وقت بیلا رانی کمرے میں داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں کیونکہ یہ چہرہ ملی آنکھیں رونا نہیں جانتیں مگر بیٹی کو ماتم کرتے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے دو آنس چھوٹ گئیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر کر جھکا لیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آکر مصلح الدین کی لاش پر گر پڑی۔

کمرے کی میز و دفنا ماں اور بیٹی کی آہ و بکا سے گونج رہی تھی۔ محلے کے بڑوں والے تھوڑی دیر میں آنے لگے۔ عورتوں نے آکر افسوس کا اظہار کیا۔ مہر کی تحفین کی۔ پھر واپس چلی گئیں کیونکہ بارہ بجے سے کر فون گئے والا تھا۔ سبھی کو کل شام تک کے لیے روٹی کی فکر کرنی تھی۔ کچھ لوگ محلے کے دو آدمیوں کی لاشیں لے کر آئے تھے جو ہنگامے میں مارے گئے تھے۔ ان کے کفن و دفن کے لیے چندہ لیا جا رہا تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ پاس بھی پھونٹی کر ڈی نہیں ہے اور مصلح الدین کی تجبیڑ و ٹھنڈی کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں نے بیلا رانی کو دیکھا اسے روتے اور بین کرتے وقت کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ہوش و حواس میں رہتی تب بھی اس کے پلے سے کچھ نہ ٹھٹھا کیونکہ اس کے پاس کچھ ہوتا تو وہ دواؤں کے لیے مجھ سے پیسے لے کر نہ جاتی۔

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ دور دور تک خیالی دوڑ لگائی کہ کسی جان پہچان والے سے کچھ رقم احوال مل سکتی ہے یا نہیں؟ مگر ایسے وقت کوئی مرہان نظر نہ آیا۔ میں گھبرا کر مکان سے باہر آیا۔ باہر آتے ہی یاد آیا کہ ابھی میری ٹیکسی کا ڈھانچہ راستے میں پڑا ہو گا میں اسے

آجائیں گے۔ کیا تمہارے پاس دواؤں میں سے کچھ پیسے بچے ہیں؟“

”تمہارے اٹھائیس روپے میں سے صرف آٹھ روپے روگئے ہیں۔ کیا آنے جانے کا کرایہ ہو جائے گا؟“

”چلو جانے کا کرایہ تو ہو جائے گا۔ واپسی میں ہم مصلح الدین کے والدین کے ساتھ آئیں گے۔“

میں مونا کا ہاتھ تھام کر باہر آگیا۔ پیلارانی نے دروازے پر آکر مصلح الدین کی لاش پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر مجبوری تھی۔ اس نے دروازے کو بند کر کے باہر سے بالادال دیا۔ پھر ہم رکشے کی تلاش میں چل پڑے۔ ابھی سڑکوں پر لوگوں کی آمدرفت تھی۔ دوسرے دن شام تک گھروں میں بند رہنے کے لیے ضروری سامان کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ ہمیں جلد ہی رکشہ مل گیا۔ ہم تین افراد کو رکشے میں بٹھانے کے لیے اس نے میٹر سے ایک روپیہ زیادہ لیا اور ہمیں رنجھوڑ لائن تک پہنچایا۔

سیاسی ہنگاموں کے دور ان رنجھوڑ لائن ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کرنیو کی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ وہاں راتوں کو بھی اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ وہاں قانون سے کھیلنے والوں نے شراب، جوئے اور دی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے کے اڈے قائم کر رکھے تھے اور عیاش طبع لوگ عورتوں کی تلاش میں سڑکوں پر بھٹکتے رہتے تھے ہم مصلح الدین کے گھر پہنچے تو کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ صاحب لوگ لاہور چلے گئے ہیں ہنگامے ختم ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔

میں اور پیلارانی ایک دوسرے کا منہ ٹکٹے لگے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ وہاں گئے تھے کہ والدین اپنی نا فرمان اولاد سے کتنی ہی نفرت کریں مگر آخری بار اس کا دیدار ضرور کرتے ہیں اور تجنیزو عتفین کی آخری رسوم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ہم مصلح الدین کے والدین تک اس کے مرنے کی خبر بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ہم مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گئے۔ واپسی کے لیے پورا کرایہ نہیں تھا مونا میرے بازو سے لگی چل رہی تھی۔ اس نئی نسل کے ساتھ چلتے وقت احساس ہوا کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور ہر طرف سے اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہ ایک جوان ہونے والی بیٹی کا بھی سارا

ہے؟ اور کیا دو چار روپے میں کہیں کفن آتا ہے؟ ہم کتنے دروازوں پر جا کر کفن کے لیے چندہ مانگ سکتے ہیں۔ یہاں پہلے ہی دواؤں کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس شخص نے میرے اور میری بیٹی کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا اپنے خون کے رشتے توڑ دیئے، میری زندگی کا راستہ موڑ دیا، ہمارے لیے فٹ پاتھ پر ریزہ لگا تا رہا اور پولیس والوں سے کبھی مار کھاتا رہا اور کبھی انہیں رشوت دے کر ہمارے لیے آوازیں لگا کر چھل پچھتا رہا اب وہاں سے خون تھوکتا ہوا آکر صرف ایک کفن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں مانگا مرنے کے بعد مانگ رہا ہے تو کیا میں اسے چندے یا خیرات کا کفن پہناؤں؟“

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔

”میرے آسودہ زندگی میں کچھ نہیں دیتے کسی کے مرنے کے بعد کیا دیں گے؟ صرف پیسہ ہی سب کچھ دیتا ہے۔ اب یہی ایک راستہ رو گیا ہے ہم مصلح الدین کے والدین تک یہ خبر پہنچا دیں۔“

پیلارانی نے مراٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بڑے کرب سے بولی۔

”ہائے! میں اپنے منہ کے آخری وقت بھی کام نہ آسکی۔ تم ٹھیک کہتے ہو اس کے والدین کو معلوم ہو گا تو اسے عزت سے کفن نصیب ہو گا۔ اس کے ماں باپ رنجھوڑ لائن میں رہتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو ہم ایک کھٹے میں انہیں لے کر یہاں آجائیں گے۔“

”میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟ یہاں مونا اکیلی نہیں رہے گی۔“

وہ پریشانی سے مونا کو دیکھ کر بولی ”میں بھی تنہا نہیں جا سکتی۔ جگہ جگہ فوج کے سپاہی راستہ روک کر پوچھیں گے کہ میں کس نیت سے اتنی رات کو تنہا گھوم رہی ہوں؟“

وہ تنہا نہیں جا سکتی تھی۔ مونا کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی لاش کے پاس سے ہر آکر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے کہا۔

”ہم تینوں ساتھ چلیں گے۔ لاش تیار ہوتی ہے۔ ہم دروازے کو باہر سے بند کر دیں گے۔ صرف کھٹے آوے گھٹنے کی بات ہے اگر ہم رکشے میں جائیں گے تو جلدی واپس

نہیں بن سکتا۔ پیلا رانی یوں بڑبڑاتی جا رہی تھی جیسے ہوش و حواس کھو چکی ہو۔
 ”میرا مسئلہ کیوں مر گیا؟“ وہ سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی ”اس
 لیے مر گیا کہ وہ خود دار تھا۔ اپنی زندگی میں وہ حرام کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔“
 ہم ایک گلی سے نکل کر سڑک پر آگئے اور ایک تھلے کے پاس نیم تاریکی میں کھڑے
 ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ وہ بدستور بڑبڑا رہی
 تھی۔

اس کے بڑبڑانے کے دوران دو شرابی لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور ہم سے ذرا دور رک
 کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں نیم تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اچانک ہی
 پیلا رانی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہمارے درمیان سے نکلی اور ان کے سامنے پہنچ
 گئی۔ وہ دونوں نشے میں تھے۔ انہیں نئے اور پرانے مال، تازہ اور باسی کھانے کی پہچان نہیں
 تھی نشے کی حالت میں وہ پیلا رانی کی عمر کا حساب نہیں کر سکتے تھے اس لیے خوش ہو کر سودا
 کرنے لگے۔

اسی وقت ایک اسکوٹر موٹر کا نانا ہوا وہاں سے گزرا۔ اس کی ہیڈ لائٹ کی روشنی مجھ پر
 سے ہوتی ہوئی موٹا پر سے چھلکتی ہوئی اور نیم تاریکی میں ایک کلی کے حسن کو اجاگر کرتی
 ہوئی گزر گئی۔ اچانک ہی سودا کرنے والوں کو نئے اور پرانے کی پہچان ہو گئی۔
 وہ چپکے ہوئے ڈھانچے کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے نئی ٹیکسی کے سامنے کھڑے
 ہو گئے۔ چشم زدن میں ایک نکلی اپنی شاخ سے ٹوٹ کر طوفانی ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر
 ہوتی نظر آتی تو پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
 اب کس کے لیے بے حیائی کا کفن خریدنا تھا۔ ایک خود دار انسان کے لیے ایک
 مرجھائے ہوئے پھول کے لئے یا ایک معصوم فوج خیزی کے لئے۔؟

